کاروانِ خیال

(کُلیات)

افسانے

افسانچے

پوپ کہانیاں

طنز و مزاح

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ایم بی ای
(برطانیہ)

کاروانِ خیال

کاروانِ خیال

(کلیات)

- افسانے
- افسانچے
- پوپ کہانیاں
- طنز و مزاح

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ایم بی ای (برطانیہ)

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

انتساب

تخیّل کے نام

یہ جو لفظوں کی پیغمبری ہم کو بخشی گئی ہے
یہ جو کاغذ، قلم، حرف کی روشنی ہم کو بخشی گئی ہے
یہ تو مالک کا فیضان ہے اس کا احسان ہے !!!
کاروانِ تخیل کی جو رہبری ہم کو بخشی گئی ہے
(رضیہ اسماعیل)

پیش لفظ

کاروانِ خیال (نثری کلیات) میں شامل پانچوں کتابیں تقریباً پچھلے پچیس برسوں میں وقتاً فوقتاً منصۂ شہود پر آتی رہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چند کتب کی تو ایک دو کاپیاں ہی میرے پاس رہ گئیں تو خیال آیا کہ ان سب کتب کو یکجا کر کے (ایک کلیات کی شکل میں) شائع کروادوں۔

میرے لئے نثر اور شاعری دونوں ساتھ ساتھ ہی چلتے رہے۔ 2000ء میں میری پہلی نثری کاوش ''چاند میں چڑیلیں'' طنز و مزاح کی صورت میں اشاعت پذیر ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اسی برس میرا پہلا شعری مجموعہ ''گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو'' اور نثری نظموں کی کتاب بعنوان ''میں عورت ہوں'' (بمعہ انگریزی تراجم) اشاعت پذیر ہوئی۔

میری پہلی نثری کاوش (چاند میں چڑیلیں) اور دوسری نثری کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' میں تقریباً بارہ برس کا طویل وقفہ آیا مگر اس عرصے میں میرا قلم میدانِ شعر و سخن میں مصروف کار رہا۔ اور میری دیگر شعری تخلیقات جن میں ''سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں'' (مکالماتی نظمیں) ''پیپل کی چھاؤں میں'' (اُردو ماہیے) ''ہوا کے سنگ سنگ'' (نظمیں، غزلیں) ہیں۔ ''احساس کی خوشبو'' (نسائی شاعری بمعہ انگریزی ترجمہ) اور ''خوشبو اُڑتی پھرے'' (دوہے) اشاعت کے مراحل سے گزرتے رہے۔ اور ان سب شعری کاوشوں کا مجموعہ کلیات کی صورت میں خوشبو' گلاب' کانٹے کے عنوان سے 2012ء میں شائع ہوا۔

میری دوسری نثری کاوش ''پوپ کہانیاں'' 2012ء میں ہی بعنوان ''کہانی بول پڑتی ہے'' منصۂ شہود پر آئی۔

اس کتاب کی تخلیق کے پیچھے بھی ایک دل چسپ کہانی ہے۔ انگریزی ادب کی طالبہ ہونے کے باعث میں پوپ کہانیوں کے وجود سے نا آشنا نہیں تھی، مگر اُردو میں ان کا تذکرہ پہلے پہل مقصود الٰہی شیخ (مرحوم) کے توسط سے مجھ تک پہنچا جس میں انہوں نے اس صنف نثر (پوپ کہانی) کا موجد ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

یہ دعویٰ کچھ عجیب سا لگا کیونکہ جہاں تک میں جانتی تھی ''پوپ کہانیاں'' ماضی میں بالخصوص امریکی ادب میں لکھی جا چکی تھیں۔ مزید تحقیق کرنے پر بہت سے نام سامنے آ گئے جنہوں نے پوپ کہانیاں لکھی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب پوپ میوزک کا چرچا زوروں پر تھا اور پوپ کلچر ایک طرح سے ہر شعبۂ آرٹ میں در آیا تھا۔ اس ضمن میں حیدر قریشی (جرمنی) نے اس میں کافی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اس پر کئی تحقیقی مضامین لکھے۔ دریں اثنا 2013ء میں عکاس انٹرنیشنل میگزین (اسلام آباد) نے ''افسانچے کا سفر'' کے نام سے خاص

نمبر شائع کیا جس میں شیخ سعدی شیرازی، خلیل جبران، سعادت حسن منٹو، جوگندر پال، منشا یاد، نذیر فتح پوری، ابن عاصی، ارشد خالد اور راقم الحروف کی تحریروں کو شاملِ اشاعت کر کے علمی و ادبی تحقیق سے ثابت کیا کہ یہ کوئی نئی صنف نثر نہیں ہے، جس کے موجد ہونے کا دعویٰ شیخ صاحب نے کیا ہے۔ بہر حال انہی دنوں پوپ کہانی کے ضمن میں میری تحاریر ماہنامہ الحمرا (لاہور) پرواز (لندن) ساحل (لندن) عکاس (اسلام آباد) کے علاوہ کئی اور دیگر ادبی جریدوں میں شائع ہوئیں۔ ہاں آخر پوپ کہانی کے موجد ہونے کا غلغلہ دم توڑ گیا۔ (یہ سب بحث و تمحیص قارئین کی دل چسپی کے لئے ''کہانی بول پڑتی ہے'' کے پیش لفظ میں تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔ جو شامل کتاب ہے)

میری تیسری نثری تخلیق 2016ء میں اشاعت کے مرحلے سے گزری۔ یہ میرا افسانوں کا پہلا مجموعہ تھا جو کہ ''آدھی چادر'' کے نام سے شائع ہوا۔ اسی سال لاہور میں اس کتاب کی رسم اجرا منعقد ہوئی جس کی صدارت حسن عسکری کاظمی اور مہمانِ خصوصی بشریٰ رحمن تھیں۔ دیگر ادباء میں ڈاکٹر شہناز مزمل، زاہد مسعود، سلمیٰ اعوان اور ڈاکٹر اجمل نیازی شامل تھے۔ علمی اور ادبی حلقوں میں اس افسانوی مجموعے نے بہت پذیرائی حاصل کی۔ اس مجموعے میں شامل کئی افسانے میرے بچپن کے مشاہدات تھے جو عرصہ دراز سے نوکِ قلم پر آنے کے لئے مضطرب تھے۔ ان افسانوں میں آدھی چادر، چیچہ وطنی، ہرنام داس، با کا، دیوارِ گریہ اور مکئی کا دانہ شامل ہیں۔ پرنام داس افسانہ تو انڈیا میں بھی بہت پسند کیا گیا اور ایک خاص افسانہ نمبر میں اسے جریدے شاعر (بمبئی) نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔

اس کے بعد کی دو مزید نثری تخلیقات ''مٹی کی آواز'' اور ''دائروں کا سفر'' 2019ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔ ''مٹی کی آواز'' افسانے ہیں جبکہ ''دائروں کا سفر'' افسانچوں پر مشتمل ہے۔

برطانیہ، پاکستان اور بھارت کے علاوہ جہاں جہاں بھی دنیا میں اُردو لکھنے پڑھنے والے اہل نظر موجود ہیں، میری تحاریر کو ان حلقوں میں بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور بہت سے معتبر ادیبوں اور شاعروں نے میری تخلیقات پر اپنے تبصرے، جائزے اور تاثرات لکھے جس کے لئے میں ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔

ان اہل نظر میں محمود ہاشمی، حیدر قریشی، بشریٰ رحمن، ڈاکٹر شہناز مزمل، زاہد مسعود، سلمیٰ اعوان، حسن عسکری کاظمی، فرحت عباس شاہ، عدیم ہاشمی، شبنم شکیل، سلطانہ مہر، ڈاکٹر حسن رضوی، ڈاکٹر صفات علوی، ڈاکٹر علی اکبر منصور، شاہد بخاری، عثمان صدیقی، صفیہ صدیقی، پاکیزو بیگ، پروین شیر، طلعت سلیم، قاضی عنایت الرحمٰن، طارق شاہد، سلطان محمود، شاہدہ احمد، فرخ زہرا گیلانی، یعقوب نظامی، اقبال راہی، عقیل دانش، باصر کاظمی، ڈاکٹر فوزیہ تبسم، خواجہ عارف، فاروق ساغر، فرزانہ خان، مامون ایمن، حمیدہ معین رضوی، شریف بقا، پروین سجل، لطیف راز، محمد طارق علی، ساحر شیوی، مناظر عاشق ہرگانوی، محفوظ الحسن، ڈاکٹر فراز حامدی، خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن ہاشمی شامل ہیں۔ ان سب تحاریر کو ایک کتاب ''عکسِ آگہی'' میں شامل کر دیا گیا ہے جو کہ ''رضیہ اسماعیل، فن اور شخصیت'' کے عنوان سے 2023ء میں شائع ہو چکی ہے۔

میری اگلی نثری کاوش ''ولایت گم گشتہ'' کے عنوان سے تکمیل کے مراحل میں ہے۔ یہ برطانیہ میں میری آدھی صدی کی سرگزشت ہے۔اس کتاب کی تکمیل میں خاصی تاخیر وقوع پذیر ہوئی ہے جو کئی ذاتی اور معروضی حالات کی وجہ سے تھی۔

گزشتہ آٹھ دس برس میں خیال کرتی رہی کہ مزید چار کتابیں لکھوں گی، جن میں ایک ''ولایت گم گشتہ'' جو میرے برطانیہ آنے کے بعد کے حالات وواقعات سے متعلق تھی، دوسری کتاب ''آ گہی درآ گہی'' کے نام سے سوچ رکھی تھی جو کہ برطانیہ میں میرے ادبی ارتقاء اور میری ادبی اور ثقافتی تنظیم آ گہی سے متعلق تھی جس کا قیام 1997ء میں عمل میں آیا۔اگلی کتاب ''دہلیز پہ بیٹھے لمحے'' کے عنوان سے سوچ رکھی تھی، جس میں باتیں، یادیں اور خاکے شامل تھے اور آخری کتاب ''اسفارِ ماہ وسال'' تھی (جو برطانیہ میں آدھی صدی میں میرے یورپ، امریکہ، کینیڈا اور مشرقِ وسطیٰ کے اسفار کا احوال تھا مگر یہ سب ممکن نہ ہوسکا)، اس لئے حد درجہ تاخیر کے پیش نظر ان سب کتب کو ''ولایت گم گشتہ'' میں مختلف ابواب کے تحت شامل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان چاروں کتب کے نفس مضمون میں ایک ہم آہنگی اور تسلسل ہے جو کہ میرے برطانیہ میں آدھی صدی کے قیام سے متعلق ہے اس لئے یہ چاروں کتب نہایت خوبصورتی سے اب ''ولایت گم گشتہ'' میں ضم ہوکر برطانیہ میں آدھی صدی کی سرگزشت کا حصہ بن چکی ہیں جو انشاءاللہ جلد ہی تکمیل کے مراحل طے کر کے منصۂ شہود پر آ جائے گی۔ اللہ رب العزت کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے ایک جیسی تخلیقی توانائی کے ساتھ ہے مجھے نثر اور شاعری لکھنے کی توفیق دی جسے اہل قلم اور اہل نظر کی تائید بھی حاصل رہی۔شکریہ

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل ایم۔بی ای
(برمنگھم) برطانیہ
مورخہ 18 اپریل 2025ء

''آدھی چادر'' کے افسانے

حسنِ ترتیب

1- پیش کلام رضیہ اسماعیل .....
2- ''آدھی چادر'' کے افسانے حیدر قریشی .....
3- رضیہ اسماعیل کی نئی تخلیق سلمیٰ اعوان .....
4- روشنی کا تعاقب .....
5- ہرنام داس .....
6- سوری .....
7- چھنال .....
8- مکئی کا دانہ .....
9- دیوارِ گریہ .....
10- چیچہ وطنی .....
11- کیہ جاناں میں کون؟ .....
12- باکا .....
13- آدھی چادر .....
14- قُفنس .....

مٹی کی آواز کے افسانے

حُسنِ ترتیب

1- پیش لفظ رضیہ اسماعیل .....
2- شک گزیدہ .....
3- تھپڑ .....
4- تتلیاں اُداس ہیں .....
5- ڈائری .....
6- عمر قید .....
7- مٹی کی آواز .....
8- یاوحشت! .....
9- تاجو .....
10- ادھورا بندھن .....
11- آنسو .....

دائروں کا سفر کے افسانچے

حُسنِ ترتیب

پیش لفظ رضیہ اسماعیل .....
1- کرن .....
2- پروپوزل .....
3- پروف .....
4- ڈیڈی .....
5- بے چہرہ نسلیں .....
6- مونالیزا .....
7- کالا پانی .....
8- ڈسپوزیبل .....
9- ری سائیکلنگ .....
10- خاندان .....
11- کُتّے .....
12- حساب کتاب .....
13- نامرد .....
14- آوارہ کُتّے .....
15- اذان .....
16- اداکار .....
17- سوری .....

18- آنچل .....
19- انفیکشن .....
20- دوسرا خواب .....
21- امتیازی سلوک .....
22- انٹیلیکچوئل .....
23- ریٹرن ٹکٹ .....
24- ٹرانسپلانٹ .....
25- تضحیک .....
26- دو تلواریں .....
27- دمادم مست قلندر .....
28- امیر غریب .....
29- نعت گوئی .....
30- باباچُھو .....
31- ریموٹ کنٹرول .....
32- دائروں کا سفر .....
33- تکون .....
34- زبان .....
35- تعزیہ .....
36- راکھا .....
37- انوکھی بچت .....
38- مجذوب .....
39- ٹیس .....
40- گولڈن آپر چیونٹی .....
41- کیلے .....
42- شریف .....

43- کبڑا عاشق .....
44- نیولا .....
45- کوکڑو .....
46- لعل بادشاہ .....
47- دعا .....
48- جہاد .....
49- قتل .....
50- دہشت گرد .....
51- بوسہ .....
52- دُکھ سکھ .....
53- ادبی مکالمہ .....

کہانی بول پڑتی ہے کی پوپ کہانیاں

حسنِ ترتیب

1- پوپ میوزک سے پوپ کہانی تک ڈاکٹر رضیہ اسماعیل .....
2- پوپ کہانی اور رضیہ اسماعیل کی کہانیاں حیدر قریشی .....
3- خواندنی اور جاذبِ نظر کہانیاں خواجہ محمد زکریا .....
4- مشین .....
5- سرخ دروازہ .....
6- تھرڈ ورلڈ گرل .....
7- ایئر فریشنر .....
8- آنر کلنگ .....
9- تھرڈ ڈائمنشن .....
10- گلاس کٹر .....
11- گاربیج .....
12- شادی ڈاٹ کوم .....
13- ریورس گیئر .....
14- پاکی .....
15- بھائی جان .....
16- ریڈیو کی موت .....
17- ٹک ٹک دیدم .....

چاند میں چڑیلیں کے مضامین

حسنِ ترتیب

1- پیش لفظ رضیہ اسماعیل .....
2- گرینڈ مدر .....
3- باؤنسر .....
4- آ گئی .....
5- کی کرشمہ سازیاں .....
6- گوریاں .....
7- ادبی جمود .....
8- ایجنڈا .....
9- ٹررن ترن .....
10- قدموں تلے .....
11- تقریر کی لذت .....
12- ولایتی چوہے .....
13- محبت کی کارفرمائیاں .....
14- کاش .....

15- رنگ برنگی ناریاں .....

16- سرونٹ .....

17- موازنے .....

18- فارمولے اور تبصرے .....

آدھی چادر

(افسانے)

انتساب اوّل

امی کے لیے

جن کی بے لوث محبتوں اور نورانی دعاؤں کی ردا نے
مجھے موسموں کی شدتوں سے محفوظ و مامون رکھا

انتساب ثانی

ثنا اور وَردہ کے لیے

جو میرے وجود کا جواز ہیں اور جن کی موجودگی
میرے ہونے کی آدھی نہیں بلکہ پوری گواہی دے رہی ہے

پیش کلام

نہایت متبرک ساعتوں میں معرضِ وجود میں آنے والی مملکتِ خداداد پاکستان کی اس نسل سے میرا تعلق ہے، جس کا جنم بٹوارے کے چند سالوں بعد ہوا۔ میں ایک ایسی نسل کی وارث ہوں جسے لوریوں کی جگہ ہجرت کی خونچکاں داستانیں سُننا پڑیں۔ بے خانماں، بے سروسامان، زخم خوردہ، شکستہ پا، مگر آنکھوں میں سنہرے مستقبل کے خواب سجائے، حوصلوں کی جولانیوں سے آباد دلوں کے ساتھ، میرے آباؤاجداد جن گھروں میں اترے ننھے ننھے ہاتھوں سے وہاں پوجا پاٹ کے لیے بنے ہوئے استھانوں سے ہم نے خود مورتیاں ہٹائیں۔ طاق میں رکھے ہوئے دیوالی کے دیئے کے دھوئیں سے سیاہ ہونے والی دیواروں کو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔

رام چندر، سیتا، راون، اورستی کے جلوس کی کہانیاں ہمیں نصاب میں پڑھنے کو ملیں۔ دسہرا، بیساکھی، دیوالی، بنارس، کاشی اور متھرا کی اندھی عقیدتوں کے قصے ہمیں ازبر کرائے گئے۔

ہماری زمانے کے سرد و گرم سے ناچشیدہ آنکھوں میں تعبیر و تعمیر پاکستان کے خوابوں کی فصل بوئی گئی۔ خوابوں کے بوجھ سے دم توڑتی ہوئی خمار آلود آنکھوں سے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے بلکہ ہم فضاؤں میں جیسے تیر رہے تھے۔ خوابوں کا فسوں ایسا تھا کہ جیسے اندر سے آواز آ رہی ہو:

خواب گر ہوں
مرے کانچ کے خواب ہیں
چوڑیوں کی بجائے سجالو
مرے خواب بانہوں میں تم
خواب پہنو مرے، خواب اوڑھو مرے
میں بھی تن پہ سجائے قبا خواب کی
حالتِ خواب میں چل رہی ہوں
نئی منزلوں کی طرف
راستے میں مرے کوئی کانٹا نہیں

خواب کی فصل ہے لہلہاتی ہوئی
خوش نما خواب رستوں میں لٹکے ہوئے
ٹہنیوں پہ کہیں خواب اٹکے ہوئے
راستہ نیند میں جیسے بھٹکے ہوئے
خواب آنکھوں کی بانہوں میں سوئے ہوئے
خواب خوابوں کے من میں سموئے ہوئے۔۔۔

پتہ ہی نہ چلا کب خوابوں کی فصل کانٹوں میں تبدیل ہوگئی۔خواب ٹوٹنے لگے،خواب بکھرنے لگے،ان بدنصیب آنکھوں نے پاکستان کو ٹوٹتے اور خوابوں کو دربدر ہوتے ہوئے دیکھا۔دوقومی نظریے کی دھجیاں بکھرتی اور خلیج بنگال میں ڈوبتی ہوئی دیکھیں۔ایسے میں میرے خواب مستقل اداسی کی ردا اوڑھ کر جیسے تھک کر سو گئے ہوں سوتب سے میں ایک اداس نسل کی بے حد اداس فرد ہوں۔

پھر میرے پرکھوں کی طرح میرے مقدر میں بھی ہجرت لکھ دی گئی۔لیکن ان کی جبری ہجرت کے برعکس میری ہجرت اختیاری تھی سو میں اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے پچھلے چالیس برس سے زائد عرصے سے اپنے نئے وطن (برطانیہ) میں مقیم ہوں۔

اب جب کہ زندگی کی دوپہر ڈھل رہی ہے۔سورج کی تمازت رفتہ رفتہ ماند پڑ رہی ہے۔افق پہ لالی اپنے خیمے گاڑ رہی ہے۔پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو سارا منظر جیسے گھلنے لگتا ہے۔سوچتی ہوں یہودی ہولوکوسٹ پر گریہ زاری کرتے نہیں تھکتے مگر پنجاب کے ہولوکوسٹ کی کہانی کب لکھی جائے گی؟اس کا نوحہ کون لکھے گا؟پنجاب کے ہولوکوسٹ کے میوزیم کب بنیں گے؟کب بین الاقوامی قوانین اس بات کا اقرار کریں گے کہ پنجاب پر کیا بیتی؟اس کے نقصان کی تلافی کون کرے گا؟پنجاب اور پنجابیوں کی تقدیر کا فیصلہ کیوں ان پہ چھوڑ دیا گیا جن کا پنجاب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا؟اس آدھی پونی غیر منصفانہ تقسیم سے بلند ہونے والے شعلے کب سرد ہوں گے؟کالی سیاہی سے نقشے پہ کھینچی ہوئی لکیر کب اور کیسے خونی لکیر بن گئی؟انسان کب انسانیت کا چولا اتار کر وحشی بن گیا؟بے شمار سوالات ہیں مگر وقت کی اندھی گپھاؤں سے کوئی جواب نہ پا کر یہی کہنا پڑتا ہے:

تیرے جواب کے وقفے طویل کتنے ہیں
گزرتے جاتے ہیں میرے سوال کے موسم

کیا صرف ایک امرتا پریتم کے وارث شاہ کو دہائیاں دے دے کر قبروں سے بلانے پر پنجاب کے زخموں کا مداوا ہو گیا؟

اس کتاب کا محرک بننے والا افسانہ ''آدھی چادر'' بھی پنجاب اور پنجابیوں کی حرماں نصیبیوں کی داستان ہے جس نے کچھ عرصہ پہلے واہگہ اٹاری بارڈر پر میرے دل کے تار جھنجھوڑ کر رکھ دیئے۔یہاں قلم بند کی جانے والی کئی کہانیوں میں بٹوارے کی تلخیاں

سانس لے رہی ہیں جن میں آدھی چادر کے علاوہ ہر نام داس، باکا اور چیچہ وطنی شامل ہیں۔

مجھے اپنے افسانوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا ہے کیونکہ یہ محض افسانے نہیں ہیں میرے اندر کا شور ہے جس نے بہت عرصے سے میرے اندر ایک اُدھم مچایا ہوا تھا۔ اب کاغذی پیرہن سے لپٹ کر ممکن ہے اسے کچھ قرار آ گیا ہو۔ میرا ماننا ہے کہ جب تک یہ کہانیاں باہر نہ آتیں۔ دوسری اَن گنت کہانیوں کو راستہ ملنا دشوار تھا۔ اب جبکہ بارش کے پہلے قطرے کی مانند یہ کہانیاں کاغذ کی سجل دھرتی پر برس گئی ہیں تو امید ہے کہ سالہا سال سے منتظر اور بہت سی کہانیوں کی رم جھم جلد ہی صفحۂ قرطاس کو شرابور کر دے گی۔

آپ انھیں پڑھیں اور خود فیصلہ کریں کیونکہ

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

رضیہ اسماعیل

16 مارچ 2016ء

''آدھی چادر'' کے افسانے

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل شاعری کی مختلف اصناف (غزل،نظم، ماہیا، دوہے، وغیرہ) میں اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے ساتھ نثر نگاری میں بھی مسلسل پیش قدمی کر رہی ہیں۔تنقیدی وتعارفی مضامین اورطنز ومزاح پر مشتمل تحریریں وہ ایک عرصہ سے لکھ رہی ہیں۔ان کے بعض شاندار خاکے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا ہے، پھران کی علمی بحث کے ساتھ شائع ہونے والا کہانیوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے''۔یہ ساری شعری ونثری نگارشات میں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا آرہا ہوں۔اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر شائع ہونے جارہا ہے۔اس کی ان پیج فائل میرے سامنے ہے۔میں اس مجموعہ کے سارے افسانے پڑھ چکا ہوں اوراب ان کے بارے اپنی رائے دے سکتا ہوں۔پہلے میں ترتیب وار ہرافسانے کا ممکنہ اختصار کے ساتھ ذکر کروں گا اور آخر میں سارے افسانوں پراپنی مجموعی رائے بیان کردوں گا۔

''روشنی کا تعاقب'' صوفیانہ خیالات سے لبریز انسان کی خارجی خباثتوں اور داخلی خوبصورتیوں کی دلچسپ کہانی ہے۔ فرانز کافکا کی کہانی کی طرح رضیہ اسماعیل مٹھی بھر زندگی کوقریب سے دیکھنے کےعمل سے ایسے گزرتی ہیں کہ خود دیکھنے کے ساتھ اپنے قارئین کوبھی مٹھی بھر زندگی قریب سے دکھاتی چلی جاتی ہیں۔ایسی زندگی جہاں بہت سارے کہے اوران کہے سوال ہیں اورسوالوں کے اندر ہی کہیں ان کے جوابوں کی روشنی بھی ہے۔

''کمرے کی کھڑکی ہرروز کھلتی اور بند ہوتی رہی۔مٹھی بھر زندگی کوقریب سے دیکھنے کی کوشش میں ہر بار نئی رام کہانی، نئی پتا، نیا منظر نامہ، نئے کردار، نئے سوال، نئے جواب سامنے آجاتے۔گویا سوچوں کی اَن گنت کھڑکیاں کھل کر کبھی دل، کبھی ذہن توکبھی روح پر دستک دینے لگتیں۔'' **(روشنی کا تعاقب)**

''ہرنام داس'' تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات کے المیہ کو بیان کرتی ہے تاہم اس میں کہانی کار نے اپنے بچپن کی عمر کی سوچ کو جس طرح اظہار کی زبان دی ہے وہ بے حد متاثر کن ہے۔ایسے ایسے معصومانہ سوال جن کے عقب میں زندگی کی مکاریوں کے کتنے راز چھپے ہوئے ہیں۔

''بس چُپ رہواوراپنی عمر سے بڑے سوال مت کیا کرو!'' **(ہرنام داس)**

ہرنام داس کے نام کے سحر میں کھوئی معصوم بچی پر جب اپنے والدین کے دکھوں کا راز کھلتا ہے توتقسیم کے انسانی المیہ کی دوطرفہ المناکی مزید دکھی کرنے لگتی ہے۔

''یہ بات سنتے ہی ہرنام داس کا اداس سا ہیولا دھیرے دھیرے وقت اور تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو گیا۔'' (**ہرنام داس**)

''**سوری**'' ویسے تو انگلینڈ میں زندگی گزارنے والوں کی ہلکی پھلکی سی روداد ہے لیکن اس کے پس منظر سے عراق پر امریکی و برطانوی حملہ کا المیہ ابھرتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کرداروں سلمان اور سوسن کو اپنا کالج کے زمانے کا جیک یاد آتا ہے۔ بڑی عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو کرنے والا جیک فوج میں چلا گیا تھا اور اسے عراق جنگ میں جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد وہ نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو کر پاگل ہو چکا تھا۔ ایک پرانے دوست کا طویل عرصہ کے بعد سامنے آنا اور وہ بھی دیوانگی کی حالت میں۔ لیکن کہانی کے مرکزی کردار کو احساس ہوتا ہے کہ عراق پر ہونے والے بے جا حملے میں شریک ہو کر جیک کا دیوانہ پن درحقیقت اس کا احساسِ گناہ ہے اور اس احساس کے حوالے سے وہ کہانی کے آخر میں کہتا ہے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ کچھ گناہوں کی معافی شاید کبھی بھی نہیں ملتی، چاہے انسان زندگی بھر لفظ ''سوری'' کی تسبیح کرتا رہے۔''

(**سوری**)

''**چھنال**'' پہلے دیپک کی ماں ساوتری کی زندگی کی اور پھر دیپک اور جیوتی کی زندگی کی ایسی کہانی ہے جس میں گھریلو زندگی اور ہندوستانی دیہاتوں کا پرانا سماج مثالی مشرقی ماحول کی تصویر پیش کر رہا ہے۔

''**مکئی کا دانہ**'' پاکستانی دیہاتوں کے عمومی ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ گاؤں کا نمبردار اپنی جاگیر کے زعم میں گاؤں میں محض اس لیے ہسپتال بننے نہیں دیتا کہ گاؤں کے کمی کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ اولادِ نرینہ سے محروم جاگیردار کے ہاں ایک مدت کے بعد بیٹا پیدا ہوتا ہے، لیکن شومئ قسمت بڑی بہن اسے چپ کرانے کی کوشش میں اس کے منہ میں مکئی کا دانہ ڈال دیتی ہے جو بچے کے گلے میں اٹک جاتا ہے۔ گاؤں کے کمپوڈر سے بچہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ آخر شہر سے اسی کمی کے بیٹے ڈاکٹر عباس کو بلایا جاتا ہے۔ وہ بچے کو اُلٹا کر کے کمر پر ہاتھ مارتا ہے تو مکئی کا دانہ باہر آ جاتا ہے۔ لیکن بچہ تو کبھی کا مر چکا تھا۔ گاؤں کے نمبردار کا وارث دم توڑ چکا تھا اور نمبردار کی رعونت خاک میں مل چکی تھی۔

لُک چھپ جانا
مکئی دا دانہ
راجے دی بیٹی
آئی جے.....لُک چھپ جانا.....

کے الفاظ سے شروع ہونے والی کہانی کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

''نمبردار کی بیٹی چندا سر پیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ آج ایک مکئی کے دانے نے راجے کی بیٹی کو لکھ سے لکھ کر دیا تھا۔ ننھا ملک سلطان بوہڑ کی کٹی ہوئی شاخ کی طرح نمبردار کے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔

آج نمبردار ملک عزیز کی دسترس میں نہ حیات رہی.....نہ زمانہ رہا.....اور نہ ہی کائنات۔ ایک حقیر سے مکئی کے دانے نے

اسے بے نام ونشان کر دیا تھا۔''

(**مکئی کا دانہ**)

''**دیوار گریہ**'' ایک خوبصورت لڑکی کی دکھ بھری داستان۔خواتین کے جذبات کی عمومی کہانی۔تاہم اس میں عمومیت کے باوجود کچھ خاص محسوس ہوتا ہے۔

''میں سوچ رہی تھی کہ ''عورتیں ویسے تو اترن پہننے میں بہت ہتک محسوس کرتی ہیں مگر دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر اوڑھتے وقت انہیں کوئی شرم، کوئی ہتک، کوئی بے عزتی محسوس کیوں نہیں ہوتی ؟''

جس خوف کی تلوار ہمیشہ سر پر لٹکتی رہتی تھی آخر وہی ہوا۔ بنانے والے نے میرا رنگ روپ سنوارنے میں اتنا وقت صرف کر دیا کہ وہ میری تقدیر لکھنا ہی بھول گیا۔''

(**دیوار گریہ**)

''**چیچہ وطنی**'' پرانے دیہاتی ماحول کی دلچسپ کہانی ہے۔بس ایک روداد سی تھی جسے رضیہ اسماعیل کے اندازِ بیان نے انہماک سے پڑھی جانے والی کہانی بنا دیا ہے۔

دو بیویوں کے شوہر محمد خان کی دوسری بیوی بن جانے والی فاطمہ جُٹی سے پہلی ملاقات کا منظر دیکھئے۔

''اپنی زمینوں پر یوں ایک اجنبی کو دندناتا ہوئے دیکھ کر فاطو جُٹی نے غصے سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

گردش ماہ وسال بھی رک گئی..... لمحے سراسیمہ سے ہو گئے۔

کھیتوں میں سرسوں کی مہک نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ ہنستے ہوئے پیلے پیلے پھولوں کی ہنسی وار کر گئی۔

گھڑ سوار نے پوری قوت سے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔گھوڑے نے بہت زور سے ہنہنا کر دونوں پاؤں یوں زمین سے اوپر اٹھائے کہ گھڑسوار گرتے گرتے بچا۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے مالک کی یہ بے وقت مداخلت اُسے سخت ناگوار گزری تھی۔

سبکتگین کی طرح رحم کھا کر چوہدری کو بھاگتے ہوئے ہرن کو رہا نہیں کرنا پڑا تھا بلکہ موقعہ پا کر ہرن خود ہی فرار ہو گیا اور چوہدری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابند سلاسل کر گیا۔ چوہدری اور فاطو جُٹی ایک دوسرے کے بالمقابل آ چکے تھے۔ فاطو جُٹی کی نگاہوں میں چوہدری نے پتہ نہیں کون سے شعلے کی لپک دیکھی کہ سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔نہ جانے وہ سمے کا کون سا پل تھا جو چوہدری کو اس سے چرا کر لے گیا۔'' (**چیچہ وطنی**)

''**کیہ جاناں میں کون**'' بظاہر ایک فرد کے رقص اور قونیہ میں مولانا روم کے پیروکاروں کے مخصوص صوفیانہ رقص کی منظر کشی سے شروع ہونے والی کہانی ہے۔لیکن صوفیانہ رمزوں کے کئی اسرار کی ہلکی ہلکی جھلکیاں دکھلاتی ہوئی یہ کہانی ایک ایسے ادھورے انسان کی المناک کہانی ہے جسے قدرت نے بناتے ہوئے مکمل نہیں کیا، آدھا، ادھورا رہنے دیا۔نہ مرد بنا، نہ عورت۔کہانی صوفیانہ ماحول

سے باہر آتی ہے تو ادب کی فضا چھا جاتی ہے۔اس ادھورے انسان کی دلچسپیوں کا سلسلہ رقص، موسیقی، ادب اور فن کے دوسرے سلسلوں سے بھی کسی نہ کسی طور ملتا جاتا ہے۔دراصل یہ خاکہ نما افسانہ ہے جو افتخار نسیم (افتی نسیم) کی زندگی کی کچھ روداد بیان کرتا ہے اور کچھ افسانہ نگار کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔افسانہ نگار کو افتی سے گہری ہمدردی ہے، لیکن افتی اپنی اضطراری حرکات سے ہر بار افسانہ نگار کو خود سے متنفر کر دیتا ہے۔اس کے باوجود افسانہ نگار کی ہمدردی اس کے لیے کم نہیں ہوتی۔اس خاکہ نما کہانی کے اختتام کا یہ قدرے طویل اقتباس دیکھیں۔

''میں نے جیسے ہی کتاب بند کی اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کتاب میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا: "It is for adults only."

پتہ نہیں کب وہ خاموشی سے آ کر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔میں نے اس کے طنز کے اوچھے وار سے لڑکھڑانے کی بجائے سوال کر دیا ''اچھا تو تم بالغ ہو؟''

اس نے جواباً طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا ''اس میں کیا شک ہے؟''

''تو دوسروں کی بلوغت کے بارے میں تمہیں کیوں شک ہے؟'' میں نے گویا جرح شروع کر دی۔اب کی بار وہ خاموش رہا۔

''ہوسکتا ہے جنہیں تم نابالغ سمجھتے ہو وہ تم سے زیادہ بالغ ہوں اور تمہیں نابالغ سمجھتے ہوں۔'' میں نے زہر میں بجھا ہوا تیر پھینکا۔

''میں اور نابالغ؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں تم!'' میں نے لفظ تم پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اپنی Sexuality کا اشتہار لگا کر، عورتوں کی طرح سولہ سنگار کر کے ہم جنس پرستوں کے جلسے جلوسوں کو لیڈ کرنا ہی بلوغت کی نشانی ہے؟'' اب کی بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی کیونکہ وار کافی سخت تھا۔لیکن وہ برافروختہ ہونے کی بجائے خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔جیسے میں نے اس کی توقع کے برخلاف بہت کچھ کہہ دیا ہو۔

اس دن کی ترش گفتگو کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی اونچی دیوار حائل ہو چکی تھی جو آخری وقت تک قائم رہی۔

اگلے روز کافی مندوبین کی واپسی متوقع تھی۔رات بہت دیر تک جاگتے رہنے کے باعث میں صبح قدرے تاخیر سے اٹھی۔ جس وقت میں نیچے کمپاؤنڈ میں آئی تو اس کی گاڑی ایئرپورٹ جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔''خدا حافظ کہنے کا موقعہ بھی نہ ملا.....شاید اچھا ہی ہوا.....رات کی گفتگو سے جو بدمزگی پیدا ہوئی تھی اس کے بعد نہ جانے کس طرح سے الوداع کہا جاتا؟'' میں نے خود سے کہا۔

اٹلی سے واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد خبر ملی کہ وہ ساتویں رنگ کی تلاش میں ہم سب کو چھوڑ کر کہیں بہت دور نکل گیا تھا کبھی نہ واپس آنے کے لیے.....

''بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟'' کی سرمدی تکرار ایک بار پھر فضاؤں میں گونج اٹھی

تھی۔'' (**کیہ جاناں میں کون**)

''**باکا**'' غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان گھرانوں کے دو دوستوں کی داستان ہے۔کلکتہ کے ایک خوش حال گھرانے کا نوجوان انڈونیشیا کی آزادی سے پہلے وہاں جاپانی فوج کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔جاپانی فوجی وہاں جاسوسی کے شبہے میں پکڑے گئے قیدیوں کے ساتھ جوسلوک کرتی ہے اس کا حال جان کر رونگھٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بلکہ بعض واقعات پڑھ کر تو انسان سوچنے لگتا ہے کہ پھر تو امریکہ کے پاس ایٹم بم گرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔کلکتہ کے خوش حال گھرانے کا ڈاکٹر یونس جاپانیوں کے مظالم کا شکار ہوکر پاگل ہوجاتا ہے۔اس دوران پاکستان بن جاتا ہے اور ڈاکٹر یونس پاکستان کے کسی پاگل خانے تک پہنچادیا جاتا ہے۔وہیں اس کے دیرینہ دوست ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور پھر علاج کے لیے اپنے گھر پر رکھ لیا۔کہانی پڑھنے سے پہلے کہانی کا عنوان ''باکا'' پڑھ کر ایسے لگتا ہے جیسے کہانی کے کسی کردار کا نام مبارک ہوگا لیکن آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی زبان میں پاگل کو باکا کہتے ہیں۔

''**آدھی چادر**'' برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے ایک نوحہ سا لکھا گیا ہے۔اس میں مشترکہ انسانی قدروں کا ذکر بھی ہے اور شدید سماجی تفاوت کا بیان بھی۔سماجی سطح پر باہم خیر اور بھلائی کے جذبات رکھنے کے باوجود سماجی تضادات کی کشمکش نے تقسیم کے موقعہ پر خونریزی کے المیہ کو جنم دیا۔ان ساری یادوں کو کہیں ادب کے حوالے سے، کہیں جذباتی رنگ میں، کہیں مذہبی شان کے ساتھ اور کہیں سادہ سے عام انسان کی طرح بیان کیا گیا ہے۔تاریخ کے کئی پہلو اس میں نظر انداز بھی ہوئے ہیں تاہم کہانی کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماضی سے حال تک کو ایک نظر دیکھا گیا ہے اور اچھے مستقبل کی امید بھی کی گئی ہے۔

''**ققنس**''۔۔۔جیسے ''کیہ جاناں میں کون'' خاکہ نما افسانہ ہے ویسے ہی ''ققنس'' رپورتاژ نما افسانہ ہے۔اس میں کوئی حرج نہیں۔جب کوئی لکھنے والا پختہ کار ہوجاتا ہے تو اس کی تخلیقات میں مختلف اصناف کی آمیزش ایک خاص فنکارانہ مہارت کے ساتھ آسکتی ہے۔رضیہ اسماعیل کی بعض تخلیقات میں ایسا دیکھا جاسکتا ہے۔''ققنس'' میں پہلے تو انگلینڈ کے بعض ادبی اداروں اور تنظیموں کا بالواسطہ تعارف کرایا جاتا ہے۔پھر بعض ادبی کرداروں سے ملوایا جاتا ہے۔مختلف ادبی موضوعات پر بحث کے لیے اچٹتے اشارے دیئے جاتے ہیں۔پھر ایک ادبی ورکشاپ کا حال سنایا جاتا ہے۔یہ سب کچھ ایک رپورتاژ کی صورت میں بھی لکھا جاسکتا تھا لیکن رضیہ اسماعیل نے اپنے اندر کے افسانہ نگار سے کام لیتے ہوئے اسے ایک افسانے کا روپ دے دیا ہے۔

ایک پبلک لائبریری کا تعارف کراتے ہوئے رضیہ اسماعیل بتاتی ہیں۔

''برمنگھم میں یورپ کی سب سے بڑی پبلک لائبریری جس کا افتتاح پاکستانی نوبل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی نے کچھ عرصہ پہلے کیا تھا۔انہوں نے شیکسپیئر میموریل روم میں باقاعدگی سے منعقد ہونے والے ادبی گروپ ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز'' (Writers without Borders) کے بارے میں کچھ مواد بھیجا تھا۔'' (**ققنس**)

ادبی گروپ ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز'' کا نام بڑا خوشنما ہے۔لیکن ابھی تک کی عملی سچی بات یہ ہے کہ تحریریں تو بارڈرز کو

کراس کرسکتی ہیں لیکن رائٹرز کو بارڈرز کراس کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔خصوصاً انڈو پاک کے ادیبوں کو ویزے کی رکاوٹیں، دوسرے ملک میں مشکوک نظروں سے دیکھے جانے کی اذیتیں ایسی ہیں جو بارڈرز کی سخت اہمیت کا احساس بھی دلاتی ہیں اور ادیب کی مجبوری کا بھی۔صرف انڈو پاک ہی میں نہیں اب تو مغربی دنیا میں آنے والوں کو بھی ویسی ہی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے۔اور لگ بھگ ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے۔سو رائٹرز وداؤٹ بارڈرز محض کہنے کی بات ہے۔

ادبی ورکشاپ میں گفتگو شروع ہوتی ہے اور ایک ترک رائٹر تک ان الفاظ میں پہنچتی ہے۔

''کیا آپ نے کبھی ادھوری کہانیوں پر غور کیا ہے؟ ادھوری محبتوں کی کہانیاں.....موڑ مڑتی ہوئی کہانیاں..... بین کرتی ہوئی کہانیاں.....روٹھی ہوئی کہانیاں..... ہاری ہوئی کہانیاں.....مگر ہر لمحہ سانس لیتی ہوئی کہانیاں.....کیونکہ کہانی کبھی نہیں مرتی!!!'' اب کی بار ٹرکش رائٹر بول رہا تھا۔'' (**ققنس**)

''ققنس'' میں بنیادی طور پر اس خیال کو پیش کیا گیا ہے کہ جیسے ققنس اپنی آگ میں جل کر راکھ ہوتا ہے اور پھر اسی راکھ سے اس کا نیا جنم ہوتا ہے ویسے ہی جس کہانی کار کی کہانی مکمل نہیں ہوتی وہ پھر اپنی راکھ سے نیا جنم لیتی ہے۔اور یوں کہانی کہنے کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔اس حوالے سے رضیہ اسماعیل نے ورکشاپ کے شرکاء کی مختلف آراء دینے کے ساتھ جوگندر پال کے ایک افسانچے کا اقتباس بھی دیا ہے۔

''ذہن کے کسی گوشے سے جوگندر پال کی آواز سنائی دی جو اس خیال کی تائید کر رہی تھی۔'' (**ققنس**)

اس کے بعد رضیہ اسماعیل نے جوگندر پال کے افسانچے کا ادھورا سا اقتباس دیا ہے۔اگر یہ پورا افسانچہ درج کر دیا جاتا تو ''ققنس'' کا بار بار اپنی راکھ سے جنم لینے کا بھید زیادہ روشن ہو کر سامنے آجاتا۔یہاں جوگندر پال کا پورا افسانچہ درج کر دیتا ہوں۔

''زندگی تو اٹوٹ ہے، اسے کوئی ایک جنم میں کیسے پورا کرے۔ہاں، اسی لیے میرا کہنا ہے کہ میں ہی چیخوف ہوں، میں ہی پریم چند، میں ہی منٹو۔۔۔اور وہ بھی کوئی، جسے ابھی پیدا ہونا ہے۔

ہاں بابو، میں اسی لیے بار بار جنم لیتا ہوں کہ اپنا کام پورا کرلوں مگر میرا کام ہر بار ادھورا رہ جاتا ہے۔

نہیں، اچھا ہی ہے کہ ادھورا رہ جاتا ہے، اسی لیے تو زندگی کو زوال نہیں، بابو۔''

مغربی دنیا میں مقیم اردو رائٹرز کے حوالے سے رضیہ اسماعیل نے بڑی سچی اور کھری باتیں کی ہیں۔ایک جھلک یہاں پیش کر دیتا ہوں۔

''مگر ہم لوگ یہاں کس قدر الگ تھلگ سی زندگی گزارتے ہیں۔کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی جگہ ٹراتے رہتے ہیں۔جب تک ہم مقامی معاشرے میں ربط و ضبط بڑھانے کی کوشش نہیں کریں گے تو Sense of Belonging کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتی اور ہم ناسٹلجیا کا ہی شکار رہیں گے۔'' میں نے بڑے دکھ سے سوچتے ہوئے ساری ڈاک ایک طرف رکھ دی۔

''اسی لیے تو نسلی ہم آہنگی (Racial Harmony) پیدا نہیں ہو رہی اور ہماری نئی نسل انتہا پسندی کی طرف راغب

ہورہی ہے۔''

ذہن کے کسی گوشے نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ادب اور ثقافت انسانوں کے درمیان رابطے کا سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے انسانی تعصب بہت حد تک دور کیا جا سکتا ہے کیونکہ تعصب کی بنیاد ہی لاعلمی یا کم علمی پر ہوتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں جہالت کہہ سکتے ہیں۔''

ذہن کے اس زبردست تجزیے کو جھٹلانے کی میرے پاس قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔'' (**قفس**)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے اس مجموعہ کی گیارہ کہانیوں کا یہ مختصر سا تعارف تھا۔ان کہانیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔آپ ایک افسانہ پڑھنا شروع کریں تو اسے ختم کیے بغیر کتاب رکھنے کو دل نہیں مانے گا۔ایک اور خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول اور علاقہ کی بات کر رہی ہوتی ہیں عام طور پر وہیں کا پورا ماحول اور پوری لفظیات کہانی میں سرایت کر جاتی ہے۔ہندوستان کے دیہات کا ماحول ہو یا انگلینڈ کا شہری ماحول، پنجاب کے صوفی شاعر ہوں یا قونیہ کے صوفی رقاص۔پاکستان کا دیہاتی منظر ہو یا امریکہ و جاپان کا کوئی بیان، رضیہ اسماعیل کہانی کے بیانیہ ہی میں نہیں اس ماحول میں بھی پوری طرح ڈوبی دکھائی دیتی ہیں۔کہانی کے زمانے اور ماحول کا پوری طرح کہانی میں سرایت کر جانا رضیہ اسماعیل کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔یہ مہارت طویل ریاضت کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔

بیشتر کہانیوں میں انسانی المیوں کے مختلف روپ سامنے آتے جاتے چلے جاتے ہیں۔مختلف کرداروں کی انفرادی نوعیت کے زندگی کے گہرے صدمات سے لے کر، تقسیم برصغیر کے وقت ہونے والا قتل و غارت، عراق میں ہونے والی ہولناک جنگ، دوسری جنگ عظیم کے زمانہ کے بعض خوفناک واقعات۔یہ سب المیے جو اِن افسانوں میں بیان کیے گئے ہیں موثر پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔پھر ان سب کے مقابلہ میں انسانی اقدار کو اجاگر کرتے ہوئے صوفیانہ روایات سے عمدہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس دھرتی کے انسانوں کے لیے امید کی روشنی دکھائی گئی ہے۔سو براہِ راست کسی نوعیت کی پیغام رسانی نہ کرتے ہوئے بھی رضیہ اسماعیل کے افسانے آج کے گلوبل انسان کے مسائل کو ماضی کے مختلف علاقوں کے مسائل کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔پھر وہ انہیں دیکھتے اور دکھاتے ہوئے ہمیں انسانی مستقبل کے انسان کے لیے پیار اور محبت کی وہ روشنی دکھاتے ہیں جو دنیا کو امن کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے افسانوں کا مجموعہ'' آدھی چادر'' علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی اور قبولیت حاصل کرے گا اور عوامی سطح پر بھی اسے مقبولیت ملے ہوگی۔انشاءاللہ!

حیدر قریشی (جرمنی)

۳۱مارچ ۲۰۱۶ء

haider_qureshi2000@yahoo.com

رضیہ اسماعیل کی نئی تخلیق ''آدھی چادر''

رضیہ اسماعیل اتنی متنوّع صفات کی حامل شخصیت ہیں کہ رشک آتا ہے۔شاعری کا میدان ہو۔اس میں جھنڈے گاڑے بیٹھی ہیں۔پانچ شعری مجموعے اپنا آپ منوا کر مزید ایک نئے اضافے سے خوشبو، گلاب، کانٹے کے نام سے چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔مزید دو مجموعے ''خوشبو اُرتی پھرے'' اور ''احساس کی خوشبو'' زیرِ طبع ہیں۔

میری اب تک کی اس خوبصورت شاعرہ سے شناسائی ادبی رسائل میں چھپنے والی اس کی غزلوں، نظموں اور یا پھر اس کی ''پوپ کہانی'' کے حوالے سے تھی۔ادب کی اس صنف کے آغاز اور اس کے بانی پر اس کے تحقیقی مضمون نے جس انداز میں بحث و مباحثے کے دروازے کھولے اور جس سے رسائل میں ایک دلچسپ بحث کا آغاز ہوا۔سچی بات ہے مجھے یہ سلسلہ اچھا لگا تھا۔یوں میں اس کے شعروں کی فکری گہرائی اور اس کے شعر گوئی میں تنوع کی مداح تو تھی ہی، مگر اس کی کلیات نے میرے اوپر بہت سی مزید پرتوں کو وا کیا۔اس کے اندر کی سچائی اور بے باکی جس طرح اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے۔اس کے کلام کی نغمگی اس میں ٹھاٹھیں مارتی غنایت ایک طرف اگر اس کا حسن بڑھاتی ہے تو وہیں اس کے اندر کے دُکھ اس کے لفظوں کے راستوں سے باہر آتے ہیں، اور آپ کو افسردہ کرتے ہیں۔

تاہم مجھے اس کے جس پہلو پر کچھ کہنا اور لکھنا ہے وہ اس کی نئی افسانوں کی کتاب ''آدھی چادر'' سے ہے۔مسودے کے مطالعہ سے احساس ہوا کہ وہ کہانی کہنے کا فن جانتی ہی نہیں بلکہ اسے سلیقے طریقے سے سجا کر پیش کرنے میں بھی ماہر ہے۔''آدھی چادر'' اِس مجموعے کی مرکزی کہانی جہاں وہ پاکستان کی کٹی پھٹی تقسیم پر نوحہ خواں ہے۔مجھے حیرت ہے کہ ہم پاکستانیوں خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت بھی اُن حقائق سے آگاہ نہیں جن پر اس کی کہانی نہ صرف روشنی ڈالتی ہے بلکہ جا بجا کرب اور دکھ کا اظہار بھی کرتی ہے۔

''ہرنام داس'' بھی تقسیم کے المیے میں گندھی کہانی ہے۔ایک حساس بچی جو ہرنام داس کی بڑی سی حویلی کے دروازوں، کھڑکیوں، اُن کمروں میں دھرے برتنوں، فرنیچر، اُس گھر کی وسعت اور کشادگی سے باتیں کرتی ہے۔جس کے اندر ایک اسرار پھیلا ہوا ہے جو احساسات کی کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے کہانی کو بڑا منطقی انجام دیتا ہے۔دراصل یہ اس کا سفر ہے۔اس ناسٹلجیا کے دُکھوں کا جس میں اس نے اپنا بچپن گزارا۔جس کی تلخ یادیں اس کی یادداشتوں میں کسی خزانے کی طرح پڑی تھیں، جنہیں وہ اب ایک ایک کر کے کہانیوں کی بُنت میں بُن رہی ہے۔

''چیچا وطنی'' اُن کی ایسی ہی ایک اور اثر انگیز کہانی ہے۔دو عورتوں کی محبت کا مرکز واحد مرد۔دو عورتیں ایک خوبصورتی کی انتہاؤں پر اور دوسری قبولیت سے بھی نچلے درجے پر۔کیا مقناطیسی چیز تھی جس نے مرد کو جکڑ لیا۔کہانی میں بکھرا تجسّس آپ کو آگے لے

جانا چاہتا ہے مگر کہانی کہنے کے انداز کی دل کشی آپ کو روکتی ہے۔ موت سے متاثر ماحول کی عکاسی ایک سوگوار موج کی طرح آپ کو اپنے ساتھ بہاتے ہوئے اس کے رنگوں کا آشکارہ کرتی ہے۔

ذرا دیکھیئے۔

آج سارے پنڈ کے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔

نہ ہی چھیمو ماچھن نے تندور تپایا۔

نہ ہی شیداں بھٹیارن نے دانے بھوننے کے لیے بھٹی سلگائی۔

نہ چوپال سے حقے گڑگڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کھیتوں میں سب ہل پنجالیاں بے آسرا پڑے کراہ رہے تھے۔

گاؤں کے رہٹ بے زبان ہو چکے تھے۔

ٹیوب ویلوں کا پانی شڑاپ شڑاپ کرنا بھول گیا تھا۔

آموں کے باغ میں کوئل کی کوک اب ہوک میں تبدیل ہو چکی تھی۔

چراگاہوں میں چرتے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی چرنا بھول کر ماتمی انداز میں سرزمین پر رکھے اُداس بیٹھے ہوئے تھے۔

پنڈ کے سارے آوارہ کُتے بھی آسمان کی طرف منہ اٹھائے وقفے وقفے سے فاطمہ جُٹی کے ہاڑوں کے جواب میں منہ کھول کر ماتمی آوازیں نکال رہے تھے۔

''دیوارِ گریہ'' بھی ایک خوبصورت دردانگیز کہانی ہے۔ معاشرے کی جہالت، مردانہ استحصال، عورت کے تحفظ کی جبلّی خواہش اور اس کے حصول میں پے در پے دھوکوں سے بغل گیری۔

رضیہ کی کہانیوں کی زبان سادہ، اسلوب خوبصورت، موضوعات میرے آپ کے معاشرے کے دُکھ، اس کی کجیاں، اس کے رویّے سبھی زیرِ تحریر آتے ہیں۔ وہ پراثر لکھنے پر قادر ہیں۔

''کیہ جاناں میں کون'' ایک اور بے حد اثر انگیز کہانی کہہ لیجیئے یا ایک ملاقات، آپ کی مرضی۔ رضیہ نے کردار کو براہ راست اس کا حقیقی نام دینے سے پوری رازداری سے کام لیا اور صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں جیسی کیفیت پیدا کرنے کا انداز اپنایا ہے۔ مگر جاننے والے بھی تو جانتے ہیں۔ تاہم یہ ایک بھرپور تاثر چھوڑنے والی تحریر ہے۔ جو آپ کو ملول کرتی ہے۔ اُن دکھوں سے آشنا کرتی ہے جو خدا کی اِس تخلیق کو نصیب ہوتے ہیں۔

رضیہ کے لئے دعا گو ہوں۔ اُن کا یہ فنّی سفر جاری رہے۔ ایک وسیع دُنیا اُن کے حصار میں رہتی ہے۔ امید ہے کہ وہ مزید کہانیوں سے ہمیں ان کرداروں سے ملواتی رہیں گی جو اُنہیں لکھنے پر اُکساتے ہیں۔

نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ

سلمیٰ اعوان (لاہور)

روشنی میں اندھیرا، اندھیرے میں بھی روشنی کی کرن ہے
میں دیے کو نہیں ڈھونڈتی، اب تو مجھ کو دیا ڈھونڈتا ہے

(رضیہ اسماعیل)

روشنی کا تعاقب

''میں یہ سوچ کر اکثر اداس ہو جاتی ہوں کہ اگر مکانوں میں کھڑکیاں نہ ہوتیں تو پھر کیا ہوتا؟''

''دروازے تو خیر دروازے ہیں، ان کی افادیت تو سب ہی جانتے ہیں مگر کھڑکیاں.....کبھی ان کی افادیت پر بھی ہم نے سنجیدگی سے غور کیا ہے؟'' میں خود ہی سوال اور خود ہی جواب بن جاتی۔

اپنے کمرے کی بڑی سی کھڑکی کے پٹ تھامے میں کافی دیر سے کھڑی تھی۔ پھر اچانک کچھ سوچ کر میں مسکرا اٹھی۔ مجھے لگا اس مسکراہٹ نے میرے اندر بہت سی کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ ذہن کی کھڑکیاں، دل کی کھڑکیاں، روح کی کھڑکیاں.....

''کیا روح کی بھی کھڑکیاں ہوتی ہیں؟'' میرے اندر سے سوال گونجا۔

''ہاں، ہوتی ہیں مگر یہ اتنی آسانی سے نہیں کھلتیں۔'' اندر سے ہی جواب آیا۔

''مگر کیوں؟'' سوال میرے لبوں تک آتے آتے رہ گیا۔ مگر میرے اَن کہے سوال کے جواب میں ہی دل بول اٹھا۔

''یہ فنا قبل از فنا والا معاملہ ہے یعنی موت سے پہلے مر جانا، اپنی ذات کی مکمل نفی۔''

''مگر ذات کی نفی اتنی آسان نہیں ہوتی۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں، اگر کوئی دوسرا آپ کی ذات کی نفی کرے تو یہ تکلیف دہ عمل ہو سکتا ہے لیکن جب آپ خود ہی اپنی ذات کی نفی کرتے ہیں تو یہ مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔'' دل نے جواب دیا۔

''یہ فہم و ادراک کی کون سی منزل ہوتی ہے؟'' میں نے پھر سوال کر دیا۔

''جب آدمی کو یہ پتا چل جائے کہ وقت کی تختی پر اس کی اہمیت ایک نقطے سے زیادہ نہیں ہے، اس کے ہونے یا نہ ہونے سے ذرہ برابر بھی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔'' اندر سے مدلّل سا جواب سن کر میں نے کچھ سوچتے ہوئے کھڑکی کے پٹ پوری طرح کھول دیئے۔

باہر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی زندگی اپنی تمام تر خباثتوں کے ہمراہ ایک زوردار انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی تھی۔

پڑوس میں رہنے والا دوہاجو رحیمو جولاہا اپنی نئی نکور بیوی کو بلا وجہ ہی منہ بھر بھر کر گالیاں دے رہا تھا۔ وہ ذرا چوں چراں کرتی تو اُسے مارنے کو دوڑتا۔

رحیمو کی ننگی ننگی گالیاں سن کر گلی میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر پڑے، دن رات کھوں کھوں کرتے، اللہ وسائے موچی نے حقے کی نَے پرے کر کے بلغم زدہ گلے سے رحیمو کو سمجھانا شروع کر دیا۔

''اوئے، رحیمو! اگر اس بے چاری پر جوانی ٹوٹ کر آئی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ اب دن رات گالیاں دینے سے اس کی جوانی کا منہ زور دریا تو اترنے سے رہا۔ پکی عمر میں سہرا باندھ کر گھوڑی پر بیٹھنا تو آسان ہے مگر گھوڑی کو قابو میں رکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔''

رحیمو کے پاس اللہ وسائے موچی کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا اور شاید اللہ وسایا اس سے کسی جواب کی توقع بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اس نے دوبارہ زور شور سے حقہ گڑگڑانا شروع کر دیا۔

کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ کر مجھے فرانز کافکا کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ ''دنیا کتنی دل چسپ جگہ ہے؟ اس بات کا اندازہ کرنا ہو تو مٹھی بھر دنیا اپنی آنکھوں کے نزدیک لا کر غور سے دیکھو۔''

''میں بھی مٹھی بھر دنیا کو اپنی آنکھوں کے بہت نزدیک لا کر دیکھوں گی۔'' میں نے ایک عزم سے کہا۔

اگرچہ مجھے اس بات کا ادراک تھا کہ بے حد نزدیک سے مشاہدہ کرنے والی دنیا کی نزاکتیں سوچ کی اور بہت سی کھڑکیاں کھول دیں گی۔

مگر میں نے اس مشاہدے سے حاصل ہونے والی لذت کے خیال سے سرشار ہو کر کچھ اور انہماک سے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

میرے علم میں یہ بات تو تھی کہ رحیمو کی پہلی بیوی رحمتے چند مہینے قبل اسے ایک لمبی رفاقت کے بعد دائمی جدائی کا داغ دے کر جا چکی تھی اور اب رحیمو کو بیوی کی یاد میں دن رات آنسو بہاتے دیکھ کر سب ہی پریشان ہو رہے تھے۔ رحیمو کو غم کی کھاٹ سے کسی طرح بھی اترتے نہ دیکھ کر اس کے بھائی نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دے ڈالا۔

''آخر بندہ ہی بندے کا دارو ہوتا ہے۔ زنانی کی موت پر اتنا لمبا سوگ مناتے تو ہم نے کسی کو نہیں دیکھا، تو کوئی بڈھا تو نہیں ہو گیا رحیمے! ہڈ پیر سلامت ہیں۔ اچھی کاٹھی ہے، مرد ذات کا کیا ہے، وہ تو ہمیشہ جوان ہی رہتا ہے۔''

رحیمو کے بھائی سلطان نے اسے دوسری شادی کے لئے قائل کرنے کے لئے دلائل دینے شروع کر دیئے۔

سلطان کی بات سن کر رحیمو کچھ روز گومگو کا شکار رہا مگر پھر دوسری شادی کے خیال نے اس کے دل میں گدگدی کرنی شروع کر دی۔ بغیر سوچے سمجھے ہی اس نے اپنے سے عمر میں کئی گنا چھوٹی لڑکی سے شادی کے لئے رضامندی ظاہر کر دی۔ رحیمو کی اس ناسمجھی کا خمیازہ اب رحیمو کے ساتھ ساتھ سب محلے والے بھگت رہے تھے۔

یک لخت سوچ کی ایک ننھی سی کھڑکی میرے ذہن میں کھل گئی، ''بھلا رحیمو کو اس عمر میں نئی سیج سجانے کی کیا ضرورت تھی؟ رحمتے کے ساتھ اس کی ایک لمبی رفاقت کی سانجھ تھی۔ ازدواجی زندگی میں اگر چند سال بھی سکھ کے نصیب ہو جائیں تو بڑی بات

ہے۔ باقی ماندہ زندگی بھی انہی چند سالوں کے سہارے بُری بھلی گزر ہی جاتی ہے، مگر رحیمو نے تو اوکھلی میں سر دے دیا ہے، اب موصلے تو پڑنے لازمی ہیں۔''

''میں تو کہتی ہوں رحمتے کی بجائے رحیمو کو مر جانا چاہیے تھا۔ کم از کم اڑوس پڑوس والوں کی زندگیاں تو اجیرن نہ ہوتیں۔ رحمتے کا کیا تھا، صابر شاکر عورت تھی۔ اس بڑھاپے میں اُسے کہاں دوسرا خصم کرنے جانا تھا، یہ حق تو صرف مردوں کی رکھیل ہے۔'' ایک دن ماسی برکتے روز روز کی جوتم پیزار سے تنگ آ کر غصے سے پھٹ پڑی۔

رحیمو کا تماشا ذرا ختم ہوتا تو ماسٹر دل محمد ڈگڈگی بجانی شروع کر دیتا۔ دن رات بے چاری ماسٹرنی کو گُھرکیاں دیتا رہتا۔ ماسٹرنی غریب گھر کی دبو قسم کی عورت تھی۔ ماسٹر کی زیادتیوں پر زبان کھولتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں تین کا پہاڑا پڑھ کر ماسٹر اس سے ہمیشہ کے لئے ہی نہ جان چھڑا لے۔

ماسٹر پرلے درجے کا کنجوس آدمی تھا۔ سکول جاتے ہوئے باورچی خانے کو تالا لگا کر جاتا، کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ ماسٹر کی کمائی سے ماسٹرنی اپنے غریب رشتے داروں کو کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ اسی پر بس نہیں، ماسٹر گھر کے دروازے پر بھی بڑا سا تالا لگا دیتا تھا۔ ماسٹرنی سارا دن کھڑکی میں لٹکی گلی میں آنے جانے والوں کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی۔ آنکھوں میں اترنے والی رم جھم کو اپنے میلے سے دوپٹے کے پلو میں جذب کرنے کی ناکام کوشش اس کے دکھ کی مزید تشہیر کر دیتی۔

کھڑکی نے سرگوشی کی ''ماسٹرنی غریب گھر سے ضرور ہے مگر شریف عورت ہے۔ کوئی اور عورت ہوتی تو ان حالات میں نہ جانے کیا کر گزرتی مگر ماسٹر کی ڈگڈگی ہے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔'' میں نے کھڑکی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مگر جیسے ہی نگاہ پلٹی، سارا منظر ریت کی طرح جھر جھر کر کے کہیں دور نکل گیا۔

میں نے ایک اور مٹھی بھر دنیا ذرا آنکھوں کے قریب لا کر دیکھنا چاہی تو گلی میں مجھے اوباش فیقا سر منہ سنوار کر ادھر ادھر تاکا جھانکی کرتا نظر آیا۔

اس تنگ سی گلی سے گزرنے والی نوجوان لڑکیوں پر گھٹیا قسم کے عاشقانہ فقرے اچھالنا اس کی عادت تھی۔ ایسے میں اگر کوئی جی دار قسم کی لڑکی پلٹ کر فیقے کو جواب دے دیتی تو فیقے کا حرامی پن سوا ہو جاتا۔ بڑی بے شرمی سے ایک آنکھ میچ کر دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا، ''بسم اللہ، آ وَ بادشاہو، تہاڈی اڈِیک سی۔''

فیقے کی بات لڑکی کے تن بدن میں آگ سی لگا دیتی اور وہ جُز بُزسی ہو کر مزید کچھ کہے سنے بغیر جلدی جلدی گلی پار کرنے کی کوشش کرتی۔

''کچھ شرم کر فیقے! محلے کی دھی بہنوں کے ساتھ ایسی اوچھی حرکتیں نہیں کرتے۔'' ایک دن تیز طرار ماسی برکتے نے فیقے کو بری طرح ڈانٹ دیا۔

''اوئے ماسی، تھوک کے حساب سے مجھے یہ بہنیں نہیں چاہیے۔ مجھے کیا ان کا اچار ڈالنا ہے؟ الٹا ان بہنوں کی فوج کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر مجھے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دے گی۔ ناں بھئی، میں کسی کو بہن وہن نہیں بناتا۔ میں تو انھیں ملکہ بنا کر دل کے تخت پر بٹھاؤں گا۔'' وہ بڑے ڈھیٹ پن سے ماسی برکتے کی بزرگی کا بھی لحاظ نہ کرتے ہوئے، ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہتا۔

''دُر فٹے منہ تیرا، شکل چنگی نہ ہو تو بات تو چنگی کر لینی چاہیے۔'' ماسی برکتے کی پھٹکار سن کر فیقا اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر کھی کھی کرنے لگتا۔

کمرے کی کھڑکی ہر روز کھلتی اور بند ہوتی رہی۔ مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں ہر بار نئی رام کہانی، نئی پتا، نیا منظر نامہ، نئے کردار، نئے سوال، نئے جواب سامنے آ جاتے۔ گویا سوچوں کی اَن گنت کھڑکیاں کھل کر کبھی دل، کبھی ذہن تو کبھی روح پر دستک دینے لگتیں۔

اس مرتبہ روح کی کھڑکی پر پڑنے والی دستک کی آواز میرے بہت اندر تک اتر رہی تھی۔ اندر اور باہر کے شور نے مل کر جیسے راگ بھاگیہ شری چھیڑ دیا تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی اندر سے دھڑ دھڑ دروازہ پیٹ رہا ہو۔ ایسے میں اپنی ذات کے خول سے اندر باہر ہوتی ہوئی چودھری فضل دین کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ریشم میری نظروں کے حصار میں آ گئی۔

میرے گھر سے ملحق چودھری کی بڑی سی حویلی کے پکے صحن میں گم سُم لیٹی ہوئی ریشم کو دیکھ کر چودھری فضل دین کے دل پر آرے چل رہے تھے۔

چودھری دبی دبی آواز میں بڑی فکر مندی سے چودھرائن سے کہہ رہا تھا، ''بڑی وکھری قسم کی لڑکی ہے ریشم۔ نہ بچوں جیسی شرارتیں ہیں، نہ فرمائشیں، نہ سکھیوں سہیلیوں سے تو تکار، نہ گڈی گڈے کا بیاہ، نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ صلح نہ صفائی۔ بس اپنی ہی دنیا میں مگن، گواچی گواچی سی، پتا نہیں ہر وقت کیا ڈھونڈتی رہتی ہے؟''

چودھری کی بات سن کر پاس بیٹھی ہوئی چودھرائن نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا، ''میرے لاکھ پوچھنے پر بھی منہ نہیں کھولتی۔ بس بٹر بٹر دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو میں یہ سوچ کر ڈر جاتی ہوں کہ کہیں اس پر کوئی بھوت پریت کا سایہ تو نہیں آ گیا۔ پنڈ کے سائیں بابا کو نہ دکھا دیں۔ کوئی دم درود ہی کر دے گا۔ سنا ہے بڑی کرنی والا بابا ہے۔''

''ہوں'' چودھری کا بے حد مختصر سا جواب سن کر چودھرائن کچھ اور ہی فکر مند ہو گئی۔

چودھرائن کی ممتا کا سمندر زبردست ہلکورے لے لے کر امید و نا امیدی کے ساحلوں کو بھگو رہا تھا۔ چودھرائن کا بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح وہ اپنی دکھوں کی سولی پر لٹکی ہوئی نازوں پلی اکلوتی اولاد کو مائیکل انجلو کے مجسّمے میڈونا کی طرح ہاتھوں میں احتیاط سے اٹھا کر ایسی لوری سنائے جسے سن کر وہ ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے۔

''اٹھ میری سوہنی دھی، دن ڈھلنے کو ہے۔'' صحن میں ساری دوپہر تیز دھوپ میں سر سے پاؤں تک سفید چادر اوڑھے چارپائی پر لیٹی ہوئی ریشم کو دیکھ کر چودھرائن نے بھرائی ہوئی آواز میں ایسے کہا لگتا تھا کہ وہ ابھی رو دے گی۔

صبح سے چودھرائن اُسے کتنی بار تیز دھوپ میں لیٹنے سے منع کر چکی تھی مگر ریشم ٹس سے مس نہ ہو رہی تھی۔

''اٹھ ریشو میری جان۔ سیانے کہتے ہیں جب دو وقت مل رہے ہوں تو لیٹنا ٹھیک نہیں ہوتا۔نحوست پھیلتی ہے۔ اٹھ شاباش!'' چودھرائن نے جیسے ہی بیٹی کو ہاتھ پکڑ کر چارپائی سے اٹھانا چاہا وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''اماں آپ سب مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ رب نے اگر میرے من کو سوچوں میں ڈال دیا ہے تو میں کیا کروں؟'' ریشم نے قدرے خفگی سے کہا۔

''ناں، دھی رانی! سوچتے تو ہم سب ہی ہیں مگر ہم نے تیری طرح جوگ نہیں لیا۔'' چودھرائن نے بیٹی کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''اماں میری اور تیری سوچوں میں یہی تو فرق ہے۔ میرا دماغ سوسوسوال کرتا ہے اور تیرا دماغ سوسو جواب مانگتا ہے۔'' بیٹی کے تیز طرار جملے پر چودھرائن لاجواب سی ہوگئی۔

ریشم کو ہر وقت یہی محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی روح کی کھڑکی پر کسی نے بڑا سا تالا لگا دیا تھا جو ہزار کوشش کے باوجود بھی اس سے کھل نہیں پا رہا تھا۔

ہر سو اندھیرا، گھور اندھیرا تھا۔ ایسے میں اسے انسانوں سے وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ جنگلوں بیابانوں میں نکل جائے جہاں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے رحیمو جولاہے، ماسٹر دل محمد اور فیقے کی آوازیں اسے سنائی نہ دیں۔ جہاں نہ چودھری فضل دین کی فکرمندیاں اس کا پیچھا کریں اور نہ ہی چودھرائن کے سوال اسے سوئی کے نکّے میں سے گزرنے پر مجبور کریں۔ مگر کیسی مجبوری تھی وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی؟

پھر ایک دن مٹھی بھر زندگی ریشم کی آنکھوں کے بھی بہت قریب آ گئی۔

گاؤں کے باہر ایک کھلا میدان تھا جہاں گھنے سایہ دار درختوں کے نیچے اکثر گائیں بھینسیں دن میں لیٹی اور بیٹھی ہوئی جگالی کرتی رہتی تھیں۔ بچے آنکھ مچولی کھیلتے، درختوں کی شاخوں سے جھولے جھولتے اور بہت اونچائی پر بنے پرندوں کے گھونسلوں تک پہنچنے کی ناکام کوشش کرتے۔ مگر جیسے ہی سورج ڈھلتا اور چراغ روشن ہوتے تو میدان بالکل سنسان ہو جاتا تھا۔

اس نے دیکھا کہ شام کے گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں وہ اس میدان میں کھڑی تھی.....

میدان کے اُس پار سرسبز کھیتوں کا سلسلہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کھیتوں کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی کئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں نہر کی طرف نکل جاتی تھیں۔ یہ نہر جیسے جیسے گاؤں کے قریب آتی، اس کا پاٹ چوڑا ہوتا جاتا تھا۔

دن کے وقت ندی پر کافی گہما گہمی رہتی تھی۔ گاؤں والے مویشیوں کو نہلاتے، پانی پلاتے، عورتیں کپڑے دھوتیں، بچوں کو نہلاتیں اور خود بھی ادھ ننگی سی نہانے کے لئے پانی میں اتر جاتیں۔

ذرا فاصلے پر بنے ہوئے ندی کے پُل پر سے نوجوان لڑکے نہر میں چھلانگیں لگاتے اور نہر کے ٹھنڈے ٹھار پانی میں اگر کبھی

تربوز تیرتے ہوئے آجاتے تو وہ انھیں پکڑنے کے لئے جھپٹ پڑتے۔ سخت گرمی کے موسم میں گویا یہاں ایک دنیا آباد رہتی تھی مگر اس وقت یہاں مکمل خاموشی تھی۔

شام کے گہرے ہوتے ہوئے سایوں میں کھلے میدان کو پار کر کے آہستہ آہستہ کھیتوں کے بیچوں بیچ بنی ہوئی پگڈنڈی سے گزر کر وہ نہر کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں کنارے پر اسے ایک چمکیلی روشنی نظر آ رہی تھی۔ لیکن جیسے جیسے وہ نہر کے قریب ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ روشنی اُس سے دور ہٹتی جا رہی تھی۔ مگر اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور آہستہ آہستہ روشنی کی طرف بڑھتی رہی۔

نہر کے کنارے پر جا کر وہ بے حد مایوس ہوگئی، کیوں کہ وہی روشنی اب نہر کے دوسرے کنارے پر چمک رہی تھی۔

ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ وہ نہر میں چھلانگ لگا کر دوسرے کنارے تک چلی جائے مگر نہر کا پاٹ کافی چوڑا تھا اور اسے ٹھیک سے تیرنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس بے بسی کی کیفیت میں وہ کتنی ہی دیر چپ چاپ نہر کے کنارے کھڑی ہو کر اُس پار چمکتی ہوئی روشنی کو دیکھتی رہی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسی سلفے کی لاٹ تھی جو اس ویرانے میں چمک رہی تھی۔ چاروں طرف آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ پھر یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی؟ کیسی تھی یہ روشنی جو بانہیں کھولیں اسے اپنی طرف بلا رہی تھی؟

روشنی کے مجنونانہ تعاقب میں اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ اندھیرا بہت گہرا ہو گیا تھا۔ اب وہاں اس کے علاوہ کوئی ذی روح نہ تھا۔ گھر واپس جانے کے خیال سے وہ جیسے ہی پلٹی، اپنے پیچھے کھڑے ایک سائے کو دیکھ کر خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

اندھیرے میں اُسے ٹھیک سے کوئی چہرہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ سایہ اس سے مخاطب ہوا، گاؤں کے سائیں بابا کی آواز پہچان کر اس کی جان میں جان آ گئی۔

''روشنی کا پیچھا کر رہی تھی پتر؟'' بابا نے نرمی سے سوال کیا۔

''ہاں بابا'' وہ جلدی سے بولی۔

''روشنی کا پیچھا کرو گی تو یہ تم سے اور دور ہو جائے گی۔'' بابا نے کہا۔

''وہ کیوں بابا؟'' اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

''اس لئے کہ ہم لوگ اپنے اندر کی روشنی کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور روشنی کو ہماری یہ بے گانگی بالکل پسند نہیں ہے۔ اس لئے جب باہر نظر آنے والی روشنی کا تعاقب کرو تو وہ ہم سے اجنبیوں کی طرح دور ہٹتی چلی جاتی ہے۔'' بابا نے بڑے صوفیانہ لہجے میں جواب دیا۔

''بابا! کیا روشنی ہمارے اندر موجود ہے؟'' اس نے تجسس سے سوال کیا۔

''ہاں پتر، یہ روشنی ازل سے ہر انسان کو ودیعت کی گئی ہے۔ یہ دل تو سوہنے رب کا گھر ہے، اس کے نور سے روشن ہے مگر بد قسمتی سے ہمیں اس کا ادراک نہیں ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''خَلَقَ اللّٰہُ الْخَلْق فی ظُلُمٰتٍ ثُمَّ القرا عَلَیْہِ نُوراً.....''

یعنی کہ اللہ رب العزت نے خلقت کو اندھیرے میں پیدا کیا مگر اس پر اپنے نور کا پرتو ڈال کر اسے روشن کر دیا۔

وہ بہت غور سے بابا کی باتیں سن رہی تھی۔

''ہم دنیا دار کمینے اپنی ناعاقبت اندیشی سے نور کے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں۔ پھر بجھے ہوئے دیوے لے کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ اپنی بدنصیبیوں اور اپنی بدبختیوں کے شکوے شکایتیں کرتے ہیں۔'' بابا نے قدرے جلال سے اونچی آواز میں کہا۔

''بابا نور کے چراغ کیسے بجھ جاتے ہیں؟ پُتر بندہ ستر ہزار پرتوں سے بنا ہے اپنے رب کے حکم سے جب وہ عالمِ ارواح سے عالمِ ناسوت یعنی اس دنیا میں آتا ہے تو اُس کے اوپر ایک پرت غالب آ جاتا ہے جس میں جلد بازی، سرکشی، بغاوت، حکم عدولی، ناشکری، بے یقینی اور وسوسوں کا ہجوم ہوتا ہے اور یہی وہ دنیا کی زندگی ہے جسے قرآن نے اسفل السافلین کہا ہے۔''

سائیں بابا اپنی روانی میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

''کیا یہ روشنی میرے اندر بھی موجود ہے؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں پُتر! یہ روشنی تو سب کے اندر موجود ہوتی ہے۔ تمھارے اندر بھی ہے۔'' بابا نے نرمی سے جواب دیا۔

''تو کیا یہ رحیمو جولاہے، ماسٹر دل محمد اور فیقے کے اندر بھی ہے؟'' اس نے اپنی بے یقینی کو یقین کا چولا پہنانے کے لئے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

ہاں، پُتر! یہ تو سوہنے رب کا نور ہے جو ہر دل کے اندر موجود ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہر دل کی طاق پر نور کا ایک چراغ رکھ دیا گیا ہے۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم اس چراغ کو اپنے عمل سے روشن رکھیں یا اپنی بداعمالیوں سے اسے بجھا دیں۔'' بابا کی باتیں سن کر وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''پُتر! زیادہ مت سوچو، بس اپنے اندر جھانکو، بجھا ہوا چراغ نگاہوں کی تپش سے خود بخود جل اٹھے گا۔ ہر طرف چانن ہی چانن ہو جائے گا۔ روشنی کا تعاقب کرنے کی بجائے اپنے اندر کی روشنی کو تلاش کرو۔ اسے پہچانو، اس سے دوستی کرو، اس سے ہاتھ ملاؤ، یہ تمھاری اپنی روشنی ہے۔ اس سچے رب کا نور ہے جو ہماری سوچ سے بھی زیادہ ہر وقت ہمارے قریب رہتا ہے'' اتنا کہہ کر سائیں بابا

''الف اللہ چنبے دی بوٹی میرے مرشد من وچ لائی ہُو
اندر بوٹی مُشک مچایا جاں پُھلن تے آئی ہُو''

کہتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

اللہ ہُو کی دھمک جیسے ہی ریشم کے دل پر پڑی تو اُسے یوں لگا جیسے اس کی روح کی بند کھڑکی کھل گئی ہو، سب اندھیرے

چھٹ گئے ہوں۔

ہر سو نور کے چراغ روشن ہو چکے تھے۔ اسے اپنے سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔ کیوں کہ اب اندر سے کوئی سوال کر رہا تھا:

تمھارے ہاتھ میں سورج بھی ہے ، چراغ بھی ہے
پھر اتنی تیرگی کیسے ہوئی زمانے میں؟

لیکن جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی، وہاں نہ سائیں بابا تھا، نہ نہر کا کنارہ، نہ کھیت، نہ کھلیان تھے۔
بس طمانیت کا ایک بھرپور احساس تھا جو اس کے چاروں طرف اللہ ہو کی دھمال ڈال رہا تھا۔
میں نے بھی اسے مطمئن پا کر مسکراتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔

مکاں پکے ہوں یا کچے، ہمیں اس سے غرض کیا ہے؟
ہمیں تو کوچ کرنا ہے یہاں بسرام سے پہلے

(رضیہ اسماعیل)

ہرنام داس

ہرنام داس کے نامانوس سے نام سے میری پہچان شعور کی آنکھ کھولتے ہی ہوگئی تھی۔

اس نام کی چھاپ نہ صرف حویلی کے در و دیوار بلکہ اس کی ہر ایک چیز پر ہی بہت گہری تھی۔ گاگر، پرات، گلاس، پلیٹیں، چھنے، کف گیر، یہاں تک کہ بستروں کی چادروں، کمبل، کھیس، تلائیوں، رضائیوں اور تکیے کے غلافوں پر بھی جگمگاتا ہوا ہرنام داس کا نام میرے ذہن کی تختی پر کئی طرح کے نقش و نگار بناتا رہتا تھا۔

وسیع و عریض حویلی کے کمروں میں مجھے اکثر اَن دیکھے ہرنام داس کا اداس اداس سا ہیولا منڈلاتا ہوا نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک دن اچانک ہرنام داس میرے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا مگر میں یہ سوچ کر ہی گھبرا اٹھتی تھی۔

آخر ہرنام داس کون تھا؟ اور اب وہ کہاں ہے؟ کیسا شخص تھا وہ جو اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ کر چلا گیا؟ میرے ذہن میں بہت سے سوال جوابوں کے لئے بے چین تھے۔

میں جیسے جیسے شعور کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی سچ پوچھو تو مجھے ہرنام داس سے ایک طرح کی ہمدردی سی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن کھانا کھاتے ہوئے پیتل کے بڑے سے گلاس کے پیندے پر ہرنام داس کا نام کندہ دیکھ کر میں نے بالآخر ماں سے پوچھ ہی لیا، ''ماں! یہ ہرنام داس کون ہے؟''

میرے منہ سے ہرنام داس کا نام سن کر توے پر روٹی ڈالتی ہوئی ماں یوں بِدکی جیسے اس نے کوئی بے حد ڈراؤنا منظر دیکھ لیا ہو۔ ماں کا ہاتھ سخت گرم توے کے ساتھ جلتے جلتے رہ گیا۔

''تجھے اس سے کیا؟'' ماں نے درشتگی سے جواب دیا۔ ''خاموشی سے ناشتہ ختم کر کے سکول جا! جب دیکھو الٹے سیدھے سوال کرتی رہتی ہے۔''

ماں کے حوصلہ شکن جواب سے ہرنام داس کے بارے میں جاننے کی خواہش وقتی طور پر تو سرد سی ہوگئی مگر یہ چنگاری اندر ہی اندر سلگتی رہی۔

سکول میں سبق یاد کرتے ہوئے بھی میرا دھیان ہرنام داس کی طرف ہی لگا رہا۔ ہِل ہِل کر ''ا''، ''ب''، ''پ'' کی تختی پڑھتے ہوئے جیسے ہی میں ''ہ'' پر آئی تو یک دم میرے منہ سے نکل گیا، ''میڈم ''ہ'' سے ''ہل'' کے علاوہ ''ہرنام داس'' بھی بنتا ہے۔''

میری زبان سے یہ نامانوس سا نام سن کر میڈم نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے اسے میری دماغی حالت پر شک ہو رہا ہو۔

گھر میں ہرنام داس کے نام سے جس قدر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا، اس کے بارے میں جاننے کی خواہش اتنی ہی بڑھتی جا رہی تھی۔

مجھے حویلی کے چپے چپے سے اس نام کی بازگشت ہر وقت سنائی دیتی رہتی تھی۔ کبھی کبھار تو مجھے لگتا کہ شاید ہرنام داس میرے دادا تھے جنھوں نے ابا کو اپنی پسند کی شادی کرنے پر جائیداد سے عاق کر دیا تھا اور غصے میں ابا کو حویلی سے نکالنے کی بجائے خود ہی اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔

ایک دن ابا کو اچھے موڈ میں دیکھ کر میں نے ہرنام داس کا ذکر چھیڑ دیا، ''ابا! ہرنام داس کیا میرے دادا تھے؟'' میرے اس اچانک سوال پر ابا کی بڑی بڑی آنکھیں غصے اور حیرت سے مزید پھیل گئیں۔

''چُپ ناہنجار! ہرنام داس تمھارے دادا کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم مسلمان ہیں اور یہ تو ہندوانہ نام ہے۔''

میں اپنے بے تکے سوال پر شرمندہ سی ہو کر رہ گئی۔

''بس چُپ رہو اور اپنی عمر سے بڑے سوال مت کیا کرو!'' ابا کی بے طرح ڈانٹ سے ہرنام داس کے بارے میں جاننے کی خواہش پر جیسے اوس سی پڑ گئی۔

ہمارے گھر میں لگتا تھا کہ دادا کی طرح ہرنام داس کا نام لینا بھی ممنوع تھا کیوں کہ دونوں کا نام سنتے ہی اماں اور ابا کی پیشانیاں شکن آلود ہو جایا کرتی تھیں۔ ان کے شہد میں گھلے ہوئے لہجے ایک دم بس ٹپکانے لگتے مگر اس قدر نامساعد حالات کے باوجود بھی میں ہرنام داس کے بارے میں سوچنے سے کنارہ کش نہ ہو سکی۔

حویلی کی شان و شوکت دیکھ کر لگتا تھا کہ ہرنام داس نے گاؤں کی واحد دو منزلہ پختہ حویلی کو بڑے دُلار سے بنایا ہوگا۔

حویلی کی نچلی منزل پر گلی کی طرف ایک کافی کشادہ بیٹھک تھی جو اب مردانے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کی دو بڑی بڑی کھڑکیاں اور نقش و نگار سے مزین ایک مضبوط چوبی دروازہ تو گلی میں کُھلتا تھا جب کہ دوسرا دروازہ گھر کی جانب بیٹھک سے ملحقہ بڑی سی ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ بیٹھک میں سب سے زیادہ متوجہ کرنے والی چیز اس کی کشادگی کے علاوہ ایک سا گوان کا نہایت ہی خوب صورت قدِ آدم آئینہ تھا جو دیوار میں بڑی مضبوطی سے نصب کروایا گیا تھا اور اس کی پیشانی پر بھی ہرنام داس کا نام کندہ تھا۔

ڈیوڑھی کا بڑا سا آہنی دروازہ اکثر بند رہتا تھا اور خاص خاص موقعوں پر ہی کھلتا تھا جب کہ اس میں بنا ہوا ایک اور چھوٹا دروازہ گھر میں آمد و رفت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس دروازے کے اوپر بھی ہرنام داس کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا جسے ابا نے ''ھٰذا مِن فضلِ ربّی'' میں تبدیل کروا دیا تھا۔

مجھے اکثر اس دروازے سے رونے کی آوازیں آتی تھیں جیسے سسکیاں لیتا ہوا دروازہ کہہ رہا ہو۔

گلی کے موڑ پہ سونا سا ایک دروازہ
ترستی آنکھوں سے رستہ کسی کا دیکھے گا

ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ دو بڑے سے برآمدوں میں کھلتا تھا۔ برآمدوں کے دونوں طرف دو رسوئیاں بنی ہوئی تھیں۔ڈیوڑھی کے پاس کھلی رسوئی گرمیوں میں استعمال ہوتی تھی جب کہ برآمدوں کے دوسرے سرے پر بنی ہوئی پختہ رسوئی سردیوں میں زیرِ استعمال رہا کرتی تھی۔

اِس رسوئی میں بنی ہوئی ایک بڑی سی چمنی سے سردیوں میں سانپ کی طرح لہرالہرا کر نکلتا ہوا دھواں مجھے بہت بھلا لگا کرتا تھا۔ہم سب بہن بھائی اس رسوئی میں سردی میں آگ کے نزدیک بیٹھنے کے لئے اپنی اپنی چھوٹی سی رنگین پیڑھیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چولھے کے بہت قریب لاتے تو ماں ڈانٹ دیتیں،''ارے کم بختو! جل مرنے کا ارادہ ہے کیا؟، پرے ہٹو!'' ماں کی ناراضگی کے خیال سے ہم اپنی اپنی پیڑھیاں قدرے پرے گھسیٹ کر بیٹھ جاتے۔

ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سنتے ہی میرا ننھا سا ذہن پھر ہرنام داس کا پیچھا کرنے لگتا۔

''کیا ہرنام داس کی ماں بھی اسی طرح اسے چولھے کے نزدیک بیٹھنے پر ڈانٹتی ہوگی؟ کیا اسے بھی سردیوں میں رسوئی کی چمنی سے سانپ کی طرح لہرالہرا کر نکلتا ہوا دھواں اچھا لگتا ہوگا؟'' ایسے میں مجھے لگتا کہ ہرنام داس ایک چھوٹا سا بچہ بن کر رسوئی کی خالی پیڑھی پر بیٹھا ہم سب کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔

حویلی کے پکے صحن کے دونوں اطراف برآمدے تھے جب کہ تیسری جانب ایک بڑا سا کمرہ تھا جو سردیوں میں مال مویشیوں کے باندھنے اور چارہ رکھنے کے کام آتا تھا۔صحن کی چوتھی جانب بہت بڑا قطعۂ زمین تھا جس میں رنگ برنگے پھولوں کی کیاریوں کے علاوہ پیپل، شیشم اور نیم کے اونچے اونچے درخت تھے۔ان کی چھاؤں میں گرمیوں میں مویشی بیٹھے جگالی کرتے رہتے تھے۔

اسی صحن کے ایک کونے میں تازی خانہ تھا جہاں ابا کے شکاری کتے ہمہ وقت منہ کھولے ہانپتے رہتے تھے۔ان ہانپتے ہوئے کتوں کو دیکھ کر مجھے لگتا تھا جیسے یہ سب ابھی ابھی ہرنام داس کو یہاں سے بھگا کر کہیں دُور چھوڑ کر لوٹے ہوں۔ پتلی پتلی تھوتھنیوں والے یہ پھرتیلے سے شکاری کتے مجھے بہت برے لگتے تھے،اس لئے ان سے میری کبھی بھی دوستی نہ ہوسکی۔

حویلی میں دو بڑے دالان تھے جن کی کھڑکیاں پکی رسوئی کے ساتھ والے برآمدے میں کھلتی تھیں۔ان دونوں دالانوں کے پیچھے کئی چھوٹے بڑے کمرے تھے جن میں دن کے وقت بھی اندھیرا سا رہتا تھا۔ابا نے سختی سے ہم تینوں بہنوں اور چھوٹے بھائی کو ان کمروں میں جانے سے منع کر رکھا تھا۔''شاید وہاں ہرنام داس کا بھوت رہتا ہوگا۔'' میرا ننھا سا ذہن پھر الجھنے لگتا۔

سب سے بڑے دالان میں دن کے وقت بہت رونق رہتی تھی، کیوں کہ یہ کمرہ افرادِ خانہ کے ہمہ وقت اٹھنے بیٹھنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔اس دالان کے ایک کونے میں جہازی سائز کا چوبی پلنگ تھا جس کے بڑے بڑے رنگین پایوں پر بہت خوب

صورت نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ہم سب بہن بھائی ان پایوں کے ساتھ جھولتے اور پلنگ کے نیچے چھپ کر آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔

پلنگ کا سرھانہ ایک قدِ آدم آئینے کی مانند تھا جس کے درمیان میں ایک بڑا شیشہ نصب تھا جس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے خوب صورت رنگین شیشے لگے ہوئے تھے جن میں ہم سب بہن بھائی اکثر اپنا اپنا چہرہ دیکھا کرتے تھے۔بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے ہرنام داس یاد آجاتا،کیا وقت نے ہرنام داس کا چہرہ بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہوگا؟

اس آئینے کے اوپر بھی ہرنام داس کا لکھا ہوا نام دیکھ کر میں سوچ میں پڑ جاتی کہ ''ہرنام داس کو آئینے اتنے اچھے کیوں لگتے تھے؟مگر ان آئینوں نے تو اس سے بے وفائی کر ڈالی۔''ذہن سے آواز ابھرتی۔

''آئینے بے وفا نہیں ہوتے،بس اپنے اوپر پڑنے والا عکس منعکس کر کے دکھا دیتے ہیں۔اب وہ چاہے ہرنام داس کی شبیہ ہو یا کسی اور کی۔''

میرے لئے حویلی کا سب سے زیادہ دل چسپ کمرہ دوسرا دالان تھا جو اس وقت سٹور کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔اس پر ہر وقت تالا لگا رہتا تھا۔ماں کے علاوہ گھر کی مہری اور کارخانے کا منشی وہاں اکثر جاتے رہتے تھے۔اس کمرے میں بے شمار چیزیں تھیں جن میں کاشت کاری کے آلات واوزار،برتن،فرنیچر،بستروں والی بڑی پیٹی،اجناس کے کنستر،اچار کے مرتبان،سرکے،شہد اور شربت کی بے شمار بوتلیں قطار در قطار رکھی ہوئی تھیں۔جب بھی اس کمرے کا دروازہ کھلتا میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دروازے کے ساتھ چپک جاتی تھی کیوں کہ ہمیں اس کمرے کے اندر پاؤں رکھنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔

مجھے اس کمرے کی دیگر چیزوں سے تو کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی مگر وہاں پیتل،تانبے،کانسی اور چاندی کے بے شمار چھوٹے بڑے برتن دیواروں پر بنی ہوئی بڑی بڑی پرچھتیوں پر بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے جو مجھے بہت پُراسرار لگا کرتے تھے۔مجھے یقین تھا کہ ان تمام برتنوں کی پشت پر بھی ہرنام داس کا نام ہی کھدا ہوا ہوگا۔یہی برتن مجھے بار بار اس کمرے کی طرف کھینچتے رہتے تھے۔جب تک کمرے کا دروازہ کھلا رہتا تھا،میں باہر کھڑی بڑی محویت سے ان برتنوں کو دیکھتی رہتی تھی۔

ایک دن مجھے یوں لگا جیسے سب برتن آپس میں کھسر پھسر کر رہے ہوں۔''پتا نہیں ہمیں کب اس قید سے رہائی ملے گی؟''ایک بڑی سی پرات نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔''خود تو چلے گئے اور ہمیں سولی پر لٹکا گئے۔''

''برتن تو استعمال کرنے کے لئے ہوتے ہیں اور یہاں دن رات پرچھتیوں پر لٹکا کر ہمارا تماشا بنا رکھا ہے۔''ایک بڑی سی گاگر نے ہاں میں ہاں ملائی۔

چاندی کی نہایت نفیس طشتری ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے بولی،''یہ تو سب نصیبوں کی باتیں ہیں۔وقت اور حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا؟''

''ہر چیز وقت اور موت کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔'' ایک کونے میں پڑی ہوئی بڑی سی جست کی پیٹی نے کسی بوڑھے فلسفی کی طرح سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اس پیٹی کے دُکھ شاید سب سے زیادہ تھے۔ ایک تو وہ خود قید میں تھی، دوسرا اس کے اندر رکھی ہوئی بے شمار چیزیں بھی دن کی روشنی دیکھنے کے لئے ترستی رہتی تھیں۔ بعض اوقات یہ سب چیزیں مل کر اس قدر شور کرتیں کہ پیٹی انھیں چُپ کراتے کراتے ہلکان ہو جاتی تھی۔

مجھے لگتا کہ پیٹی کا دکھ شاید ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کیوں کہ اگر اس کمرے کے مکین جانتے ہوتے تو اس سے ہمدردی ضرور کرتے مگر انھیں تو بس اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ ابا نے ہرنام داس کو مار کر اس کمرے میں پیٹی کے نیچے دبا دیا تھا اور حویلی کی ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا۔ بڑی سی پیٹی کے نیچے ہرنام داس کی بے نام سی قبر پر نہ کوئی پھول چڑھانے والا تھا اور نہ ہی کوئی دیا جلانے والا۔

ایک دن میں نے ماں کو پڑوس کی ماسی خدیجہ سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ''ہندو اپنے مُردوں کو شمشان گھاٹ میں جلاتے ہیں وگرنہ ان کی آتما بھٹکتی رہتی ہے۔''

اسی دن سے میں یہ منصوبے بنانے لگی کہ ہرنام داس کا مُردہ کیسے جلایا جائے۔ کیا ساری حویلی کو آگ لگا دی جائے یا صرف اس کمرے کو؟

ماں کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ہرنام داس کی اداس سی آتما اس حویلی میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور اس کی شانتی کے لئے اسے آگ میں جلانا ضروری تھا۔

ہرنام داس کا خیال یوں ہی میرے ساتھ دن رات آنکھ مچولی کھیلتا رہتا مگر عملی طور پر میرے لئے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا۔

ایک دن گاؤں میں بڑی گہما گہمی تھی۔ سب بھاگم بھاگ چوپال کی طرف جا رہے تھے۔

''سنا ہے ہندوستانی ملٹری آئی ہے، گھر گھر تلاشی لیں گے۔'' گلی میں تیز تیز قدموں سے جاتے ہوئے بختو موچی نے کسی دوسرے آدمی سے کہا۔

میرا دل چاہا کہ میں بھی بھاگ کر بختو موچی کے پیچھے پیچھے چوپال کی طرف جاؤں اور ملٹری والوں کو بتاؤں کہ میرے ابا نے ہرنام داس کو مار کر سٹور میں بڑی سی پیٹی کے نیچے دبایا ہوا ہے مگر مجھے اتنی دُور چوپال میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ہندوستانی ملٹری ہمارے گاؤں میں ہرنام داس کو تلاش کرنے کے لئے ہی آئی ہے اور کسی وقت بھی وہ ہماری حویلی میں آ جائے گی۔ میں دم سادھے ڈیوڑھی میں ماں کے پاس بیٹھی ہوئی گلی میں سے فوجی بوٹوں کے ساتھ دندناتے ہوئے پاکستانی اور ہندوستانی ملٹری کے جوانوں کو گزرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

''یہ کیا؟ یہ سب تو ہماری حویلی کے سامنے سے گزر کر آگے چلے گئے ہیں؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

میرا الجھا الجھا سا ذہن کہہ رہا تھا کہ ''ہرنام داس تو یہاں دفن ہے مگر یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟'' مگر ماں سے کچھ بولنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔

''وہ اگلی گلی کے نکڑ والے گھر میں بڑا خزانہ چھپا کر گئے تھے اور اب ہندوستانی ملٹری کو ساتھ لے کر آئے ہیں تا کہ اس گھر کو کھود کر یہاں سے خزانہ نکالیں۔'' کوئی گلی میں کہتا ہوا جا رہا تھا۔

''اچھا، اچھا، وہی گھر جس میں مہاجر آ کر آباد ہوئے ہیں!''

''ہاں، بالکل وہی بڑا سا گھر۔'' دوسرے نے جواب دیا۔ چلو یار وہاں چل کر ہم بھی تماشا دیکھتے ہیں۔ دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں میں ملٹری کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ سب کام چھوڑ چھاڑ کر جوق در جوق خزانے کی تلاش کا تماشا دیکھنے امڈ پڑے۔

گھر کے لٹے پٹے مکین الگ افسردہ تھے کہ اس خزانے کا علم انھیں کیوں کر نہ ہو سکا وگرنہ وہ اسے کھود کر نکال لیتے۔

دو روز کی سخت کھدائی کے بعد بھی زمین میں دبائی گئی پیتل کی چھ گاگروں میں بند سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات اور نقدی کا کوئی نشان نہ مل سکا۔ تیسرے روز کھدائی اتنی گہری ہو گئی کہ زمین سے پانی رِسنے لگا تو گاؤں کے نمبردار نے، جو اس سارے معاملے کی نگرانی کر رہا تھا، ہاتھ اٹھا دیے کہ ''بس، اب اس سے زیادہ کھدائی کی گنجائش نہیں ہے وگرنہ گھر کی دیواریں مسمار ہونے کا خطرہ ہے۔''

مجھے پورا یقین تھا کہ خزانے کی کھدائی سے فارغ ہو کر ملٹری ہمارے ہاں ہی آئے گی اور ہرنام داس کی لاش کو سٹور سے باہر نکالے گی مگر اسی روز سہ پہر کو ملٹری کے تمام جوان گاؤں سے واپس چلے گئے تو میری رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی۔

سیانے کہتے ہیں'' کچھ عرصے کے بعد خزانہ اپنی جگہ سے کھسکنا شروع ہو جاتا ہے۔'' نمبردارنی کسی سے کہہ رہی تھی۔

''کہیں یہ خزانہ کھسکتے کھسکتے نمبردار کے گھر تو نہیں چلا گیا؟'' میرے ذہن میں سوال کا کیڑا پھر کلبلانے لگا۔

''لگتا ہے خزانہ چل پڑا ہے۔'' ایک اور آواز آئی۔

''بھلا خزانہ کوئی ہرنام داس ہے جو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چل پڑا ہے۔'' میں نے ترنت دل ہی دل میں جواب دیا۔

گاؤں میں ملٹری والے واقعہ کے بعد کافی دنوں تک ابا افسردہ اور بے حد خاموش سے رہے۔ ابا کی اس قدر طویل خاموشی مجھے بہت کھل رہی تھی۔

پھر ایک رات تاریکی میں سے جیسے ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے کتابِ زیست کے کتنے ہی ورق ایک ساتھ پلٹ دیئے۔

پردے آہستہ آہستہ سرکنے لگے۔

حجاب اٹھتے گئے۔
گرہیں کھلتی گئیں۔

میں دم سادھے ساتھ والے بستر پر سوتی جاگتی ابا اور اماں کی سرگوشیاں اور کبھی قدرے اونچی آواز میں ہوتی ہوئی باتیں.....کبھی سرد آہیں.....کبھی سسکیاں.....کبھی آنسو تو کبھی ہچکیاں، سننے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے آدھی ادھوری باتوں سے ہی میری سماعتوں میں شگاف سے پڑتے جا رہے تھے۔

بن کے رہے گا پاکستان.....بٹ کے رہے گا ہندوستان .....لے کے رہیں گے پاکستان.....مسلم لیگ.....کانگریس.....جناح.....نہرو.....گاندھی.....ریڈکلف ایوارڈ.....تقسیم.....بٹوارا.....فسادات.....قتل و غارت.....اغوا.....جلاؤ گھیراؤ.....چیخ پکار.....منتیں سماجتیں.....لاشوں سے بھرے کنوئیں.....کٹی ہوئی چھاتیاں.....ادھڑے ہوئے پیٹ اور نیزوں پر لٹکتے ہوئے نوزائیدہ وجود.....سہانا خواب.....لہورنگ تعبیر.....ابا اور اماں کی پسند کی شادی.....دادا ابا کا انھیں گھر سے نکال دینا.....امرتسر کی حویلی.....سکھوں کے جتھے.....بلوائیوں کا حویلی میں آگ لگانا.....لوٹ مار.....دادا.....دادی.....چچا ظفر کا شہید ہونا۔

چشمِ فلک تاریخ کے ہولناک ترین مناظر دیکھ رہی تھی۔

ابا کہہ رہے تھے،''جب میں نے ریحانہ کو تاک کر برچھی ماری تو وہ سیدھی اس کے دل پر جا کر لگی۔ مجھے ریحانہ کی وہ نگاہیں نہیں بھولتیں جب اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ جن ہاتھوں سے مجھے اُسے ڈولی میں بٹھانا تھا، انہی ہاتھوں سے میں نے اسے خون میں نہلا دیا۔ مگر میں کیا کرتا؟ اُسے اُس روز نہ مارتا تو وہ زندگی بھر ہر روز ہزار بار مرتی۔''

وقت کے سینے پر لکھی ہوئی تحریر پڑھتے ہوئے ابا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔

''کیسے کیسے ہولناک منظر دیکھنے پڑے۔ کن مشکلوں سے صرف جانیں ہی بچا کر نکلے.....بھرے پُرے گھر چھوڑ دیئے۔ نہ جانے کس کے نصیب میں وہ سب تھا.....اور اِدھر ہمارے نصیب میں ہرنام داس.....'' اماں نے گلوگیر لہجے میں بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

اَن چاہی ہجرتیں انسان کے وجود کو بہت سے ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہیں اور باقی ساری زندگی ان ٹکڑوں کو جوڑ کر تصویریں مکمل کرنے میں ہی گزر جاتی ہے۔ فضا میں جیسے ایک سرگوشی سی ابھری۔

''دیکھا نہیں تھا، امرتسر اور لاہور کے درمیان کا علاقہ لاشوں سے کس طرح اٹا پڑا تھا جیسے کوئی بہت وسیع قبرستان ہو۔''

ابا نے اَدھ مری ہوئی آواز میں کہا۔ اور دونوں کی سسکیاں رات کی تاریکی میں ایک دوسرے میں آہستہ آہستہ مدغم ہوتی چلی گئیں۔

سردی کی ایک زبردست لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر چکی تھی۔

مجھے لگا کہ میں بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح مر چکی ہوں اور میری لاش بھی لاہور اور امرتسر کے درمیان کہیں بے یارو

مددگار، بے گور وکفن پڑی سوال کر رہی ہے۔

اگر ہجرت ابا، اماں اور ہرنام داس کے مقدر میں لوحِ ازل پر لکھی جا چکی تھی۔ تو پھر کیا اِس قدر کشت وخون ضروری تھا؟

''اس ادل بدل میں کس نے کیا پایا اور کیا کھویا؟''

جس مٹی سے ان کے خمیر اٹھے، اسے یوں بے سروسامانی میں چھوڑتے ہوئے ان سب نے کیا سوچا ہوگا؟

وقت نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

''زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب بڑے بڑے طاقت ور اور حوصلہ مند لوگ بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ''is this all?''

یہ بات سنتے ہی ہرنام داس کا اداس سا ہیولا دھیرے دھیرے وقت اور تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو گیا۔

داغِ ندامت دھونے دے اب
اپنا آپ بھگونے دے اب

(رضیہ اسماعیل)

سوری

سوری بظاہر ایک چھوٹا سا لفظ ہے مگر اس کے اندر جذبات اور احساسات کا ایک مکمل جہان آباد ہے۔

میں نے اس سے پہلے کبھی لفظ ''سوری'' پر اس قدر غور نہیں کیا تھا۔

مغربی معاشرت میں تقریباً آدھی سے زیادہ زندگی گذارتے گذارتے میں تھینک یو پلیز اور سوری کہنے کا اس قدر عادی ہو گیا ہوں کہ بعض اوقات تو یہ الفاظ محض مجھے تکیہ کلام لگنے لگتے ہیں جنہیں شاید میں بہت زیادہ سوچ بچار کئے بغیر ہی تہذیب و اخلاق کے اعلیٰ اصولوں کے پیش نظر بڑے میکانکی انداز میں ادا کرتا رہتا ہوں۔

میں نے زندگی میں لفظ ''سوری'' خود بھی بے شمار مرتبہ ادا کیا ہے اور دوسروں سے بھی سنا ہے مگر میری پچاس سالہ زندگی میں ایک اجنبی شخص نے جس طرح سے اس لفظ کی ادائیگی کی اس نے میری روح کے بہت اندر تک گویا گراری سی پھیر دی اور میں پوری جان سے لرز کر رہ گیا۔

اس چھوٹے سے لفظ کو ادا کرتے وقت وہ سخت اذیت کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ اس اجنبی کے چہرے پر شدید کرب، ندامت، پشیمانی اور احساس جرم کی چھاپ حقیقتاً اس قدر گہری تھی کہ میں زیادہ دیر تک اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔

چار حرفی لفظ سوری کی بہت بڑی حقیقت آج مجھ پر عیاں ہو رہی تھی۔

رات تقریباً آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی جب میں اپنی بیوی سوسن اور بیٹی شعاع کے ساتھ آکسفورڈ کے اپالو تھیٹر سے مشہور انگریز کامیڈین بِل بیلی (Bill Bailey) کا سٹینڈ اپ کامیڈی کا شو دیکھ کر باہر نکلا۔

ہم تھیٹر سے باہر نکل کر ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اتنی رات گئے ہوٹل تک پیدل ہی مارچ کیا جائے یا پھر ٹیکسی پکڑی جائے کہ اس اجنبی شخص سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے آہستہ سے کتاب زیست کا ایک ورق اُلٹ دیا ہو۔

آج سے تقریباً تیس برس قبل میری اور سوسن کی ملاقات اسی شہر میں ہوئی تھی۔ تعلیم مکمل کرتے ہی ہم دونوں نے ایجاب و قبول کر لیا تھا۔ یوں تو ہمارا مستقل ٹھکانہ لندن میں تھا مگر ہم کم از کم پچھلے پچیس برسوں سے اپنی شادی کی سالگرہ منانے آکسفورڈ ہی آیا کرتے تھے۔

ہم دونوں کو ہی اس شہر بے مثال سے عشق تھا۔ اس شہر نے اوائل عمر میں ہماری شخصیتوں کی اٹھان دیکھی تھی۔ بنتے بگڑتے

ہوئے ہمارے شب و روز دیکھے تھے۔ سب سے بڑھ کر اس شہر کی فضائیں ہماری محبت کی گواہ تھیں۔ ہم خود تو آکسفورڈ سے نکل گئے مگر آکسفورڈ ہمارے اندر سے کبھی بھی نہ نکل سکا۔

آکسفورڈ کے ساتھ اس قدر جذباتی وابستگی سے ہماری بیٹی شعاع خوب واقف تھی۔

اس مرتبہ اس نے ہمیں سرپرائز دینے کے لیے ہمارے فیورٹ کامیڈین کے شو کے ٹکٹ خرید رکھے تھے کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یونیورسٹی لائف میں اکثر میں اور سوسن اپنے دوستوں جیک، ٹینا اور جل کے ساتھ اس تھیٹر میں آیا کرتے تھے۔

دراصل یہ شہر پہلی ہی نظر میں مجھے بھا گیا تھا۔ جس طرح کچی عمروں کے خواب زندگی بھر انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اسی طرح آکسفورڈ اور خاص طور پر ماڈلن (Magdalen) کالج کی محبت میرے دل میں ہمیشہ کے لیے گھر کر چکی تھی۔

جب میں پہلی مرتبہ پاپا کے ساتھ یہاں آیا تو میری عمر یہی کوئی تیرہ چودہ برس رہی ہوگی۔ پاپا اپنے دوست انکل اظہر سے ملنے یہاں آئے تھے جو اس کالج میں درس و تدریس سے وابستہ تھے۔

پاپا تو سارا وقت انکل اظہر سے گپ شپ کرتے رہے مگر میں سحر زدہ سا ماڈلن کالج کی پرشکوہ عمارت، اس کے فنِ تعمیر، اس کے مرغزاروں اور اس سے ملحقہ ڈیر پارک (Deer Park) اور ایڈیسن ریور سائیڈ واک (Addison River Side Walk) میں کھویا رہا۔ میری محویت دیکھ کر انکل اظہر بتا رہے تھے کہ ماڈلن کالج آکسفورڈ کے تمام کالجوں کی خوبصورت ترین عمارتوں میں سے ایک ہے۔ یہ کالج قدیم اور جدید طرزِ تعمیر کا حسین امتزاج ہے۔ اس کی تقریباً سوا ایکڑ پر پھیلی ہوئی گراؤنڈز اسے ایک منفرد حیثیت عطا کرتی ہیں۔ اس کالج کو اپنی انفرادیت کے حُسن پر ناز ہے۔''

''انکل آپ ہمیں سارے کالج کی سیر کروائیں نا۔'' میں جیسے نیند کی کیفیت میں گویا ہوا۔

"Sure Sure" انکل اظہر نے گرم جوشی سے جواب دیا۔

کالج کی شاندار لائبریری، ڈائننگ ہال، کامن روم اور بار کی سیر کرواتے ہوئے انکل اظہر کہہ رہے تھے:

''آکسفورڈ کالجوں کا شہر ہے۔ یہاں اس وقت تیس سے زیادہ کالج دور و نزدیک سے آئے ہوئے طالبانِ علم کی تشنگی کو سیراب کرتے ہیں۔ تعلیمی سال کے آغاز میں تو اس شہر میں ایک میلے کا سماں ہوتا ہے۔ جہاں دنیا کے مختلف خطوں کے نمائندہ طلبا وہاں کی چہل پہل اور رونق کا حصہ ہوتے ہیں۔ مختلف کلچرز اور ثقافت کے امتزاج سے یہاں کی معاشرتی زندگی ایک نئے ہی سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔''

"Very cosmopolitan atmosphere." پاپا نے انکل اظہر کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں ہر کالج کا سیٹ اپ تقریباً ایک جیسا ہی ہے مگر ہر کالج کی اپنی شناخت اور مخصوص نام ہے۔ کالج کو یہاں عموماً ہال کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ہر کالج کے اپنے لونگ کوارٹرز ہوتے ہیں جہاں سٹوڈنٹس رہائش پذیر ہوتے ہیں۔

انکل اظہر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے تو میں نے انہیں کالج کے بارے میں مزید بتانے پر اصرار کیا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولے ''اس کالج کی مقبولیت کا اصل راز اس کی خوبصورتی کے علاوہ اس کی طرح طرح کی کلچرل سوسائٹیز ہیں۔جن میں فلم، ڈرامہ، پوئٹری، میوزک، فٹ بال، ہاکی، رگبی، کرکٹ، تیراکی اور کشتی رانی شامل ہیں۔''

"How interesting!" میں نے پرشوق لہجے میں کہا تو انکل دوبارہ بولے کہ ''اگر کبھی موقعہ ملے تو اس کالج کے کوائر (Choir)، آرکسٹرا، بینڈز اور جاز گروپس کی پرفارمنس ضرور دیکھنی چاہیے، Absolutely amazing ہوتی ہے۔''

آکسفورڈ سے واپسی پر میں کسی گہری سوچ میں تھا اور میری آنکھیں کسی آنے والے زمانے کا خواب دیکھنے میں محو تھیں۔

مجھے اس قدر خاموش دیکھ کر پاپا نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھ ہی لیا "Why are you so quiet?"

''کیا آکسفورڈ پسند نہیں آیا؟''

''ایسی بات نہیں ہے بلکہ مجھے تو آکسفورڈ اور خاص طور پر انکل اظہر کا کالج بہت اچھے لگے ہیں۔'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔

"I am definately in love with this place."

میں نے قدرے جوش سے کہا تو پاپا مسکراتے ہوئے بولے:

"Oh! love at first sight."

''آکسفورڈ کی محبت میں گرفتار ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ یہ برطانیہ میں قدیم طرز کا بہت خوبصورت شہر ہے ہر طرف ہریالی، سبزا اور رنگارنگ پھولوں سے گھرا ہوا یہ شہر پہلی ہی نظر میں دل کے تاروں کو چھو لیتا ہے۔''

پاپا بڑی محویت سے آکسفورڈ کے بارے میں بتا رہے تھے جب کہ میری نگاہیں روانی سے بہتے ہوئے دریائے ٹیمز پر مرکوز تھیں جو اس شہر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی حصوں میں تقسیم ہو کر دریائے ٹیمز آکسفورڈ شہر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے تھا۔

وقت کا پہیہ گھوم کر پھر پیچھے کی طرف چلا گیا۔

کالجوں کے شہر میں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا تھا۔ نئے اور پرانے سٹوڈنٹس کا جم غفیر، ہشاش بشاش چہروں کے ساتھ آپس میں باتیں کرتے تو کہیں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، کوئی بریف کیس اٹھائے تو کوئی کمر پر Ruksack لادے اپنے اپنے کالجز کی طرف رجسٹریشن کے لیے جا رہے تھے۔ فٹ پاتھوں پر بھی کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔

سڑک پر سائیکلوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ گروہ در گروہ اسٹوڈنٹس سڑک کراس کرنے کے انتظار میں کھڑے تھے۔ سڑک کا کچھ حصہ پیدل چلنے والوں کی حفاظت کے پیش نظر بند کر کے ٹریفک کو Divert کر دیا گیا تھا۔

''اس منظر کو دیکھنے کے لیے تو میں نے کئی سال انتظار کیا تھا'' میں نے خود سے کہا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس منظر کو ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھ کے کیمرے کے ذریعے ذہن کی البم میں محفوظ کر لوں۔ اس

سے پہلے کہ یہ لمحہ وقت کی وسعتوں میں گم ہو کر ماضی کی ایک یاد بن کر رہ جائے۔

رجسٹریشن کے لیے کافی دیر سے طویل قطار میں کھڑے کھڑے میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ایک لڑکی مجھ سے آ کر بری طرح ٹکرا گئی۔ میں تقریباً گرتے گرتے بچا اور ماضی کی گرفت سے نکل کر زمانہ حال میں واپس آ گیا۔

"I am so sorry."

شرمندگی کے ملے جلے تاثرات اور خاصے گھبراہٹ بھرے لہجے میں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی لڑکی کہہ رہی تھی۔

وہ مزید کچھ کہنے کے لیے ابھی مناسب الفاظ کی تلاش میں تھی کہ میں نے پہل کر کے اسے اس پریشانی سے نجات دلا دی۔

''آپ کو رجسٹریشن کروانے کے لیے قطار کے بالکل آخر میں جا کر کھڑے ہونا چاہیے۔'' میں نے اپنی دانست میں اسے مفت مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں..... دراصل ہمارا ایڈمشن تو سینٹ ہلڈا (St. Hilda) کالج میں ہوا ہے لیکن ہم نے اس کالج کی خوبصورتی کے اس قدر چرچے سن رکھے تھے کہ ہمارا دل چاہا کہ اپنے کالج میں جانے سے پہلے ہم ایک نظر اس کالج کو دیکھ لیں۔'' سیاہ آنکھوں نے وضاحت کی۔

"Oh! all women college!" میں نے قدرے تعجب کا اظہار کیا۔

دراصل سینٹ ہلڈا آکسفورڈ کا وہ واحد کالج تھا جو صرف خواتین کی تعلیم و تدریس کے لیے مخصوص تھا اور وہاں مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

طویل قطار میں میرے ساتھ ہی کھڑا جیک جس سے میری کچھ دیر پہلے ہی جان پہچان ہوئی تھی، سیاہ آنکھوں کی بات سن کر قہقہہ لگاتے لگاتے رہ گیا۔ جیک کے اس تمسخرانہ انداز پر لڑکی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کچھ مزید پھیل کر اپنی دوسری ساتھی لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"This is Tina from Banglore."

سیاہ آنکھوں نے اپنی شوخ و شنگ ساتھی لڑکی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"I am Jill from Bristol."

دوسری لڑکی نے قدرے سنجیدگی سے خود ہی اپنا تعارف کروا دیا۔

''آپ کا بھی کوئی نام ہے کہ نہیں؟'' میں نے سیاہ آنکھوں سے پوچھا۔

''اوہ سوری! میں سوسن ہوں۔'' خوبصورت نام ہے میں نے دل میں سوچا۔

اتنی دیر میں جیک نے جل سے خود ہی اپنا تعارف کروانا شروع کر دیا تھا۔

کالج کے بے پناہ رش میں اسٹوڈنٹس کی لمبی قطاروں میں سے راستہ بنا کر ان تینوں کو گیٹ تک لیجاتے لیجاتے کافی وقت

لگ گیا۔

تینوں کے چہروں سے فکرمندی صاف جھلک رہی تھی کہ کہیں وہ اپنی رجسٹریشن کے لیے لیٹ نہ ہو جائیں۔

گیٹ سے باہر نکلتے نکلتے سیاہ آنکھوں نے پوچھا ''آپ کا بھی کوئی نام تو ہوگا؟''

میں نے آداب بجالاتے ہوئے جواب دیا ''سلمان شاہ'' اور وہ مسکراتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

ہم سب کی پہلی ملاقات جلد ہی بڑی گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی جس نے بعد میں ہم سب کی زندگیوں کے راستے متعین کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

ہماری ملاقات شروع شروع میں تو صرف ویک اینڈ پر ہی ہوا کرتی تھی پھر جیسے جیسے دوستی کی گرہ مضبوط ہوتی گئی ہفتے کے دوران بھی شام کو اکثر ہم کسی قریبی کیفے ٹیریا میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔

اس عرصے میں بے حد باتونی جیک اور خاموش خاموش سی جِل میں کافی انسیت پیدا ہو چکی تھی۔لیکن ان کی دوستی کچھ ہاٹ اینڈ کولڈ قسم کی تھی۔ جب ملتے تو لگتا تھا کہ دو ہنسوں کا یہ جوڑا اب کبھی بھی جدا نہیں ہوگا۔ پھر جیک اچانک کچھ بتائے بغیر کئی کئی دنوں کے لیے غائب ہو جاتا۔

نظر آتا تو کینٹین، بار، کامن روم یا کالج کے لان میں کسی نہ کسی کے ساتھ کمیونزم، کیپٹلزم اور سوشلزم پر لمبی لمبی بحثیں کر رہا ہوتا۔

اتنی لمبی غیر حاضری کے بعد جِل جب بھی جیک کو دیکھتی تو اس کی بہت سی معذرتوں کے جواب میں صرف شٹ اپ کہہ کر اسے خاموش کرا دیا کرتی تھی۔

اس کے برعکس ٹینا کی رگ مزاح دونوں کو دیکھ کر پھڑک اٹھتی تھی کہ آخر یہ کوئی لڑائی جھگڑا کیوں نہیں کرتے اور جِل کیوں ہمیشہ خاموشی سے جیک کی معذرت قبول کر لیتی ہے۔

ایسے میں شرارت سے ٹینا

Jack and Jill went up the hill to fetch a pill of water....

لہک لہک کر گانا شروع کر دیتی۔

وہ واٹر کی آر کو اس قدر لمبا کر دیا کرتی تھی کہ وہ دونوں غصہ کرنے کی بجائے کھلکھلا کر اس زور سے ہنستے کی ان کی آنکھوں میں پانی آ جاتا تھا۔

ایسے میں سوسن ہنستے ہنستے لقمہ دیتی ''بس کرو ٹینا اب بالٹی کا سارا پانی تو ان کی آنکھوں کے رستے بہہ نکلا ہے۔''

اس کے برعکس سوسن اور میرے درمیان بحث وتکرار شاذ و نادر ہی ہوا کرتی تھی۔تھوڑے ہی عرصے میں ہم ذہنی طور پر کافی قریب آ چکے تھے۔وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی اس ذہنی ہم آہنگی کا ہی نتیجہ تھا کہ ہمیں اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے بہت زیادہ

لفظوں کی ضرورت پیش نہیں آیا کرتی تھی۔

یونیورسٹی کے ہنگاموں اور ہماری نوک جھونک میں سنہرے سنہرے سے دن اور جھلملاتی ہوئی شامیں دبے پاؤں گذرتی جا رہی تھیں۔

اب اکثر شام کو سوسن، جل اور ٹینا ہمارے ہال میں آنے لگی تھیں۔ ایڈیسن ریور سائیڈ پر چہل قدمی کرتے، ادب اور فلسفے کی گتھیاں سلجھاتے، ڈیر پارک کا نظارہ کرتے کرتے وقت گذرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

بنگلور کی رہنے والی ٹینا کو ہرنوں سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا۔

وہ جب بھی ہمارے ہال میں آتی کتنی ہی دیر تک پارک کی ریلنگ سے لگ کر خاموشی سے ہرنوں کو دیکھتی رہتی تھی اور اگر کوئی ہرن قدرے قریب آجاتا تو وہ ایک ادائے دلبری سے یہ شعر پڑھ کر بیچارے کا دل توڑ دیتی۔

تو میرے ساتھ کہاں تک چلے گا میرے غزال
میں راستہ ہوں مجھے شہر سے گزرنا ہے

ایسے میں سوسن ہرن کے بچاؤ کے لیے میدان میں کود پڑتی۔

''یار بس کر ٹینا یہ ہرن تیری شاعری وائری نہیں سمجھتا۔''

''ارے جانے بھی دو۔'' ٹینا تنک کر کہتی۔

''کیوں نہیں سمجھتا! آدھی سے زیادہ اُردو شاعری تو اسی غزال کے دم سے ہے۔ غزال نہ ہوتا تو غزل کہاں سے آتی؟ اور یہ جو شاعر لوگ محبوب کی آنکھوں کو اس کی غزالی آنکھوں سے تشبیہ دیتے نہیں تھکتے ایک دم بانجھ ہو جاتے۔''

''واہ واہ کیا زبردست نقطہ ہے۔ تالیاں.....تالیاں۔''

ایسے میں جیک اور میں دونوں مل کر تالیاں بجانے لگتے۔

''چلو کم از کم تم اسے بوائے فرینڈ ہی بنالو۔ کہیں غزال یہ نہ کہتا پھرے کہ پھرتے ہیں مہ خوار کوئی پوچھتا نہیں۔''

ایسے میں سوسن بھی میرے اور جیک کے ساتھ شامل ہو جاتی مگر جل پھر بھی کچھ کہے بنا گہری گہری نظروں سے صرف جیک کو دیکھتی رہتی تھی۔

شعر و شاعری کا شوق ٹینا کو ورثے میں ملا تھا۔ اس کا تعلق بنگلور کے ایک نہایت علمی اور ادبی گھرانے سے تھا۔ اس کے والد ایک بہت اچھے شاعر تھے۔ ٹینا خود تو شعر نہیں کہتی تھی مگر سخن فہم اور سخن شناس ضرور تھی۔ بہت سے اردو اور ہندی کے شعراء کے سینکڑوں اشعار اُسے زبانی یاد تھے جو وہ موقع بہ موقع اچھالتی رہتی تھی۔

ایسے میں جیک اور جل ہونقوں کی طرح ٹینا کا منہ تکا کرتے تھے پھر وہ انگریزی میں ٹرانسلیٹ کر کے شعر کا مطلب دونوں کو سمجھایا کرتی تھی۔

اب پھر جیک کئی دنوں کی غیر حاضری کے بعد اچانک وارد ہوا تھا جس سے جل اُس سے کافی ناراض دکھائی دے رہی تھی۔
زیادہ تر خاموش رہنے والی جل آج جیک کی کمیونزم، سوشلزم اور کیپٹلزم پر دھواں دھار تقریر سے تنگ آ کر بولی:
''جیک کسی نئے نظام کی بات کرو۔ یہ سب نظام ناکام ہو چکے ہیں کیونکہ یہ سب استحصالی نظام تھے۔ دنیا میں کہیں مساوات نہیں ہے۔ طاقتور ہمیشہ کمزور کو ہی لوٹنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے۔''
جیک جل کو قدرے بے یقینی سے دیکھنے لگا مگر کچھ بولا نہیں۔
''شکر ہے اس کی تقریریں سن سن کر اس کے امیر کبیر باپ نے اپنی ساری دولت غریبوں میں دان نہیں کر دی۔'' ٹینا، جل کی حمایت میں بول اٹھی۔
''جیک ضروری نہیں ہے کہ ہر کوئی ہر وقت ایک ہی موضوع پر بات کرنا پسند کرے۔ ہر شخص کو اپنا نقطہ نظر رکھنے کی آزادی ہے۔ الگ الگ Socio-Cultural ماحول میں پروان چڑھنے کے سبب ہر ایک کی سوچ مختلف ہوتی ہے جس کا احترام کرنا ضروری ہوتا ہے۔
جل سیلانی طبیعت والے من موجی سے جیک کو سمجھانے والے انداز میں کہتی تو جیک کا جوش قدرے دھیما پڑ جاتا۔
''اور پھر جینڈر ڈیفرنسز (Gender Differences) کی وجہ سے مرد اور عورت کے سوچنے کا انداز الگ ہے۔''
جل کے اتنا کہتے ہی ٹینا بول اٹھتی:
"Women are from Venus and men are from the Mars."
''یار ہر بات میں فیمینزم کا جھنڈا لہرانا ضروری ہے کیا؟''
جیک بڑی بیزاری سے سوال کرتا۔
''یہ تم سلمان شاہ سے پوچھو۔'' ٹینا جلدی سے جواب دیتی۔
''بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں؟ یار اپنی اس فیمینزم کی بحث میں تم دونوں مجھے مت گھسیٹو۔'' میں معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دے کر جان چھڑانے کی کوشش کرتا۔
جیک دراصل ایک امیر کبیر ارسٹوکریٹ خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کئی پشتوں سے کارنوال کے علاقے میں آباد تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کو ایک بڑی جاگیر کے علاوہ کئی شاہی القابات و خطابات سے نوازا گیا تھا۔
برطانیہ کی سیاست میں ان کا خاندان کافی سرگرم تھا۔ ہاؤس آف لارڈز میں ان کی موروثی نشست تھی۔
جیک کو اوائل عمر سے ہی برطانوی شرفاء کے رسم و رواج کے مطابق ملک کے مہنگے ترین بورڈنگ سکول ٹان برج (Ton Bridge) میں داخل کروایا گیا تھا جہاں وہ شاہی خاندان کے کئی افراد کے علاوہ ایلیٹ کلاس کے بچوں کے ساتھ پڑھتے اور کھیلتے کودتے بڑا ہوا تھا۔

لیکن جیک کو اپنے پُرشکوہ خاندانی شجرے اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے خاصی چڑ تھی اس لیے وہ اس کا ذکر بہت کم کیا کرتا تھا۔

ایک امیر زادے کی طرح انتہائی ناز و نعم میں پل کر جوان ہونے کے باوجود جیک کی طبیعت میں فطری سادگی تھی۔ ہر قسم کے نمود و نمائش سے وہ کوسوں دور بھاگتا تھا لیکن اُس کے ارسٹوکریٹک نقوش، چال ڈھال میں تمکنت اور وقار کے ساتھ ساتھ لب و لہجہ میں تہذیب و شائستگی کی جھلک اس کی خاندانی وجاہت کی چغلی کھائے بغیر نہیں رہتے تھے۔

''جیک اپنے ڈیڈ سے یونیورسٹی اخراجات کے علاوہ ایک پائی بھی نہیں لیتا اور اپنے غیر تعلیمی اخراجات پڑھائی کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم کام کر کے پورے کرتا ہے۔''

ایک دن جِل نے جیک کی غیر موجودگی میں انکشاف کیا تو ہم اس نوابزادے کے کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جو ایسا خاندانی پس منظر رکھنے کے باوجود آکسفورڈ کے گلی کوچوں میں ایک معمولی سی بائیک پر بڑے اطمینان سے پیڈل مارتا ہوا نظر آتا تھا۔

آج جیک پھر کئی دنوں کے بعد نظر آیا تھا۔ ہاتھ میں کئی کتابیں پکڑے ہوئے وہ لان کے اس کونے کی طرف آ گیا جہاں ہم چاروں بیٹھے ہوئے گرمیوں کی سہ پہر میں کولڈ ڈرنکس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

وہ ہمارے پاس آ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ہم سب جانتے تھے کہ جیک سے یہ سوال پوچھنا ہی بے کار تھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں غائب تھا؟ کیونکہ اس کا یوں اچانک ٹرم ٹائم میں ایک دو بار گم ہو جانا اب ہمارے لیے ایک معمول کی بات بن چکی تھی۔

جیک کو خاموش پا کر میں نے ہی بات کا آغاز کیا۔

''کیا آج کسی ازم پر بات نہیں ہوگی؟'' میں نے جیک کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، آج لٹریچر پر بات ہوگی۔ فلسفے پر بات ہوگی۔ آج افلاطون، نطشے، کانٹ اور ہیگل پر بات کریں گے۔'' جیک نے متانت سے جواب دیا۔

نطشے کے نام سے سوسن کو سخت چڑ تھی۔ ایک دم بول اٹھی ''ارے وہی مجذوب فلسفی جو اپنے قلبی واردات کا صحیح ادراک نہ کر سکا اور بھٹک گیا۔''

تمہارے اسی نطشے کے لیے اقبال نے کہا تھا نا، ٹینا نے شعر جڑ دیا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھتا مقام کبریا کیا ہے!

سوسن اور ٹینا کو نطشے کی مخالفت پر کمر بستہ دیکھ کر جیک نے فلسفے پر بات چیت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

''تو چلو آج لٹریچر پر بات کر لیتے ہیں۔'' جیک نے بڑے صلح جویانہ لہجے میں تجویز پیش کی۔

''آپ ٹالسٹائی سے ملاقات کرنا چاہیں گی یا میکسم گورکی کی عزت افزائی فرمائیں گی وگرنہ تو دوستوفسکی، پشکن، چیخوف اور

گوگول ہاتھ باندھے ہوئے دربارِ عالیہ میں حاضری کے منتظر ہیں۔''

جیک کے اس ظریفانہ انداز گفتگو پر جل جو کافی دیر سے روٹھی روٹھی سی بیٹھی ہوئی تھی ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''یہ تم رشین لٹریچر کا پیچھا کب چھوڑو گے جیک؟'' ٹینا نے جل کر سوال کیا۔

"Never" جیک جو رشین ادب کا شیدائی تھا اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اگر عالمی ادب میں سے رشین لٹریچر کو نکال دیا جائے تو پھر باقی پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟'' اس نے ٹینا پر اپنی دانست میں زبردست وار کیا۔

''بہت کچھ۔'' ٹینا نے جلدی سے جواب دیا۔

''چیکوسلواکیہ کافرانز کافکا، آئرلینڈ کا جیمز جوائس اور فرانس کا ژاں پال سارترے عالمی ادب کے افق پر عہد ساز ادیبوں کی حیثیت سے طلوع ہوئے ہیں۔ کیا تم ان کی اہمیت سے انکار کر سکتے ہو؟''

''آل رائٹ، آل رائٹ۔'' جیک نے جیسے سرنڈر کرتے ہوئے کہا۔

''سارترے بیسویں صدی کی عظیم ادبی شخصیت ہے۔ وہ ایک فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل لے کر پیدا ہوا تھا اور تاریخ علم و ادب میں اتنی بڑی سطح پر یہ واقعہ تیسری مرتبہ پیش آیا ہے۔ افلاطون اور نطشے کے بعد اب سارترے کی شخصیت بھی فلسفے کے بلند امتزاج کی علامت بن گئی ہے۔'' ٹینا نے اپنی بات کے حق میں مزید دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''زندہ وجود کی اہمیت پر سارترے کے فلسفہ زیست پر تو کوئی باشعور شخص اعتراض کر ہی نہیں سکتا۔'' ٹینا جو سارترے کے عشق میں مبتلا تھی اپنی ہی دھن میں بولے چلی جا رہی تھی۔

دراصل جیک اور ٹینا کی ادبی نوک جھونک کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں ہی فلسفہ اور عالمی ادب میں جوائنٹ آنرز کر رہے تھے جبکہ میرا مضمون معاشیات تھا۔ سوسن اور جل نفسیات کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ اس لیے ان دونوں کے بحث مباحثہ میں ہم صرف ایک خاص حد تک ہی شریک ہوا کرتے تھے۔

یہ جیک سے ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی کیونکہ گریجویشن مکمل کئے بغیر ہی وہ اچانک پھر غائب ہو گیا۔ اب کی بار اس کی غیر حاضری کافی طویل ہو گئی تھی۔ ہم سب اس کی طرف سے خاصے فکرمند تھے کیونکہ جیک نے ہم میں سے کسی سے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔

جل بھی ایک گومگو کی کیفیت میں تھی کہ آخر جیک کو کیا ہوا؟ وہ اچانک کیوں غائب ہو گیا؟ اور اب فائنل ایئر کے امتحانات سر پر آ گئے تھے مگر جیک کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔

گریجویشن مکمل کرنے کے بعد ہم سب تتر بتر ہو گئے۔ سوسن اور میں لندن چلے گئے اور ٹینا واپس بنگلور۔

سب اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف یوں لوٹ چکے تھے جیسے پرندے سارے دن دانہ دنکا چگنے کے بعد شام کو اپنے اپنے

آشیانوں کی طرف لوٹتے ہیں۔

سوائے جِل کے جو آکسفورڈ میں رک کر ہی جیک کا انتظار کرنا چاہتی تھی۔ اس نے آکسفورڈ کے کسی کالج میں ریسرچ فیلو شپ حاصل کر لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جیک ایک دن ضرور واپس آئے گا اور سینٹ ہلڈا کالج کے باہر کھڑا ہو کر اس کا انتظار کرے گا اور اگر وہ چلی گئی تو وہ اسے وہاں نہ پا کر سخت مایوس ہوگا۔

بظاہر لاتعلق اور خاموش سی رہنے والی جِل کے جذبوں کی گہرائی دیکھ کر ہمارے سر اُس کے سامنے عقیدت سے جھک گئے۔

''جیک بہت خوش قسمت ہے جو اسے جِل جیسی لڑکی ملی ہے وگرنہ مغربی معاشروں میں ایسی وفاداری کی مثالیں تو نہ ہونے کے برابر ہی ہیں۔'' ٹینا نے جِل کے فیصلے سے متاثر ہو کر کہا۔

آخری ملاقات پر ہم سب ہی اُداس تھے۔ جیک کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ الوداعی بوسے دیتے ہوئے ٹینا نے فرازؔ کے شعر کا مصرعہ دہرا دیا:

ع اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے

''خدا نہ کرے۔'' سوسن نے بڑی بوڑھیوں کے سے انداز میں کچھ اس طرح کہا کہ ہم سب اداس چہروں کے ساتھ زور سے ہنس پڑے۔

''پاپا اب آپ تیاری شروع کریں۔ ہمیں شام کو تھیٹر بھی جانا ہے۔''

میں جو اتنی دیر سے آنکھیں موندے ہوئے پڑا تھا شعاع کی آواز مجھے واپس ہوٹل کے کمرے میں لے آئی۔

''ابھی تو کافی وقت ہے جانے میں۔'' سوسن نے واش روم سے نکلتے ہوئے کہا۔

جیک کے بارے میں سوچ کر مجھ پر کچھ اداسی سی طاری ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی سوچوں کا رُخ موڑنے کی غرض سے ٹی وی آن کر دیا۔

بی بی سی پر وار ویٹرنز (War Veterans) کے بارے میں ایک ڈاکومنٹری فلم دکھائی جا رہی تھی۔ اس وقت بات چیت عراق کی جنگ سے واپس آنے والے امریکی اور برطانوی فوجیوں کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی صحت کے حوالے سے ہو رہی تھی کہ کس طرح وہ جنگ سے واپس آ کر گوناگوں ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو رہے تھے۔ ڈاکومنٹری کافی ڈسٹربنگ لگ رہی تھی۔

امریکہ اور برطانیہ میں ان فوجیوں کے متعلق کچھ ہارڈ فیکٹس (Hard Facts) کے علاوہ ویٹرنز کے فیملی ممبرز کے انٹرویوز بھی دکھائے جا رہے تھے۔

امریکہ میں ڈیپارٹمنٹ آف ویٹرن افیرز (V.A) کا نگران آفیسر بتا رہا تھا کہ ''تقریباً 49% ویٹرنز جنگ سے واپسی پر شدید دماغی صدمے کا شکار ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر 65 سیکنڈ میں ایک فوجی خودکشی کر رہا ہے اس طرح اندازاً کم از کم 22 فوجی روزانہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔''

اب ایک کلینکل سائیکالوجسٹ کسی ریسرچ کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے بتا رہا تھا کہ:

"After experiencing a severe trauma or life threatening event, many veterans develop PTSD symptoms."

یہ PTSD کیا ہے؟ پیش کار نے سوال کیا۔

PTSD کی مزید وضاحت کرتے ہوئے سائیکالوجسٹ نے بتایا ''افغانستان اور عراق سے واپس آنے والے بہت سے فوجیوں میں PTSD کی علامات پائی گئی ہیں۔ PTSD یعنی پوسٹ ٹرامیٹک سٹریس ڈس آرڈر (Post Traumatic Stress Disorder) کے مطابق جنگ کے دوران پیش آنے والے ہولناک واقعات اور شدید ذہنی اور جذباتی دباؤ انسانی ذہن پر بہت منفی اثرات مرتب کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک شدید صدمے کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ جس کا صحیح اندازہ اس وقت تو نہیں ہو پاتا مگر حالت جنگ سے باہر آ کر جب آپ ایک نارمل لائف اسٹائل میں آتے ہیں تو اس کی علامات اس وقت ظاہر ہوتی ہیں۔ یعنی کہ ڈیلیڈری ایکشن (Delayed Reaction)۔

بی بی سی پیش کار نے پھر سوال کیا ''کیا وجہ ہے کہ کچھ ویٹرنز تو PTSD کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ کچھ نہیں بھی ہوتے؟''

''اس کے بارے میں تو وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن PTSD کی علامات ظاہر ہونے کا دارومدار کافی حد تک اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ ایک فوجی نے جنگ میں کتنی مرتبہ شمولیت اختیار کی اور کتنی لڑائیوں میں حصہ لیا۔''

سائیکالوجسٹ نے نپا تلا سا جواب دیا۔

اب سائیکالوجسٹ کے ساتھ ساتھ ایک کمیونٹی جنرل پریکٹشنر (GP) بھی گفتگو میں شامل ہو گیا تھا وہ بتا رہا تھا کہ ''اس کے پاس آنے والے ویٹرنز جس قسم کے مسائل کا اظہار کرتے ہیں ان میں لگاتار منفی خیالات کا آنا، ڈراؤنے خواب، فلیش بیک جیسے کہ میدان جنگ کے ہولناک واقعات ابھی بھی وقوع پذیر ہو رہے ہوں یا پھر بے خوابی۔ دل کی دھڑکن کا تیز ہونا، جسم کی حرکت کا قابو میں نہ رہنا، شدید قسم کی بے چینی اور گھبراہٹ کے دورے پڑنا جس میں سینے میں درد کے ساتھ ساتھ سانس رکتا ہوا محسوس ہونا۔''

سائیکالوجسٹ نے دوبارہ گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا کہ ''PTSD کی علامات (Symptoms) عموماً مختلف لوگوں کو مختلف انداز میں متاثر کرتی ہیں لیکن عموماً ویٹرنز میں پائی جانے والی علامات چار طرح سے ظاہر ہوتی ہیں۔

جن میں پہلی علامت کو ہم "Re Current" کہتے ہیں جس میں شدید ذہنی اور جذباتی صدمے والے واقعات آپ کو بار بار یاد آتے ہیں۔

دوسری صورت "Extreme Avoidance" کی ہوتی ہے جس میں آپ لوگوں، جگہوں یا ایسی سچویشن سے اجتناب برتتے ہیں جس سے منفی یادیں سر اٹھا سکتی ہوں۔ اس رویے کے نتیجے میں آپ ہر چیز میں دلچسپی کھوتے چلے جاتے ہیں۔

تیسری علامت "Negative Change" کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جس میں آپ کے خیالات اور موڈ میں

زبردست تبدیلی واقع ہوجاتی ہے اور آپ اپنے اور دوسروں کے بارے میں بہت منفی خیالات کے ساتھ ساتھ ایک مستقل خوف و ہراس، احساس جرم اور شرمندگی کی کیفیت میں گرفتار رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ پورے معاشرے سے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔

چوتھی صورت میں آپ "Emotionally Reactive" ہوجاتے ہیں جس میں ہمہ وقت چوکنے رہنا، معمولی معمولی باتوں پر خوفزدہ ہوکر اچھل پڑنا، چڑچڑا پن، شدید غصے کے دورے پڑنا یا پھر بہت ہی غیر ذمہ دارانہ ردعمل کا مظاہرہ کرنا۔ ذہنی یکسوئی نہ ہونا اور ہر وقت ایک عدم تحفظ کے تحت جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر ہائی الرٹ کیفیت میں رہنا شامل ہے۔''

پیش کار نے ساری گفتگو کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا کہ جنگ سے واپسی پر PTSD کی علامات کبھی کبھار تو مہینوں بلکہ سالوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تلخ یادیں وقتاً فوقتاً سر ابھارتی رہتی ہیں مگر آپ کو ڈس فنکشنل (Disfunctional) نہیں کرتیں لیکن اگر آپ کی روزمرہ زندگی بسر کرنے کی اہلیت شدید طور پر متاثر ہو رہی ہے تو پھر بہت ممکن ہے کہ آپ PTSD کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں آپ کو مدد کے لیے ضرور رجوع کرنا چاہیے۔

میں، سوسن اور شعاع دم سادھے ہوئے ڈاکومنٹری دیکھ رہے تھے۔ طبیعت ایک دم بوجھل سی ہوچکی تھی۔

''کس قدر افسوس ناک صورت حال ہے۔'' سوسن نے افسردگی سے کہا۔

''بے گناہ انسانوں پر ظلم کرنے کے بعد جب احساس جرم کے کیڑے روح پر رینگتے ہیں تو PTSD تو کیا اس سے بڑی عفریت بھی جسم و جاں پر نازل ہوسکتی ہے۔'' شعاع نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

ابھی ہم ٹھیک سے اپنے خیالات و تاثرات شیئر بھی نہیں کر پائے تھے کہ چند فیملیز کے ساتھ انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ایک خاتون بتا رہی تھی کہ ''اس کا شوہر عراق جنگ سے واپسی پر ایک نارمل فیملی لائف گذارنے کے قابل نہیں رہا۔ راتوں کو اکثر ڈر کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ کمرے میں ادھر اُدھر دیکھتا اور کونے کھدروں کی تلاشی لینی شروع کر دیتا ہے۔ بیڈ کے نیچے جھانکتا ہے۔ الماری کھول کر دیکھتا ہے۔ تکیے کے نیچے سے اپنی گن تلاش کرتا ہے اور کچھ نہ پا کر پسینہ پسینہ ہوکر کمرے کے وسط میں بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کے چاروں طرف یوں دیکھتا ہے جیسے وہ اپنے بیڈ روم میں نہیں بلکہ ابھی تک میدان جنگ میں دشمن کے ساتھ مقابلے میں مصروف ہو اور پھر زور زور سے رونا شروع کر دیتا ہے۔''

اب خاتون باقاعدہ آنسوؤں سے رو رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری آنکھیں بھی بھیگ چکی تھیں لیکن اس نے جلد ہی حوصلہ مجتمع کر کے رومال سے آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پونچھا اور دوبارہ بات کرنے لگ گئی۔

''رفتہ رفتہ اس نے گھر سے غائب ہونا شروع کر دیا۔ کئی مرتبہ تو میں نے اُسے گھر سے باہر پڑے کوڑے دان (Wheely Bin) میں چھپے ہوئے ڈھونڈھ کر نکالا ہے۔ وہ کوڑے دان میں بیٹھ کر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تھوڑا سا ڈھکنا اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھتا تھا جیسے کہ میدان جنگ میں دشمن کی بو سونگھ رہا ہو اور پھر ڈھکنا بند کر کے چھپ کر بیٹھ جاتا تھا۔ گویا ابھی تک کم بیٹ (Combat) پوزیشن میں ہو۔''

پیش کار نے خاتون کو دلاسہ دیتے ہوئے پوچھا کہ اس نے اپنے شوہر کو کسی V.A سنٹر میں ٹریٹمنٹ کے لیے ریفر کیوں نہیں کیا؟

''کیا تھا'' خاتون نے جواب دیا لیکن جیک کچھ ہی دنوں کے بعد وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس میں زندہ رہنے کی خواہش ہی مر چکی ہے۔ پتہ نہیں کیسے کیسے قیامت خیز منظر اس کی آنکھ کی پتلی میں جم چکے ہیں کہ وہ پہلے والا جیک ہی نہیں رہا'' خاتون بے حد تھکے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

دفعتہ سوسن کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی ''اوہ مائی گاڈ یہ تو جِل ہے، اور ہم اتنی دیر سے اسے پہچان ہی نہیں پائے۔ وقت نے کتنی بے رحمی سے اپنے آہنی پنجے اس کے چہرے پر گاڑ رکھے ہیں کہ اس کی شکل تک پہچانی نہیں جا رہی۔''

''جِل جس قسم کے حالات کا شکار ہے اس میں اکثر لوگوں کے چہرے گم ہو جایا کرتے ہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

ٹینا کی کہی ہوئی بات آج یاد آ رہی تھی ''اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے''۔

''جیک نے واقعی جِل کے یقین کی لاج رکھ لی۔'' سوسن نے کہا۔

''ہاں'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''تو جیک نے پڑھائی چھوڑ کر آرمی جوائن کر لی تھی، اسی لیے کچھ بتائے بغیر ہی غائب ہو گیا تھا۔''

میں اور سوسن ڈاکومنٹری دیکھنے کے بعد بہت افسردہ سے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ایسی حالت میں ہمارا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ ہم کامیڈی شو دیکھنے کے لیے تھیٹر میں جائیں لیکن شعاع کی دل آزاری کے خیال سے ہم نے بادل نخواستہ اٹھ کر تھیٹر جانے کی تیاری شروع کر دی۔

تھیٹر جاتے ہوئے سارا وقت میں اور سوسن، جیک کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے ''فلسفے کی گتھیاں سلجھانے والا اور ادب پر لمبی لمبی بحثیں کرنے والا نازک مزاج اور اصول پسند جیک، جنگ کی ہولناکیوں سے کس قدر دکھی ہوا ہوگا۔'' سوسن نے آہستگی سے کہا۔

''لیکن اس سے زیادہ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ جن مہلک ہتھیاروں (Weapons of mass destruction) کو تباہ کرنے کی خاطر اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عراقیوں کو آزاد کرانے کے لیے وہ وہاں گیا ہوگا۔ ان ہتھیاروں کو وہاں نہ پا کر اور سیاست دانوں کے جھوٹ کا پول کھل جانے پر وہ کس قدر ذہنی اذیت سے دوچار ہوا ہوگا۔'' میں نے افسردگی سے جواب دیا۔

''دراصل جیک انسان کے احترام اور اس کی آزادی پر یقین رکھتا تھا لیکن اپنے وہ عقائد و نظریات جنہیں اس نے زندگی بھر مقدس اور عزیز رکھا ان کی زبوں حالی اور بے توقیری دیکھ کر وہ کس قدر دکھی ہوا ہوگا۔ اس کی بے بسی کی انتہا دیکھنے کے لائق ہو گی۔''

سوسن نے نہایت دکھی آواز میں کہا اور پلکوں پر لرزتے ہوئے موتیوں کو رومال میں جذب کرنے لگی۔

جیسے تیسے کر کے شو ختم ہوا رات کافی بیت چکی تھی۔

تھیٹر سے باہر نکل کر تنگ سی گلی میں کھڑے ابھی ہم سوچ بچار کر ہی رہے تھے کہ کس طرح ہوٹل پہنچیں کہ بکھرے ہوئے بالوں، بڑھی ہوئی داڑھی اور ملگجے کپڑوں کے ساتھ نشے میں دھت اس اجنبی شخص نے میری بیٹی شعاع کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔

وہ ذرا قریب آتا، ہلکا سا مسکراتا اور پیچھے ہٹ جاتا۔ اس نے چند مرتبہ یہی حرکت کی تو میں نے شعاع کے قریب ہوتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔

میرے اس طرح دیکھنے پر وہ گلی کی دوسری نکڑ کی طرف چلا گیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد لڑکھڑاتا ہوا واپس آ گیا۔

"I am sorry my Princess..... I am sorry..... I am sorry my Princess..... I have not done anything..... I am really sorry."

وہ شعاع کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تقریباً آدھا جھکا ہوا یوں سوری سوری کہہ رہا تھا جیسے موت سے بچنے کے لیے وہ گڑگڑا گڑگڑا کر رحم کی اپیل کر رہا ہو۔

اجنبی کا اندازِ تخاطب اور آنکھوں میں اداسیوں کے ہزاروں صحراؤں کی ریت کی چبھن سے زیادہ جیسے اس کے ضمیر کی چبھن اس کی روح پر تازیانے برسا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ آج سارے کا سارا ہی اپنی آنکھوں کے پیالوں سے جھپک جائے گا۔

آپ اس شخص کی درزیدہ کیفیت کچھ یوں سمجھ لیں کہ اگر کسی انسان کو زندہ ہی قبر میں اتار دیا جائے تو جیسے ہی قبر اس کے گرد شکنجہ کسنا شروع کرے تو وہ شخص وحشت و سراسیمگی کے عالم میں وہاں سے بھاگ نکلے۔ خوف و دہشت سے اس کی زبان گنگ ہو جائے اور اس کی آواز حلق سے نکلنے کی ناکام کوشش میں ایک گھٹی گھٹی سی چیخ بن کر رہ جائے۔

انتہائی بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنا اپالو تھیٹر کے باہر اپنے گناہوں کی اس انداز میں معافی طلب کرتا ہوا یہ اجنبی مجھے دنیا کا مفلس ترین شخص لگا۔

اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میرا دل مٹھی میں لے کر بری طرح سے مسل رہا ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے دونوں ہاتھ سے سیدھا کھڑا کرتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنا شروع کیا تو وہی برسوں پرانی کشادہ پیشانی، اٹھی ہوئی خاندانی ناک اور ذہین آنکھیں جن کی چمک گردشِ زمانہ سے ماند پڑ چکی تھی۔

میں نے تقریباً چیختے ہوئے جیک..... جیک کہنا شروع کر دیا۔

اس نے گھبرا کر مجھے اور سوسن کو بے یقینی سے دیکھا مگر اس کی نگاہیں کسی بھی پہچان سے کوسوں دور تھیں۔

''اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے۔'' ٹینا کی آواز کی بازگشت ایک بار پھر فضا میں گونج اٹھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ کچھ گناہوں کی معافی شاید کبھی بھی نہیں ملتی، چاہے انسان زندگی بھر لفظ ''سوری'' کی تسبیح کرتا رہے۔

مرد و زن کے لئے شرم و غیرت حیا لازمی ہے مگر
مرد جیسا بھی ہو آنکھ، میں عورتوں کی حیا ڈھونڈتا ہے

(رضیہ اسماعیل)

چھنال

''اری او چھنال.....کہاں مرگئی؟

مجال ہے جو اس رانڈ کے کانوں پر جوں تک رینگ جائے۔ کب سے دو بوند پانی کے لئے ترس رہا ہوں۔''

بڑے سے آنگن کے ایک کونے میں برگد کے درخت تلے پڑی کھاٹ پر، شام کے ملگجے سے اندھیرے میں بے حس و حرکت پڑا ہوا دیپو کافی دیر سے چلاّ رہا تھا۔

''میری ٹانگوں میں دم ہوتا تو تیرے پیچھے جا کر اپنے یار کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑتا، سو جوتے مار کر، چُٹیا سے پکڑ کر گھر سے نکال باہر کرتا۔ ہائے رام اب میں کیا کروں!'' دیپو نے روہانسا ہو کر کہا۔

دیپو کی واہی تباہی نے سارے ماحول کو اداس سا کر دیا تھا۔

درخت پر بیٹھے ہوئے پنچھی بھی دن بھر دانہ دنکا چگنے کے بعد سستانا چاہ رہے تھے مگر دیپو کا واویلا سن کر سب ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

تھان سے بندھی گئیا بھی سب کچھ سمجھنے کی کوشش میں ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ وہ سامنے پڑے ہوئے چارے کو یوں حسرت سے تک رہی تھی جیسے ایک لاچار اور بے بس ماں اپنے جاں بلب بچے کو آخری سانسیں لیتے ہوئے دیکھ کر امید اور نا امیدی کی دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہو۔ لیکن پھر جیسے اسے ایک ہڑکا سا لگے اور وہ ہڑ بڑا کر اپنی سوچوں سے باہر نکل آئے اور اپنے بچے کو بے اختیار چومنا شروع کر دے۔

گئیا بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کچھ نہ سمجھتے ہوئے گھبرا کر بڑی بے چارگی سے چارے پر منہ مارنا شروع کر دیتی تھی۔

وقت نے جیسے سرگوشی کی ''مکان صرف چھتوں، دیواروں، کھڑکیوں، دروازوں، دالانوں، برآمدوں، ڈیوڑھیوں، آنگنوں اور ممٹیوں سے ہی قدر و منزلت حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کا اصل شرف تو اُن کے مکین ہوتے ہیں۔''

بقول اسد اللہ خان غالبؔ۔

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

اور اس مکان کا اصل شرف تو دیپو کی ماں ساوتری دیوی تھی جو بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ مانگ سے سیندور پونچھ کر بیوگی کا سفید چولا پہن کر، ننھے سے دیپو کو سینے سے چمٹائے اس کی مسکراہٹوں کی لو سے ہی جیون کی سنسان اور تاریک راہوں کو روشن کرتی رہی مگر لب پر کبھی حرفِ شکایت نہ لائی۔

پارسائی کی ایک مثال بن کر جوانی کے کڑے کوس کاٹ دیئے۔ گاؤں کے بڑے بزرگ سب اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ راہ چلتی ساوتری دیوی کو دیکھ کر سب ادب سے راستہ چھوڑ دیتے تھے، کیوں کہ ساوتری دیوی نے عزم و ہمت کی جوالا مکھی بن کر ناری جاتی کے مان سمبان کو جلا بخشی تھی۔ مجال ہے جو کبھی کمزور پڑی یا جھکی ہو۔ بس جیون بھر ترشول کی طرح تنی کھڑی رہی۔ جیسے وہ گوشت پوست کی عورت نہیں پتھر کی ایک چٹان ہو

لیکن کون جانے اس چٹان میں اندر ہی اندر کتنے جھرنے پھوٹ پھوٹ کر بانجھ ہو چکے تھے؟

دیپو کے سہرے کے پھول کھلنے اور گھر کے بڑے سے آنگن میں پوتے پوتیوں کی معصوم کلکاریاں سننے کے سپنے آنکھوں میں سجائے ہی ساوتری دیوی نے جیون کاٹ دیا۔

دیپو کے پتا نے چند بیگھے زمین چھوڑی تھی جس سے کسی کا احسان لیے بغیر اس کی گزر اوقات ڈھنگ سے ہو جاتی تھی۔

ساوتری دیوی نے ساتھ کے گاؤں میں ایک بھلے مانس گھرانا دیکھ کر دیپو کے لگن کی بات بڑھائی تو بس چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہو گیا۔ ساوتری دیوی کی خوشی دیدنی تھی۔ بیاہ کی تیاریوں کو دیکھ کر اگر کوئی دبی زبان سے کچھ کہتا بھی تو ساوتری دیوی ہنستے ہوئے کہتی، ''ارے، میری ایک ہی تو سنتان ہے، کون سے دس بارہ بچے ہیں جن کے بیاہ رچانے ہیں مجھے۔ میں تو دیپو کے بیاہ پر جی بھر کر اپنے ارمان نکالوں گی۔''

دیپو کا بیاہ اس قدر دھوم دھام سے ہوا اور بھوجن ایسا مزے کا تھا کہ گاؤں والے بہت دنوں تک انگلیاں چاٹ چاٹ کر چٹخارے لیتے رہے۔ دیپو اور جیوتی کی جوڑی سچ مچ دیپک اور جیوتی کے موافق ہی ثابت ہوئی۔ یک جان و دو قالب۔ دیپو تو جیوتی کو دیکھتے ہی اس پر جی جان سے فدا ہو گیا تھا۔ ماں کے صدقے واری جاتا تھا کہ کتنی اچھی جیون ساتھی ڈھونڈی اس کے لئے۔ دیپو اور جیوتی کے پریم کے چرچے رفتہ رفتہ گاؤں میں سب ہی کی زبان پر آ گئے۔

گاؤں کی کچی کنواریاں اکثر پنگھٹ پر ان کے پریم کے قصے سنا سنا کر مزے لیتیں اور پھر شرم سے دوہری ہو کر منہ ڈھانپ کر کھلکھلا کھلکھلا کر خوب ہنستیں۔

''چنتا نہ کرو جب تمھارا لگن ہو گا تو تمھارا پتی بھی ایسا ہی تمھارا دیوانہ ہو گا۔ مرد تو روپ اور جوانی کا بھوکا ہوتا ہے، شیر کی طرح تمھاری بوٹیاں نہ نوچ لے تو میرا نام بدل دیجیو۔'' شانتی موسی نے گویا رنگ روپ والی ساری کنواریوں کو چنوتی دے دی۔

لگتا تھا ادھیڑ عمر شانتی موسی کو اپنی جوانی کے دن یاد آ رہے تھے جبھی تو وہ بات کرتے کرتے لجا سی جاگئی۔

اُدھر ساوتری دیوی، دیپو اور جیوتی سے کوئی خوش خبری سننے کے لئے دن رات بھگوان سے پرارتھنا کرتی۔ مندر میں

چڑھاوے چڑھاتی۔بس اس کا یہی ارمان تھا کہ دیپو کی سنتان کا منہ دیکھ لے تو سمجھے گی اس نے گنگا نہالیا مگر ساوتری دیوی کے پاس وقت کم پڑ گیا۔گاؤں میں اچانک ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی جس سے بہت سے لوگوں کی طرح ساوتری دیوی بھی دیکھتے ہی دیکھتے پرلوک سدھار گئی۔

ماں کی اچانک موت کا جانکاہ صدمہ دیپو کی برداشت سے باہر تھا۔ماں کی چتا کو آگ دکھاتے ہوئے وہ یوں بلک بلک کر رویا کہ لگتا تھا کہیں چتا کی آگ اس کے آنسوؤں کی نمی سے وقت سے پہلے ہی ٹھنڈی نہ ہو جائے۔

گہری اداسیوں میں ڈوبے ہوئے دیپو کو اپنی بکھری ہوئی ہستی کو سمیٹنے میں بہت وقت لگ گیا۔ایسے میں جیوتی کی دل جوئی اور خاطر مدارات نے اس کے لئے مرہم کا کام کیا اور وہ رفتہ رفتہ زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔

لگتا تھا دیپو اور جیوتی کی پرکشا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ایک دن کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ٹریکٹر کی ٹکر سے دیپو ایسا زخمی ہوا کہ کمر کی چوٹ سے وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر اٹھنے کے قابل نہ رہا۔جیوتی کے جیون کی تو جیسے جوت ہی بجھ گئی۔ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا۔جیوتی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

ساوتری دیوی نے تقریباً ساری پونجی دیپو کی شادی پر لٹا دی تھی۔کوئی مال دار سگا سمبندھی بھی نہیں تھا کہ روپے پیسے سے ان کی مدد کرتا تاکہ وہ دیپو کو شہر کے بڑے ہسپتال میں لے جا کر علاج کرواتی۔میکے میں لے دے کر رشتے کا ایک غریب ماما تھا جس نے جیوتی کے ماتا پتا کے سورگ باشی ہونے کے بعد ان کی اکلوتی بٹیا کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری اٹھائی اور مناسب بر دیکھ کر اس کا بیاہ کر دیا۔

جیوتی کے نصیب اچھے تھے کہ اس انادکو ساوتری دیوی کا گھرانا مل گیا۔دان دھیج لیے بنا ہی ساوتری دیوی نے اس کے ماما کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا جس پر غریب ماما بے حد پرسن تھا۔

ان حالات میں گاؤں کے وید سے ہی جو دوا دارو بن پڑتا تھا، جیوتی وہی کروا رہی تھی۔اور اس کے ساتھ ساتھ وہ دن رات بھگوان سے پرارتھنا کرتی کہ وہ دیپو کو جلدی اچھا کر دے۔

شروع شروع کے دنوں میں تو صدمے سے نڈھال اور مستقبل کی سوچوں سے پریشان جیوتی گُم سُم سی ہو کر دیپو کی کھاٹ سے ہی لگ کر بیٹھی رہی۔نہ کھانا، نہ پینا، نہ بولنا، نہ ہنسنا۔بس خالی خالی نظروں سے سب کو تکتی رہتی مگر آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لے رہے تھے۔

جیوتی کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر چند روز تو محلے والوں نے اسے بھوجن کرا دیا مگر کب تک؟

دیپو کی بیماری نے بڑی سمسّیا کھڑی کر دی تھی۔اب زمینوں پر کام کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔پھر ایک روز جیوتی کچھ سوچ کر اٹھی، ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھے اور گاؤں کے مُکھیا کی حویلی جا پہنچی۔مُکھیا یوں اچانک جیوتی کو حویلی میں پا کر قدرے حیران سا ہو گیا۔

''کہو، جیوتی! کیا بات ہے؟'' مُکھیا نے نرم لہجے میں جیسے ہی جیوتی سے بات کی، اس کے آنسو پھر سے پلکوں پر لرزنے لگے۔

''مالک، آپ تو دیپو کی حالت جانتے ہی ہیں۔ نہ جانے کب کھاٹ چھوڑے گا وہ؟ زمینوں کی دیکھ ریکھ کرنے والا اب کوئی نہیں۔ اگر ابھی سے چارہ نہ کیا تو تمام کی تمام کھڑی فصل برباد ہو جائے گی۔ ایسے میں آشا کی کرن بس آپ ہی ہیں۔ کرپا کیجئے۔ اس وقت آپ ہی ہمارے لئے بھگوان ہیں۔''

جیوتی کی سچی اور سیدھی سادی باتوں نے نرم دل مُکھیا کا دل پگھلا کر رکھ دیا۔ وہ دیپو کی ماں ساوتری دیوی کی بہت عزت کرتا تھا۔ ان کے گھر کے حالات سن کر بہت دکھی ہوا۔ دیپو کے ٹھیک ہونے تک اس نے زمین کے سلسلے میں تمام کاموں کی ذمہ داری قبول کر لی اور بدلے میں فصل کا کچھ حصہ باقاعدگی سے جیوتی کو دینے پر رضامندی ظاہر کر دی جس پر جیوتی نے سُکھ کا سانس لیا۔

اُدھر دیپو جیسا کڑیل جوان کھاٹ پر پڑے پڑے چند مہینوں میں ہی برسوں کا بیمار دکھائی دینے لگا۔ مزاج میں بہت زیادہ چڑچڑاہٹ آ گئی تھی۔ چلتی پھرتی جیوتی کو دیکھ کر اس کے دل پر آرے سے چلتے تھے۔ جیوتی کا رنگ روپ، جس کا وہ کبھی دیوانہ تھا، اب اُسے کھَلنے لگا تھا۔ دن رات جانے اَن جانے اندیشے اُس کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے۔

جیوتی کی دن رات کی سیوا بھی اب اسے زہر لگنے لگی تھی۔ اسے لگتا کہ جیوتی اس پر ترس کھا کر سب کچھ کر رہی تھی۔ جب کہ جیوتی اپنا پتی پرمیشور دھرم نبھاتے ہوئے ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

ایسے میں جیوتی کے کاموں میں سو سو کیڑے نکالنا اور بہانے بہانے سے اسے گالیاں دینا دیپو کا معمول بن چکا تھا جس سے گھر کا ماحول ہر وقت کشیدہ رہنے لگا تھا۔

دیپو کی حالت دیکھ کر جیوتی نے ہار سنگھار چھوڑ دیا۔ سادہ سی سوتی ساڑھی پہن لی۔ نہ کہیں آنا، نہ جانا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے جس سے دیپو اس سے خوش ہو کر اسے وقت بے وقت کوسنے دینے سے باز رہے۔

''آخر اسے بھی ہمدردی کے دو بولوں کی ضرورت ہے۔ انسان ہے، کوئی پشو تو نہیں کہ جیسے چاہو ہانکتے چلے جاؤ۔''

پلکوں پر لرزتے آنسوؤں کو سہارا دیتے ہوئے اُس نے سوچا۔

''ناری کا من کتنا بھی وشال ہو مگر مرد کی بداعتمادی سے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

حالات کی سولی پر لٹکی ہوئی جیوتی کی ذہنی حالت اور اس کے دکھ درد سے دیپو قطعی بے خبر تھا۔

اِدھر کچھ دنوں سے جیوتی شام ہوتے ہی دیپو کو بھوجن کرا کر کچھ کہے سنے بنا ہی گھر سے خاموشی سے نکل جاتی اور رات گئے واپس لوٹتی۔ تب تک دیپو انتظار کرتے کرتے اور اسے کوسنے دیتے ہوئے سو چکا ہوتا تھا۔

آج پھر شام ہوتے ہی جیسے ہی جیوتی نے گھر کی چوکھٹ پار کی، دیپو نے چھنال چھنال کی رٹ لگانا شروع کر دی۔

شام کے وقت گلی سے گزرنے والے سب ہی لوگ اب ان گالیوں کے عادی سے ہو چکے تھے۔

میں اور باپو بھی ہر شام مندر میں گیتا کے پاٹھ سے فارغ ہو کر واپسی پر گھر جاتے ہوئے اس گلی سے گزرا کرتے تھے۔ دیپو کی باتیں سن کر باپو کی تیوری پر بل پڑ جاتے اور وہ نہایت ناگواری سے اپنی ناک سکیڑ لیا کرتا تھا جیسے بدبو کا زبردست بھبکا اس کے نتھنوں میں گھس گیا ہو مگر اس گلی سے گزرنا ہماری مجبوری تھی۔ کیوں کہ ہمارے گھر کو جانے والا ایک یہی قریبی راستہ تھا۔

میں اکثر باپو کے چہرے کی ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے قدرے ایڑیاں اٹھا کر دیپو اور جیوتی کے گھر کی کچی چار دیواری کے پار جھانکنے کی ناکام کوشش کرتا تو باپو مجھے بڑی طرح جھڑک کر تیز تیز قدموں سے چلنے کا بھاشن دے ڈالتا۔

''ہر شام یہی ناٹک ہوتا ہے۔ اس عورت کے لچھن کچھ اچھے نہیں لگتے۔'' باپو منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہتا۔ لیکن مجھے کبھی ہمت نہ پڑی کہ میں باپو سے پوچھ سکوں کہ اس کی بات کا کیا مطلب ہے؟

میں اپنی عمر کی سمجھی اور ناسمجھی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ کچھ باتیں تو میری سمجھ میں آ جاتی تھیں مگر بہت سی باتیں بس سر کے اوپر سے ہی گزر جاتیں۔ ایسے میں ماں اور باپو کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جو میرے سوالوں کا جواب دیتا۔ ماں تو پھر بھی کچھ بتا ہی دیا کرتی تھی جب کہ باپو کا جواب اکثر ''ہوں، ہاں'' میں ہی ہوتا جو میرے لئے بڑی الجھن کا باعث بنتا۔

باپو کافی عرصے سے گاؤں کے چھوٹے سے سکول میں ماسٹری کر رہا تھا اور اب وہ ریٹائر ہونے کے قریب تھا۔ کچھ مدت سے اس نے شام کو مندر میں گیتا کا پاٹھ بھی پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ سکول کی نوکری چھوڑنے کے بعد گیان دھیان کی کوئی مصروفیت تو بنی رہے۔

ایک دن ماں کو رسوئی کے کام میں مصروف دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ جیوتی دیدی اور دیپو بھیا کے بارے میں کچھ پوچھوں۔ ماں سے سوال پوچھنے کا یہ وقت بہت اچھا ہوتا تھا، کیوں کہ کام کی مصروفیت یا شاید بے دھیانی میں ہی وہ میرے بہت سے الٹے سیدھے سوالوں کے کھرے کھرے جواب دے دیا کرتی تھی۔

''ماں! یہ چھنال کیا ہوتی ہے؟''

انہاک سے برتن مانجھتی ہوئی ماں نے تیوری پر بل ڈال کر مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا، ''کہاں سے سنا ہے یہ تو نے؟'' پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے بولی، ''دیپو سے سنا ہو گا، ہائے رام! کیا کل جُگ ہے، کہاں ساوتری دیوی اور کہاں یہ جیوتی؟ خاندان کی ناک کٹوا دی اس نے تو۔ دیپو نے کھاٹ کیا پکڑی، یہ گلچھرّے اڑانے لگی۔''

''ماں! بتاؤ ناں چھنال کیا ہوتی ہے؟''

''ارے چھنال بہت ہوشیار اور چالاک ناری کو کہتے ہیں۔'' ماں نے اپنی دانست میں بڑی بے ضرر سی وضاحت کی۔

''مگر ہوشیار ہونے میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ باپو تو سکول میں ہر وقت کہتے رہتے ہیں کہ جیون میں ہر ایک کو ہوشیار ہونا چاہیے۔''

''ارے، میرا مطلب پڑھائی میں ہوشیار ہونے سے نہیں ہے۔'' ماں بولی۔

''تو پھر کیا مطلب ہے تمھارا؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''ارے یہ کیا کورٹ کچہری کے وکیلوں کی طرح تم نے جرح شروع کر دی ہے؟'' ماں کچھ دیر کو رُک کر جیسے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگی۔ پھر ایک لمبی آہ بھر کر بولی، ''یہ بہت ہی چالاک، ہوشیار بلکہ چلتر ہن ناری کو کہتے ہیں جو مردوں سے آنکھ مٹکا کرتی پھرے۔''

''چلتر ہن'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر ماں سے پوچھا۔

''ہائے رام! اب اس ناسمجھ کو کیسے سمجھاؤں کہ چلتر ہن ناری کیا ہوتی ہے؟'' ماں نے میرے پے در پے سوالوں سے زِچ ہو کر کہا۔

''چلتر ہن ناری وہ ہوتی ہے جو غیر مردوں سے الٹی سیدھی باتیں کرتی پھرے اور پتی ورتا ہونے کے نام پر بٹہ لگائے۔''

''مگر میں نے تو جیوتی دیدی کو کبھی کسی دوسرے مرد سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ تو ہر وقت دیپو بھیا کی دیکھ ریکھ میں ہی جتی رہتی ہے۔'' میں نے جیوتی دیدی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا مگر ماں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ماں کی طویل خاموشی سے تنگ آ کر میں نے پھر سوال جڑ دیا۔ ''ماں اگر مرد دوسری عورتوں سے آنکھ مٹکا کریں تو کیا انھیں بھی چھنال کہتے ہیں؟''

اب کی بار ماں نے ترنت جواب دیا، ''نہیں نہیں، مرد تو گندے جوہڑ میں سوڈ بکیاں بھی لگا لے تو پھر پوتر کا پوتر ہی رہتا ہے۔ چھنال تو بس ناری جاتی ہی ہوتی ہے۔'' ماں نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا۔

''مگر ایسا کیوں؟ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے قدرے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ بس سنسار میں ایسا ہی ریتی رواج ہے۔ ہم کون سے مہاتما ہیں جو سماج سدھار کرتے پھریں۔'' ماں نے میرے تابڑ توڑ سوالوں سے چِڑ کر مجھے تقریباً جھڑکتے ہوئے کہا، ''کیا ناری بھون کھولنے کا ارادہ ہے تیرا، جہاں تو لوگوں کو بھاشن دے دے کر بتائے گا کہ کون سی ناری اچھی ہے اور کون سی بری؟''

''نہیں ماں! ایسی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''بس اب جا، الٹے سیدھے سوالوں سے میرا سر نہ کھا۔'' اس کے ساتھ ہی سوال جواب کا سلسلہ گویا منقطع ہو گیا۔

سچ تو یہ ہے کہ ماں کی باتوں سے میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔

مجھے سندر سی جیوتی دیدی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ جب سے بیاہ کر ہمارے گاؤں آئی تھی اس کی ہنس مُکھ طبیعت اور موہنی سی صورت نے سب کا دل موہ لیا تھا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے وہ اکثر مجھے پاس بلا کر پیار کیا کرتی تھی اور کبھی کبھی کوئی میٹھی چیز بھی کھانے کو دے دیا کرتی تھی۔ آج کئی دنوں کے بعد میرا جی چاہا کہ میں جیوتی دیدی کے گھر جاؤں۔

باپو شہر گیا ہوا تھا اور شام سے پہلے گاؤں لوٹنے والا نہیں تھا۔ ماں کو کچھ بتائے بغیر ہی میں وہاں سے کھسک گیا وگرنہ وہ تو لٹھ

لے کر میرے پیچھے پڑ جاتی اگر اسے اِس بات کی بھنک بھی پڑ جاتی کہ میں جیوتی دیدی کے ہاں جانے والا ہوں۔

آنگن میں قدم رکھتے ہی میری نظر جیوتی دیدی پر پڑی جو بڑی مشکل سے دیپو بھیا کی کھاٹ کو گھسیٹ کر برآمدے کی طرف لے جا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''ارے راجن! تم آج کہاں سے ٹپک پڑے؟ اچھا ہوا تم آ گئے، اِدھر آؤ۔ کچھ مدد کرو، دیکھو تمھارے دیپو بھیا کب سے آنگن میں سے برآمدے میں آنے کا کہہ رہے تھے۔ آج دھوپ میں تپش کچھ زیادہ ہی ہے۔''

میں خوش خوش بھاگ کر گیا اور جیوتی دیدی کی مدد کرنے لگا۔

جیوتی دیدی بولتی جا رہی تھی۔ دیپو بھیا آنکھیں موندھے ہوئے تھے۔ میرے آنے پر بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا، بس بے حس و حرکت پڑے رہے۔

میں نے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ''ساوتری نواس'' ایک گہری اداسی کی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ بڑے سے آنگن کے ایک کونے میں گئیا چارے پر منہ رکھے خالی خالی نگاہوں سے ہر شے کو تک رہی تھی۔ یہ ساوتری دیوی کے دنوں کی گئیا تھی جس کی ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جاتی تھی مگر آج اس گھر کے مکینوں کو اپنی ہی پتا پڑی ہوئی تھی۔ ایسے میں اس بے زبان کے ناز نخرے کون اٹھاتا؟

دیپو بھیا کے کبوتر بھی چھتری پر حواس باختہ سے بیٹھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ بھی دیپو کی بیماری پر غٹرغوں کرنا بھول چکے تھے۔

آنگن کے بیچوں بیچ تلسی کا پودا بھی اشک بار نگاہوں سے گئے وقتوں کی رونقیں یاد کر کے اداس ہو رہا تھا۔

برآمدے میں لٹکے ہوئے سنہری پنجرے میں گانی والا خوب صورت طوطا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پر پھڑ پھڑا کر ماحول کے سکوت کو توڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یہ طوطا جیوتی اپنے میکے سے ساتھ لائی تھی۔ بس یہی ایک نشانی تھی میکے کی جسے دیکھ کر جیوتی کا من شانت ہو جایا کرتا تھا۔ لگتا تھا کہ اب طوطا بھی دیپو کی طرح جیوتی سے بدگمان ہو چکا تھا۔ دن رات دیپو کی چھنال چھنال کی رٹ سن کر طوطا بھی جیوتی کو دیکھ کر چھنال چھنال کی گردان کرنے لگتا تھا جس سے جیوتی دل مسوس کر رہ جاتی کہ اب پنچھی بھی اسے شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔

دھوپ کی تپش سے بچنے کے لئے بوڑھے برگد کی شاخوں پر بیٹھے ہوئے پنچھی گاہے گاہے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

''یہ جیوتی ہر شام کہاں چلی جاتی ہے، دیپو کو بتائے بغیر؟'' ایک نے کہا۔

''یہ تو رام ہی جانے۔'' دوسرے نے آہستگی سے جواب دیا۔

''میں تو دیپو کی ہر روز کی کِل کِل سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔'' تیسرے پنچھی نے کہا۔ ''لگتا ہے اب کوئی اور ٹھکانا دیکھنا

پڑے گا۔'' اس نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اور ٹھکانا دیکھ تو سکتے ہیں مگر ہمارا اس آنگن اور برگد کے ساتھ ناتا بہت پرانا ہے۔'' ایک تجربہ کار پنچھی نے سنجیدگی سے کہا۔

''برے وقت میں کیا ہم بھی اس گھر کے مکینوں کا ساتھ چھوڑ دیں؟ سیانے پنچھی نے گویا سب کو سوال کی زد پر رکھ دیا۔ مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ پھر خود ہی بولا، ''ایسا کام صرف انسان ہی کر سکتے ہیں، ہم پنچھی پکھیرو نہیں۔ ہم یہاں سے کہیں اور نہیں جائیں گے۔ انہی شاخوں پر بیٹھ کر پرارتھنا کریں گے کہ اس گھر کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹ آئیں۔'' بوڑھے پنچھی کی بات سے سب کے سراسیمہ چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور ان سب نے مل کر کچھ اس انداز سے چہچہانا شروع کر دیا کہ میں اور جیوتی دیدی سر اٹھا کر برگد کی شاخوں کو حیرانی سے تکنے لگے اور یہ سوچ کر مسکرا دیئے کہ شاید پرندوں کی چہچہاہٹ میں اچھے وقتوں کا سندیسہ ہو۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی دیپو جیوتی کے چلتر کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیتا مگر جیوتی سنی اَن سنی کر کے گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔

دونوں کے درمیان اب بات چیت بہت کم ہو گئی تھی۔

جیوتی اگر کبھی دیپو سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو اس کے جلے کٹے جواب سن کر خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی۔ اس نے پلٹ کر دیپو کی کڑوی کسیلی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیا تھا جیسے ایسا کرنے سے اسے اپنا دھرم بھرشٹ ہونے کا اندیشہ ہو۔

اِدھر کچھ روز سے جیوتی نے گاؤں کے مالشیئے کو دیپو کی کمر اور ٹانگوں کی باقاعدگی سے مالش کرنے کا کہہ دیا تھا۔ ہر دوسرے روز دینو کا کا ایک گھنٹے کے لئے دیپو کی مالش کرنے وقت پر پہنچ جاتا۔

پہلے پہل تو دینو کا کا کو دیکھ کر دیپو نے کچھ احتجاج کیا مگر پھر تھک ہار کر ہتھیار ڈال دیئے۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے دیپو اپنی ٹانگوں میں ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔

پھر ایک روز اس نے معجزاتی طور پر اپنے پاؤں کی انگلیوں کو حرکت کرتے ہوئے محسوس کیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے مہینوں بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اس کے پاؤں کی انگلیاں حرکت کرنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی تو اسے شک ہونے لگتا تھا کہ اس کے پاؤں کی انگلیاں واقعی حرکت کر رہی تھیں یا یہ اس کا وہم تھا۔ مگر کئی بار آزمانے پر بھی واقعی اس کے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ والی دونوں انگلیاں ہل رہی تھیں۔ دیپو اس چمتکار پر حیران و ششدر تھا۔ اسے تو لگتا تھا کہ اب وہ جیون بھر کے لئے کھاٹ کا ہو کر رہ جائے گا مگر اس نے اِس بات کا ذکر نہ ہی دینو کا کا اور نہ ہی جیوتی سے کیا کیوں کہ اس کے من میں تو کچھ اور ہی پل رہا تھا۔

چند ہی ہفتوں میں اس کے دونوں پاؤں کی تمام انگلیاں حرکت کرنے لگی تھیں۔ اب وہ اپنے دونوں پاؤں ہلا جلا سکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی ٹانگوں میں جیسے جان سی پڑ رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی دلی کیفیت کو چھپا رہا تھا۔ اب وہ جیوتی سے بھی بدظن نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی اُسے کوسنے دیتا تھا۔ بس خاموش خاموش سا کھاٹ پر پڑا نیلے آکاش کو تکتا اور کسی گہری

سوچ میں ڈوبا دکھائی دیتا تھا۔

دیپو سوچ رہا تھا کہ ایک دن جب وہ بالکل بھلا چنگا ہو کر چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا تو جیوتی کا پیچھا کر کے اسے رنگے ہاتھوں پکڑے گا اور اس چھنال کو جو ساری ساری رات گھر سے باہر رہ کر اپنے تن کی آگ بجھاتی تھی، ساری پنچایت کے سامنے ننگا کرے گا کیوں کہ اس نے ان کے خاندان اور اس کی سورگ باشی ماں کی نیک نامی پر کلنک لگا دیا تھا۔

دیپو اپنے مشن کی تکمیل کے بارے میں دن رات سوچتا رہتا تھا۔ جیوتی کو اب اس کی اس قدر گھمبیر خاموشی سے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔

''کیا بات ہے دیپو نہ اب برا بھلا کہتا ہے نہ ہی کوئی بات کرتا ہے۔ جو بھی کھانے کو دو خاموشی سے کھا لیتا ہے وگرنہ پہلے تو وہ غصے میں آ کر اکثر کھانے سمیت ہی برتن آنگن میں پھینک دیا کرتا تھا'' جیوتی دن رات انہی سوچوں میں ڈوبی ہوتی تھی مگر سوچ کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

جیوتی کو گھر سے باہر جاتے ہوئے آج چالیسواں روز تھا۔ اب دیپو کی ٹانگوں میں اتنی توانائی آ چکی تھی کہ وہ اس کا پیچھا کر سکتا تھا۔

آج شام ڈھلے جیسے ہی جیوتی نے گھر کی چوکھٹ پار کی، دیپو بھی آہستہ آہستہ قدموں سے قدرے فاصلے پر رہ کر اس کا پیچھا کرنے لگا۔ آج وہ بہت خوش تھا کہ جیوتی جیسی بدکار عورت کی پارسائی کا پردہ چاک کرنے جا رہا تھا۔

گھر سے کافی دُور بہنے والی ندی کے گھاٹ پر جا کر جیوتی رک گئی اور ندی کنارے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک وہ وہاں بیٹھی رہی۔ پھر ہاتھ اٹھا کر پرارتھنا کرتے ہوئے اس پر رقت سی طاری ہو گئی اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی مگر دیپو کو اتنے فاصلے پر ٹھیک سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

چندرما کی چٹکی ہوئی چاندنی میں ندی کنارے بیٹھی ہوئی جیوتی کوئی اپسرا معلوم ہو رہی تھی۔ جسے دیکھ کر ایک مدت کے بعد دیپو کا دل بھی پگھلنے لگا مگر جلد ہی اس نے خود پر طاری ہونے والی مدہوشی پر قابو پا لیا۔

پرارتھنا ختم کرنے کے بعد جیوتی نے ندی کے پانی سے منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔ پھر جیسے ہی وہ اٹھ کر واپس جانے کے لئے پلٹی تو اپنے پیچھے کھڑے دیپو کو دیکھ کر خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

''دیپو، تم یہاں؟ تم یہاں کیسے آئے؟ تم اچھے ہو گئے ہو؟ تم چل سکتے ہو؟'' یہ کہتے کہتے وہ تقریباً بے ہوش سی ہو کر دیپو کے بازوؤں میں جھول گئی۔

دیپو نے ندی سے پانی لے کر جیوتی کے منہ پر چند چھینٹے مارے جس سے جیوتی ہوش میں آ گئی۔

''مجھے کسی گیانی نے چالیس راتیں ندی کے گھاٹ پر چلہ کرنے کے لئے کہا تھا جس کا تمھیں پتا نہیں چلنا چاہیے تھا۔ میں ہر رات یہاں اسی لئے آیا کرتی تھی۔'' جیوتی نے جیسے اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہی۔

''بس چپ ہو جاؤ، جیوتی!.....تو اس ویرانے میں چالیس راتوں سے میرے لئے آ رہی تھی اور میں تم سے اس قدر بدگمان تھا.....دھتکار ہے مجھ پر.....دھتکار ہے!''

جیوتی کے آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے۔ دیپو نے روتی ہوئی جیوتی کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔''تم نے یہ سب مجھ سے کیوں چھپایا؟ چھنال کہیں کی!''

دیپو کی بات سن کر جیوتی شرم سے لال ہو کر بیر بہوٹی بن گئی۔

دور گھاٹ پر رات کے سناٹے میں کسی منچلے کے گانے کی آواز آ رہی تھی:

کِھلے شگوفے پیڑوں پر ، رُت پیا مِلن کی آئی
من ہی من دیکھ کے اُس کو، گوری ہے شرمائی

کچھ غم تو اندھیرے کا جھونکوں پہ کھلا ہوتا
اے کاش ہواؤں کے ہاتھوں میں دیا ہوتا

(رضیہ اسماعیل)

مکئی کا دانہ

لُک چھپ جانا
مکئی دادانہ
راجے دی بیٹی
آئی جے.....لُک چھپ جانا.....

نمبردار ملک عزیز کی وسیع وعریض پختہ حویلی کی عقبی دیوار سے متصل کھیل کے میدان میں حسبِ معمول ہر روز کی طرح آج بھی بچوں کے کھیل کود اور شور وغل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں مگر آج ان آوازوں میں شوخی، شرارت، جوش اور جذبے کے رنگ قدرے پھیکے پھیکے سے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے رنگین لہریئے دوپٹے کو تیز دھوپ میں کافی دیر تک سکھانے سے اس کے رنگ پھیکے پڑ گئے ہوں۔

ادھر نمبردار کی حویلی میں آمدورفت معمول سے کچھ زیادہ تھی۔ حویلی کا بڑا پھاٹک کھول دیا گیا تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے ،مرد، عورتیں اور بچے حویلی کے صحن اور برآمدے میں جمع ہو رہے تھے۔

سب سے بڑے کمرے کے بیچوں بیچ رکھی رنگین پائیوں والی چارپائی پر نمبردار کا اکلوتا وارث شیر خوار ملک سلطان بے سدھ پڑا ہوا تھا۔

نمبردار اور نمبردارنی کے چہروں کے رنگ کسی آنے والے طوفان کے خوف سے اُڑے ہوئے تھے۔

نمبردار کے کچھ قریبی عزیز بھی حویلی میں پہنچ چکے تھے اور ننھے ملک سلطان کی چارپائی کے اردگرد کھڑے بہت پریشانی اور اضطراب میں ہاتھ مل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا وقت ان کے ہاتھوں سے سرکتا جا رہا تھا، ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

نمبردار شدید ہیجانی کیفیت میں کبھی کمرے میں چکر لگاتا تو کبھی باہر برآمدے میں آ کر وہاں رکھی ہوئی کرسیوں پر تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاتا۔ پھر فوراً ہی اٹھ کر کمرے کے اندر چلا جاتا اور اپنے اکلوتے وارث کی چارپائی کے اردگرد یوں چکر لگانے لگتا جیسے شہنشاہ بابر اپنے عزیز از جان بیٹے ہمایوں کی بیماری اپنے سر لینے کی دعائیں کر رہا ہو۔

''اوئے، کہاں مر گیا ہے کمپونڈر.....؟ آج کیا وہ گاؤں میں نہیں ہے؟ دیکھو یہیں کہیں ساتھ والے گاؤں میں گیا ہوگا، پکڑ

کے لاؤ اسے!'' نمبردار کی غصے اور پریشانی میں گندھی ہوئی رُعب دار آواز گونجی۔

''جی مالک، بندے اسے ڈھونڈنے کے لئے گئے ہیں۔ بس ابھی آتے ہوں گے۔'' منشی کریم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''پتا نہیں بندے کب کمپونڈر کو لے کر آئیں، منشی تم ایسا کرو کہ گھوڑی تیار کروا کے کسی بندے کو شہر بھیجو تا کہ وہ وہاں کے بڑے ہسپتال سے ڈاکٹر عباس کو ساتھ لے کر گاؤں آئے۔'' نمبردار نے منشی کو حکم سے زیادہ ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

آج نمبردار کو رہ رہ کر اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے گاؤں میں ہسپتال کیوں نہ بننے دیا؟ طفیل جولاہے کا بیٹا عباس جو اس نے بچپن میں شہر میں اپنے کسی امیر بے اولاد رشتے دار کو دے دیا تھا، اب پڑھ لکھ کر بڑا قابل ڈاکٹر بن گیا تھا۔ وہ گاؤں میں ہسپتال کھولنا چاہتا تھا مگر نمبردار نے اس کی ایک نہ چلنے دی اور الٹی سلٹی دلیلیں دے کر اسے گاؤں سے چلتا کر دیا۔

نمبردارنی نے ملک عزیز کو گاؤں میں ہسپتال کھولنے کے لئے جب قائل کرنا چاہا تو ملک عزیز کا غرور و تکبر میں ڈوبا ہوا جواب سن کر وہ خاموش ہو گئی۔

''اب کمی کمین ہمارے سر پر چڑھ کر بیٹھیں گے۔ یہ لوگ پاؤں کی جوتی کی نوک پر رکھے جانے کے لائق ہی ہوتے ہیں۔ انھیں زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہیے۔ ڈاکٹر بن گیا ہے تو کیا ہوا، ہے تو جولاہے کا بیٹا ہی ناں۔''

ملک عزیز نے بڑی نخوت سے رنگین پیچواں حقے کی نَے پرے پھینکتے ہوئے کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ طفیل جولاہے اور اس کے ڈاکٹر بیٹے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھا کر گاؤں سے باہر پھینک رہا ہو۔

نمبردار کا رویہ دیکھ کر اس لمحے یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی، زمانہ اور کائنات سب اسی کی دسترس میں ہوں اور باقی ہر شخص اس کی نظر میں مردہ، بے وقعت اور بے توقیر ہو، جس کے وجود کے اجزائے ترکیبی فضا میں تحلیل ہو کر زمان و مکان کی حدود و قیود سے باہر نکل چکے ہوں۔

آج ملک عزیز کی جان شکنجے میں پھنسی ہوئی تھی اور اسے طفیل جولاہے کا ڈاکٹر پتر یاد آ رہا تھا جسے کسی وقت اس نے بڑی رعونت سے کمی کمین کا بیٹا کہہ کر دھتکار دیا تھا۔

بے سدھ پڑے ہوئے ننھے ملک سلطان کی عمر رسیدہ دادی اپنے نحیف و نزار وجود کے ساتھ لاٹھی ٹیکتی ہوئی ملازموں کے سہارے چارپائی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

اس کی جلتی بجھتی آنکھوں میں حویلی کے اکلوتے وارث کی زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ بجھتے ہوئے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس نے آتے ہی ملازموں کو ننھے سلطان کے ہاتھ پاؤں کی مالش کرنے کے لئے کہا اور خود آہستہ آہستہ اس کا سینہ سہلانے لگی۔

''گھر میں اگر کوئی تیز خوشبو ہے تو اسے جلدی سے لے کر آؤ!''

اس نے جیسے ہی کہا، نمبردار نی جو کافی دیر سے سکتے کی سی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی، فوراً اٹھ کر چنبیلی اور تارے میرے کی بوتلیں اٹھا کر لے آئی۔

بڑی ملکانی نے انگلیوں کے پوروں پر تھوڑا سا تیل لگا کر دم کیا اور ننھے سلطان کی ناک کے قریب لگا دیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس کے ماتھے اور سینے پر مالش کرنے لگی۔ لیکن ننھا ملک سلطان ہوش کی دنیا سے بہت دور تھا۔

بے سُدھ پڑے ہوئے ننھے ملک سلطان کو دیکھ کر بڑی ملکانی کی جہاں دیدہ آنکھوں میں مایوسی کے سایوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں حویلی کے صحن میں شور سا مچ گیا۔ ''کمپونڈر آ گیا، کمپونڈر آ گیا۔'' ملی جلی آوازیں سن کر نمبردار کی جان میں جان آئی اور وہ بے قراری سے بھاگ کر صحن میں کمپونڈر کو خود لینے چلا گیا۔

''ملک صاحب! بچہ ٹھیک ہے۔ جلدی ہوش میں آ جائے گا۔'' کمپونڈر نے بچے کا تھوڑی دیر تک معائنہ کرنے کے بعد کہا، ''آپ ایسا کریں کہ بچے کو ذرا گرمی پہنچائیں تو گرمائش سے وہ ہوش میں آ جائے گا۔''

نمبردار کمپونڈر کی بات ہونقوں کی طرح سن رہا تھا مگر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس نے نوکروں کو رضائی، کمبل، گرم پانی کی بوتلیں اور انگیٹھیاں لانے کا حکم دے دیا۔

کمرہ جون جولائی کی سخت گرمی میں انگیٹھیاں جلانے سے تندور بن چکا تھا۔ ہر کوئی پسینے میں شرابور کمرے سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہانپتا ہوا نکل کر برآمدے میں آ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگتا تھا۔

لُک چھپ جانا
مکئی دادانہ
راجے دی بیٹی
آئی جے.....لُک چھپ جانا.....

کھیل کے میدان سے بچوں کے ''لُکن میٹی'' کھیلنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

اس کھیل کے میدان کے عین وسط میں بوہڑ کا بہت پرانا درخت تھا جس کی شاخیں اس قدر گھنی تھیں کہ دن کے وقت سورج کی روشنی بھی ان میں سے گزر کر بمشکل ہی زمین تک پہنچ پاتی تھی۔ اس لئے وہاں دن کے وقت بھی ہلکا سا اندھیرا ہی رہتا تھا جو اس جگہ کو قدرے پُراسرار سا بنائے رکھتا تھا۔

بوہڑ کے درخت کی شاخیں اس قدر پھیل چکی تھیں کہ انھوں نے تقریباً کھیل کے سارے میدان کے اوپر ایک چھتری سی تان رکھی تھی۔ کئی جگہ تو یہ شاخیں اتنی نیچی ہو چکی تھیں کہ زمین کو چوم رہی تھیں۔ بچے اکثر ان شاخوں کے ساتھ جھولا جھولتے رہتے تھے۔

یہ قطعۂ زمین بھی نمبردار کی ہی ملکیت تھا جو اس نے اپنے مال مویشی باندھنے اور ان کے راکھے کی رہائش کی غرض سے حویلی کی تعمیر کرتے وقت الگ چھوڑ دیا تھا۔ اس میدان کے ایک طرف حویلی کی اونچی دیوار تھی اور باقی دونوں اطراف میں کچی پکی کوٹھریاں تھیں جن میں سے ایک کوٹھری تو راکھے کی تھی جب کہ سامنے کی چار کوٹھریاں مویشیوں کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔

ان کوٹھریوں کی بیرونی دیوار قبرستان کی طرف تھی۔ کھیل کا یہ میدان بس ایک سمت سے ہی کھلا ہوا تھا۔

بوہڑ کے بوڑھے درخت نے اس قدر ہاتھ پاؤں پھیلا لیے تھے کہ اس کی گھنی شاخیں نمبردار کی حویلی کی اونچی دیوار پھاند کر اس کے صحن تک جا پہنچی تھیں جس سے اس کے ایک حصے میں اندھیرا سا ہونے لگتا تھا جو نمبردار کو سخت ناپسند تھا۔ اس لئے وقتاً فوقتاً وہ صحن پر جھکی ہوئی شاخوں کو کٹوا دیا کرتا تھا۔

آج صبح ہی نمبردار نے بوہڑ کی بہت سی شاخیں کٹوا دی تھیں۔ نمبردار نی قدرے وہمی طبیعت کی مالک تھی۔ بوہڑ کی سرسبز شاخوں کو کٹا ہوا دیکھ کر پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ ہرے بھرے درختوں کو کاٹنے سے نحوست پھیلتی ہے۔

بوہڑ کے درخت کی شاخوں کے ساتھ ساتھ اس کی جڑیں بھی بہت دور تک پھیل چکی تھیں۔ تقریباً کھیل کے آدھے میدان پر تو بوہڑ کی جڑوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ ایک روز یہ جڑیں بڑھتے بڑھتے ملحقہ قبرستان تک پہنچ کر قبروں میں سوئے ہوئے مُردوں کو بھی پریشان کر دیں گی اور روزِ محشر جب مُردے اپنی اپنی قبروں سے نکلیں گے تو اکاس بیل کی طرح ان کے بدن سے لپٹی ہوئی یہ جڑیں بھی قبروں سے باہر آ جائیں گی۔

کھیل کے میدان کی کھلی جانب کچے پکے مکانوں کی ایک قطار تھی۔ اس سے ذرا آگے ایک مسجد تھی جس کے احاطے میں بھی ایک بہت پرانا بوہڑ کا درخت تھا جس کی شاخوں نے احاطے کے علاوہ مسجد کے صحن کے بڑے حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر نمبردار کے برعکس مسجد کے صحن میں پھیلی ہوئی شاخوں کو کبھی کسی نے نہیں کٹوایا تھا۔

مسجد کے بیرونی صحن کے تین اطراف ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ کہیں کہیں تو اس کا پاٹ اتنا چوڑا ہو جاتا تھا کہ ایک چھوٹے سے دریا کا گمان ہوتا تھا۔ تالاب کے اس پار سرسبز کھیتوں کا دور تک پھیلا ہوا سلسلہ تھا۔ برسات کے موسم میں تالاب کا پانی کنارے پھلانگ کر اکثر قریبی گھروں میں گھس جایا کرتا تھا مگر گاؤں والے اسے ایک معمول کی بات سمجھ کر پریشان نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ برسات کا موسم آتے ہی گھروں کے سامنے ریت کی بوریوں کی دیوار سی بنا دیا کرتے تھے جن سے پانی کو زیادہ کُھل کھیلنے کا موقع نہ ملتا۔

تالاب کا تھوڑا سا حصہ کھیل کے میدان کے قریب تھا۔ بچے جب لُکن میٹی، گلی ڈنڈا، شٹاپو، کوکلا چھپاکی، پٹھو گرم اور گولیاں کھیلنے سے اکتا جاتے تو زیادہ تر لڑکے تالاب کے اس حصے میں اگے ہوئے کنول کے پھول توڑنے کی کوشش کرتے اور اس کوشش میں کئی مرتبہ وہ پانی میں بھی گر جاتے تھے مگر خوش قسمتی سے تالاب کے اس حصے میں پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔

گرمیوں کی جھلستی ہوئی دوپہر میں اس میدان میں بچوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا کیوں کہ یہاں سورج کی شعاعیں زمین تک نہ

پہنچنے کے باعث کافی خنکی رہتی تھی۔ برسات کے موسم میں بھی یہ جگہ بچوں کے دم سے آباد رہتی تھی۔ کتنے ہی زور کی بارش ہوتی لیکن صرف چند بوندیں ہی درخت کی گھنی شاخوں سے لڑلڑا کر زمین تک پہنچ پاتی تھیں۔

گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں کبھی کبھار نمبردار کی اکلوتی بیٹی چندا اپنے شیر خوار بھائی ملک سلطان کو لے کر وہاں آجایا کرتی تھی۔ان دونوں کے ساتھ رنگین پیڑھی اٹھائے ہوئے نمبردارنی کی خاص ملازمہ چھیمو بھی ہوا کرتی تھی۔

ملک سلطان بڑی منتوں مرادوں، تعویذ گنڈوں اور دوادارو کے بعد نمبردار کی پہلوٹی کی بیٹی چندا کے چودہ برس بعد پیدا ہوا تھا۔

نمبردار عمر رسیدہ تھا۔کئی مربع زرعی زمین کا مالک تھا۔ جائیداد کے وارث کی شدید خواہش برسوں بعد پوری ہوئی تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔گاؤں میں کئی روز تک جشن کا سماں رہا۔غریب غربا کو کھانا کھلانے کے علاوہ نمبردارنی نے دل کھول کر صدقہ خیرات کیا۔

مسجد کے مولوی صاحب نے بطور خاص ملک سلطان کی حفاظت کے لئے تعویذ لکھ کر دیا جو ہر وقت اس کے گلے میں پڑا رہتا تھا۔

نمبردارنی بہت سی ملازمائیں ہونے کے باوجود روزانہ خود ملک سلطان کے بدن کی مالش کرتی، اسے نہلاتی، بدن پر پوڈر چھڑکتی، بالوں میں خوشبودار تیل لگاتی، بڑے پیار سے بال بنا کر آنکھوں میں سرمے کی سلائیاں پھیرتی اور نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کے لئے بچے کو کالا ٹیکہ لگانا کبھی نہ بھولتی تھی۔

مولوی صاحب کا دیا ہوا تعویذ ہر وقت بچے کے گلے میں پڑا رہتا مگر نہلاتے وقت نمبردارنی تعویذ کو اتار کر، چوم کر قدرے اونچی جگہ پر رکھ دیا کرتی تھی تاکہ اللہ کے کلام کی بے ادبی نہ ہو۔

ڈیڑھ دو سال کا گول مٹول، سرخ و سپید رنگت والا ملک سلطان اس قدر خوب صورت تھا کہ ہر دیکھنے والا کا دل اس کی بلائیں لینے کو چاہتا تھا۔

چندا جب کبھی بھی چھوٹے ملک کے ساتھ کھیل کے میدان میں آتی تو نمبردارنی اس کے پاس دوسرے بچوں کے لئے کبھی کھٹی میٹھی گولیاں، کبھی ریوڑیاں، کبھی مرونڈا تو کبھی باداموں والا گڑ بھیج دیا کرتی تھی جو چندا سب بچوں میں بانٹ دیا کرتی تھی۔اس لئے بچے نمبردار کی بیٹی کا کھیل کے میدان میں بہت بے تابی سے انتظار کرتے رہتے تھے اور جس دن چندا آجاتی، اس دن گویا ان سب کی عید ہو جایا کرتی تھی۔

آج جب چندا کھیلنے کے لئے آئی تو خلافِ معمول ملازمہ اس کے ہمراہ نہیں تھی اور نہ ہی کوئی میٹھی چیز اپنے ساتھ لائی تھی۔ آج نمبردارنی نے اسے زمینوں سے آئی ہوئی تازہ مکئی شیدو ماچھن سے بھنوا کر ساتھ کر دی تھی۔

کھٹی میٹھی گولیوں، ریوڑیوں، گُڑ اور مرونڈے کا بے چینی سے انتظار کرتے ہوئے بچوں کو مکئی کے دانے دیکھ کر قدرے

مایوسی تو ہوئی مگر وہ جلد ہی میٹھے کو بھول کر مکئی کے دانوں پر پل پڑے۔

آج نمبردارنی ملک سلطان کو کالا ٹیکہ لگانا بھی بھول گئی تھی۔

ویسے تو بوہڑ کے درخت کی گھنی چھاؤں میں بہت سے پرندے ہر وقت چہچہاتے رہتے تھے اور کئی پرندوں نے تو کافی اونچائی پر گھونسلے بھی بنا رکھے تھے مگر آج نہ جانے کیوں پرندے کچھ خاموش سے تھے۔

الوؤں کا ایک جوڑا کہیں سے آ کر بوہڑ کی شاخوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان الوؤں کو دیکھ کر بچوں میں ایک نیا جوش و ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ شوقِ تجسس میں وہ سب الوؤں کے پیچھے پڑ گئے۔ الوؤں کا جوڑا جہاں بھی جا کر بیٹھتا، سب بچے انھیں چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر مارتے اور شی شی کر کے انھیں وہاں سے بھگا دیتے۔ یوں دونوں پریشان حال الوشاخ شاخ پر چکر لگا رہے تھے۔ لگتا تھا انھیں درخت کی گھنی شاخوں میں سے نکلنے کا راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا وگرنہ اتنے شور شرابے سے تو وہ ضرور وہاں سے اُڑ کر چلے جاتے۔

''نہ تنگ کرو انھیں، بیٹھے رہنے دو!'' نمبردار کی بیٹی چندا کی آواز گونجی مگر بچوں نے سنی اَن سنی کر دی۔

''ناں جی! ان کو یہاں سے اُڑا دو۔ میری اماں کہتی ہے الو منحوس ہوتے ہیں۔ یہ جس جگہ بیٹھ جائیں وہاں نحوست پھیلا دیتے ہیں۔'' ایک دوسری لڑکی نے گویا وارننگ دے ڈالی۔

نحوست اور منحوس کے الفاظ سن کر تو سارے ہی بچے الوؤں کو وہاں سے بھگانے کے مشن پر لگ گئے۔ پریشان حال الو شاخوں میں چھپتے پھرتے تھے۔ ہر بچہ اوپر منہ اٹھا کر درختوں کی گھنی شاخوں میں الوؤں کو ہی تلاش کر رہا تھا۔

اس شور شرابے سے پریشان ہو کر ملک سلطان نے بُری طرح رونا شروع کر دیا تو چندا نے اسے مکئی کے چند دانے دے کر بہلانا چاہا مگر وہ بدستور روتا رہا۔

پھر اچانک روتے روتے ملک سلطان کی سانس اکھڑنے لگی۔ اُسے سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی جس پر چندا نے چیخنا چلانا شروع دیا۔ سب بچے الوؤں کو چھوڑ کر چندا اور ملک سلطان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ ملک سلطان کے چہرے کی رنگت لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

بچے کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر کچھ بچے حویلی کی طرف بھاگے۔ تھوڑی ہی دیر میں حویلی کے سب ملازم، نمبردار اور نمبردارنی بدحواسی کے عالم میں کھیل کے میدان میں جمع ہو چکے تھے۔ حیران و پریشان نمبردار بچے کو بازوؤں میں اٹھائے حویلی میں واپس لے آیا اور چارپائی پر لٹا دیا۔

شیر خوار ملک سلطان ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ دوپہر سے سہ پہر ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ملک سلطان کے چہرے کی سرخ و سپید رنگت نیلاہٹ کے بعد اب زردی مائل ہو چکی تھی۔

شہر سے طفیل جولاہے کا پتر ڈاکٹر عباس ابھی تک گاؤں نہیں پہنچا تھا، نہ ہی کمپونڈر رکا کچھ پتا تھا کہ وہ کہاں گیا؟

''اوئے کمپونڈر کو ہی ڈھونڈ کر لے آؤ، وہ حرام کا جنا اب کہاں غائب ہو گیا ہے؟''

نمبردار کی غصے اور بے بسی میں بھری ہوئی آواز جیسے ہی گونجی، ملازموں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا مگر کافی تلاش کے بعد بھی کمپونڈر کا کوئی پتا نہ چلا۔

''وہ انھیں کہاں ملے گا، وہ تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔'' کسی نے دبی دبی آواز میں کہا۔''ہاں، نہر والی سڑک پر جاتے ہوئے تو میں نے بھی اسے دیکھا ہے۔'' ایک دوسری آواز نے گویا کمپونڈر کے ملک سلطان کے علاج میں ناکامی اور نمبردار کے غیظ و غضب سے بچنے کے لئے گاؤں سے بھاگنے کی تصدیق کر دی۔

حویلی کے صحن میں پھر شور سا مچ گیا۔

''شہر سے بڑا ڈاکٹر آ گیا ہے۔ آ گیا ہے ڈاکٹر۔

اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اللہ ملک سلطان کو حیاتی دے۔

نمبردار کے وارث کی خیر ہو،

ستے خیراں ہون ملک سلطان دیاں۔''

ملی جلی آوازوں کی بھنبھناہٹ میں اپنی گاڑی سے اتر کر ڈاکٹر عباس تیزی سے کمرے کی طرف لپکا۔ حویلی کے صحن میں موجود سب ہی لوگ تقریباً بھاگتے ہوئے ڈاکٹر کے پیچھے کمرے میں جمع ہو گئے۔

ڈاکٹر عباس نے نہایت عجلت میں شیر خوار ملک سلطان کا ڈاکٹری معائنہ شروع کر دیا۔ اس کی نبضیں ٹٹولیں۔ اسٹھیتھوسکوپ لگا کر دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ آنکھیں الٹ پلٹ کر دیکھیں، ناک اور منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس کی آمد و رفت محسوس کرنے کی کوشش کی۔

''ڈاکٹر عباس! بچے کو ذرا ہلا جلا کر تو دیکھو'' یہ کہتے ہوئے نمبردار نے جلدی سے شیر خوار ملک سلطان کو چارپائی سے اٹھا کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

ڈاکٹر عباس نے بچے کو دونوں پاؤں سے پکڑ کر الٹا کر کے جیسے ہی اس کی کمر پر دو چار ہلکے ہلکے ٹھوکے دیئے تو مکئی کا ایک دانہ ننھے ملک سلطان کے منہ سے نکل کر زمین پر آن گرا.....

وہی مکئی کا دانہ جو آج صبح چندانے الوؤں کے شور شرابے کے ڈر سے روتے ہوئے ملک سلطان کو چپ کرانے کے لئے دیا تھا، ملک سلطان کے گلے میں پھنس گیا تھا۔

''نمبردار صاحب! مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ملک سلطان تو..... آج صبح ہی..... مکئی کے دانے..... کی وجہ سے..... دم گھٹنے سے..... فوت ہو گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے رکتے رکتے کہا۔

ڈاکٹر عباس کی افسردہ آواز جیسے ہی کمرے میں گونجی، وہاں کہرام مچ گیا۔

نمبردارنی غش کھا کر گر پڑی تھی۔

بوڑھی دادی زمین پر بیٹھ کر نیم بے ہوشی کی حالت میں بین کرنے لگی۔

''ہائے سلطان تو میرا کفن چھین کر لے گیا ہے.....جانے کی باری تو میری تھی، تجھے کس بات کی جلدی تھی؟.....سب برباد ہو گیا.....سب ختم ہو گیا۔''

نمبردار کی بیٹی چندا سر پیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

آج ایک مکئی کے دانے نے راجے کی بیٹی کو لکھ سے کھ کر دیا تھا۔

ننھا ملک سلطان بوہڑ کی کٹی ہوئی شاخ کی طرح نمبردار کے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔

آج نمبردار ملک عزیز کی دسترس میں نہ حیات رہی.....نہ زمانہ رہا.....اور نہ ہی کائنات۔

ایک حقیر سے مکئی کے دانے نے اسے بے نام ونشان کر دیا تھا۔

مل جاتے ہیں غم لیکن غم خوار نہیں ملتے
بکتی ہوں جہاں خوشیاں بازار نہیں ملتے
غم گھر کی منڈیروں پر آرام سے بیٹھا ہے
جانے کے ابھی اس کے آثار نہیں ملتے

(رضیہ اسماعیل)

دیوارِ گریہ

مجھے بچپن سے ہی اندھیرے اور تنہائی سے بہت وحشت ہوا کرتی تھی۔ پتہ نہیں میرے تحت الشعور میں کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا عدم تحفظ کا یہ کون سا احساس تھا جس کی گرفت سے میں زندگی بھر آزاد نہ ہو سکی۔

''کیا یہ کسی گذرے ہوئے کل کی تلخ یاد تھی یا پھر آنے والے کل کا نوحہ؟'' میں اکثر سوال کرتی مگر جواب ندارد۔ شاید ابھی سوال کرنے کا وقت ہی نہیں آیا تھا اسی لیے تو وقت کی زنبیل سے کبھی کوئی جواب برآمد نہ ہوا۔

میں اماں بابا کی پہلوٹی کی اولاد تھی۔ بنانے والے نے رنگ روپ بڑی فیاضی سے دیا تھا اس لیے جو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کچھ لوگ تو دبے دبے لفظوں میں آنے والے کل کے اندیشوں کا اظہار بھی کر دیا کرتے تھے۔

''بہت زیادہ رنگ روپ بھی بدنصیبی لے کر آتا ہے۔'' پڑوس کی بوا **نصیبن** سے میں بچپن سے ہی یہ بات سنتی آ رہی تھی۔

''شہزادیوں جیسے رنگ روپ پر کہیں قسمت فقیروں جیسی نہ نکل آئے۔'' مستقبل کے اندیشوں سے خوفزدہ ہو کر اماں جب بھی کہتیں تو میں ان کی بات نظر انداز کر کے کسی ان دیکھے شہزادے کے تصور میں آنکھیں موند لیا کرتی تھی۔

پھر ایک دن شہزادہ آ ہی گیا۔

میں گھر کے آنگن میں اُگے بڑے سے چیری بلاسم کے درخت کے ساتھ ادھ کھلی آنکھوں سے برسات کی ہلکی ہلکی پھوار میں بیٹھی جھولا جھول رہی تھی کہ میرے روپ کی کٹاری سیدھی شہزادے کے دل میں جا کر لگی۔

نہ جانے وہ کب سے دروازے کے پاس خاموش کھڑا بڑی محویت سے مجھے دیکھ رہا تھا لیکن میں دنیا و مافیا سے بے خبر ساون کے گیت گانے میں مگن تھی۔

اس کے اچانک چھینکنے کی آواز نے میرے انہماک کو توڑ دیا تو میں ایک اجنبی شخص کو اپنے اس قدر قریب پا کر سٹپٹا سی گئی

''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے بڑی درشتگی سے اس سے سوال کیا تو وہ کچھ نروس سا ہو گیا۔

''میں..... میں..... جی میں اشعر ہوں'' اس نے گویا منمناتے ہوئے کہا۔

''کون اشعر؟ میں نے تو تمہیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟''

میرے تفتیشی انداز میں سوال کرنے پر وہ قدرے شوخی پر اتر آیا۔

''اگر آپ نے مجھے اس سے پہلے نہیں دیکھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔''

''یہ کس قسم کا جواب ہے۔'' میں مزید چڑ گئی۔

''کس سے ملنا ہے تمہیں اور تم یوں گھر کے اندر کس خوشی میں گھسے چلے آ رہے ہو۔ دروازے کس لیے ہوتے ہیں؟ اسی لیے نا کہ انہیں کھٹکھٹا کر گھر والوں کو اپنے آنے کی اطلاع کرو۔'' میں نے ایک دم ہی اسے نشانے پر رکھ لیا اور دونالی بندوق سے ایک ساتھ ہی کئی فائر کر دیئے۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ لیکن اگر گھر والے دروازے کھلے چھوڑ کر صحن میں آنکھیں موند کر جھولے جھولیں گے تو کوئی بھی اندر آ سکتا ہے۔ دروازے حفاظت کے لیے ہوتے ہیں اس لیے انہیں بند رکھنا ضروری ہے۔''

اجنبی نے زبردست جوابی فائر کر دیا تو میں کھسیانی سی ہوگئی۔

''شاید میں بے دھیانی میں دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔'' میں نے خود سے ہی وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے.....ٹھیک ہے۔ زیادہ بقراط بننے کی ضرورنہیں ہے۔ سیدھے سیدھے مطلب کی بات پر آؤ۔ کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''میں لاہور والی آپا کا سب سے چھوٹا بیٹا اشعر ہوں۔ اس نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''پہلی مرتبہ آپ کے شہر میں آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بڑا خوبصورت شہر ہے اور شہر والے تو.....''

دروازے پر بڑے بھیا کی آواز سن کر وہ کچھ مزید کہتے کہتے رک گیا۔

بڑے عجیب ہیں یہ اشعر میاں اور اس سے زیادہ عجیب وغریب ان کے دیکھنے کا انداز ہے۔ میں بڑبڑاتی ہوئی صحن سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

یہ اشعر سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اشعر میرے تایا ابو کی بڑی بیٹی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔

لیکن مجھے اِس سے پہلے اُس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ گو اس کی چرب زبانی کے قصے میں نے سن رکھے تھے۔

وہ صرف چند روز ہی ہمارے ہاں ٹھہرا۔ ان چند دنوں میں کوئی خاص بات چیت بھی ہمارے درمیان نہ ہوئی لیکن گھر میں چلتے پھرتے مجھے یہی احساس رہتا تھا جیسے دو آنکھیں ہر وقت میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح گھومنا پھرنا مجھے بے حد برا لگ رہا تھا۔

شکر ہے جا رہا ہے میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ برآمدے میں جاتے وقت سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے ناک سکوڑ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اگلے ہی ہفتے وہ پھر آن دھمکا۔ اب کی بار وہ اپنی امی کے ساتھ آیا تھا۔ آپا آتے ہی ابو کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔

''چچا! آپ ہما میری جھولی میں ڈال دیں میرے اشعر کے لیے۔'' آپا نے گڑگڑا کر ابو سے کچھ اس طرح التجا کی کہ ابو بھی

سوچ میں پڑ گئے پھر بولے:

''لیکن ہما ابھی چھوٹی ہے۔شادی بیاہ کی اس کی عمر نہیں ہے۔ بڑی ہوجائے تو دیکھا جائے گا اور اشعر بھی تو ابھی تعلیم حاصل کررہا ہے۔'' ابو نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

''چچا! آپ میرا دل نہ توڑیں۔ مجھے مایوس نہ کریں۔ میں بڑی امیدیں لے کر آئی ہوں۔ میری جھولی میں خیرات ڈال دیں۔''

آپا نے پھر بڑے جذباتی انداز میں اپنا مدعا بیان کیا۔

''اتنی جلدی کس بات کی ہے؟'' ابو نے جواب دیا ''وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔''

''ارے نہیں چچا۔ بھلا ایسے رنگ روپ والی لڑکیاں کب زیادہ دیر تک بیٹھی رہتی ہیں؟ اس سے پہلے کہ ہما پر کسی اور کی نظر پڑ جائے آپ رشتے کے لیے بس ہاں کر دیں۔

فی الحال منگنی کر دیں۔ اشعر کی تعلیم ایک دو سال میں مکمل ہونے والی ہے۔ اس کے برسر روزگار ہوتے ہی شادی کر دیں گے۔'' آپا نے اگلا چند سالہ منصوبہ اس قدر شد و مد سے ابو کے گوش گذار کیا کہ ابو کو ہاں کرتے ہی بنی۔

آپا نے اگلے چند دنوں میں ہی منگنی کی رسم ادا کرنے کی رٹ لگا دی تو ابو ان کی بات ٹال نہ سکے۔

البتہ امی اس قدر جلدی رشتہ کرنے کے حق میں نہیں تھیں اس لیے وہ کافی خائف نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے دبی دبی زبان میں ابو سے کہا بھی کہ اتنی لمبی منگنی ٹھیک نہیں ہوتی۔ کل کلاں کو اگر کوئی بات ہوگئی تو خوامخواہ ہی بچی کے نام کے ساتھ دم چھلا لگ جائے گا۔ قصور چاہے لڑکے والوں کا ہی ہو مگر منگنی ٹوٹنے کا سارا ملبہ لڑکی پر ہی آ کر گرتا ہے۔''

امی نے ابو کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔

آپا منگنی کی انگوٹھی پہنا کر ہی لاہور واپس گئیں اور جاتے جاتے اگلے مہینے دھوم دھام سے منگنی کی رسم ادا کرنے کے لیے اپنے ہاں ہم سب کو مدعو کر گئیں۔

میں اس سارے معاملے سے لاتعلق سی بنی یوں پھر رہی تھی جیسے میرا نہیں کسی اور کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔

دراصل اشعر سے اچانک ملاقات کو میں ابھی ٹھیک سے اپنے اندر جذب بھی نہیں کر پائی تھی کہ آناً فاناً منگنی کی رسم ادا ہوگئی۔ ایک جذباتی سا تعلق جو لڑکیاں اپنے منگیتروں کے ساتھ محسوس کرتی ہیں مجھے وہ خانہ ابھی کچھ خالی خالی سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے شروع میں یہ سب کچھ مجھے ایک خواب سے زیادہ نہیں لگ رہا تھا اس لیے میں نے اُسے کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔ مگر جیسے جیسے دن گزر رہے تھے دل میں اشعر کی خاموش خاموش نگاہوں نے کھلبلی سی مچانی شروع کر دی تھی۔

اگلے مہینے طے شدہ پروگرام کے مطابق منگنی کی رسم ادا کرنے امی ابو اور بھیا خوشی خوشی لاہور چلے گئے۔

ابو کہہ رہے تھے کہ اس دن آپا کی خوشی دیدنی تھی۔ میں نے اس سے زیادہ خوش اسے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی ہر آنے جانے والے کے ساتھ خوش گپیاں کر رہی تھی۔ بات بات پر قہقہے پھوٹے پڑتے تھے۔

نوکر چاکر بھاگ بھاگ کر پنڈال سجا رہے تھے۔ پکوان پک رہے تھے۔ مٹھائیاں طشتریوں میں سجائی جا رہی تھی۔ مشروبات ترتیب سے رکھے جا رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وقت کا مزاج بدل گیا۔ تند و تیز آندھیاں چلنے لگیں۔ زندگی کا بادبان ایک خشک پتے کی طرح لرزنے لگا۔

کسی بات پر ہنستے ہنستے آپا کو ایسا اُچھو لگا کہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ آنکھیں باہر اُبل پڑیں۔ چہرے کی رنگت نیلی پڑ گئی اور ادھ موئی سی آپا زمین پر دھڑام سے ایسی گریں کہ پھر نہ اٹھ سکیں۔

گھر بھر میں جیسے زبردست بھونچال آ گیا ہو ''ڈاکٹر کو بلاؤ..... سینے پر مالش کرو..... پانی پلاؤ..... کمر سہلاؤ..... ہسپتال لے چلو..... گاڑی نکالو..... جلدی سے فون کرو.....''

سبھی گھر والے، نوکر چاکر اور منگنی کی تقریب میں شامل ہونے کے لیے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مہمان ہر طرف سراسیمہ سے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

آپا کی خوشیوں کو نظر بد کھا گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کو روتا بلکتا ہوا چھوڑ کر بہت دور چلی گئیں۔

منگنی کی تقریب ماتم میں بدل گئی۔

سہ پہر تک تقریب میں شرکت کے لیے مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی آہ و بکا کی آوازیں سن کر مہمان پریشان ہو رہے تھے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خوشیوں سے بھرے اس گھر پر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی؟

پنڈال میں سے کرسیاں اٹھا کر سفید چادریں بچھائی جانے لگیں، ہار، پھول، سجاوٹ نوچ نوچ کر پنڈال سے اتار لیے گئے۔ ایسا پنڈال کس نے دیکھا ہوگا جہاں کچھ دیر پہلے تک زندگی قہقہے لگا رہی تھی اور اب ہر سو موت کی زردیاں پھیلی ہوئی تھیں؟

خواب ایک چھناکے سے ٹوٹ چکا تھا۔ اندھیرے اور خوف کا عفریت اپنی باہیں کھولے کھڑا جیسے کہہ رہا تھا۔

بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

آپا کے وعدے وعید اس کے ساتھ ہی منوں مٹی تلے دفن ہو گئے۔ اشعر کے ابو اس رشتے سے پہلے ہی ناخوش تھے اس لیے آپا کے چہلم کے بعد ہی انہوں نے مجھے منحوس قرار دے کر منگنی توڑ دی۔

آپا کی غیر موجودگی میں اشعر کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے۔

آپا کی اچانک موت کے صدمے سے ادھ موا اشعر پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ باپ کی ہٹ دھرمی

کے آگے وہ بھی ہارے ہوئے جواری کی طرح خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے سینے میں اتری ہوئی میرے روپ کی کٹاری نہ جانے کیسے باہر نکل آئی تھی۔

ہر سو اندھیرے پھیل رہے تھے..... تنہائیاں آباد ہو رہی تھیں..... وحشتیں رقص کناں تھی مگر ہر بات سے بے نیاز وقت کا پنچھی اپنے پنکھ پھیلائے اڑتا جا رہا تھا۔

میں اکثر سوچ میں پڑ جاتی تھی کہ نام تو اماں بابا نے میرا ہما رکھا تھا..... خوش بختی کا پرندہ..... کہتے ہیں جس کے سر پر بیٹھ جائے وہ راج کرتا ہے مگر لگتا تھا کہ یہ پرندہ میرے سر پر بیٹھنے کی بجائے میرے گرداگرد چکر لگا کر بس دائیں بائیں سے ہوتا ہوا ہی کھسک گیا تھا اور جاتے جاتے اپنے طاقتور پروں سے میری تقدیر کا چراغ بھی گُل کر گیا تھا۔

''شاید دُکھ کا مجھ سے کچھ زیادہ ہی رشتہ ہے۔ ایک دن ہنستی ہوں تو دس دن رونا پڑ جاتا ہے۔'' میں نے ایک دن آنسو پونچھتے ہوئے اپنی چھوٹی بہن ندا سے کہا۔

''آپا آپ دل چھوٹا نہ کریں، اللہ کی مرضی، شاید اس میں ہی کوئی بہتری ہوگی۔'' ندا نے جیسے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کیا بہتری ہے؟ مجھے منحوس قرار دے دیا گیا ہے حالانکہ ہر ایک کی موت کا وقت اٹل ہے۔ آپا کا اسی طرح جانا لکھا تھا۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح کی باتوں سے لڑکیوں کے ذہنوں میں کیسی نفسیاتی گرہیں پڑ جاتی ہیں جنہیں کھولتے کھولتے ان کی ساری عمر بیت جاتی ہے۔''

میں نے تلخی سے جواب دیا تو ندا بھی خاموش ہو گئی۔

میٹرک کے امتحان کا نتیجہ کافی اچھا آیا تو میں نے کالج جانے کی ضد شروع کر دی۔ اماں بابا دونوں ہی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے حق میں نہیں تھے۔

''کیا لڑکیوں کی زندگی کا مقصد صرف شادی کر کے بچے پیدا کرنا ہی ہے۔'' میں نے ایک دن اماں سے بحث کرتے ہوئے کہا۔

''آج کل کے زمانے میں لڑکیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم بہت ضروری ہے۔ نہ جانے کل زندگی کونسا سوال لے کر سامنے کھڑی ہو جائے؟ ان میں اتنی اہلیت اور خود اعتمادی تو ہونی چاہیے کہ وہ حالات کا مقابلہ کر سکیں۔''

''ضرورت سے زیادہ خود اعتماد لڑکیوں کے گھر مشکل سے ہی بستے ہیں۔''

اماں نے اپنے موقف کے حق میں نہایت بھونڈی دلیل دے کر مجھے کافی برہم کر دیا۔

''اس قسم کی دقیانوسی سوچیں ہی تو لڑکیوں کو لے ڈوبتی ہیں۔ ہمارے ہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت سرے سے ہی غلط کی جاتی ہے۔ لڑکوں کو تو ہم ریس کا گھوڑا بنا کر کھلی چھٹی دے دیتے ہیں جبکہ لڑکیوں کی شخصیت کو مضبوط کرنے اور انہیں بااعتماد بنانے کی بجائے ہم بے جا روک ٹوک سے نہ صرف ان کی عزتِ نفس مجروح کرتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت میں بے یقینی اور بے اعتمادی کی

سلاخیں گاڑ دیتے ہیں جس سے حساس طبیعت اور کومل جذبوں والی لڑکیاں مزید کمزور ہو کر احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں۔''

اماں خاموشی سے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھیں۔ شاید انہیں مجھ سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی یا پھر انہیں لگ رہا تھا کہ انہوں نے مجھے سمجھنے میں غلطی کر دی تھی۔

''اسی لیے تو لڑکیاں اپنی ذات پر انحصار کرنے کی بجائے زندگی بھر سہارے تلاش کرتی رہتی ہیں۔ لڑکیوں کو اپاہج بنا کر ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی بہت شاندار تربیت کر دی ہے ہم نے۔'' میں بے تکان بولے چلی جا رہی تھی۔

میری اس بحث و تمحیص کا کم از کم اتنا اثر ضرور ہوا کہ اماں نے میرے کالج جانے کی مزید مخالفت نہ کی اور ابو بھی کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے۔

بڑی مشکل سے ایک سال ڈیڑھ ہی گزرا ہوگا کہ ایک فارن ریٹرن کا رشتہ آ گیا۔ گھر بھر میں پھر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

''کیا ہوا اگر صاحبزادے عمر میں چودہ پندرہ برس بڑے ہیں۔ تعلیم بھی واجبی سی ہے مگر کینیڈا میں پکے ویزے پر ہیں۔ خاندان بہت شریف ہے۔ بس اس سے زیادہ اچھا رشتہ ہما کے لیے آنے والا نہیں جبکہ ایک منگنی پہلے ہی ٹوٹ چکی ہے۔'' اماں اور ابا ایک روز چپکے چپکے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ..... تعلیم ادھوری رہ گئی.....

فارن ریٹرن رشتہ تھا۔ ایف اے بی اے کی کیا وقعت؟

''صاحبزادے کے بارے میں نہ کوئی تحقیق کہ فارن میں کس کس گھاٹ سے پانی پیتے رہے ہیں؟ بس خاندانی شرافت مسلم تھی۔ وہی رشتے کا معیار ٹھہری۔''

میری تیرہ بختی یہاں بھی جیت گئی۔

کینیڈا آتے ہوئے جہیز اور بری کے دونوں سوٹ کیس ٹورنٹو ایئرپورٹ پر جہاز سے برآمد ہی نہ ہوئے۔ میں رو رو کر پرائے دیس میں ہلکان ہو رہی تھی کہ کتنے چاؤ سے اماں نے کیسے کیسے ملبوسات تیار کروائے تھے۔ یہ سوچ کر کہ وہاں کپڑے سینے سلانے کی سہولت کہاں ہوگی۔

کئی دن انہی تین کپڑوں میں جو پاکستان سے پہن کر آئی تھی گذر گئے۔

زیادہ رونے پر میاں گھرکیاں دینے لگتے۔

''بند کرو یہ رونا دھونا۔ بس قسمت میں نہیں تھے اور بن جائیں گے۔''

''یہ سب کچھ میری ہی قسمت میں کیوں نہیں ہوتا؟'' میں کاتب تقدیر سے سوال کرنے لگتی۔

پرایا دیس..... نہ تہذیب و معاشرت اور زبان سے واقفیت..... نہ کوئی عزیز نہ رشتے دار..... نہ سکھیاں نہ سہیلیاں..... ''یہ اماں نے کہاں کا لے پانی بھیج دیا۔ کیا شادی ایسی ہوتی ہے؟'' میں رہ رہ کر خود سے سوال کرتی تھی۔

رفتہ رفتہ میاں کی طبیعت، عادات واطوار، طشت از بام ہونے لگے۔ ہاتھ چُھٹ اور منہ پَھٹ۔ پینا پلانا تو خیر روز کا ہی معمول تھا۔ شام کو نشے میں دھت جھومتے جھامتے جب گھر لوٹتے تو بلاوجہ ہی روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے اور مجھے یہ سمجھ ہی نہ آتی کہ آخر میرا قصور کیا تھا جو اس طرح کا بہیمانہ سلوک مجھ سے روا رکھا گیا؟

چھ سالوں میں اوپر تلے چار بچے ہو گئے۔ چوتھے بچے کی پیدائش پر میاں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر ہی اپنی بجائے میری نس بندی کروادی کیونکہ اب مزید بچوں کی اسے خواہش نہیں تھی۔

میں سارا دن اکیلی چار بچوں کے ساتھ بولائی بولائی پھرتی رہتی۔ کبھی کوئی بیمار تو کبھی کسی کو چوٹ لگ جاتی اور میاں تو جیسے بچے پیدا کر کے بھول ہی گئے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ بچے میرے کسی گناہ کا نتیجہ ہوں جس کی سزا میں اکیلی بھگت رہی تھی۔

وقت اور حالات نے ادھ موا کر دیا۔ زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ خودکشی مذہب اسلام میں حرام نہ ہوتی تو میں بڑی خوشی سے موت کو گلے لگا لیتی۔

بالآخر نروس بریک ڈاؤن ہو گیا، جو ہونا ہی تھا۔ آخر کب تک کوئی اس قسم کے دباؤ میں زندگی گزار سکتا ہے۔

اسپتال میں ڈاکٹروں، نرسوں اور سوشل ورکروں کے پوچھنے پر جب پہلی مرتبہ بات باہر نکلی کہ یہ سب گھریلو تشدد کا شاخسانہ تھا تو میاں بہت برہم ہوئے۔ سخت توہین محسوس ہوئی کیونکہ اب سب کو اس کی کرتوتوں کا علم ہو چکا تھا۔

میں راندۂ درگاہ ٹھہری۔ زندگی بھر اب مصلوب ہونا میرا مقدر تھا اس لیے اسپتال سے واپسی پر میرا استقبال میاں نے مجھے طلاق کا تحفہ دے کر کیا۔

''مرد اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہے، اس کے ترکش میں طلاق کے تیر سے زیادہ زہریلا تیر اور کوئی نہیں ہوتا جس سے وہ صرف ایک عورت کو ہی نہیں مارتا بلکہ اپنے ہی بچوں کے ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کر دیتا ہے۔'' میں نے آنکھوں کے کٹوروں سے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

زندگی کے راستے تنگ و تاریک ہو چکے تھے۔ اماں کے خدشات حقیقت بن چکے تھے۔ شہزادیوں جیسے روپ پر قسمت واقعی فقیروں جیسی نکل آئی تھی۔

میں کس قدر سخت جان تھی کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی جیے چلی جا رہی تھی۔ نہ زندہ رہنے کی خواہش مر رہی تھی کہ چار بچوں کے لیے ہر حال میں جینا ہی تھا اور نہ ہی رنگ روپ کملا رہا تھا۔ جسے دیکھو روپ کے چقماق پر اپنا آپ رگڑ کر آگ میں پروانے کی طرح جل مرنے کے لیے تیار تھا۔

وقت گزاری کے لیے سب موجود مگر میری ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں تھا۔

سر سے چادر کھینچنے والے ہاتھ بہت مگر سر پر عزت کی چادر ڈالنے والا ایک بھی ہاتھ نہیں تھا۔ گویا سب دست بریدہ تھے۔

پھر ایک روز تاریکیوں، تنہائیوں اور وحشتوں کے درمان کے لیے میں نے ارضِ مقدس کے لیے رختِ سفر باندھا جہاں مجھ جیسے بے سہاروں، بے آسراؤں، حرماں نصیبوں کی جھولیاں بھرتی ہیں۔ دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ میں بھی خالی ہاتھ واپس نہ آئی بلکہ اپنی تیرہ بختی کو اپنے دامن میں سمیٹ کر واپس لے آئی۔

رحمان کے گھر میں میری ملاقات شیطان سے ہوگئی۔

وہ کہہ رہا تھا ''میں کئی برسوں سے سعودیہ میں ملازمت کر رہا ہوں۔ بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے جو ماں کے پاس پاکستان میں رہتی ہے۔ ماں کی بھانجی ہے۔ دو بچے بھی ہیں اس لیے طلاق نہیں دے سکتا بس ماں کی خوشی کے لیے نبھاہ کیے جا رہا ہوں۔ مگر اب میں اپنی خوشی کے لیے دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ساتھی کے بغیر زندگی گذارنا مشکل ہے۔''

میں اتنے زخم کھا چکی تھی، اتنے دھوکے نبھا چکی تھی کہ اب کسی کی بھی بات پر یقین کرنے کو دل مائل نہیں ہوتا تھا مگر جب اس نے خانۂ خدا میں بارہا میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ میرے دکھ درد کا ساتھی بنے گا میری ریزہ ریزہ ہوتی ہوئی ہستی کو سمیٹ لے گا۔ میری سسکتی ہوئی تنہائیوں کو مسکان میں بدل دے گا۔ میرے سدا کے خوف اور عدم تحفظ کو احساس تحفظ کی ردا اوڑھا دے گا تو یقین کرنا ہی پڑا۔

اُف کتنی باتیں، کتنے وعدے..... کتنے حرف..... کتنے لفظ.....مگر سب بے وقعت، سب بے توقیر۔

چند ماہ بعد ہی وہ وزٹ ویزہ پر کینیڈا آ گیا۔ کئی سال اس کے مستقل ویزے کے لیے امیگریشن کے ساتھ کیس لڑتی رہی۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں امیگریشن والے ویزہ دینے سے انکار کر رہے تھے۔ اس لئے اس نے مجبوراً پہلی بیوی کو کاغذی طلاق بھجوا دی۔

ہزار سچ جھوٹ بول کر مستقل قیام کا ویزہ ملا تو اس کے پر پرزے نکل آئے۔

وہی صدیوں پرانی مردوں والی کہانی دہرائی جانے لگی۔ کچھ بھی تو نیا نہیں تھا۔ نظر باز آدمی تھا۔ آتے ہی شہر میں اپنے قماش کی کئی عورتوں سے یارانہ گانٹھ لیا..... پینا پلانا.....نائٹ کلب.....گالم گلوچ.....زبان درازی.....راتوں کو دیر سے گھر آنا معمول کی بات تھی.....

میرے بچے مجھ سے الگ بدظن ہو چکے تھے کہ میں نے کیسا آدمی ان کے سر پر مسلط کر دیا تھا؟ نہ ہی اس نے بچوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور نہ ہی بچوں نے اسے باپ کے طور پر قبول کیا۔ وہ بھی صحیح تھے جب اپنے سگے باپ نے مڑ کر ان کی خیر خبر نہ لی تو وہ کسی اور کا اعتبار کیوں کرتے؟

خانۂ خدا میں میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کھائی ہوئی قسمیں اور وعدے وعید اس نے یوں سچ کر دکھائے کہ مجھے طلاق دے کر میرے ہی شہر میں میری رسوائیوں کا سامان کر دیا.....اس نے دوسری شادی رچالی.....کسی اپنے جیسی آوارہ منش عورت کے ساتھ.....

میں سوچ رہی تھی کہ ''عورتیں ویسے تو اترن پہننے میں بہت ہتک محسوس کرتی ہیں مگر دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر اوڑھتے

وقت انہیں کوئی شرم، کوئی ہتک، کوئی بے عزتی محسوس کیوں نہیں ہوتی ؟''

جس خوف کی تلوار ہمیشہ سر پر لٹکتی رہتی تھی آخر وہی ہوا۔ بنانے والے نے میرا رنگ روپ سنوارنے میں اتنا وقت صرف کر دیا کہ وہ میری تقدیر لکھنا ہی بھول گیا۔

میں زندگی بھر نصیب کے کورے کاغذ کو ہاتھوں میں لے کر بیٹھی یہ سوچتی رہی کہ کب کوئی آ کر اس پر میری قسمت کا ایک خوبصورت باب رقم کرے گا ؟

آج اماں کی کہی ہوئی بات بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔

''کیسی دُکھ کی مٹی لگی ہے اس کے تن کو کہ ہر بار سکھ قریب آتے آتے بس کنی کترا کر نکل جاتا ہے۔''

اندھیرے پھیل چکے تھے۔ تاریکیاں گہری ہو چکی تھیں۔ تنہائیاں آباد تھیں۔ اُمیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ وحشتیں ڈھول پیٹ رہی تھیں۔ ساعتیں ریزہ ریزہ ہو چکی تھیں۔ زندگی یوں غم کی گرفت میں آ چکی تھی جیسے شیر کے طاقتور جبڑوں میں ڈرا سہما ہوا خوفزدہ سا غزال آخری ہچکی لینے کا منتظر ہو۔

بچپن سے میرے اندر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا خوف اب پوری طرح بیدار ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اب بھی اس سے نظریں چرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے غم نے میری ہی چوکھٹ دیکھ لی ہو۔ حوصلوں کے خستہ حال بادباں پھڑ پھڑا کر میری بربادی کا نوحہ بیان کر رہے تھے۔

''تم کس دیوارِ گریہ کی آس لگائے یوں بے حوصلہ ہوئی جا رہی ہو؟'' کہیں اندر سے آواز ابھری۔

''کوئی کسی کی دیوارِ گریہ نہیں بنتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی دیوارِ گریہ ہوتی ہے۔ سر کٹ کر ہمیشہ اپنے ہی شانوں پر گرتا ہے کسی اور کے نہیں۔ جتنے آنسو بہانے ہیں آج ہی بہا لو مگر حوصلہ مت ہارنا۔ اب یہ حوصلہ ہی تمہارا قبلہ ہے جس کے گرد اگرد تمہیں زندگی بھر طواف کرنا ہے۔''

یوں لگا جیسے کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بہت پیار سے دلاسہ دیا ہو۔

میں یک لخت اپنی سوچوں سے باہر نکل آئی۔

وقت کا پنچھی پنکھ پھیلائے ہمیشہ کی طرح محوِ پرواز تھا مگر آج اس نے جاتے جاتے ایک ایسی بات کہہ دی جس نے میرے حوصلوں کے دریدہ بادبانوں کی بخیہ گری کر دی۔

"Courage is not the towering oak
that sees storms come and go,
it is the fragile blossom
that opens in the snow."

میں ایک بار پھر نئے عزم، نئے حوصلے، نئی ہمت کے ساتھ اٹھ کر منڈیر پر بیٹھے ہوئے غم کے پرندوں کو اڑانے لگ گئی۔

رُوح یوں پھاند گئی جسم کی دیواروں کو
جیسے پنچھی کوئی پنجرے سے رہا ہوتا ہے

(رضیہ اسماعیل)

چیچہ وطنی

میرے ذہن کے کورے کاغذ پر پہلی کہانی یہی کوئی چھ سات برس کی عمر میں اتری ہوگی۔

آج برسوں گزر جانے کے بعد بھی یہ واقعہ میرے ذہن کے پردوں سے یوں چپکا ہوا ہے جیسے زندگی ہمیشہ سے موت کی دسترس میں ہو اور اس سے فرار کسی طور بھی ممکن نہ ہو۔

میں ہزار کوشش کے باوجود بھی ''چیچہ وطنی'' کو اپنے ذہن کی تختی سے نہیں مٹا سکی اس لیے آج کاغذ کے سپرد کرنے پر مجبور ہوں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اونچے شملے والا، خوبرو، گبھرو جوان چوہدری محمد خاں جب کلف لگے سفید براق کپڑے پہنے، کارتوسوں کی پیٹی اور دونالی بندوق کندھے پر سجائے، چرچراتے ہوئے چرمی جوتوں کے ساتھ پنڈ کی گلیوں میں سے گزرتا تھا تو کنواریاں تو ایک طرف، خصماں والیوں کے دل بھی سینے میں ایک بار ضرور زور سے دھڑک اٹھتے ہوں گے۔

آج سارا پنڈ حشرات الارض کی طرح کونوں کھدروں سے نکل نکل کر چوہدریوں کی حویلی کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

حیران و پریشان انسانوں کے جم غفیر کو دیکھ کر ڈھور ڈنگر خوفزدہ سے ہو کر کھونٹوں سے رسے تڑا تڑا کر بھاگ رہے تھے۔

یوں لگ رہا تھا جیسے سورج سوا نیزے پر آ گیا اور ہر ایک کو میدان حشر میں پہنچنے کی جلدی ہو۔

''ہائے میرا اُچے شملیاں والا۔ میرا پردیسی شہزادہ، مینوں خبر نہ ہوئی..... میں لٹی گئی جے لوکو۔''

سینے پر دوہتڑ مار مار کر دردناک انداز میں بین کرتی ہوئی لحیم شحیم فاطمہ جُٹی جسے سب فاطو جُٹی کے نام سے پکارتے تھے آج بن جل مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ فاطو جُٹی کی آہ و بکا سے ہر آنکھ پرنم تھی۔

شدید ذہنی صدمے کی کیفیت میں فاطو جُٹی نے اپنے لمبے گھنگریالے بالوں کی چوٹی کھول دی تھی۔ سر سے ریشمی چادر اتار کر اس نے لیرو لیر کر دی تھی جس سے وہ چوہدری محمد خاں کے زخموں سے رستے ہوئے لہو کو پونچھ پونچھ کر اپنے ہاتھوں اور چہرے پر ملتے ہوئے بین کر رہی تھی۔

''چوہدری تیری جگہ میں ٹوٹے ہو جاندی۔ ظالماں میرا کلیجہ کڈھ لیا۔ ہائے میں اپنا قول ہار گئی..... میں اپنے چوہدری دی حفاظت نہ کر سکی۔''

فاطو جُٹی کے دل پسیج دینے والے ہاڑوں نے سارے ماحول کو بے حد سوگوار کر دیا تھا۔
آج سارے پنڈ کے چولہے ٹھنڈے پڑے تھے۔
نہ ہی چھیمو ماچھن نے تندور تپایا۔
نہ ہی شیداں بھٹیارن نے دانے بھوننے کے لیے بھٹی سلگائی۔
نہ چوپال سے حقے گڑگڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
کھیتوں میں سب ہل پنجالیاں بے آسرا پڑے کراہ رہے تھے۔
گاؤں کے رہٹ بے زبان ہو چکے تھے۔
ٹیوب ویلوں کا پانی شڑاپ شڑاپ کرنا بھول گیا تھا۔
آموں کے باغ میں کوئل کی کوک اب ہوک میں تبدیل ہو چکی تھی۔
چراگاہوں میں چرتے ہوئے ڈھور ڈنگر بھی چرنا بھول کر ماتمی انداز میں سرزمین پر رکھے اُداس بیٹھے ہوئے تھے۔
پنڈ کے سارے آوارہ کُتے بھی آسمان کی طرف منہ اٹھائے وقفے وقفے سے فاطو جُٹی کے ہاڑوں کے جواب میں منہ کھول کر ماتمی آوازیں نکال رہے تھے۔

دراصل اس پرامن پنڈ میں لرزہ خیز قتل کی یہ پہلی واردات تھی اور پھر قتل بھی ایسے بندے کا جس کی جی داری اور بہادری کے چرچے کئی کئی کوس تک پھیلے ہوئے تھے۔ آج چوہدریوں کی حویلی کے وسیع وعریض صحن اور چاروں طرف بنی ہوئی راہداریوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ سارے پنڈ کو جیسے غم کا گھن لگ چکا تھا۔

چوہدری محمد خان کا خون سے لت پت جوان جسم حویلی کے صحن کے درمیان، سفید نواڑی چارپائی پر بے حس وحرکت پڑا ہوا تھا۔ زندگی کی حرارت سے محروم۔ دراز قد چوہدری کے پاؤں چارپائی کی حدیں پھلانگ پھلانگ کر باہر نکل رہے تھے۔ خون سے تربتر سفید لباس میں چارپائی پر لیٹا ہوا چوہدری محمد خان اس حالت میں بھی حسن وجمال کا پیکر لگ رہا تھا۔

فاطو جُٹی اور چوہدری کے انوکھے ملاپ کے قصے پنڈ کے ہر بندے کی زبان پر تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ دونوں ہی کوئی دیومالائی کردار ہوں۔ اس دھرتی پر رہنے والوں سے بہت مختلف، بہت الگ، وکھری ٹائپ کے.....

چوہدری محمد خان کون تھا؟ وہ اس پنڈ میں کہاں سے آیا تھا؟ سوائے فاطو جُٹی کے یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ طرح طرح کے قصے پنڈ والوں میں مشہور تھے مگر بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ چوہدری محمد خان کا ساتھ والے پنڈ کے ملکوں سے بڑا یارانہ تھا اور وہ شکار کھیلنے کے لیے ان کی زمینوں پر سال میں ایک بار ضرور آیا کرتا تھا۔

ایک سال چوہدری شکار کھیلنے آیا تو خود ہی شکار ہو گیا۔
اپنے شکار کا پیچھا کرتے کرتے، ہرن کے تعاقب میں سبکتگین کی طرح گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے وہ اپنے شکاری کتوں کے

ہمراہ باقی کی شکار پارٹی سے بچھڑ کر بہت دور نکل آیا۔

جان بچانے کی تگ ودو میں بھاگتا ہوا ہرن فاطو جُٹی کی زمینوں پر آ نکلا۔ اتفاق سے فاطو جُٹی آج اپنی زمینوں کے دورے پر نکلی ہوئی تھی۔

شکاری کتوں کی معیت میں گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے چوہدری محمد خان بھی فاطو جُٹی کی زمینوں پر کھڑی فصلوں کو روندنے لگا۔

اپنی زمینوں پر یوں ایک اجنبی کو دندناتا ہوئے دیکھ کر فاطو جُٹی نے غصے سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

گردش ماہ وسال بھی رک گئی.....

لمحے سراسیمہ سے ہو گئے۔

کھیتوں میں سرسوں کی مہک نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ ہنستے ہوئے پیلے پیلے پھولوں کی ہنسی وار کر گئی۔

گھڑسوار نے پوری قوت سے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

گھوڑے نے بہت زور سے ہنہنا کر دونوں پاؤں یوں زمین سے اوپر اٹھائے کہ گھڑسوار گرتے گرتے بچا۔ یوں لگتا تھا جیسے اپنے مالک کی یہ بے وقت مداخلت اُسے سخت ناگوار گزری تھی۔

سبکتگین کی طرح رحم کھا کر چوہدری کو بھاگتے ہوئے ہرن کو رہا نہیں کرنا پڑا تھا بلکہ موقعہ پا کر ہرن خود ہی فرار ہو گیا اور چوہدری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابند سلاسل کر گیا۔

چوہدری اور فاطو جُٹی ایک دوسرے کے بالمقابل آ چکے تھے۔ فاطو جُٹی کی نگاہوں میں چوہدری نے پتہ نہیں کون سے شعلے کی لپک دیکھی کہ سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔

نہ جانے وہ سمے کا کون سا پل تھا جو چوہدری کو اس سے چرا کر لے گیا۔

وقت کی ٹہنی سے ٹوٹ کر گرنے والے دو انمول لمحے ان دونوں کی جھولی میں آن گرے جنہیں انہوں نے بڑی احتیاط سے اٹھا کر اپنے اپنے دل کے کٹوروں میں بند کر لیا۔

اندھا کیوپڈ اپنا کام کر چکا تھا۔ آنکھوں والوں کو عشق کے ایک ہی وار نے تھیا تھیا کر کے نچا دیا تھا۔

ویسے تو چوہدری اتنا شاندار مرد تھا کہ کوئی بھی حسین سے حسین عورت اس پر ہزار جان سے مرمٹتی مگر یہاں لگتا تھا کہ چڑیا کی دُکی نے حکم کے اِکے کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

مردانہ ڈیل ڈول، گہری سانولی رنگت اس پر ہلکے ہلکے چیچک کے داغ، نہ ہار نہ سنگھار، نہ کنگھی نہ چوٹی، سر جھاڑ منہ پھاڑ۔ کھلے ہڈ پیروں کے اوپر ریشمی لاچا پہنے، لب و لہجے میں مردانہ کھنک رکھنے والی فاطو جُٹی میں عورتوں والی نزاکت تو نام کو نہ تھی۔ اوپر سے مزاج کبھی تولہ تو کبھی ماشہ۔ لگتا تھا اسے بناتے وقت قدرت نے نمک اور مرچ کا استعمال کچھ زیادہ ہی فیاضی سے کر دیا تھا۔

''مگر ایک بات ہے اس میں.....عورت ہے بڑی جی دار۔ اچھوں اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتی۔'' پنڈ کے مرد اکثر چوپال

میں بیٹھ کر فاطو جُٹی کے اعتماد اور تڑاک پھڑاک انداز گفتگو پر رشک کیا کرتے تھے۔

وہ مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس قدر رعب داب سے باتیں کرتی تھی کہ آخر مرد گھبرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیا کرتے تھے۔

حویلی کے برآمدے میں بڑے سے رنگین پیڑھے پر بیٹھی ریشمی لاچا ٹخنوں سے اوپر اٹھا کر حقہ گڑگڑاتی ہوئی فاطو جُٹی ملازموں کی فوج کو ان کی نالائقی پر اکثر لعن طعن کر رہی ہوتی تھی ایسے میں وہ کسی ظالم، جابر جاگیردار سے کم نظر نہ آتی تھی۔

پنڈ والے کبھی کبھی تو سوچتے کہ وڈے چوہدری کو اس طرح کی بیٹی قدرت نے کس گناہ کی پاداش میں دے دی تھی جو عورت سے زیادہ ایک مرد تھی۔

وہ پنڈ کے وڈے چوہدری حکم داد کی اکلوتی اولاد تھی۔ کئی مربعے زمین کی اکیلی وارث۔ چوہدری اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ کبھی اس کی بات نہیں ٹالتا تھا۔ اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات وڈے چوہدری کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی کیونکہ بچپن میں ہی فاطو کی ماں کے مرجانے کے بعد وڈے چوہدری نے اُسے ماں اور باپ دونوں ہی بن کر پالا تھا۔ اس قدر لاڈ پیار نے فاطو جُٹی کے مزاج کو اور بھی پر لگا دیئے تھے۔

فاطو جُٹی کی عمر کوئی پچیس برس سے اوپر ہو چکی تھی۔ پنڈ میں اس کے جوڑ کا کوئی ایسا مرد نہیں تھا جو اس شیرنی کے مقابل آتا۔

آس پاس کی زمینداریوں سے اس کے لیے شادی کے چند ایک پیغام ضرور آئے مگر فاطو جُٹی کو اپنی زمین چھوڑ کر کہیں اور جانا منظور نہ تھا۔ اس کی شرط تھی کہ شادی کرنے والے کو گھر داماد بن کر رہنا پڑے گا جس کے لیے کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ اس کشمکش میں وڈے چوہدری کا انتقال ہو گیا تو فاطو جُٹی بالکل اکیلی رہ گئی۔

آج وقت اس پر مہربان تھا۔

چوہدری محمد خان سے طوفانی ملاقات کے بعد وہ یکسر کافی بدل گئی تھی۔ لب و لہجے میں قدرے نرمی آ گئی تھی۔

کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش جسے اس نے دل کی تاریک سی کوٹھڑی میں کہیں دفن کر رکھا تھا آج زندہ ہو کر جیسے باہر آ گئی تھی۔

فاطو جُٹی اور چوہدری کے دھواں دھار عشق اور دونوں کے عجیب و غریب جوڑ کو دیکھ کر پنڈ کی کنواریاں اکثر ہنسی مذاق کرتے ہوئے کہتیں:

''ہائے نی لگتا ہے جیسے جن پری پر عاشق ہو گیا ہے۔ کہاں چوہدری اور کہاں فاطو جُٹی۔ بے چارہ چوہدری۔'' اتنا کہہ کر سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتیں مگر ان دونوں کو کسی کی بھی پرواہ نہیں تھی۔

جلد ہی دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

وقت کا پہیہ بڑی سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ چوہدری اور فاطو جُٹی کے ہاں اوپر تلے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہو گئے تو دونوں کے دلوں کے ساتھ ساتھ ان کی حویلی بھی خوشبوؤں سے معطر ہو گئی۔

جن نے پری کو یوں قابو میں کر لیا تھا کہ چوہدری اپنے گھر کا رستہ ہی بھول گیا۔ اس پنڈ میں اس نے مستقل ڈیرا ڈال لیا مگر سال میں ایک آدھ مرتبہ وہ اپنے آبائی علاقے میں ضرور جایا کرتا تھا لیکن کسی نے اس کے کسی رشتہ دار کو کبھی اس پنڈ میں آتے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

چوہدری اس پنڈ میں پردیسی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ جدی پشتی پنڈ میں رہنے والوں نے اسے کبھی دل سے قبول نہ کیا مگر فاطو جُٹی کے ڈر سے کبھی کسی نے زبان نہیں کھولی تھی۔

چوہدری خود چودہ جماعتیں پاس تھا۔ باذوق آدمی تھا۔ ایسے میں پنڈ کے ڈاکٹر سے اس کی گاڑھی چھنتی تھی جو اس پنڈ میں واحد اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ دونوں گھنٹوں بیٹھ کر ادب، آرٹ، موسیقی، سیاست اور کھیل کود کے علاوہ حالات حاضرہ پر زور شور سے گفتگو کیا کرتے تھے۔

دونوں ہی شکار کے شوقین تھے۔ ڈاکٹر نے بھی بڑی اعلیٰ نسل کے شکاری کُتے پال رکھے تھے۔ ہفتے عشرے میں دونوں اپنے اپنے کتوں کو لے کر شکار کے لیے نکل جاتے تھے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ان دونوں میں ایک اور قدر مشترک بھی تھی۔ دونوں ہی اس پنڈ میں مہاجر تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ چوہدری کی ہجرت اختیاری تھی جو اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کی تھی جبکہ ڈاکٹر کی ہجرت غیر اختیاری اور جبری تھی جو اسے ہندوستان کے بٹوارے پر نہ چاہتے ہوئے بھی اختیار کرنا پڑی تھی۔

دونوں ہی پیچھے بہت کچھ چھوڑ آئے تھے مگر اس کے بارے میں وہ کبھی کھل کر آپس میں بات نہیں کیا کرتے تھے مگر اس ہجرت نے یقیناً انہیں دوستی کے ایک مضبوط بندھن میں باندھ دیا تھا۔

وقت سبک خرامی سے چلنا بھول کر ایک رات، ایک ہی جست میں بہت آگے نکل گیا۔

طوفانی رات، گھپ اندھیرا..... ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب خلق خدا بسرتوں میں دبکی پڑی تھی۔ ایسے میں کپڑے میں منہ چھپائے، ہاتھ میں ڈنگوری اور بہت نیچی لو کیے ہوئے لالٹین پکڑے، کوئی بہت آہستگی سے ڈاکٹر کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا مگر طوفانی ہوا کے تھپیڑوں سے ہلکی دستک کی آواز دبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے اجنبی کو اب کی بار قدرے زور سے دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈیوڑھی کا دروازہ کھل گیا۔ اجنبی ڈاکٹر کے ساتھ ڈیوڑھی کے اندر آ کر کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔

ڈاکٹر بے حد فکر مند لہجے میں اجنبی سے آہستہ آہستہ گفتگو کر رہا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے جلدی سے کھونٹی سے اپنا اوورکوٹ اور مفلر اُتارا۔ ہاتھ میں ٹارچ سنبھالی اور اجنبی کے ساتھ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر ڈاکٹرنی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ یہی سمجھی کہ شاید کوئی بہت بیمار ہے جو اتنی طوفانی رات میں کچھ بتائے بغیر ہی ڈاکٹر گھر سے عجلت میں چلا گیا ہے۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے انتظار کے بعد دروازے کی چرچراہٹ دوبارہ سنائی دی تو پہلے سے ہی جاگتی ہوئی ڈاکٹرنی بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے؟ آپ اتنی دیر تک کہاں تھے؟ کسی مریض کو دیکھنے گئے تھے؟'' ڈاکٹرنی نے جلدی جلدی کئی سوال کر ڈالے۔

''نہیں'' ڈاکٹر نے نہایت آہستگی سے جواب دیا مگر پریشانی ڈاکٹر کے لہجے سے مترشح تھی۔

''آخر بات کیا ہے؟ اتنی رات گئے باہر نکلنے کا اور کیا مقصد تھا؟'' ڈاکٹرنی کے اصرار پر ڈاکٹر کو بتانا ہی پڑا۔

''رنگڑوں کا مزارع آیا تھا، بڑی تشویش ناک بات بتا کر گیا ہے۔ اس لیے میں چوہدری محمد خان کو ملنے کے لیے اس کی زمینوں پر پنڈ سے باہر گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے رُک رُک کر کہا۔

''مگر پریشانی کیا ہے؟'' ڈاکٹرنی نے پھر پوچھا۔

''دراصل آج چوہدری اپنی زمینوں پر سو رہا ہے۔ کیونکہ پانی کی باری اس کی ہے۔ اس کا پانی اکثر چوری کر لیا جاتا ہے جس پر رنگڑوں سے چوہدری کی کئی مرتبہ گرمی سردی ہو چکی ہے۔'' ڈاکٹر نے گویا تمہید باندھتے ہوئے کہا۔

''تو اس سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ یہ تو زمین داروں کے روز روز کے قصے ہیں۔'' ڈاکٹرنی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

اب کی بار ڈاکٹر نے جواب دینے میں قدرے تاخیر کا مظاہرہ کیا تو ڈاکٹرنی پھر بول پڑی ''اس مزارع پر آپ کو اعتماد ہے؟ کہیں کچھ اور ہی چکر نہ ہو، مجھے تو یہ معاملہ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ عزیز اچھا آدمی ہے۔ حق سچ کی بات کرتا ہے۔ اسی لیے تو ایسی طوفانی رات میں جان پر کھیل کر وہ چلا آیا ہے۔ دراصل آج رنگڑوں نے چوہدری محمد خان کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آج وہ خود زمینوں پر سو کر پانی کی نگرانی کرے گا۔

وہ کہہ رہا تھا کہ آپ چوہدری کے بہت اچھے دوست ہیں اسے جا کر خبردار کر دیں کہ یا تو آج وہ واپس گھر آ کر سوئے یا پھر کچھ اسلحہ اپنے پاس حفاظت کے لیے رکھ لے۔''

''تو پھر چوہدری نے آپ کی بات مانی ہے؟'' ڈاکٹرنی نے گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں..... بہت ضدی ہے وہ..... نڈر آدمی ہے۔ کہتا ہے جو گولی مجھے لگے گی وہ ابھی تک بنی ہی نہیں۔''

اُسے اپنی دونالی بندوق پر بہت بھروسہ ہے۔ کہہ رہا تھا ''کس مائی کے لال میں جرأت ہے جو مجھے ہاتھ لگا جائے۔ میں اُسے نتھ نہ ڈال دوں گا۔''

ڈاکٹر کی تسلی تشفی کرا کے چوہدری نے اسے واپس تو بھیج دیا مگر اس طوفانی رات میں ڈاکٹر نے آنکھ تک نہیں جھپکی۔ دونوں میاں بیوی ساری رات جاگ کر کسی انہونی کا انتظار کرتے رہے۔

چوہدری کی کہی ہوئی باتیں ڈاکٹر کو یاد آ رہی تھیں ''اوئے ڈاکٹر ان رنگڑوں کا دوادارو نہ کیا کر، کم ذات لوگ ہیں۔ ٹھیک ہو کر تجھے ہی ڈنگ ماریں گے۔''

ڈاکٹر چوہدری کی بات سن کر ہنس کر کہتا ''یار میں ڈاکٹر ہوں، بیمار کا علاج کرنا میرا فرض ہے۔''

''تو پھر کرتے رہو ان سانپوں کا علاج۔'' چوہدری بے زاری سے جواب دیتا۔

''جب یہ لوگ لٹے پٹے ہوئے ملک کے بٹوارے کے وقت بے سروسامانی کی حالت میں اس پنڈ میں آئے تھے تو ہم نے ان سب کی بہت مدد کی تھی لیکن جب انہیں اپنی زمینیں الاٹ ہو گئیں تو یہ ہمیں ہی آنکھیں دکھانے لگے۔ بڑے ہی احسان فراموش لوگ ہیں۔ اب تو کھلم کھلا دشمنی پر اُتر آئے ہیں۔'' چوہدری گویا آج دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

''جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔ کیا خوبصورت بات کہی ہے حضرت علیؓ نے۔ یہ بات ان جیسے لوگوں پر ہی صادق آتی ہے۔'' چوہدری نے قدرے مایوسی سے کہا۔

طوفانی رات کے کسی پہر میں وقت کا پہیہ یک لخت سارے کا سارا ہی گھوم گیا.....انہونی ہو کر رہی۔ سورج کی روپہلی کرنیں کسی نوزائیدہ بچے کی طرح رو رہی تھیں۔

رات کی تاریکی میں ڈنڈوں، لاٹھیوں، کلہاڑیوں، برچھیوں اور پستولوں سے مسلح رنگڑوں کے ایک بڑے گروہ نے زمینوں پر سوئے ہوئے چوہدری کو بڑے بہیمانہ انداز میں قتل کر دیا تھا۔ سامنے سے مقابلہ کرنے کی تو کسی میں ہمت نہیں تھی اس لیے انہوں نے چھپ چھپا کر چوروں کی طرح چوہدری کے سر پر لاٹھیوں سے ایسا کاری وار کیا کہ اُسے سرہانے پڑی دونالی بندوق اٹھانے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔

دن چڑھتے ہی اس لرزہ خیز قتل کی خبر بڑی تیزی سے دور دور تک پھیل گئی۔

پھر وہی پولیس.....آنیاں.....جانیاں.....کاغذی کارروائیاں.....تفتیش.....جائے وقوعہ.....گرفتاریاں.....آلۂ قتل.....ایف آئی آر.....ثبوت.....گواہ.....شہادتیں.....عدالتیں سب کچھ ہی موجود تھا سوائے چوہدری کے۔

تیسرے روز پوسٹ مارٹم کے بعد چوہدری کی لاش واپس پنڈ میں آئی تو ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔ دوپہر تک تدفین کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

اچانک یوں لگا جیسے پنڈ میں بھونچال آ گیا ہو۔ در و دیوار لرزنے لگے۔ زمین کانپ کانپ گئی۔ بہت سے لوگوں کے بری طرح رونے پیٹنے اور بین کرنے کی آوازوں نے سارے ماحول میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا تھا۔

عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم سینہ کوبی کرتا ہوا حویلی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک اور کربلا سجا دی گئی ہو

اور حسینی قافلہ یزید کے دربار میں ماتم کرتا ہوا جا رہا ہو۔

کوفیوں کی طرح اس ماتم کناں ہجوم کا نظارہ کرنے کے لیے پنڈ والے گلیوں، بازاروں اور مکانوں کی چھتوں پر امڈ پڑے۔ سب حیران و ششدر تھے کہ یہ کون سے سگے سمبندھی ہیں جو اس انداز میں پنڈ میں وارد ہوئے ہیں۔

اس ماتمی جلوس میں سب سے آگے اونچی لمبی، لش لش کرتی، مکھنوں کی پلی، سلفے کی لاٹ ورگی، رج کے سوہنی جُٹی، کالے کپڑے پہنے ہوئے بازو اٹھا اٹھا کر دہائیاں دیتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

یہ چوہدری کی خاندانی بیاہتا تھی جو صحیح معنوں میں چوہدری کا جوڑ تھی۔ جیسے دو سورجوں کی جوڑی ہو۔

چوہدرائن کو دیکھ کر بڑی بوڑھیوں نے دانتوں میں انگلیاں دبا لیں۔

''ایسی بیوی کے ہوتے ہوئے چوہدری نے فاطو جُٹی میں کیا دیکھا؟'' ایک نے حیرت سے کہا۔

''یہ سب نصیبوں کا چکر ہے۔ سنا نہیں سیانے کہہ گئے ہیں روپ رون تے کرم کھان۔'' دوسری نے جواب دیا۔

''عشق خوددار کی رسمیں بدلی نہیں جاتیں۔ عشق ظاہری شکل و شباہت نہیں بلکہ روحوں کی پہچان کا نام ہے..... بس سمجھ لو کہ چھاپ تلک سب چھینی مو سے نیناں ملائیکے'' وقت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مرغِ بسمل کی طرح تڑپتی ہوئی جُٹی نے حویلی کی دہلیز پر آ کر اپنی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ لہولہان کلائیوں سے بال کھول کر سینے پر دو ہتڑ مار کر اس حسن سوگوار نے بین کرنے شروع کر دیئے اور باقی سارے ہجوم نے بھی اس کی تقلید میں زور زور سے سر منہ پیٹنا اور رونا شروع کر دیا۔

حویلی کے صحن میں قدم رکھتے ہی آہ و فغاں کرتی ہوئی جُٹی نے زمین سے کچھ مٹی اٹھا کر اپنے سر میں ڈال لی اور بری طرح روتے ہوئے آ کر صحن میں پڑے چوہدری کے بے جان وجود پر ڈھیر ہو گئی۔

کافی دیر تک وہ اسی نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی رہی۔ پھر اچانک وہ جیسے گہری نیند سے بیدار ہو کر اٹھی اور پاس کھڑی ہوئی فاطو جُٹی کو دونوں شانوں سے پکڑ کر ہذیانی انداز میں چیخنے چلانے لگی۔

''تم میری دین دار ہو فاطو۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے اپنے چوہدری کو تمہارے سپرد کیا تھا۔ کون سی منحوس گھڑی میں وہ اس پنڈ میں آیا تھا۔ تو ڈائن ہے تو نے میرے سر کے سائیں کو کھا لیا۔ تو نے میرے پردیسی کو مار ڈالا۔''

بڑی مشکل سے بے قابو ہوتی ہوئی چوہدرائن کو ہجوم نے فاطو جُٹی سے الگ کیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک نئی بحث چھڑ گئی جو فاطو جُٹی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

چوہدری کی خاندانی بیوی کا اصرار تھا کہ وہ اس کی میت واپس اس کے آبائی علاقے میں لے کر جائے گی جبکہ فاطو جُٹی کہہ رہی تھی کہ چوہدری کی تدفین اسی پنڈ میں ہو گی۔ دونوں عورتیں اپنے اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

کسی کروٹ بھی اونٹ نہ بیٹھتے دیکھ کر پنڈ کے نمبردار نے فوری طور پر پنچایت اکٹھی کر لی۔ پنچایت نے دونوں پارٹیوں

کے دلائل بڑے تحمل سے سنے۔ سلفے کی لاٹ کہہ رہی تھی ''ساری زندگی تو نے اُسے اپنا قیدی بنا کر رکھا اب تو اُسے آزاد کر دے۔ زندگی میں تو وہ میرا نہ ہو سکا اب مٹی کی ڈھیری ہی مجھے دے دے۔ میں کم از کم اس کی قبر پر جا کر رو ہی لیا کروں گی۔''

فاطو جُٹی کیا بتاتی کہ ''چوہدری کی جدائی سے تو وہ خود عمر بھر کے لیے غم کی قید میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ کسی اور کو کیا آزاد کرے گی؟''

مگر فاطو جُٹی نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بات کرنا ہی بھول گئی ہو یا پھر چوہدری جاتے جاتے اس کی گز بھر لمبی زبان بھی ساتھ ہی لے گیا ہو۔

بالآخر پنچایت نے اپنا فیصلہ سنا دیا ''چوہدری محمد خان اس پنڈ میں پردیسی تھا مگر وہ لاوارث نہیں تھا۔ زمینوں، جاگیروں اور حسب نسب والا تھا۔ اس کی میت اس کے اصل وارثوں کو ہی ملنی چاہیے تاکہ وہ اسے اس کے آبائی علاقے میں لے جا کر دفن کر سکیں۔ یہی اس علاقے کا دستور ہے۔''

پنچایت کا فیصلہ سن کر فاطو جُٹی کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کی عمر قید کی سزا کو پھانسی میں تبدیل کر دیا ہو۔

پنچایت کا فیصلہ سننے کے بعد ہجوم نے بڑی تیزی سے چوہدری محمد خان کی میت کو شہر کی طرف جانے والی کچی سڑک پر کھڑے ٹرک کی طرف لیجانا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے میت ٹرک کے قریب جا رہی تھی فاطو جُٹی کو یوں لگ رہا تھا جیسے لوگ اُسے بھی کھینچ کھینچ کر پھانسی گھاٹ کی طرف لے جا رہے ہوں۔

فاطو جُٹی کی دگرگوں حالت دیکھ کر میرے ذہن کے کسی گوشے سے آواز ابھری۔

''اس وقت فاطو جُٹی کی دلی کیفیت کا اندازہ اس کے سوا اور کون کر سکتا ہے؟ اس کا قیدی تو آزاد ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنے وطن واپس جا رہا ہے مگر وہ اب زندگی بھر کے لیے احساس جرم کی ٹکٹکی پر لٹکی رہے گی۔''

چوہدری یار باش آدمی تھا اس لیے اُسے الوداع کہنے کے لیے دور و نزدیک کے تعلقوں سے چوہدریوں، سرداروں، وڈیروں، ملکوں اور خانوں کا ایک ہجوم اُمڈ آیا تھا۔

ان سب سے پرے دور ایک کونے میں چوہدری کا جگری یار ڈاکٹر نہایت افسردگی سے کھڑا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

اس کے قریب ہی کھڑی گم سم سی فاطو جُٹی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں مگر کمال ضبط کے ساتھ اپنے چوہدری کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

دفعتہ ٹرک ڈرائیور کی کھردری سی آواز نے سب کی محویت کو توڑ دیا ''جلدی کریں جی۔ بارش شروع ہونے والی ہے اور پینڈا ابھی بڑا لمبا ہے۔'' صبح سے انتظار کرتے ہوئے ٹرک ڈرائیور نے بڑی بے صبری سے کہا۔

''مگر جانا کہاں ہے؟'' ٹرک ڈرائیور نے سٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے گاڑی کو گیئر میں ڈال کر ایکسیلیٹر پر بڑے زور سے پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

''چیچہ وطنی، چیچہ وطنی، چیچہ وطنی۔''

اس کے ساتھ ہی لفظ ''چیچہ وطنی'' کی گونج فضا میں چاروں طرف پھیل گئی۔

ٹرک کی گڑگڑاہٹ اور لوگوں کے بے پناہ شور کے درمیان میرے ذہن کے پردوں سے چپک جانے والے لفظ ''چیچہ وطنی'' کی بازگشت پھر مجھے زندگی بھر سنائی دیتی رہی۔

میرے وجود میں ایک شور ہے بگھولوں کا
میں اپنی ذات کے صحرا میں قید ہوں جیسے

(رضیہ اسماعیل)

کیہ جاناں میں کون؟

کیہ جاناں میں کون؟
بلھا! کیہ جاناں میں کون؟
کیہ جاناں میں کون؟
کیہ جاناں میں کون؟

پاؤں میں گھنگرو باندھے، ڈھولک کی تھاپ پر تالیوں کے بے پناہ شور میں وہ نہایت فنکارانہ انداز میں بلھا! کیہ جاناں میں کون کی سرمدی تکرار پر کبھی کتھک تو کبھی بھارت ناٹیم کے داؤ پینترے آزما آزما کر اعضا کی شاعری کر رہا تھا۔

ویسے تو وہ ایک بہت اچھا شاعر تھا مگر آج اس کی اعضا کی شاعری دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لفظوں اور جذبوں کی شاعری سے چند قدم آگے نکل گیا تھا۔

پورا ماحول سحر زدہ سا لگ رہا تھا۔ رات دانتوں تلے انگلی دبائے حیرت سے اس گہری سانولی رنگت اور متناسب نقوش والے طویل القامت رقاص کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک اس نے رقص کا ایک نیا انداز اپنایا۔ بڑی تیزی سے گول گول دائرے میں گھومتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کھول کر آسمان کی طرف اٹھالی جبکہ بائیں ہتھیلی زمین کی طرف ایک خاص انداز سے کر کے وہ گویا عالمِ سُکر میں کہیں بہت دور نکل گیا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے چاروں اور دائروں گھومتی ہوئی کائنات کو تسخیر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ہم سب بڑی محویت سے اسے ایک جذب کے عالم میں رقص کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ میرے لیے یہ نظارہ قابلِ دید سے کچھ آگے ہی نکل گیا تھا اس لیے میں نے اس منظر کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنے کی غرض سے جیسے ہی کیمرہ سیدھا کیا اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔

میں حیران تھی کہ اس نیم مدہوشی میں بھی وہ کس قدر ہوش میں تھا۔ گویا اس کی لیزر بیم سے مسلح ادھ کھلی آنکھیں اپنے اردگرد

ہونے والی ہر ہر حرکت سے پوری طرح باخبر تھیں۔

رقص میں ذرا سا وقفہ کرتے ہوئے اس نے کہا:

"It is all off the record."

اور دوبارہ اسی انہماک سے اس نے دائروں میں رقص کرنا شروع کر دیا۔

اُسے یوں والہانہ انداز میں رقص کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے مولنا جلال الدین رومی کے مزار پر ان کے پیروکار درویشوں کا مشہور صوفی رقص یاد آ گیا جو مجھے کچھ عرصہ پہلے قونیہ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

مولنا روم کی وفات کے بعد تقریباً تیرھویں صدی میں اس رقص کا آغاز ہوا جسے درویش محفل سماع سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس رقص میں صرف دو سازوں بانسری (نے) اور دف (ڈرم) کا استعمال کیا جاتا ہے۔

تقریب کے آغاز میں درویش رقص کو متعارف کرواتے ہوئے کمنٹیٹر کہہ رہا تھا:

"It is a serious dance performed in various stages. It imitates the rotation of the heavenly spheres."

بانسری کی مسحور کن لَے اور دف کی ہلکی ہلکی آواز کے ساتھ ہال کے ملگجے سے اندھیرے میں سٹیج سے پردہ سرکنا شروع ہوا۔ چند درویش سیاہ گاؤن پہنے اور سروں پر تاج سے مشابہہ اونٹ کے بالوں سے بنی ٹوپیاں پہنے آہستہ آہستہ سٹیج پر نمودار ہونا شروع ہوئے۔

بیک گراؤنڈ میں کمنٹیٹر کی آواز آ رہی تھی۔

''درویشوں کے سر پر رکھی ہوئی ٹوپی کی مشابہت مولانا روم کے مزار کے کتبے کے علاوہ انسانی نفس کے مزار کے کتبے سے بھی ہے۔''

بات بڑی دل چسپ تھی اور فکر انگیز بھی۔ میں کچھ اور انہماک سے پرفارمنس دیکھنے میں محو ہو گئی۔

درویشوں کے ایک لائن میں کھڑے ہوتے ہی ایک شخص جسے وہ شیخ کہہ رہے تھے اپنی نشست پر نمودار ہوتا ہے۔ درویش سیاہ گاؤن اتار کر سفید فراک نما گاؤن پہن لیتے ہیں اور سب سے آگے کھڑا رقاص اپنے شیخ کی سمت نہایت عقیدت و احترام سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں پر بوسہ دیتا ہے اور جواب میں شیخ اُس کے فراک نما لباس کو بوسہ دیتا ہے۔

''یہ محفل سماع انسان کے روحانی سفر کے مختلف مراحل کی نشان دہی کرتی ہے جس میں دل، ذہن اور جسم انسانی فطرت کے تین اہم ستون مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ سفید گاؤن نفس کے لباس سے مشابہہ ہے جبکہ سیاہ گاؤن اتارنے کی حکمت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انسان کا حق اور سچ کی طرف روحانی طور پر دوبارہ جنم ہوا ہے۔''

قونیہ کی محفل سماع میں کمنٹیٹر کی آواز مجھے اب قدرے دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی کیونکہ بلھا! کیہ جاناں میں کون؟

کیہ جاناں میں کون؟ کی آواز اب بہت قریب آ چکی تھی۔

ہال میں وہ ایک وجد کے عالم میں Gyrating کر رہا تھا۔لٹو کی طرح تیزی سے اُسے اپنے محور پر گھومتے دیکھ کر مجھے وہ کوزہ گر یاد آ گیا جو چاک پر کچی مٹی کی لوئی سے اپنے ہنرمند ہاتھوں سے شاہکار تخلیق کرتا ہے مگر نہ جانے کوزہ گر نے یہ شاہکار نامکمل کیوں رہنے دیا تھا؟

محفل سماع میں کمنٹیٹر بتا رہا تھا کہ ''کائنات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو گردش میں نہ ہو۔ ہر شے کی بقا کی بنیادی شرط لگاتار گردش میں رہنا ہی ہے اور جس لمحے بھی یہ گردش رکی سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا۔مولانا روم کا صوفیانہ کلام پیش کرتے ہوئے اس نے مزید وضاحت کی۔

"A secret turning in us
makes the universe turn.
Head unaware of feet
and feet head
neither cares.
they keep turning."

میری توجہ ہال میں نہایت تیزی سے چکر پھیریاں کھاتے ہوئے سیاہ رنگت والے دراز قد رقاص نے پھر اپنی جانب مبذول کرالی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا رقص آہستہ آہستہ احتجاج کی شکل اختیار کر رہا ہو۔شاید وہ ہوش اور مدہوشی کے بین بین اپنے بنانے والے سے احتجاج ہی تو کر رہا تھا۔اپنے نامکمل ہونے کا احتجاج،اپنے ادھورے پن کا احتجاج،جیسے کہہ رہا ہو:

میں منتظر ہوں کسی ہاتھ کا بنایا ہوا
کہ جس نے مجھ میں ابھی اور رنگ بھرنے ہیں

آدھے ادھورے پھیکے رنگوں سے بنی ہوئی اس کی تصویر میں دھنک کے سارے ہی رنگ موجود تھے سوائے ساتویں رنگ کے۔لگتا تھا اس کی آفرینش میں بنانے والے نے ساتویں رنگ کی جگہ آٹھواں رنگ استعمال کر دیا تھا۔اسی لیے تو وہ نہ مکمل مرد بن سکا اور نہ ہی عورت۔بس دونوں کے بیچ کی کوئی آدھی ادھوری چیز۔

دیکھنے میں تو وہ مکمل مرد ہی نظر آتا تھا لیکن مرد کے خول میں جیسے ایک نسوانی روح اس کے اندر حلول کر دی گئی تھی۔دھنک کے ساتویں رنگ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کی تلاش کے پاؤں میں جیسے چھالے سے پڑ رہے تھے۔

ساتواں رنگ کائنات کی تخلیق میں کس قدر اہم ہے اس کی قدر و قیمت تو وہی جان سکتا ہے جس کے وجود میں اس رنگ کی

آمیزش ہونے سے رہ گئی ہو۔ ساتواں رنگ جو انسانیت کا مرکز ومحور ہے۔ جو بندے کا اپنے خالق سے ایک روحانی تعلق پیدا کرتا ہے۔ کائنات کا یہ رنگ ساتوں زمینوں اور آسمانوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ ان میں ایک Harmony اور ایک خوبصورت Rytham پیدا کرتا ہے جو تمام کائنات میں جاری وساری رہتا ہے۔

میں کسی گہری سوچ میں کافی دور نکل گئی تھی۔

''اسی لیے تو دھنک کے سات رنگ، دنیا کے سات عجوبے، خانۂ خدا کے سات چکر، ہفتے کے سات دن، موسیقی کے سات سُر اور سات گناہ کبیرہ.....سب اپنے اندر کچھ معنویت رکھتے ہیں۔ گویا کائنات پر سات کے ہندسے کی حکمرانی ہے۔''

میں نے مسکرا کر سوچا۔

وہ شکایتوں کی گٹھڑی سر پر رکھے، اندر کی موسیقی کے شور سے بوکھلا کر نہ جانے کن کیفیتوں کے حصار میں کبھی ہتھیلیوں کو خاص زاویے سے اوپر نیچے کرنے اور کبھی دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر گول گول دائروں میں بہت تیزی سے تھرکتے ہوئے بدن کی ساری محرومیوں کو کشید کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہوئے کہہ رہا ہو:

بدن دیا ہے اگر رونق بدن بھی دے
شجر ہوں میں تو مجھے سبز پیرہن بھی دے

اُدھر قونیہ کی محفل سماع میں رقص درویش اپنے عروج پر تھا۔

وسیع وعریض ہال کے عین وسط میں سبھی درویش رقص کے دوران اپنے دائیں ہاتھ کی کھلی ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے جبکہ بائیں ہاتھ کی ہتھیلیوں کا رُخ زمین کی جانب تھا۔

پس پردہ کمنٹیٹر کہہ رہا تھا ''آسمان کی طرف اٹھا ہوا دایاں ہاتھ آسمان سے نازل ہونے والے فیوض وبرکات کو سمیٹ رہا ہے جبکہ بایاں ہاتھ ان انوار کو زمین کی طرف منتقل کرتا جا رہا ہے۔ درویشوں کے رقص کے مختلف مراحل میں سینے پر بندھے ہوئے ہاتھ اپنے خالق کی وحدانیت کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس کی فکر کر رہے ہیں۔ اس کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ اس کی حمد وثنا اور بندگی کر رہے ہیں۔ جس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ زمین وآسمان کی مالک بس وہ پاک ذات ہی ہے۔''

اِدھر بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟

کی مسلسل تکرار پر ورلنگ درویشز (Whirling Dervishes) کی مانند رقص کرتا ہوا وہ ساتویں رنگ کی کھوج میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

اُدھر ہال میں درویشوں کا رقص بھی اس مرحلے پر پہنچ چکا تھا جہاں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی روح اپنے محبوب کی جانب محو پرواز ہے۔ انوار کی بارش میں نہائے ہوئے درویش جیسے اپنے خالق ومالک کی ذات وصفات کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔

ان کے وجود اضطراری کیفیت میں کافی دیر گردش کرنے کے بعد اب آہستہ آہستہ پرسکون ہوتے جا رہے تھے جیسے ان پر

ایک وصل کی کیفیت طاری ہو چکی ہو۔

ہال میں اختتامی موسیقی بجائی جا رہی تھی۔ اس مرحلے پر رقص رک چُکا تھا اور شیخ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہال کے وسط میں کھڑے درویشوں کے پاس آ گیا تھا۔ سب اُسے جھک جھک کر سلام کر رہے تھے اور پھر درویشوں کا طائفہ آہستہ آہستہ پس پردہ چلا گیا۔

ادھر دراز قامت رقاص تھرکتے تھرکتے نڈھال ہو چکا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے حالت استغراق میں وہ اپنے بنانے والے سے راز و نیاز کر رہا تھا۔ اپنے نامکمل وجود کا نوحہ پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

میں گردِ راہ سے کب تک ہوا کا رُخ دیکھوں
دیئے ہیں پر تو انہیں کھولنے کا فن بھی دے

تالیوں کا شور آہستہ آہستہ معدوم ہو رہا تھا۔

ڈھولک پر تھاپ پڑنی بند ہو گئی تھی۔

مگر وہ وہیں زمین پر مراقبے کی سی کیفیت میں کافی دیر تک بیٹھا رہا جیسے کسی غیر مرئی وجود سے محوِ گفتگو ہو۔

یہ اٹلی میں ہمارے سات روزہ ادبی سیمینار کا آخری دن تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی اور دوسرے دن اس کے علاوہ اور کئی مندوبین کو علی الصبح ہی میلان ایئرپورٹ سے واپسی کی فلائٹس پکڑنا تھیں۔ اس لیے اسے ڈسٹرب کیے بغیر ہی سب مندوبین آہستہ آہستہ ڈائننگ ہال میں سے اٹھ کر سونے کے لیے چلے گئے۔

یوں تو وہ ایک بہت اچھا لکھاری تھا مگر اس کی اصل وجہِ شہرت اس کی تحریروں کو پھلانگ کر بہت آگے نکل گئی تھی۔

اردو ادب میں غالباً یہ پہلا موقعہ تھا جب کسی نے اپنی جنس اور جنسیت (Sex & sexuality) کا اظہار یوں کھلے بندوں کیا ہو۔

اس نے اپنے ہم جنس پرست (Homosexual) ہونے کا اعتراف کر لیا تھا۔ بقول اس کے ''ایک آزاد معاشرے میں رہتے ہوئے اسے گیان مل چکا تھا اور اسے سچ بولنا آ گیا تھا۔''

اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس سچائی کے اعتراف میں اس پر لعنت ملامت کے نوکیلے پتھروں کی بوچھاڑ کے سوا اسے کچھ اور ملنے والا نہیں تھا اسی لیے تو اسے کہنا پڑا۔

خود اپنی راہ نکالی ہے میں نے پتھر سے
تمام عمر گزاری ہے اپنے ڈھب کے ساتھ

اپنے ڈھب کی زندگی گزارتے ہوئے وہ امریکہ میں ہم جنس پرستوں کی تحریک (Gay movement) کا سرخیل بن چکا تھا۔

ان کے جلسے جلوسوں کی رہنمائی کرتے ہوئے وہ اکثر سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس، زیورات سے لدا پھندا ایک انوکھی چھب سے دیکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا تھا۔ حنائی ہاتھوں کے ساتھ شرماتا لجاتا، ناز و ادا دکھلاتا کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آتا تھا۔ اپنے اس مخصوص گٹ اپ کا ذکر اس نے اپنا انگریزی شاعری کی کتاب میں کچھ یوں کیا ہے:

"I wear some time flashy
red garb,
lipstick,
Adorn my hair with sandoor
and jhoomer my ears, nose
and neck with gold ornaments,
my palms and feet are
painted with Henna."

میں اس کی نظم پڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی کیا یہ لاشعوری طور پر کسی ان دیکھی دلہن کا گھونگھٹ اٹھانے سے محروم رہ جانے کا نوحہ تو نہیں تھا؟

امریکہ میں ہال آف فیم (Hall of fame) میں اس کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔
ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری اُسے مل چکی تھی۔
دنیا بھر سے اُسے جنس اور جنسیت کے موضوع پر لیکچر دینے کے بلاوے آ رہے تھے۔
اس کی انگریزی شاعری کا مجموعہ ''Myrmecophile'' امریکہ کے سٹی کالجز میں گریجویشن کے کورس میں شامل کر دیا گیا تھا۔

''شہرت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر وہ کیا محسوس کر رہا تھا؟
آزاد ہونے کی اس نے جو قیمت ادا کی تھی وہ اس کی سوچ سے کہیں بہت زیادہ تو نہیں تھی؟
کیا وہ اصل آزادی تھی بھی یا بقول ناسک۔

مجھے آزادی ملی بھی تو کچھ ایسے ناسکؔ
جیسے کمرے سے کوئی صحن میں پنجرہ رکھ دے

میں یہ سب جاننے کی بے حد شائق تھی۔
پرائی زمینوں پر انعام و اکرام اور اعزازات کے باوجود اس کے ہم وطن اس کا نام سن کر یا تو کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جایا

کرتے تھے یا پھر ان کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھر آتی تھی جو جلد ہی ناگواری کے احساس میں تبدیل ہو جاتی تھی۔

ذاتی طور پر مجھے اس کی شخصیت کافی پراسرار سی لگتی تھی۔

چند ادبی دوستوں کے توسط سے میری فون پر ہی اس سے علیک سلیک چند مرتبہ ہو چکی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ ہنستے ہوئے اسے ''باجی'' کہہ کر بلایا تو اس نے جھٹ مجھے ''بھائی جان'' کہہ کر جوابی پتھر مار دیا۔ میں اس کی بذلہ سنجی پر محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں اُسے قریب سے دیکھوں۔ اس کی شخصیت کا مشاہدہ کروں۔ اس سے بہت سے سوال کروں اور بہت سے جواب مانگوں۔

میری اس خواہش کی تکمیل کچھ اس طرح ہوئی کہ ایک روز اچانک ہی اٹلی میں منعقد ہونے والے ایک سات روزہ ادبی سیمینار اور کانفرنس کا بلاوا آ گیا۔

امریکہ، جرمنی، ہالینڈ، پاکستان، سوئزرلینڈ، اٹلی اور برطانیہ سے آنے والے مندوبین کے ناموں میں اس کا نام دیکھ کر مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی۔

''اس سے ملنے کا یہ بہترین موقعہ ہے۔'' میں نے سوچا۔

اس لیے میں اپنی بے پناہ ذاتی اور پیشہ وارانہ مصروفیات کو پس پشت ڈال کر اٹلی جا پہنچی۔

ہمارا قیام میلان شہر کی ہنگامہ خیزیوں سے کافی دور ایک چھوٹے سے قصبے میں تھا۔

ایک پرشکوہ عمارت سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے بیچوں بیچ سر اٹھائے کھڑی تھی۔ دراصل یہ ایک ہوسٹل تھا جو کسی امیر اٹالین زمیندار کی ملکیت تھا اور اس نے اس تنظیم کو جس کی دعوت پر ہم سیمینار میں شرکت کے لیے گئے تھے استعمال کی اجازت دے رکھی تھی۔

ایک دن وہ کہنے لگا ''ہمیں انسانی آبادی سے اس طرح دور رکھا گیا ہے جیسے ہم اچھوت ہوں۔'' اس کی بات سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''ہمارے اچھوت ہونے میں کیا شک ہے؟ تخلیق کا وائرس تو بہت خطرناک ہوتا ہے۔'' میرا جواب سن کر اس نے زبردست قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ جو شاعر اور ادیب خود ساختہ اناؤں کے چکر میں ہر وقت لڑتے بھڑتے رہتے ہیں میرے خیال میں ان کی ٹریننگ کے لیے ان سب کو سال میں کم از کم ایک مرتبہ سات دنوں کے لیے یہاں چھوڑ دینا چاہیے۔ اس ادبی یاترا سے وہ دُھل دھلا کر جب نکلیں گے تو ادب میں بہتری کے امکانات پیدا ہوں گے۔''

تمام دن ادبی مصروفیات میں گزارنے کے بعد مندوبین جب شام کو ڈائننگ ہال میں جمع ہوتے تو سارے دن کی روئیداد

کے ساتھ ساتھ خوش گپیاں، ہنسی مذاق، قہقہے اور نوک جھونک بہت اچھی لگتی تھی۔

اتنے سارے ادیبوں کا ایک چھت کے نیچے جمع ہونا حقیقت نہیں بلکہ خواب لگ رہا تھا۔ سب لوگ کافی رات گئے تک ہال میں کھانا کھانے کے بعد بھی بیٹھے رہتے تھے جیسے اگر سو گئے تو یہ سب لمحے خواب و خیال بن کر بکھر جائیں گے۔

شروع شروع میں وہ قدرے ریزرو تھا۔ ہر ایک کا گہری گہری نگاہوں سے جائزہ لیتا رہتا جیسے وہ دلوں اور ذہنوں کا ایکسرے کر رہا ہو لیکن جب اس کی شخصیت نے پر کھولنے شروع کیے تو پتہ چلا کہ وہ زبردست مجلسی آدمی تھا۔ جتنی دیر وہ ڈائننگ ہال میں بیٹھا رہتا ہر ایک کی توجہ اس کی طرف مبذول رہتی۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع المطالعہ بھی تھا۔ سینکڑوں لطیفے اُسے زبانی یاد تھے جو اُس کی گفتگو میں حسِ مزاح کا تڑکہ لگا کر حاضرین محفل کو خوب ہنسنے ہنسانے کا موقعہ فراہم کرتے۔ اس کی حاضر جوابی پر زبردست حسِ مزاح سونے پر سہاگے کا کام کرتی جس سے محفل میں ہمہ وقت پھلجڑیاں سی پھوٹتی رہتی تھیں۔

ایک دن بڑی آہستگی سے کہنے لگا ''بڑی راز کی بات ہے صرف تمہیں ہی بتا رہا ہوں۔''

''کیا بات ہے؟'' میں نے کہا؟

''ہال میں جب بھی آتا ہوں ایک آدمی مجھے عجیب عجیب نظروں سے گھورتا رہتا ہے۔ مجھے تو اس سے ڈر لگنے لگ گیا ہے۔''

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا ''تمہیں دیکھ کر تو لوگ ڈر جاتے ہیں تم اُس سے کیوں ڈر رہے ہو؟''

''ہنی (Honey) مجھے تو اس کی بیوی پر بڑا ترس آتا ہے۔ کتنی پرکشش ہے اور یہ مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔''

میں نے ''نو کومنٹ'' کہہ کر بات ختم کر دی۔

ہر ادبی سیشن کے لیے وہ نہایت اہتمام سے تیار ہوتا۔ سیاہ چائنیز کٹ ہاف کوٹ کے گلے اور بازوؤں پر خوبصورت طلائی کام۔ ڈائمنڈ، یاقوت، زمرد، الماس، عقیق، فیروزے اور پکھراج کے کئی ہار گلے میں ڈالے، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں خوبصورت نگینوں والی انگوٹھیاں سجائے اور سر پر بڑا سا کاؤ بوائے اسٹائل کا ہیٹ لیے جب وہ ایک خاص انداز سے چلتا ہوا صبح ڈائننگ ہال میں داخل ہوتا تو سب خواتین کے چہروں پر ایک خاص قسم کی مسکراہٹ سی پھیل جایا کرتی تھی جبکہ مرد حضرات (شاید شرمندگی سے) کچھ دیر کے لیے نگاہیں نیچی کر لیا کرتے تھے۔

اس کی سج دھج دیکھ کر کبھی تو ہم خواتین کم مائیگی کا شکار ہونے لگتیں مگر جلد ہی ہم سر کو جھٹک دیتے کہ کیا واہیات بات ہے۔ ہم یہاں ایک ادبی سیمینار کے لیے آئے ہیں کسی مقابلہ حسن میں شرکت کرنے نہیں کہ اگر ہمارے بناؤ سنگھار میں کچھ کمی رہ گئی تو ججز ہمارے مارکس کاٹ لیں گے اور پھر اُس سے ہمارا کیا مقابلہ؟

دن کے وقت کانفرنس اور سیمینارز میں تو بات چیت کرنے کا موقعہ کم ہی ملتا مگر وہ جب بھی مجھے ڈائننگ ہال، برآمدوں یا

لان میں چہل قدمی کرتا ہوا نظر آتا تو میں اس کے لیے کوئی نہ کوئی سوال ضرور تیار رکھتی تھی۔

ایک دن کہنے لگا ''مجھے معلوم ہے لوگ میرے Homosexual ہونے کے بارے میں بڑے Derogatory انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ اکثر دوست احباب یہ باتیں میرے گوش گذار کر کے اصرار کتے ہیں کہ میں ان لوگوں پر جوابی پتھر پھینکوں مگر میرا اصول ہے کہ اگر میں نے کوئی بات اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی یا کانوں سے نہیں سنی تو میں صرف سنی سنائی باتوں پر کیسے اعتبار کرلوں۔''

اُس کی بات سن کر مجھے اس وقت اس کا قد کوہ ہمالیہ سے بھی اونچا محسوس ہوا جبکہ اسے دوسروں کے خلاف لگائی بجھائی کر کے لکھنے پر اکسانے والے بونوں سے بھی زیادہ کوتاہ قد نظر آ رہے تھے۔

ان سات دنوں میں مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ میرے لگاتار سوالوں سے کنی کترا رہا ہو۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ میں جب بھی اسے ہار سنگھار کئے ہوئے دیکھتی تو میری ازلی سنجیدگی نہ جانے کہاں گم ہو جاتی اور مجھ میں بے پناہ شوخی عود کر آتی۔ میرے اندر سے جیسے ایک شریر سا بچہ ہمکتا ہوا آگے بڑھ بڑھ کر کبھی اس کے گلے میں پڑے رنگ برنگے ہار تو کبھی اس کی چمکتی ہوئی انگوٹھیوں سے کھیلنے کی کوشش کرتا یا پھر اس کے سر پہ سلیقے سے رکھے ہوئے بڑے سے ہیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گرانے کی کوشش کرتا۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی ہم سب آؤٹنگ کی غرض سے وینس، پیسا کا لیننگ ٹاور اور رومیو جولیٹ کی بالکونی دیکھنے جا رہے تھے۔ میں قدرے تاخیر سے کمپاؤنڈ میں پہنچی۔ سب گاڑیوں میں لوگ بیٹھ چکے تھے صرف اس کی گاڑی میں ایک سیٹ خالی تھی۔ ڈرائیور نے مجھے وہاں بٹھانے کے لیے جیسے ہی منہ کھولا تو وہ تڑپ کر بولا ''خدا کے واسطے یہاں اور جسے مرضی بٹھا لو مگر اُسے مت بٹھانا'' گاڑی میں پہلے سے بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے جب مجھے یہ بات بتائی تو میں زبردست قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکی۔

تیر نشانے پر لگا تھا۔ میرے مسلسل مشاہدے اور اس کے اندر اترتے ہوئے سوالوں کے لیزر بیم سے یقیناً وہ بوکھلا گیا تھا۔

اپنی Sexuality کی اس قدر دلیرانہ تشہیر کے باوجود مجھے وہ اندر سے کچھ خوفزدہ سا، ڈرا ڈرا کچھ سہما سہما سا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کانچ کے ہزاروں لاکھوں رنگین ٹکڑوں سے بنے ہوئے خوبصورت شیش محل میں براجمان تھا۔ اسے اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی زبردست پتھر آ کر اس شیش محل کو چکنا چور نہ کر دے۔

اس کے عدم تحفظ کے احساس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ژاں پال سارتر کی بات یاد آ گئی کہ ''اگر تم خود سے ڈر گئے تو یہ دنیا کا سب سے بڑا خوف ہوگا۔'' یقیناً خوف کے آکٹوپس نے اسے بھی اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

ایک شام وہ ڈائننگ ہال میں اپنے مخصوص کونے میں بیٹھا وائن کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کے علاوہ چند اور مرد مند و بین بھی شام کو ہال کے اس کونے میں بیٹھ کر وائن سے شغل کیا کرتے تھے اس وقت تمام خواتین باہر ٹیرس پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرتیں اور ہال کے اندر جانے سے حتی المقدور گریز کرتیں۔

ایک دن خواتین کی روایتی گفتگو سے بور ہو کر میں ہال کے اس گوشے کی طرف نکل گئی جہاں ناؤ نوش کا دور تقریباً ختم ہو چکا تھا مگر وہ ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا آخری پیگ ختم کرنے کی کوشش میں تھا۔

میں خاموشی سے جا کر اس کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کئی خاموش لمحے گزرنے کے بعد میں نے پوچھا ''ڈرنک کیا جا رہا ہے؟''

''وائن پیو گی؟'' اس نے میرے سوال کے جواب میں ایک اور سوال جڑ دیا تو میں نے بڑی دلیری سے جواب دیا ''ہاں پی لوں گی۔''

میرا جواب سن کر اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری اور مجھے آزمانے کے لیے اس نے جھٹ پاس ہی پڑے گلاس میں وائن انڈیلنی شروع کر دی۔

میں وائن کا گلاس سامنے رکھ کر کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی تو وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولا ''اب پیتی کیوں نہیں ہو؟''

''پی لوں گی اتنی جلدی کیا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

''یہاں نہیں باہر جا کر پیوں گی۔'' میں نے متانت سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی میں وائن کا گلاس اٹھا کر باہر ٹیرس پر آ گئی۔ میرے ہاتھ میں وائن کا گلاس دیکھ کر ٹیرس پر بیٹھی ہوئی سبھی خواتین کی نگاہیں ایک ساتھ سوالیہ نشان بن کر اٹھیں ''ڈونٹ وری'' میں نے مسکراتے ہوئے کہہ کر وائن کا گلاس قریبی گلاب کی کیاریوں میں انڈیل دیا تو سبھی خواتین نے کورس میں مل کر ماہیا گانا شروع کر دیا:

سو ہے رنگ نیں شراباں دے
بھیڑیاں جدائیاں سجنا
پھکے رنگ نیں گلاباں دے

میں نے واپس ہال میں آ کر جیسے ہی خالی گلاس اس کے سامنے رکھا وہ حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''پی لی؟''

میں خاموش رہی تو وہ پھر بول پڑا ''نہیں تم نے اُسے پھینک دیا ہے۔''

اس نے اتنے وثوق سے کہا جیسے اسے مکمل یقین تھا کہ میں نے وائن نہیں پی تھی۔

مجھے پھر خاموش کھڑے دیکھ کر تقریباً سرزنش کرنے والے انداز میں وہ بولا:

"How disrespectful it is not to respect the wine."

میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر خاموشی سے ہال سے باہر نکل آئی۔

ایک ادبی سیشن خاص طور پر اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ پاکستان سے آئے ہوئے ایک سینئر قلم کار اور ٹی وی پروڈیوسر نے اس سیشن کی صدارت کی۔ اختتامی خطبے میں اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جو لگتا تھا کہ اسے سخت ناگوار گذری تھی، ''اس قسم کے

لوگوں کو ہمارے معاشرے میں مخنس کہا جاتا ہے۔''

میں جانتی تھی کہ وہ اپنی پہچان ایک مخنس کے طور پر کروائے جانے کے سخت خلاف تھا۔ بعد میں کہنے لگا ''یہ شخص جس نے یہاں مجھے مخنس کہا ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ میری عزت افزائی کر رہا ہے مگر باہر میرے بارے میں اور نہ جانے کیسی کیسی باتیں لوگوں سے کرتا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کچھ دل برداشتہ سا لگ رہا تھا۔

اگلے دن کے سیشن میں فیمینزم پر بات ہو رہی تھی۔ رسمی مقالات پڑھنے کی بجائے یہ ایک اوپن ڈسکشن سیشن تھا۔

سبھی مندوبین اظہار خیال کر رہے تھے۔ اس کا نقطہ نظر تھا کہ ''خواتین کی لکھی ہوئی ہر تحریر نسائی تحریر نہیں کہلا سکتی کیونکہ نسائیت کا مکمل شعور اور بھرپور احساس تو بہت سی لکھنے والیوں میں بھی مفقود ہے۔ پروین شاکر صرف اس لیے اردو شاعری میں مائل سٹون (Milestone) بن گئی ہے کہ اس نے مردوں کو گالیاں دینے کی بجائے بھرپور انسانی شعور کے ساتھ بڑے دھیمے لب و لہجے میں پہلی مرتبہ عورت کے داخلی جذبات و احساسات کی بات کی ہے۔''

سبھی مندوبین پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر وہ پھر بولا ''مردوں کا نسائی شعور پر لکھنا ناممکن ہے کیونکہ ایک عورت کے اندرونی جذباتی اور نفسیاتی کیفیات سے پوری طرح ایک عورت ہی صحیح معنوں میں واقف ہو سکتی ہے۔ اس کی بات سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

میں نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا ''ہم ہمیشہ ادب میں عورتوں اور مردوں کے خیالات اور جذبات و احساسات کی ہی بات کرتے ہیں کیا کسی نے کبھی سوچا ہے کہ اب ہمارے ادب میں ایک ''تھرڈ ڈائیمنشن'' بھی آ چکی ہے اور ہمیں ادب میں اس کو بھی جگہ دینا ہوگی۔''

میری بات سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ مگر اس کے اندر سے بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کی دردناک صدائیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔

اس کی انگریزی نظموں کا مجموعہ "Myrmecophile" ایک دن ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں پڑی کافی ٹیبل پر چند اور کتابوں کے درمیان پڑا ہوا تھا۔ میں نے اٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔ ایک نظم جس کا عنوان "Infanticide" یعنی نوزائیدہ بچے کا قتل تھا۔ اس نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ زمانہ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کی بات کرتے ہوئے اس نے ایک فکر انگیز بات کہی:

"To be gay is like being
born as a female off spring
..... cant tell the sufferings
I am going through
as a homosexual."

''ہمیشہ خوش نظر آنے والا خوشیا اندر سے کس قدر ناخوش تھا؟'' میں نے دکھ سے سوچا۔ اس وقت وہ مجھے ایک Gay سے کہیں زیادہ Grief کی مورت نظر آ رہا تھا۔

اس سے اگلی نظم کا عنوان اور بھی تڑپا دینے والا تھا۔

"An orphan whose father is alive."

باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانا ایک بچے کے لیے بڑی بدنصیبی کی بات ہے مگر اس بچے کی بدبختی کا کیا کہنا جو باپ کی زندگی میں ہی اپنے آپ کو یتیم سمجھے۔

بُلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کی بازگشت ایک بار پھر فضا میں گونج اٹھی تھی۔

میرے خیال میں اس کی بات ایک زبردست نفسیاتی صدمے Psychological Trauma کی نشاندہی کر رہی تھی۔ وہ ہجوم میں بھی کس قدر اداس اور تنہا تنہا سا دکھائی دیتا تھا۔ اپنے بارے میں اس نے کتنا سچ کہا تھا۔

عمر کٹی ہے کسی آبدوز کشتی میں
سفر تمام ہوا اور کچھ نہیں دیکھا

اتنے سوانگ رچانے کے باوجود وہ کس قدر تنہا اور اداس تھا۔ ایک ایسا چھوٹا سا بچہ جو باپ کی انگلی پکڑ کر چلنے، اس کی ٹانگوں سے لپٹنے اور اس کے کندھوں پر بیٹھ کر زمانے کے سرد و گرم سے ناچشیدہ نگاہوں سے دنیا کو دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

میں کافی دیر تک کتاب ہاتھ میں پکڑے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

میں نے جیسے ہی کتاب بند کی اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کتاب میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا:

"It is for adults only."

پتہ نہیں کب وہ خاموشی سے آ کر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے اس کے طنز کے اوچھے وار سے لڑکھڑانے کی بجائے سوال کر دیا ''اچھا تو تم بالغ ہو؟''

اس نے جواباً طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا ''اس میں کیا شک ہے؟''

''تو دوسروں کی بلوغت کے بارے میں تمہیں کیوں شک ہے؟''

میں نے گویا جرح شروع کر دی۔ اب کی بار وہ خاموش رہا۔

''ہو سکتا ہے جنہیں تم نابالغ سمجھتے ہو وہ تم سے زیادہ بالغ ہوں اور تمہیں نابالغ سمجھتے ہوں۔'' میں نے زہر میں بجھا ہوا تیر پھینکا۔

''میں اور نابالغ؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں تم!'' میں نے لفظ تم پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اپنی Sexuality کا اشتہار لگا کر، عورتوں کی طرح سولہ سنگار کر کے ہم جنس پرستوں کے جلسے جلوسوں کو لیڈ کرنا ہی بلوغت کی نشانی ہے؟''

اب کی بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی کیونکہ وار کافی سخت تھا۔لیکن وہ برافروختہ ہونے کی بجائے خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔جیسے میں نے اس کی توقع کے برخلاف بہت کچھ کہہ دیا ہو۔

اس دن کی تلخ ترش گفتگو کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی اونچی دیوار حائل ہو چکی تھی جو آخری وقت تک قائم رہی۔

اگلے روز کافی مندوبین کی واپسی متوقع تھی۔

رات بہت دیر تک جاگتے رہنے کے باعث میں صبح قدرے تاخیر سے اٹھی۔جس وقت میں نیچے کمپاؤنڈ میں آئی تو اس کی گاڑی ایئرپورٹ جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

''خدا حافظ کہنے کا موقعہ بھی نہ ملا.....شاید اچھا ہی ہوا.....رات کی گفتگو سے جو بدمزگی پیدا ہوئی تھی اس کے بعد نہ جانے کس طرح سے الوداع کہا جاتا؟''میں نے خود سے کہا۔

اٹلی سے واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد خبر ملی کہ وہ ساتویں رنگ کی تلاش میں ہم سب کو چھوڑ کر کہیں بہت دور نکل گیا تھا کبھی نہ واپس آنے کے لیے.....

''بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟'' کی سرمدی تکرار ایک بار پھر فضاؤں میں گونج اٹھی تھی۔

یہ آئینوں کے مقدر میں کیسی رات آئی؟
کہ اب تو عکس بھی ان میں نظر نہیں آتا

(رضیہ اسماعیل)

باکا

اس کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے ہارمونیم کی آوزسن کر میں تھوڑی دیر کے لیے ضرور رُک جایا کرتا تھا۔
کبھی کبھار تو میں اس کے کمرے کی ہمیشہ بند رہنے والی کھڑکی کے پاس جا کر دبیز پردوں میں سے گھور گھور کر کمرے میں کچھ دیکھنے کی ناکام کوشش بھی کیا کرتا تھا حالانکہ یہ کوشش ایسی ہی تھی جیسے کوئی موم کے پر لگا کر سورج کے قریب جانے کی کوشش کرے۔

اتنا بڑا خطرہ مول لیتے وقت میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس کی شخصیت اتنی خوفناک قسم کی کیوں تھی؟
جب میں نے اسے پہلی مرتبہ کئی مہینے قبل دیکھا تھا تو وہ مجھے اس وقت ہی بہت پراسرار سا لگا تھا۔
اس کی شخصیت سے بڑھ کر مجھے اس کا اوٹ پٹانگ قسم کا نام بہت الجھن میں ڈالے ہوئے تھا۔
''بھلا باکا بھی کوئی نام ہے؟''
میں نے تمسخرانہ انداز میں گویا اس کی ذات کی نفی کرنا چاہی تو پاپا نے مجھے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔
عجیب اتفاق تھا کہ میں جب کبھی بھی اس کے نام کے بارے میں استفسار کرتا تو وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہوتا تھا اس لیے پاپا اس کے بارے میں کچھ بھی کہنے سے احتراز کرتے۔
میں کافی دیر سے اینکسی کے برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر کبھی بیٹھے اور کبھی تقریباً لیٹے ہوئے پاپا کی توجہ کا منتظر تھا۔لیکن پاپا اس قدر انہماک سے کچھ لکھ رہے تھے کہ انھیں گردوپیش کی جیسے کچھ خبر ہی نہیں تھی۔
اتنی دیر تک خاموش بیٹھے رہنا مجھے سخت ناگوار گزر رہا تھا اور ویسے بھی زیادہ دیر تک خاموش رہنا میری فطرت کے خلاف تھا۔اس لیے میں نے بوریت سے تنگ آ کر دھوپ میں کافی دیر سے اٹین شین کھڑے ہوئے اس شخص کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔
''گو وقت کے فریم دھندلا چکے ہیں مگر وہ جوانی میں یقیناً ہینڈسم رہا ہوگا۔''
میں نے اس کے سراپا کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچا۔
درمیانے سے قدرے نکلتا ہوا قد، چھریرا بدن جیسے بہت زیادہ کسرت کرتا رہا ہو کیونکہ اس کے جسم پر کہیں ایک انچ بھی زائد گوشت نہیں تھا۔

متوازن نقوش اور کافی حد تک صاف رنگت جو چہرے کی شادابی کے رخصت ہو جانے کے بعد اب کچھ مٹیالی مٹیالی سی ہو چکی تھی۔ بیضوی چہرے پہ ستواں ناک اور پھیلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، بڑھی ہوئی داڑھی جیسے کئی ہفتوں سے تراشی نہ گئی ہو۔

سر پر کسی زمانے میں گہرے گھنے بال رہے ہوں گے مگر اب کافی حد تک چھدرے ہو چکے تھے بلکہ ان میں جگہ جگہ کپاس پھوٹ رہی تھی۔ کنپٹیاں کافی سفید ہو چکی تھیں۔ عمر یہی کوئی پچاس پچپن کے قریب ہوگی مگر زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔

میرے نزدیک اس کی شخصیت کو مزید گھمبیر بنانے والی چیز اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں تھیں۔ جنہیں وہ کبھی کھولتا تو کبھی میچ لیتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے مٹھی بھر ریت اٹھا کر اس کی آنکھوں میں پھینک دی ہو۔ جس کی چبھن کے ساتھ ساتھ سورج کی تیز روشنی اس کے لیے خاصی تکلیف دہ ثابت ہو رہی ہو۔

اس تمام عرصے میں اس نے میری طرف بالکل کوئی توجہ نہ دی جیسے میں اس کے نزدیک کوئی بے حد حقیر قسم کی چیز تھی جو کسی طور بھی دیکھنے کے لائق نہیں تھی۔

لیکن اس وقت بات میرے کسی کمپلیکس کی نہیں تھی بلکہ اس کی پراسرار شخصیت کی تھی جو بڑی دل جمعی سے تیز دھوپ میں کافی دیر سے فوجی انداز میں سلیوٹ مارنے والی پوزیشن میں بے حس و حرکت کھڑا جیسے اپنے کمانڈر کا کوئی حکم بجالا رہا ہو۔

ذرا اور غور سے دیکھنے پر لگتا تھا کہ وہ جیسے وقفے وقفے سے زیر لب مسکرا رہا تھا۔ میں نے جب اس بار اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دیکھی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی خوبصورت انسانی جذبے کا اظہار بھی کر سکتا تھا کیونکہ اتنے سارے مہینوں میں مجھے وہ انسان سے زیادہ ایک روبوٹ معلوم ہوتا تھا جو نہایت میکانکی انداز میں لگے بندھے طریقے سے ناک کی سیدھ میں چلتا رہتا ہے۔

اس کی پوری شخصیت پر ایک تکلیف دہ قسم کی پژمردگی سی چھائی ہوئی تھی جیسے پت جھڑ کا موسم وہاں آ کر آگے جانا بھول گیا ہو۔

نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے وہ من ہی من میں کسی سے ہمکلام تھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے کبھی اثبات تو کبھی نفی میں جواب دے رہا تھا۔

اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے بظاہر باہر کی طرف آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود اس نے اپنی اصل آنکھیں اندر کی طرف کھول رکھی تھیں بہت کچھ دیکھ لینے کے بعد جیسے سیراب ہو کر آنکھیں اندر کی طرف برسنا شروع کر دیں اور اندر کا وجود طغیانیوں کی زد میں آ جائے۔

بظاہر لاتعلق اور پرسکون سا دکھائی دینے والا یہ شخص اس سمندر کی مانند لگ رہا تھا جس کی عمیق تہہ میں بے شمار آبی بلائیں ہمہ وقت حرکت میں رہتی ہیں لیکن جب کبھی وہ سطح سمندر پر نمودار ہونے کی کوشش کرتی ہیں تو پرسکون سمندر شوریدگی کی انتہائی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔

جب سے وہ ہمارے ہاں آیا تھا اکثر خاموش ہی رہتا تھا مگر ایک مرتبہ وہ خاصی شوریدگی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

اس وقت اس کی بڑی بڑی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھی تھیں جن سے وحشت کچھ اس طرح ٹپک رہی تھی جیسے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے پھیل کر دو انڈوں کی شکل اختیار کر چکے ہوں جن مین سے کچھ ہی دیر میں دو وحشی چوزے باہر نکل کر دیکھنے والوں کی آنکھیں اُچک لیں گے۔

جب سے اس پر ایسی شوریدگی طاری ہوئی تھی پاپا نے مجھے اور چھوٹی بہن کوئل کو سختی سے بنگلے کے پچھواڑے میں بنی ہوئی اینکسی کی طرف جہاں وہ رہتا تھا اکیلے جانے سے منع کر دیا تھا۔

ہر روز چند گھنٹے اینکسی کے صحن میں تپتی ہوئی دھوپ میں بے حس و حرکت کھڑے رہنا اس کا معمول تھا جو میری سمجھ سے بالکل بالاتر تھا۔اس تمام عرصے میں پاپا برآمدے میں بیٹھ کر کچھ لکھنے میں مصروف رہا کرتے تھے۔

میرے لیے اس کو قریب سے دیکھنے کا یہ بہترین موقع ہوا کرتا تھا اس لیے میں اکثر کسی نہ کسی بہانے پاپا کے پاس جانے کی کوشش کیا کرتا تھا مگر پاپا مجھے جلد ہی وہاں سے بھگا دیا کرتے تھے۔

آج خلاف معمول کافی دیر کے بعد پاپا نے لکھنا بند کر کے سر اٹھا کر مجھے اور اس کو باری باری دیکھتے ہوئے بڑی حیرانی سے پوچھا۔''تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو'' پاپا کی بات سن کر میں پوری جان سے سلگ اٹھا۔''واہ ایک تو جنگی قیدی کی طرح مجھے یہاں کب سے بٹھا رکھا ہے اور اب اوپر سے پوچھ رہے ہیں کہ میں ابھی تک یہیں ہوں؟''

پاپا کی بات کا جواب دیئے بغیر ہی میں وہاں سے اٹھ گیا۔

جب سے وہ یہاں آیا تھا وہی پاپا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔جس سے مجھے بے حد جلن محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے یہ اقرار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اس نے کچھ ہی عرصے میں میری نظروں میں ناپسندیدہ شخصیت کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

اس کی یوں اچانک گھر میں آمد سے ممّی ہم دونوں بہن بھائیوں کی طرف سے خاصی فکرمند رہا کرتی تھیں۔اور ہمیں اینکسی کی طرف نہ جانے کی بار بار یاددہانی کرانے کے باوجود ہم دونوں پر نظر رکھتیں اور ساتھ ہی فضل بابا کو سختی سے ہدایت کرتی رہتیں کہ بچے اینکسی کی طرف نہ جانے پائیں مگر اتنی پابندیوں کے باوجود میں آنکھ بچا کر اس کی راجدھانی کی طرف نکل ہی جایا کرتا تھا۔

ممّی اور پاپا ہمارے سامنے اس کے ماضی کے بارے میں بالکل کوئی بات نہیں کیا کرتے تھے لیکن میری پندرہ سولہ برس کی متجسس طبیعت کتاب زیست کے سارے ورق ایک ساتھ ہی پلٹ دینے کی متمنی تھی۔

پاپا جب بھی اچھے موڈ میں ہوتے تو ڈھیروں باتیں کیا کرتے تھے وگرنہ دوسروں کی بے وقت مداخلت انھیں سخت ناگوار گزرتی تھی۔لیکن جب سے وہ یہاں آیا تھا پاپا کافی موڈی سے ہو گئے تھے۔لگتا تھا جب وہ بظاہر بالکل فارغ بیٹھے ہوتے تو اس وقت بھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہے ہوتے تھے۔اس لیے میرے دل میں اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ہر اگنے والے سورج کے ساتھ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔

ایک دن پاپا کو بہت اچھے موڈ میں دیکھ کر میں اس کے بارے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ پاپا جانتے تھے کہ میں اس کے بارے میں جاننے کے لیے کس قدر بے تاب رہتا ہوں۔

دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کچھ سوچ کر بولے ''یونس سے میری ملاقات کلکتہ یونیورسٹی میں ہوئی تھی جہاں ہم دونوں نے اکٹھے میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ یونس بے حد ذہین تھا۔ ہنس مکھ اور نہایت مجلسی طبیعت رکھتا تھا۔ خوش ذوق تھا۔ خوش خوراک اور خوش لباس تھا اسے فنونِ لطیفہ سے بہت رغبت تھی۔ بہت اعلیٰ شعری ذوق رکھنے کے ساتھ ساتھ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ ہارمونیم کافی مہارت سے بجاتا تھا۔ آواز میں سوز تھا۔ ہم سب دوست اکثر اس سے گانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ جسے وہ بہت خوشی سے پورا کیا کرتا تھا۔

چائے کا بے حد رسیا تھا۔ اس کی چائے خاص طور پر سیلون کے باغات سے سپیشل آرڈر پر آیا کرتی تھی۔ جسے دیکھ کر ہم سب دوست اس کی نفیس طبیعت کے ساتھ ساتھ اس کی خوش قسمتی پر رشک کیا کرتے تھے کیونکہ اس کا والد کلکتہ کا ایک نہایت خوشحال بزنس مین تھا۔

پاپا کچھ دیر سانس لینے کو رکے اور پھر ایک لمبی آہ بھر کر بولے ''وہ بھی کیا دن تھے۔ نفیس طبع اور بذلہ سنج یونس ہر محفل کی جان ہوا کرتا تھا۔ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ کالج کی بہترین لڑکیوں کی چاہت کو بھی ادائے بے نیازی سے ٹال دیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ سیر و سیاحت کا بے حد شوقین تھا۔ سیلانی طبیعت تھی، ایک جگہ ٹِک کر بیٹھنا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ مختلف زبانیں سیکھنے کا بہت شوقین تھا اسی لیے فرنچ، جرمن اور ڈچ کے علاوہ اس نے تھائی، ملائی اور جاپانی زبانیں بھی سیکھ رکھی تھیں۔

دنیا کے کئی ملکوں کی سیاحت کر چکا تھا مگر ابھی تک اسے فار ایسٹ جانے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔

"Far East always fasereted him."

اس کے شوقِ آوارگی کے سبب ہم سب دوست اسے مذاق میں ابنِ بطوطہ کہا کرتے تھے۔

اپنے کالج کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے پاپا کافی اداس ہو گئے تھے لیکن مجھے اس کے بارے میں جاننے کی بہت جلدی تھی اس لیے جیسے ہی پاپا ذرا خاموش ہوتے تو میں پریشان سا ہو جاتا کہ پتہ نہیں اب اس کے بعد کب پاپا اتنے اچھے موڈ میں ہوں گے؟

اس کی پراسرار شخصیت پر سے ایک ایک کر کے پردے اٹھ رہے تھے اور میں اس کی حیرت کدے جیسی شخصیت سے بے حد مرعوب ہو رہا تھا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اب اس سے دلی ہمدردی ہو رہی تھی اور چند ماہ سے میں نے اسے جو نہایت ناپسندیدہ شخصیت کا ٹائٹل دے رکھا تھا وہ میں نے چپکے سے واپس لے لیا تھا۔

پاپا بتا رہے تھے کہ ''یونس کو سرجری میں بہت دلچسپی تھی اس لیے وہ سرجری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ میں رائل کالج آف سرجنز (ایڈنبرا) میں چلا گیا جبکہ میں نے سائیکاٹری کی پروفیشنل ٹریننگ ہندوستان میں رہ کر ہی مکمل کی اور کلکتہ میں ہی ملازمت اختیار کر لی حالانکہ میری ساری فیملی پنجاب میں تھی۔ شاید یہ یونس کی دوستی کا اعجاز تھا کہ میں کلکتہ کا ہی ہو کر رہ گیا۔

پاپا بہت دھیرے دھیرے یادوں کی کتاب کے ورق الٹ رہے تھے۔

''کیا اس عرصے میں آپ دونوں میں رابطہ رہا؟''

میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''ہاں'' باقاعدہ خط و کتاب ہوتی رہتی تھی پھر یونس اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس کلکتہ آ گیا تھا۔

کیا ان کی شادی ہوئی؟ میرے پوچھنے پر پاپا بتانے لگے۔

''والدین کے بے حد اصرار کے باوجود وہ شادی پر رضامند نہ ہوا لیکن اس نے وعدہ کر لیا کہ جیسے ہی وہ فار ایسٹ میں چین، جاپان، ملائیشیا، فلپائن اور تھائی لینڈ کی سیاحت مکمل کر لے گا اس کے بعد ضرور سیٹل ہو جائے گا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔

''ہونا کیا تھا'' پاپا نے مایوسی سے جواب دیا۔

انسان اپنے منصوبے بنا رہا ہوتا ہے لیکن قدرت اس کے لیے کسی اور ہی منصوبے کی پیش بندی کر رہی ہوتی ہے۔

پاپا نے گلا صاف کرتے ہوئے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

''دراصل ہم جس پل میں زندہ ہیں وہی پل ہمارا ہوتا ہے جو گزر گیا وہ ماضی میں گم ہو گیا اور جو کل آنے والا ہے وہ کس نے دیکھا ہے؟ بس وقت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کروٹ بدل لے اور زندگی کب کون سا موڑ مڑ جائے اور ہم وہیں حیران پریشان کھڑے لکیریں پیٹتے رہ جائیں۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے قدرے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یونس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا'' پاپا نے بڑے دُکھ سے کہا۔ ''یہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز کا زمانہ تھا جب 1939ء میں جرمنی نے پولینڈ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا لیکن جنگ کا دائرہ ابھی یورپ سے باہر کے ملکوں تک نہیں پھیلا تھا۔ منع کرنے کے باوجود اور عالمی منظر نامے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے یونس جون 1941ء میں فار ایسٹ کی سیاحت کے لیے نکل گیا۔''

پاپا جیسے ہی خاموش ہوئے ممّی کی اچانک آمد نے ہمیں وقت کے گزرنے کا احساس دلایا۔ ''رات کافی بیت چکی ہے اور آپ ابھی تک باتوں میں ہی لگے ہوئے ہیں۔'' وہ قدرے خفگی سے بولیں۔

''ممّی پلیز پاپا سے بس تھوڑی سی بات اور کرنی ہے پھر میں سونے کے لیے چلا جاؤں گا۔'' میں نے ممّی کی طرف بڑی پرامید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آج کافی دنوں کے بعد باپ بیٹے میں راز و نیاز ہو رہے ہیں۔ بس تھوڑی دیر اور بات ہو سکتی ہے کیونکہ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔''

ممّی نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔

کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے پاپا کا شانہ ہلاتے ہوئے میں نے بے صبری سے کہا ''پاپا! جلدی بتائیں ناں۔ پھر کیا ہوا؟''

''جرمنی کے رویے سے پوری دنیا میں تشویش کی لہر دوڑ چکی تھی۔ کئی طرح کے اندیشے ملکوں ملکوں سر اٹھا رہے تھے۔

تمہارے دادا کا جکارتہ میں قیمتی پتھروں کا کاروبار تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ وہاں کاروبار کو سمیٹ کر سارا سرمایہ ہندوستان منتقل کر دیں۔ اس لیے انہوں نے مجھے صلاح مشورے کے لیے جکارتہ آنے کو کہا۔

میرے اور یونس کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ ہم چند ماہ بعد جکارتہ میں ملیں گے اور پھر دونوں اکٹھے ہی ہندوستان واپس آ جائیں گے مگر سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

''کیوں؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''بدقسمتی سے دسمبر 1941ء میں جاپان نے پیسفک میں ویسٹرن کالونیز (Western colonies) پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے یورپ کے ساتھ ساتھ ساؤتھ ایسٹ ایشیا بھی ورلڈ وار کا تھیٹر بن گیا۔ اس طرح انڈیا، برما، تھائی لینڈ، ملایا، سنگاپور، ہانگ کانگ، سب ہی جنگ کی لپیٹ میں آ گئے اور ہم سب کئی برس تک وہیں پھنس کر رہ گئے۔

پاپا پر نیند کا غلبہ طاری ہو رہا تھا ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سن کر ممّی نے مجھے بھی سونے کے لیے بھیج دیا مگر میرا ذہن نیند کی وادیوں میں اترنے کی بجائے عالمی منظر نامے میں کھویا ہوا تھا۔

میری وارفتگی کو دیکھتے ہوئے تاریخ نے اپنی کتاب کھول لی۔

جاپان کے اچانک حملے نے ویسٹر کالونیز میں تھرتھلی مچا دی تھی۔ یہ ڈچ ایسٹ انڈیز جسے آج کل انڈونیشیا کہا جاتا ہے کی تاریخ کا نازک ترین دور تھا۔ اس ملک کا انتظام و انصرام جاپان کے حملے سے قبل نیدرلینڈ (ڈچ) کے ہاتھ میں تھا۔ جاپانیوں کے سامنے ڈچ اقتدار زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا مگر کہیں کہیں مزاحمت جاری تھی۔

مقامی لوگ جو ڈچ حکمرانوں کی چیرہ دستیوں سے کافی دل برداشتہ تھے۔ انہوں نے جاپانیوں کو اس اُمید پر خوش آمدید کہا کہ شاید یہ دوسروں سے بہتر حکمران ثابت ہوں مگر یہ ان کی خام خیالی تھی کیونکہ جاپانیوں نے مقامی لوگوں پر غلامی کا شکنجہ مزید کس دیا تھا۔

ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ہر کوئی غیر محفوظ گویا قیامت صغریٰ برپا ہو چکی تھی۔

کہیں جاپانی مقامی لوگوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے تو وہ علاقے جن پر ابھی ڈچ تسلط تھا وہاں پر ڈچ مقامی لوگوں کو جاپانیوں کے لیے جاسوسی کرنے کے الزام میں زیر عتاب لے آتے تھے۔

میں تاریخ کی سرگوشیاں بڑے انہماک سے سن رہا تھا کہ دفعتاً تاریخ خاموش ہو گئی۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد تاریخ نے کتاب زیست کا ایک اور ورق پلٹا۔

''اقتدار اور اختیار دو ایسی انسانی جبلتیں ہیں جن کے لیے انسان آخری حد تک پار کرنے سے گریز نہیں کرتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے تاریخ سے سوال کر دیا۔

''ادھر جرمنی میں ہٹلر کے جنگی جنون سے مغرب کا ناک میں دم آ چکا تھا کیونکہ ہٹلر سارے یورپ پر کنٹرول حاصل کرنے کا خواہشمند تھا جبکہ جاپان تمام ایشیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کا متمنی تھا۔ ناعاقبت اندیش لیڈروں نے امن عالم کا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا جس نے دوسری جنگ عظیم کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔''

مگر کون کس کے خلاف لڑ رہا تھا؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے تاریخ سے وضاحت چاہی۔

''جاپان، اٹلی اور جرمنی ایک طرف تھے۔ جنہیں (Axis Powers) کا نام دیا گیا جبکہ انگلینڈ، فرانس، آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، روس، چین، انڈیا اور امریکہ اس جنگ میں اتحادی (Allies) تھے۔ اس طرح پہلی جنگ عظیم کے برعکس جو صرف یورپ میں ہی لڑی گئی تھی۔ دوسری جنگ عظیم یورپ سے باہر روس، نارتھ افریقہ اور ایشیا تک پھیل گئی۔'' تاریخ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی ملک غیر جانبدار بھی رہا یا سب ہی جنگ میں کود پڑے تھے؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''کچھ ممالک غیر جانبدار تھے جن میں سپین، سوئٹزرلینڈ، سویڈن اور آئرلینڈ شامل تھے۔'' تاریخ نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اس جنگ کا ہولناک انجام جاپان کے دو گنجان آباد شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر اتحادی امریکی کی طرف سے ایٹم بم گرائے جانے پر ہوا۔''

اب کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر تاریخ کی دبی دبی سسکیاں فضا میں اُبھرنے لگیں۔

ایک طویل وقفے کے بعد تاریخ نے لب کھولے اور اشکبار آنکھوں سے کہا۔ ''میں 6 اگست 1945ء کو کیسے بھول سکتی ہوں کیونکہ یہ انسانی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔''

''اس دن کیا ہوا تھا؟'' میں نے جیسے ہی پوچھا تاریخ بے حوصلہ ہو گئی۔

اس دن نام نہاد ترقی یافتہ انسانی تہذیب نے اپنے ہی ہاتھوں سے خودکشی کی تھی۔'' تاریخ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

میں نے کچھ نہ سمجھے ہوئے نظریں اٹھا کر دیکھا تو تاریخ پھر بول پڑی۔ ''اس دن سوا آٹھ بجے امریکہ نے ہیروشیما پر چار ٹن وزنی بم گرایا تھا پھر 9 اگست کو دن کے گیارہ بج کر دو منٹ پر جاپان کے دوسرے شہر ناگاساکی پر بم گرا کر تین لاکھ سے زائد بے گناہ انسان کو چشم زدن میں زندہ درگور کر دیا۔''

اب کے جیسے سکوتِ مرگ طاری ہو چکا تھا۔

مؤرخ نے لرزتے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کتاب زیست بند کر دی۔ انسانیت کے لرزہ خیز قتل پر نوحہ خوانی کرتی ہوئی

تاریخ خاموشی سے وقت کی خزاؤں میں خیمہ زن ہوگئی۔

رات بہت دیر تک جاگتے رہنے کی وجہ سے دوسری صبح ہم سب ہی کافی دیر تک سوتے رہے۔لیکن اچانک کسی کے چیخنے کی آواز سن کر ہم بدحواس ہو کر اٹھ بیٹھے۔آواز اینکسی کی طرف سے آ رہی تھی۔ ہائے مر گیا۔۔۔بچاؤ۔۔۔بچاؤ۔بچاؤ صاحب'' یہ تو فضل بابا کی آواز تھی۔

پاپا بستر سے نکل کر ننگے پاؤں ہی اینکسی کی طرف بھاگے تو میں بھی ان کے پیچھے ہی اٹھ کر بھاگا۔ممّی اور کوئل بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھیں اور برآمدے میں آ کر کھڑی ہوگئیں۔

گیٹ کے قریب ایک دل دہلا دینے والا منظر تھا۔

فضل بابا زمین پر گرے ہوئے تھے اور وہ انھیں بُری طرح زدوکوب کر رہا تھا۔بابا کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور ان کی پگڑی کھل کر ان کے گلے کے اردگرد اس بُری طرح سے لپٹی ہوئی تھی کہ ان کی آنکھیں باہر کو ابل پڑی تھیں۔اس حال میں بھی چیختے چلاتے ہوئے فضل بابا نے اس کی ٹانگوں کو زبردستی سے پکڑ رکھا تھا جیسے وہ اسے گیٹ کے باہر جانے سے روک رہا ہو۔

پاپا اور مین نے جا کر بڑی تگ و دو کے بعد فضل بابا کی گلو خلاصی کروائی۔اور ہانپتے کانپتے نیم جان فضل بابا کو میں برآمدے میں لے آیا۔

اُدھر پاپا نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا ہوا تھا۔اس کی سرخ انگارہ وحشت زدہ آنکھیں پھر دو بڑے بڑے انڈوں میں تبدیل ہو چکی تھیں اور لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے ان سے دو خونخوار چوزے باہر نکل کر ہم سب کی آنکھیں اُچک لیں گے۔

وہ لگاتار فضا میں گھونسے مار رہا تھا جیسے وہ کسی ان دیکھے وجود سے گتھم گتھا تھا۔'' دیکھ لوں گا میں تجھے مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟ میری جان لینا چاہتے ہو؟'' بازو اٹھا اٹھا کر شدید غصے میں جیسے وہ کسی کو کوسنے دے رہا تھا۔

اس کی یہ حالت کسی کو بھی خوفزدہ کر دینے کے لیے کافی تھی۔

پاپا اسے گھسیٹتے ہوئے اینکسی کی طرف لے جا رہے تھے جبکہ وہ پوری طاقت سے ہاتھ چھڑا چھڑا کر گیٹ کی طرف بھاگ رہا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے اس پر کوئی آسیب سوار ہو گیا تھا۔بڑی مشکلوں سے پاپا نے اسے کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی لگا دی۔

اس واقعہ کے بعد اگلے کئی ہفتے تک وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہا مگر ہمارے پورے گھر پر ایک ماتمی فضا چھائی رہی۔ممّی سخت متفکر تھیں کہ بچوں کی موجودگی میں اس کا ایسی حالت میں گھر میں رہنا ٹھیک نہیں تھا بلکہ اسے مینٹل اسائلم میں بھیج دینا چاہیے تھا۔

''وہ پہلے بھی کئی سال وہاں رہ چکا ہے مگر ٹھیک نہیں ہوا اب میں خود اس کا علاج کر رہا ہوں، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' ممّی کو بضد دیکھ کر پاپا بولے۔

''اسے اس وقت توجہ کی ضرورت ہے۔اس کا ایسے ماحول میں رہنا بہت ضروری ہے جہاں اسے یقین ہو کہ کوئی اسے نقصان نہیں پہنچائے گا۔میں اسے اس حال میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔'' پاپا نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اس کی حالت دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ اگر انسانی دماغ کام کرنا چھوڑ دے تو کہتے ہیں کہ انسان کی کلینکل موت واقع ہو جاتی ہے۔ زندہ دل، نفیس طبع، خوش مزاج، خوش لباس، خوش خوراک اور آرٹ سے محبت کرنے والے شخص کی کلینکل موت تو نہ جانے کب کی ہو چکی تھی؟''

کسی نے چپکے سے کہا۔ ''اس کا فوسل تو بہت پہلے بن گیا تھا مگر زندگی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔''

اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا ذہن چند مہینے پیچھے پلٹ گیا جب وہ یہاں نیا نیا آیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے حال سے بہت زیادہ بیگانہ تھا۔ وحشت و سراسمگی اس کی پور پور سے ٹپک رہی تھی مگر تھوڑے ہی عرصے بعد پاپا کی توجہ پا کر وہ کافی پرسکون ہو گیا تھا بلکہ کسی وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بالکل بھلا چنگا ہو کیونکہ وہ بڑی سمجھ بوجھ والی باتیں کیا کرتا تھا۔

کئی چھوٹے موٹے کام اسے اپنے ہاتھوں سے کر کے خوشی ہوتی تھی۔ وہ اپنے کپڑے خود ہی دھولیا کرتا تھا۔ اینکسی کے چھوٹے سے باغیچے کی دیکھ ریکھ کرنا اور پودوں کو پانی دینا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ کھانا پکانے کا وہ بہت شوقین تھا۔ ایک دن پاپا سے ضد کرنے لگا کہ وہ اپنے چھوٹے سے کچن میں کھانا خود بنائے گا۔

فضل بابا نے اسے ضروری سودا سلف تو لا کر دے دیا مگر پاپا نے اسے سختی سے ہدایت کی کچن استعمال کرتے وقت اس کا خاص دھیان رکھے۔

ایک دن فضل بابا بتا رہے تھے کہ ''صاحب! انہوں نے سالن اس لگن سے تیار کیا ہے کہ بھون بھون کر جیسے گوشت کا کُشتہ مار رہے ہوں۔ مجال ہے کہ مجھے انہوں نے رسوئی میں قدم رکھنے دیا ہو۔ میں بس باہر برآمدے میں ہی چکر لگاتا رہ گیا۔ پھر چائے بنانے لگے تو چائے کو ایسی پھینٹی لگائی۔ ایسی ایسی پٹخنیاں دیں۔ ایسا دھوپی پڑا مارا کہ چائے بیچاری شاید خوف کے مارے دوبارہ ڈبے میں بند ہونے کی دعائیں کر رہی ہوگی۔''

فضل بابا کی بات سن کر ہم سب لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''انشاءاللہ وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' پاپا نے فضل بابا کی باتیں سن کر بڑے پرامید لہجے میں کہا۔ ''چائے اس کی کمزوری ہے۔''

ایک دن فضل بابا ممّی سے کہہ رہے تھے کہ وہ قرآن پاک پڑھنا چاہتے ہیں، پاپا نے بتایا تھا کہ وہ خوش الحان تھا اور جوانی میں بہت خوبصورت قرات کیا کرتا تھا۔

مگر یہ کیا؟ جب فضل بابا نے انھیں قرآن پاک دیا تو وہ باقاعدہ پڑھنے کی بجائے صرف ہر لائن پر انگلی پھیر کر بسم اللہ شریف ہی پڑھ رہے تھے۔

لگتا تھا کہ ان کی یادداشت انھیں دغا دے گئی تھی۔

پاپا نے جب یہ سنا تو انھیں بہت دُکھ ہوا۔

پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا اور وقت رفتہ اب پلٹ کر آنے والا نہیں تھا۔

اب باکا کی حالت دن بدن بگڑنی شروع ہوگئی تھی اکثر اس کے کمرے میں سے مختلف زبانوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ بیچ بیچ میں بے ہنگم قہقہے سنائی دینے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سے جھگڑ رہا ہو۔ پھر چیزیں اٹھا اٹھا کر فرش پر پٹخنے کی آوازیں آتیں۔

پاپا بتا رہے تھے کہ بیماری کی حالت میں اسے آوازیں سنائی دیتی ہیں اور ہیولوں کی مانند کچھ چیزیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

اب فضل بابا جب بھی کھانا لے کر جاتے تو وہ غصے سے اٹھا کر باہر پھینک دیا کرتا تھا۔ ''کبھی کہتے ہیں کہ کھانے میں زہر ہے۔ آپ سب لوگ میرے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کھانا بہت بدمزہ ہے۔ میں ایسا بدذائقہ کھانا نہیں کھا سکتا صرف شاہی باورچی کے ہاتھ کا پکا لذیذ کھانا کھاؤں گا۔''

فضل بابا تشویشناک لہجے میں بتا رہے تھے کافی دنوں سے اس نے فضل بابا کو بھی کمرے میں گھسنے نہیں دیا تھا۔ کھانے کی ٹرے دروازے کے آگے رکھ کر ہی وہ لوٹ آتے تھے۔

ایک دن پاپا خود کمرے میں گئے تو وہاں خاصے صحت مند چوہے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اور کمرے میں کونوں کھدروں میں جگہ جگہ چھوٹی موٹی رکابیوں اور پلیٹوں میں کھانا رکھا ہوا تھا۔

پاپا کے پوچھے پر اس نے کہا کہ ''سپاہیوں کی فوج تیار کر رہا ہوں۔ وہ کھانا نہیں کھائیں گے تو طاقت ور کیسے ہوں گے۔ جاپانیوں سے مقابلہ کیسے کریں گے؟''

ایک دن کافی رات گئے اس کے کمرے سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ''میرے جسم پر کیڑے چل رہے ہیں یہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ کچھ کام کرو۔ میں کیا کام کروں؟'' پاپا اس کا شور شرابہ سن کر جلدی سے اٹھ کر اسے دیکھنے چلے گئے۔

پھر یکا یک اس نے سینہ کوبی شروع کر دی اور ہاتھوں کو اس انداز میں حرکت دینے لگا جیسے زنجیر زنی کر رہا ہو۔ میں ادھ کھلے دروازے میں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پاپا جیسے ہی اسے نیند کی گولی دے کر کمرے سے باہر نکلے میں بھاگ کر برآمدے کے ستون کی اوٹ میں چھپ گیا۔ مبادا پاپا مجھے ڈانٹ پلا دیں کہ میں اتنی رات گئے ان کے پیچھے اینکسی میں کیوں آیا؟

مگر اب چند دنوں سے وہ پُرسکون تھا۔

آج خلافِ توقع اس کے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا شاید فضل بابا باہر سے کنڈی لگانا بھول گئے ہیں یا اب دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے سوچا۔

آج باکا کے کمرے کا کچھ اور ہی رنگ تھا۔ وہ ہارمونیم سامنے رکھ کر زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا اور تصور کر رہا تھا کہ جیسے وہ مغل اعظم، ظلم سبحانی، شہنشاہ اکبر کے دربار کا نام چیں گوّیا تان سین ہو کیونکہ تھوڑی دیر بعد اس نے اٹھ کر بے حد تعظیم سے تقریباً آدھا جھک کر شہنشاہ اکبر کو کورنش بجالاتے ہوئے اپنا تعارف شہنشاہِ موسیقی تان سین کہہ کر کرایا اور ہارمونیم بجانا شروع کر دیا۔

میں کافی دیر تک کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا۔

معلوم نہیں پاپا کب آ کر چپکے سے میرے پیچھے کھڑے ہو گئے اور خاموشی سے سارا منظر دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد آہستگی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بنگلے میں واپس لے آئے۔

''پاپا آپ کو انکل دوبارہ کب اور کہاں ملے؟'' اب میں نے اسے انکل کہنا شروع کر دیا تھا۔

دوسرے دن پاپا کو کافی خوشگوار موڈ میں دیکھ کر میں نے وقت کی کڑیاں ملانے کی کوشش کی۔

پاپا نے بتایا کہ ''تقریباً سات سال تک میں تمہارے دادا اور دوسرے چند عزیزوں کے ساتھ جکارتہ میں پھنسا رہا۔ جاپانی تسلط میں وقت بہت مشکل سے کٹ رہا تھا مگر کوئی جائے امان نہ تھی۔

ادھر ہندوستان میں باقی گھر والوں کی کچھ خیر خبر نہیں تھی۔ مواصلات کا نظام مکمل طور پر درہم برہم ہو چکا تھا۔ ہمارا کاروبار بھی تباہ ہو گیا تھا۔ تمہارے دادا کو سانس کی بیماری تھی۔ ان حالات میں ان کا مرض شدت اختیار کر گیا مگر علاج معالجے کی نہ کوئی سہولت تھی اور نہ ہی دوائیں دستیاب تھیں بلکہ ہم تو چھپتے پھرتے تھے کہ کہیں جاپانیوں یا ڈچوں کی نظروں میں نہ آ جائیں اور جاسوسی کے الزام میں دھر لئے جائیں۔

جاپانی نہایت ہی ظالم اور شقی القلب تھے۔ انسانی ہمدردی سے تو وہ واقف ہی نہیں تھے۔ بہت ہی بے حس اور ایکدم جذبات سے عاری لوگ تھے۔

تمہارے دادا کے بزنس پارٹنر کے دو بیٹے جاپانیوں کے لیے ڈچوں کی جاسوسی کرتے ہوئے پکڑے جانے کے قریب تھے کہ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگے۔ ہمیں ان کی کچھ خیر خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں گئے مگر ڈچ جنہیں ان کی سفید رنگت اور بھورے بالوں کی وجہ سے مقامی باشندے ''بلنڈے'' کہہ کر بلاتے تھے شکاری کتوں کی طرح جگہ جگہ ان کی بو سونگھتے پھر رہے تھے اور بار بار ہمارے علاقے کے چکر لگانے کے علاوہ ہمارے گھروں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔

پاپا ذرا دم لینے کو رکے پھر بڑے غمگین لہجے میں بولے۔

''تمہارے دادا انہی نامساعد حالات میں سانس کی شدید بیماری کی وجہ سے وہاں انتقال کر گئے اور میں ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی ان کے لیے کچھ نہ کر سکا لیکن یہ پچھتاوا زندگی بھر میرے ساتھ رہے گا۔''

پاپا کی اداسی دیکھ کر میں نے کچھ مزید جاننے کے لیے اصرار نہ کیا مگر پاپا خود ہی کہنے لگے (آج شاید وہ باتیں کرنے کے موڈ میں ہیں میں نے سوچا)۔

''1945ء میں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر 1946ء میں ڈچ ایسٹ انڈیز آزاد ہو کر موجودہ انڈونیشیا بن گیا تو ذرا سکھ کا سانس لینا نصیب ہوا لیکن جلد ہی بچے کھچے ایشیائیوں کو بحری جہازوں میں ٹھونس کر ہندوستان روانہ کر دیا گیا۔ ہمارا جہاز کلکتے کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا جہاں سے میں اور میرے چند عزیز بڑی مشکلوں سے امرتسر آ گئے۔''

ان دنوں ہندوستان میں انگریز تسلط سے آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ ہر طرف بن کے رہے گا پاکستان۔۔۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔ لے کے رہیں گے پاکستان کے نعروں کی گونج تھی۔'' پاپا تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولے۔

پھر بٹوارہ ہو گیا۔ عجیب ابتلا کا وقت تھا۔ ہر طرف جلاؤ گھیراؤ، بلوے اور قتل و غارت سے خوفزدہ مسلمان چھپنے چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

آزادی کی اس لڑائی میں ہمارے کئی عزیز کام آ گئے۔ ہم بہ ہزار دقت، گرتے پڑتے، بچتے بچاتے لاہور والٹن کیمپ تک آ پہنچے جہاں انسانی رنج والم کی ان گنت داستانیں چپے چپے پر بکھری ہوئی تھیں۔ بعد میں لاہور شہر میں ہماری آبادکاری ہوئی۔''

''تو پھر انکل آپ کو کہاں ملے؟''

''حالات ذرا قابو میں آئے تو میں نے لاہور میں پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی لیکن مقامی مینٹل ہوسپٹل کے ساتھ مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ میرے کئی کولیگ وہاں کام کر رہے تھے اور وقتاً فوقتاً کئی مشکل کیسز کے لیے مجھ سے کنسلٹ کرتے رہے تھے۔'' پاپا نے بڑے پروفیشنل انداز میں گفتگو کرنا شروع کر دی۔

''ڈاکٹر اختر نے مجھے ایک مریض کی کیس ہسٹری پر مشورے کے لیے انگیج کیا جو کافی عرصے سے مینٹل ہوسپٹل میں تھا۔'' پاپا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''قیام پاکستان کے وقت ڈاکٹر اختر کی ڈیوٹی والٹن کیمپ میں لگی ہوئی تھی اور یہ مریض انہوں نے وہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔''

ڈاکٹر اختر بتا رہے تھے کہ ''مریض کی یادداشت کافی متاثر ہو چکی ہے لیکن کبھی کبھی بالکل ہوش مندانہ گفتگو بھی کرتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق میڈیکل کے پیشے سے رہ چکا ہے۔''

میں فائل سٹڈی کر رہا تھا جبکہ ڈاکٹر اختر آہستہ آہستہ گفتگو کر کے مریض کے سماجی پس منظر کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کرتے جا رہے تھے۔ ''مریض کے میڈیکل نوٹس واضح طور پر شیروفرینیا (Schizophrenia) کی بیماری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کے رویے (Behaviour) میں وہم اور وسوسوں (Delusion) کے ساتھ ساتھ فریب نظر اور فریب خیال (Hallucination) کی کیفیت بھی موجود ہے جس میں اسے کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں اور ہیولے بھی نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں مریض کی چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے۔ اس مریض کے کیس میں توسمعی (Auditory) اور بصری (visual) دونوں طرح کا ہولوسی نیشن موجود ہے۔'' میں نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔

''گو کہ مرض کافی ایڈوانس سٹیج پر جا چکا ہے مگر کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر اختر نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے اگلی ملاقات پر میرا مریض سے ملنے کا پروگرام طے کر دیا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''پہلی ہی ملاقات میں مریض کو کچھ دیر دیکھنے کے بعد میرے اندر ایک زبردست چھنا کا ہوا۔ جیسے بہت تند و تیز آندھی ایکدم آ کر منڈیر پر رکھے پانی کے سارے گھڑے اس بُری طرح الٹ دے کہ ٹوٹی ہوئی ٹھیکریوں کے ساتھ ساتھ آس پاس کی ہر چیز شرابور ہو جائے۔ میری بھی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔

لیکن میں نے مریض پر بالکل بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کیونکہ اچانک پہچان سے اس کو مزید ذہنی صدمہ پہنچنے کا احتمال تھا۔ لیکن میں آج تک حیران ہوں کہ یونس جکارتہ سے ہندوستان اور پھر والٹن کیمپ کیسے پہنچا؟''

''تو انکل نے کب آپ کو پہچانا؟''

کچھ دیر خاموش رہ کر پاپا کہنے لگے۔

''میں باقاعدگی سے یونس کو دیکھنے ہسپتال جاتا رہتا تھا۔ نئے ٹریٹمنٹ پلان اور میری توجہ سے رفتہ رفتہ اس کی حالت سدھرنے لگی اور وہ بھول بھلیوں میں سے راستہ بناتا ہوا ایک دن پہچان کی سرحد پر آن پہنچا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت دیر تک خاموشی اور آنسوؤں کی زبان میں گفتگو کرتے رہے۔''

''اس قدر باتونی یونس پر چپ کا سایہ پڑ چکا تھا۔ میری باتوں کے جواب زیادہ تر ہوں ہاں میں ہی دیتا تھا۔'' پاپا نے نہایت افسردگی سے کہا۔

ایک دن اس کے نہایت مختصر سے سامان میں سے ایک بے حد بوسیدہ ڈائری برآمد ہوئی۔ جسے پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں بہت دیر تک روتا رہا۔

اب پاپا بے حد آزردہ ہو چکے تھے۔

''پتہ نہیں۔ اس نے کب اور کیسے یہ ڈائری لکھی ہوگی اور وہ جاپانیوں کی قید سے کیسے نکلا؟''

کمرے میں ایک گھمبیر خاموشی کافی دیر تک چھائی رہی۔

پاپا نے کچھ دیر اسی کیفیت میں رہنے کے بعد ڈائری کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

''وعدے کے مطابق یونس مجھ سے ملنے جکارتہ آیا تھا مگر وہاں جاپانیوں نے اسے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اسے دشمن کا ایجنٹ سمجھ کر انفارمیشن اگلوانے کے لیے اس پر کئی غیر انسانی حربے استعمال کیے جس سے اس کی ذہنی اور دماغی صحت بری طرح متاثر ہوئی۔'' اتنا کہہ کر پاپا ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔

میں نے بھی وقت کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

دوسرے دن پاپا کی رائٹنگ ٹیبل کی دراز میں پڑی ہوئی ایک بوسیدہ سی ڈائری دیکھ کر میں چونک گیا۔

جیسے ہی میں نے ڈائری کھول کر پڑھنا شروع کیا مجھے اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہوا کیونکہ یہ محض ایک ڈائری نہیں تھی بلکہ جاپانیوں کے لرزہ خیز مظالم کی مکمل ایف آئی آر تھی۔ میں ڈائری پڑھتا رہا اور روتا رہا۔ کٹی پھٹی بوسیدہ سی ڈائری جس کے کئی صفحے تو مکمل

طور پر پڑھنے کے لائق بھی نہیں رہے تھے اس پر میرے آنسو مزید گلکاریاں کرنے لگے۔

چند صفحے پلٹے تو لکھا تھا ''جاپانی بہت شقی القلب لوگ ہیں۔ ہر قسم کے انسانی جذبوں سے عاری ہیں۔ بے حد میکانکی انداز میں بات کرنے والے۔ میرے لاکھ بتانے کے باوجود انہوں نے مجھے جکارتہ میں جاسوسی کے شبے میں گرفتار کرلیا ہے۔ اب پتہ نہیں کیا ہوگا؟

آگے چل کر لکھا تھا۔ ''معلوم نہیں ہم کہاں ہیں؟ چوبیس گھنٹوں میں صرف دو کپ پانی ملتا ہے۔ وگرنہ سمندر کا نمکین پانی پینا پڑتا ہے۔ بہت کم کھانے اور سخت دھوپ میں گھنٹوں مشقت کرنے سے ڈی ہائیڈریشن ہوجاتا ہے۔ اکثر قیدی، ہیضہ، ڈائریا، پیچش اور بخار میں مبتلا رہتے ہیں۔''

اگلے چند صفحے خالی تھے۔ ''آج کچھ قیدی کھانا چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ بہت سخت سزا دی گئی۔ کئی قیدیوں کے سر قلم کردیئے گئے اور کچھ قیدی فائرا سکواڈ کی گولیوں کی بوچھاڑ سے اپنے ہاتھوں سے کھودی گئی قبروں میں جا گرے۔''

آگے کئی صفحات پانی میں بھیگ جانے کی وجہ سے پڑھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

''آج یونٹ 731 دکھانے کے لیے لے گئے جہاں زندہ انسانوں کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ یہ Cannibalism کا نہایت دہشتناک منظر تھا۔ انسان اس قدر وحشی بھی ہوسکتا ہے؟ میری سوچ اس سے آگے نہیں جارہی۔''

اگلے چند صفحوں پر آڑی ترچھی لکیریں تھیں جو شاید لکھنے والے کی ذہنی حالت کی غمازی کررہی تھیں۔

''کس قدر تکلیف دہ منظر ہے۔ اذیت پہچانے کی بھی حد ہوتی ہے۔ Vivisection دیکھ کر تو میری طبیعت سخت خراب ہوگئی۔ بے ہوش کیے بغیر ہی قیدیوں کی ٹانگیں، بازو، کاٹے جارہے تھے۔ ان کی دردناک چیخیں سن کر میں ان کی موت کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ نہ جانے میری باری کب آجائے؟ ایسی وحشت، ایسی بربریت۔''

آگے کئی صفحات پر Doodling کی ہوئی تھی۔

''آج چند قیدیوں کے پیٹ پر بڑے بڑے چوہے رکھ کر اوپر ایک برتن کس کر باندھ دیا گیا ہے۔ چوہے گوشت کھا کھا کر بدن میں سوراخ کرکے دوسری طرف نکل رہے ہیں۔ قیدیوں کی حالت غیر ہوچکی ہے۔۔۔ قریب المرگ ہیں۔۔۔ مجھے وارننگ دی جارہی ہے کہ جلد یا بدیر میرا حشر بھی ویسا ہی ہونے والا ہے اگر میں نے انھیں ڈچ فوجیوں کے بارے میں کوئی انفارمیشن نہ دی تو۔۔۔''

اگلے چند صفحے خالی تھے۔

''میں انھیں یقین دلا دلا کر تھک گیا ہوں کہ میں کوئی جاسوس نہیں ہوں۔۔۔ مگر وہ مانتے ہی نہیں۔۔۔ میرے ساتھ ان کا رویہ تھوڑا سا مختلف ہے کیونکہ میں جاپانی میں بات چیت کرلیتا ہوں۔ جس سے یہ کافی کنفیوژن کا شکار ہیں کہ شاید میں واقعی ہی جاسوس ہوں، جاپانی زبان جاننا ہی اب میرے لیے مصیبت بن چکا ہے۔''

اگلے چند صفحے پھٹے ہوئے تھے۔

''کچھ قیدیوں کو پیٹ بھر کر پانی پلا کر آج صبح موٹے تازے گارڈز ان کے پیٹے پر چھلانگیں مار رہے تھے۔قیدیوں کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے جس سے وہ سخت اذیت میں مبتلا تھے۔ پانی ان کے جسم کے ہر سوراخ سے بہنا شروع ہو گیا تھا۔ان کی تکلیف مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔قیدی اپنی اپنی زبان میں اپنے اپنے خداؤں سے موت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔''

اگلے دو صفحے شاید آنسوؤں سے بھیگ چکے تھے۔

''میرا انسان اور انسانیت دونوں پر سے یقین اٹھ گیا ہے۔۔۔اب کچھ اور دیکھنے کی خواہش نہیں رہی۔کاش میرا خدا مجھ سے یہ آنکھیں چھین لے یا پھر میرے ہوش وحواس۔۔۔ میں انسانیت کی تذلیل کے یہ مونوگرام نہیں دیکھ سکتا۔۔نہیں دیکھ سکتا۔۔۔''

اگلے چند صفحے پھر پانی میں بھیگے ہوئے تھے اور لکھائی پھیل کر پڑھنے کے لائق نہیں رہی تھی۔

''آج کے دو منظر میری آنکھوں کی پتلیوں میں جم گئے ہیں۔دو قیدیوں کی ٹانگوں سے بانس باندھ کر ان کے وجود کو درمیان سے دولخت کر دیا گیا۔۔۔یہ سچ ہے کہ انسان واقعی ظالم اور جاہل ہے۔''

اگلے صفحے پر پھر ڈوڈلنگ (Doodling) کی ہوئی تھی۔

''سنا ہے کہ آج پریشر چیمبر میں چند قیدیوں کو ڈال کر پریشر اتنا بڑھا دیا گیا کہ ان کی آنکھیں شدید دباؤ سے اُبل کر باہر آ گریں۔''

میں اس سے مزید نہ پڑھ سکا اور ڈائری بند کر کے واپس دراز میں رکھ دی۔

روتے روتے میری ہچکی بندھ چکی تھی۔ایسی وہشت۔ایسی بربریت۔۔ایسے لرزہ خیز مظالم دیکھنے کے بعد اگر کوئی دماغی توازن کھو دے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

میں نے بڑے دُکھ سے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا۔

''حضرت یونس علیہ السلام آیت کریمہ کا ورد کرتے ہوئے مچھلی کے پیٹ میں سے صحیح سلامت نکل آئے تھے تو کیا ڈاکٹر یونس کو کسی نے بھی اسم اعظم کے بارے میں نہیں بتایا تھا جسے پڑھ کر وہ بھی تاریکیوں سے روشنیوں میں آ جاتے؟''

آج مجھے انکل یونس سے صرف ہمدردی ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ میرا سر بے پناہ عقیدت واحترام سے ان کی عظمت و ہمت کے آگے جھکا جا رہا تھا۔

''باکا کا کیا مطلب ہے؟ اور انکل کا یہ نام کیسے پڑا؟''

انکل یونس کے واپس مینٹل اسائلم چلے جانے کے کئی دنوں بعد آج میں نے پاپا سے پوچھا تو آج خلافِ معمول مجھے انگلی

سے چپ رہنے کا اشارہ کرنے کی بجائے وہ بتانے لگے۔

''دراصل باکا جاپانی زبان میں پاگل، مجنوں یا مخبوط الحواس شخص کو کہتے ہیں۔ جاپانیوں کے کیمپ میں جب یونس کی دماغی حالت مخدوش ہوئی ہوگی تو انہوں نے شناخت کے لیے اس کے گلے میں ایک تختی لٹکا دی تھی جس پر لفظ ''باکا'' لکھا ہوا تھا۔''

ذرا رُک کر پاپا پھر کہنے لگے۔

''ڈاکٹر اختر بتا رہے تھے کہ لاہور کے والٹن کیمپ میں ڈیوٹی کے دوران جب یونس انھیں ملا تو وہی تختی اس کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی اور تب سے اس کا نام ''باکا'' پڑ گیا۔

میں سوچتی ہوں میرا خواب تو مکمل تھا
نہ جانے خواب کی تعبیر کیوں ادھوری ہے؟

(رضیہ اسماعیل)

آدھی چادر

دھول مٹی سے اٹے ہوئے کچے پکے راستے کے نشیب و فراز کو تسخیر کرتی ہوئی ہماری لینڈ کروزر بڑی سبک رفتاری سے واہگہ اٹاری بارڈر کی جانب بڑھ رہی تھی۔

ہم جیسے جیسے بارڈر ایریا کے قریب آ رہے تھے ایک نامعلوم سی خاموشی ہمارے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی جیسے چمکیلی دھوپ میں یک لخت سورج کے سامنے ایک سیاہ بدلی آ کر روشنی کا راستہ روک لے اور چاروں اور تاریکی سی پھیل جائے لیکن اس خاموشی پر افسردگی سے زیادہ سنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔

کافی دیر سے اونچی آواز میں کسی کنٹروورشل موضوع پر بحث کرتے ہوئے طارق بھیا اور عنیزہ آپا کی آوازیں بھی سرحد کے احترام میں آہستہ آہستہ نیچی ہوتی جا رہی تھیں۔

سمن اور رابنہ جو کچھ دیر پہلے تک ایک دوسرے کو الٹے سیدھے لطیفے سنا سنا کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں وہ بھی اب خاموش ہو چکی تھیں۔

اور میرا ذہن ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان کہیں زقندیں بھر رہا تھا۔

عنیزہ آپا کئی برسوں کے بعد امریکہ سے اپنی فیملی کے ساتھ چھٹیاں گذارنے لاہور آئی تھیں۔

جولائی، اگست کی پاگل کر دینے والی لاہور کی گرمی جس میں چیل بھی اپنے گھونسلے میں انڈے کو یتیم کر دے۔ آپا کا اصرار تھا بچوں کو واہگہ اٹاری بارڈر پر فلیگ چینجنگ تقریب ضرور دکھائی جائے۔

''انہیں بھی تو پتہ چلے کہ اس ملک کے حصول کے لیے ہمارے آباؤ اجداد نے کیا کیا قربانیاں دی ہیں۔ کس طرح خاک و خون کے دریا عبور کر کے عزتوں اور جانوں کے نذرانے پیش کر کے انہوں نے اس آزاد سرزمین پر قدم رکھا تھا۔''

عنیزہ آپا بات کرتے کرتے کافی جذباتی ہو گئیں۔

ادھر واہگہ اٹاری بارڈر پر پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں نے فضا میں ایک زبردست ارتعاش پیدا کر رکھا تھا۔

''لگتا ہے تقریب شروع ہو چکی ہے۔'' عنیزہ آپا نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، ذرا جلدی قدم اٹھائیں۔'' میں نے جواب دیا۔

گاڑی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ کر کچھ راستہ پیدل چل کر ہمیں ''باب آزادی'' تک جانا تھا۔

دھول مٹی سے اٹے، اونچے نیچے، کچے پکے راستے پر چلتے ہوئے پاؤں اپنے محور سے ہٹ ہٹ جاتے تھے۔ الٹے سیدھے پڑتے پاؤں اور دل کی بے ترتیب ہوتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ ہم آہستہ آہستہ بارڈر کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔

یہ ہمارے لیے ایک بالکل انوکھا تجربہ تھا کیونکہ ہم پہلی مرتبہ ہی یہاں آ رہے تھے۔

آزدی کے نشے میں مخمور سحر زدہ سے ماحول کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے انسانوں کے ساتھ ساتھ دھرتی بھی ایک لچکیلی شاخ کی مانند مستی میں جھوم رہی تھیں۔

''پاکستان زندہ باد..... پاکستان زندہ باد'' کے دل افروز نعرے فضا میں ہر سو پھلجھڑیاں سی چھوڑ رہے تھے۔

میرے دل کے کہیں بہت اندر سے دعا نکلی ''بے شک پاکستان تا ابد قائم رہے گا۔ اس کی تعمیر میں میرے پرکھوں کا لہو بھی شامل ہے جو کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔''

نہ جانے کب چند مضطرب سے آنسو آزادی کے حصول کے لیے جانوں کا نذرانہ دینے والے لاکھوں شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے رخساروں کی زمین پر پاؤں پاؤں چلنے لگے اور مجھے انہیں پونچھنے کی چنداں ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی۔

''آزادی بھی کیا چیز ہے؟'' دل نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں یہ وہ نشہ ہے جس کا خمار زندگی بھر نہیں اترتا۔''

میں نے بھی ہولے سے جواب دیا۔

''لیکن آزادی کی قدر و قیمت کا ادراک ہونا ہر شخص کا مقدر نہیں ہوتا۔''

دل کی سرگوشیاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

میرے جواب دینے سے پہلے ہی کہیں سے والٹیر کی آواز سماعتوں کو ریشم جیسے نرم ہاتھوں سے سہلاتی ہوئی ابھری ''خدا اور آزادی زندگی کی دو بڑی حقیقتیں ہیں اور باقی سب حقیقتیں اس کے گرد گھومتی ہیں۔'' یہ سن کر دل نے چپ سادھ لی جیسے اسے اس کی بات کا جواب مل گیا ہو۔

باب آزادی پر نظر پڑتے ہی میرے تیز تیز چلتے ہوئے قدم یک لخت رُک گئے اور میں کتنی ہی دیر تک نہایت شان سے ایستادہ باب آزادی کو اور کبھی دونوں ملکوں کی سرزمین کو جدا کرتی ہوئی سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ سے گزرنے والی ٹیڑھی میڑھی ایک لکیر کو سوچ بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ یہ کیسی سرحد ہے جس پر لگی ایک ہلکی سی آہنی باڑ کے ذریعے اس کے آر پار آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے؟

تو یہ ہے لائن آف کنٹرول (LOC)۔ میں نے خود سے کہا۔

''ہاں۔ پنجاب کے نقشے پر ایک کالی لکیر..... زمین پر کھینچی جانے والی بدقسمت ترین لکیر۔ جس نے پنجاب کے دل کو چیر کر

رکھ دیا۔''

تاریخ نے جیسے شرمندگی سے جواب دیا۔

''اوراس دل سے اس قدر خون بہا کہ دھرتی سرخ ہوگئی۔ پنجاب کے پانچ دریاؤں کے پانیوں کے رنگ تبدیل ہو گئے۔''

میں نے نہایت دکھی دل کے ساتھ کہا تو دور کہیں فضا میں امرتا پریتم کی غم زدہ آواز گونج اٹھی۔

''اج آکھاں وارث شاہ نوں
کدے قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا
کوئی اگلا ورقہ پھول
اِک روئی سی دھی پنجاب دی
توں لِکھ لِکھ مارے وین
وے اج لکھاں دھیاں روندیاں
تینوں وارث شاہ نوں کہن
اٹھ دردمنداں دیا دردیا
اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں
تے لہودی بھری چناب.....''

میں اس سے زیادہ نہ سن سکی اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ میری اور امرتا پریتم کی دلی حالت سے بے خبر بارڈر کے دونوں طرف معمول کی زندگی میں مصروف کسان کھیتی باڑی میں مشغول تھے۔ ڈھور ڈنگر اِدھر اُدھر ہریالی پر منہ مار رہے تھے۔ سرحدی پابندیوں سے بے نیاز پرندے آزادانہ بارڈر کے آر پار جارہے تھے۔ نیلگوں آسمان نے اپنی چادر سرحد کے دونوں طرف یکساں طور پر تان رکھی تھی۔

میں نے سوچا ''فطرت کے وہی رنگ ڈھنگ ہیں مگر سرحد کے دونوں پار رہنے والوں کی زندگیوں میں بٹوارے سے جو عظیم تغیر وتبدل رونما ہوا ہے اس کا صحیح ادراک ان کے سوا اور کون کرسکتا؟''

چند بچے جو کچھ دیر پہلے تک کھیتوں کی منڈیروں پر لکن میٹی کھیلتے ہوئے کھیتوں میں جا چھپے تھے اب تھک ہار کر پگڈنڈی پر ستانے کے لیے بیٹھ گئے تھے۔

زمینی حقائق سے جیسے بے نیاز، مگر سرحد کے دونوں طرف لگنے والے نعروں کی طرف متوجہ ہو کر گاہے بگاہے دونوں طرف

کے کسانوں کی طرف سے کبھی ''پاکستان زندہ باد'' تو کبھی ''ہندوستان زندہ باد'' کے نعروں کی ہلکی سی گونج فضا میں بکھر جاتی تھی۔

لگتا تھا سرحد کے دونوں طرف کی نعرے بازی ان لوگوں کے لیے ایک معمول کی چیز بن چکی تھی جس پر کسی قسم کے جذباتی ردعمل کا اظہار کیے بغیر وہ چپ چاپ اپنے کام میں مشغول تھے۔

''پاکستان زندہ باد'' کے سُرمگیں نعرے فضا کے تقدس میں ہر لحظہ اضافہ کر رہے تھے۔

میں بہت غور سے سرحد پر بنے دیوہیکل آہنی دروازوں کے آر پار دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اپنے شانے پر اچانک کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کرتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا بشن سنگھ تھا جو ابھی تک تذبذب کی کیفیت پوچھ رہا تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں چلا گیا؟

''کھول دو'' کا سراج الدین۔ مسلی کچلی، لٹی پٹی، نچڑی نچڑائی زندہ درگور سکینہ کو پا کر خوشی سے نہال ہو رہا تھا جیسے سکینہ کا جنم آج ہی ہوا ہو۔

پاس ہی ''ٹھنڈے گوشت'' والا ایشر سنگھ شرمندہ شرمندہ سا کھڑا تھا جبکہ اُسے خونخوار آنکھوں سے دیکھتی ہوئی کلونت کور کے سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ جیسے وہ عورت کی بجائے ایک زخمی شیرنی میں تبدیل ہو چکی ہو کیونکہ شکار کو پوری طرح پنجوں میں دبوچ لینے کے باوجود عین منہ میں نوالہ ڈالتے وقت پلیٹ اس کے آگے سے ہٹالی گئی تھی۔

قاسمی کا پرمیشر سنگھ اپنے کھلے کیسوں اور زخمی وجود کے ساتھ اختر اور کرتارے کی انگلی پکڑے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت میں تھا۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ کرتارا اُسے مل گیا تھا۔ لیکن پاس کھڑی امرکور اسے نہایت خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے جیسے کہہ رہی تھی:

''اگر تجھے تیرا کرتار مل گیا ہے تو پھر اختر کی انگلی پکڑے رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جانے دو اسے.....اب چھوڑو.....''

''جھلی.....اتنا بھی نہیں جانتی کہ محبت سے پکڑی ہوئی انگلی کو چھوڑ دینا اتنا آسان نہیں ہوتا'' پرمیشر سنگھ نے دل ہی دل میں کہا۔

مجھے اچانک یوں لگا جیسے پاکستان زندہ باد کے نعروں میں کچھ اور آوازیں بھی شامل ہو چکی ہیں۔ ایک عجیب سا شور زبردست انگڑائی لے کر میرے چاروں طرف بیدار ہو چکا تھا۔

''یہ کیسا شور ہے؟'' میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فضا میں غیر مرئی وجود تلاش کرنے لگی۔

یکا یک وقت کا آئینہ ایک زبردست چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

ان گنت کرچیوں میں کوئی ایک چہرہ بھی مکمل نہیں تھا۔ آدھے چہرے، پورے چہرے، کٹے پھٹے چہرے.....اگر آنکھ ہے تو ناک غائب.....رخسار ہیں تو لب ندارد۔ بے ترتیب چہرے.....دہشت زدہ چہرے.....بنتے بگڑتے چہرے.....

کون ہیں یہ سب لوگ؟ میں خوف سے تقریباً چیخ اٹھی مگر کسی نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے سب نے آہستہ آہستہ میرے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا ہو۔ میرا سانس رکنے سا لگا۔ تنگ جگہوں سے مجھے ہمیشہ ہی بہت وحشت ہوتی ہے اس لیے میں جلدی سے اپنے اردگرد اکٹھے ہونے والے ہجوم کا گھیرا توڑ کر باہر نکل آئی اور کھلی فضا میں لمبی لمبی سانس لے کر اپنے اوسان بحال کرنے لگی۔

مجھے لگ رہا تھا جیسے یہ سب لوگ مجھے اپنی اپنی کہانیاں سنانے کے لیے بے چین تھے۔

''میں خوشونت سنگھ کا جگا ہوں۔''

''میں نوراں ہوں۔''

''میں اقبال سنگھ ہوں۔''

''میں قدرت اللہ شہاب کی دلشاد ہوں۔ یہ مصطفی خان ہے۔''

''میں ملاّ علی بخش ہوں۔''

''میں راجندر سنگھ کی لاجونتی ہوں۔ یہ سندر لال ہے۔''

''میں کرشن چندر کا اوم پرکاش ہوں۔''

''میں صدیق ہوں۔''

''میں لالہ بانشی رام کھتری ہوں۔''

''میں پشپا ہوں۔''

''میں کملا کر۔''

''میں روزی۔''

''میں شنکر۔''

''میں بیلا، میں بتول۔''

''میں فارس روڈ کی طوائف ہوں۔''

ان سب کی آوازیں میری سماعتوں پر پگھلے ہوئے سیسے کی طرح پڑ رہی تھیں میں نے بے حد تکلیف سے تقریباً چیختے ہوئے کہا ''بس چپ ہو جاؤ، خدا کے واسطے، چپ ہو جاؤ۔''

آوازوں کے بے ہنگم شور میں یکا یک کچھ دردناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ جنہیں سن کر وقت کا سینہ شق ہو گیا۔

''میں کرشن چندر کی زینب ہوں۔''

''میں پاروہوں۔''

''میں شام کور ہوں۔''

''میں بیگم ہوں۔''

''ہم جو تخلیق کے علم بردار ہیں ہمیں کوئی نہیں مار سکتا کوئی ہماری عصمت دری نہیں کر سکتا۔''

زینب کی غضب ناک آواز فضا کو چیرتی ہوئی ابھری۔

''ہم کل کی مائیں بہنیں آج طوائفوں سے بدتر ہو چکی ہیں۔''

شام کور کی آواز کے ساتھ پاروا اور بیگم کی آوازیں بھی شامل ہو چکی تھیں۔

تاریخ کے قلمدان سے سیاہی جوش مار کر یک لخت باہر آ کر گری اور وقت کے کورے کاغذ پر ایک بدنما سیاہ لکیر چھوڑ گئی۔

تاریخ بے لباس ہو چکی تھی۔

وحشت و بربریت کا جنونی رقص..... صدیوں پرانے بھائی چارے کی گٹھریاں..... محبتوں کے پُشتارے..... مان سنمان..... عہد و پیمان..... کچھ بھی تو کام نہ آیا۔

تاریخ نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''گوتم بدھ..... گیتا..... وید..... قرآن..... گرنتھ..... سب اپنی جگہ اونچے استھانوں پر پڑے رہ گئے۔'' میرے ہونٹوں پر سسکی ابھری۔

''الورا اجنتا..... تاج محل..... ادب..... آرٹ..... گیت..... سنگیت..... کبیر، تلسی داس..... ولی..... غالب..... ٹیگور..... اقبال..... سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا..... کچھ بھی تو انسانوں کی نفرت کا راستہ نہ روک سکا۔ یہاں تک کہ سب تہذیب و تمدن جل کر خاک ہو گیا۔'' میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''ست سری اکال..... راج کرے گا خالصہ..... باقی رہے نہ کوئی..... ہر ہر مہادیو..... رادھے شام..... جو مانگے ہے پاکستان اس کو دے دو قبرستان..... رنگے اور مُودے کا بدلہ لینا ہے..... خون سے مُسلوں کے اس داغ کو دھونا ہے۔''

بس سب کچھ انسانیت سوز نعروں میں تحلیل ہو گیا۔

یہ کہتے ہوئے تاریخ کے سینے سے ایک زبردست ہوک اٹھی۔

میں اداسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی سوچ رہی تھی کہ:

کیا بٹوارے کے زخموں کا کوئی مرہم ہے؟

کیا ہجرت کی زہر آلود یادوں کا کوئی تریاق ہے؟

کیا کٹے ہوئے پستانوں سے بہنے والے مقدس دودھ کا کوئی حساب ہے؟

کیا عصمتوں کے چاک رفو کرنا ممکن ہے؟

کیا دونوں ٹانگوں کے درمیان بہنے والی خون کی ندیوں کا کوئی کنارہ ہے؟

کیا بے نور ہوتی ہوئی آنکھوں میں دم توڑ دینے والے خوابوں کا کوئی شمار ہے؟
کیا نیزے کی انیوں پر چڑھی ہوئی دریدہ نسل کی کوئی دادرسی ہے؟
کیا رستے میں رہ جانے والوں کے بے گوروکفن.....تعفن زدہ.....اور سڑاند مارتے ہوئے جسموں کا کوئی احترام ہے؟
لیکن میری بات کا جواب شاید کسی کے بھی پاس نہیں تھا کیونکہ وقت کا پنچھی پر پھیلائے کہیں بہت دور خلاؤں میں گم ہو چکا تھا اور تاریخ نے نوشتہ تقدیر لکھ کر اپنے کاغذ قلم سمیٹ لیے تھے۔

''انسان کے ظالم، جاہل اور جلد باز ہونے کی گواہی تو قرآن صدیوں پہلے ہی دے چکا ہے۔'' دل سے آواز ابھری۔
ہاں مگر انسانیت اور احترام آدمیت بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟
میں نے قدرے درشتگی سے جواب دیا جو کہ جواب سے زیادہ ایک سوال تھا۔
''انسان اور انسانیت؟'' دل نے طنز بھرے لہجے میں جواب دیا۔
''جانتی ہو انسان کا اصل نام بشر ہے۔ وہ ''ب ش ر'' یعنی تین لفظوں کا مجموعہ ہے جس کے لغوی معنی ''بشارت دینے والا'' کے ہیں۔ اس میں سے صرف اگر ''ب'' کو ہٹا دیا جائے تو پیچھے دو حرف کا مجموعہ یعنی ''شر'' رہ جاتا ہے۔
اگر ''ب'' کو خیر کے ہم پلہ سمجھ لیا جائے تو پھر باقی شر کے سوا انسان میں اور کیا رہ جاتا ہے؟ دل نے جیسے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔
''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر انسان پر ابلیسیت کی ترغیبات حاوی ہو جائیں تو پھر وہی ہوتا ہے جو وقت نے انسانی تاریخ کی اس سب سے بڑی ہجرت کے موقعہ پر ہوتے ہوئے دیکھا۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
''بھلا غاروں میں رہنے اور پتوں سے تن ڈھانپنے والے وحشی انسانوں کو بے لباس ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے؟''
میں ابھی دل کی اس بات کا جواب دینے کے بارے میں کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ عنیزہ آپا کی آواز نے میری محویت کو توڑ دیا۔
''کہاں گم ہو اتنی دیر سے تم؟'' آپا کی آواز سن کر میں بادل نخواستہ اپنی سوچوں سے باہر نکل آئی۔
''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے اب اتنے تواتر سے سنائی نہیں دے رہے تھے ''شاید تقریب ختم ہونے کو ہے؟'' میں نے سوچا۔
''یہی دھول اور مٹی سے اٹی ہوئی سڑک ہے نا جس پر چل کر ہمارے آباؤاجداد کے لٹے پٹے قافلے پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔''
عنیزہ آپا کی آواز مجھے جیسے کئی قرنوں کا فاصلہ طے کر کے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔
ان کے لہجے میں ایک انوکھا سا درد تھا۔ ان کے سوال میں ہی ان کا جواب موجود تھا۔

عنیزہ آپا یقیناً مجھ سے جواب نہیں مانگ رہی ہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت کو دہرا رہی ہیں۔ میں نے خود سے کہا۔

وقت کے چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب سرکنے شروع ہو گئے۔

صحن میں بیٹھی نانی ماں بتا رہی تھیں کہ جب ان کا ٹرک قیام پاکستان کے کئی مہینوں کے بعد ملٹری کی معیت میں واہگہ اٹاری بارڈر پر پہنچا تو وہ فرط جذبات سے مغلوب ہو کر ٹرک سے نیچے اتر آئیں۔

''میں پاکستان کی سرزمین کو ٹرک کے پہیوں تلے روندتے ہوئے نہیں بلکہ پیدل چل کر جانا چاہتی ہوں۔''

نانی نے ملٹری پولیس سے کہا تو وہ بھی نانی کے جذبے کے آگے خاموش ہو گئے۔

پھر نانی ماں نہ جانے کتنی ہی دیر تک خاک آلود چہرے کے ساتھ حرم کی طرح پاک زمین پر سجدہ ریز رہیں۔

ایک طغیانی تھی کہ آنکھوں سے تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''پتہ نہیں یہ نئے وطن میں آنے کی خوشی کے آنسو تھے یا پیچھے رہ جانے والے وطن کو چھوڑنے کا ماتم تھا؟'' میں نے سوچا۔

دل دریا سمندروں ڈونگھے تے کون دلاں دیاں جانے ہُو؟

فضا کو چیرتے ہوئے چند بول جیسے میری سوچوں کی تائید کر رہے ہوں۔

عنیزہ آپا اور میں نے جھک کر زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اس طرح چومی جیسے حجر اسود کو بوسہ دے رہے ہوں۔

ادھر چمکیلی دھوپ میں صحن میں تخت پوش پر بیٹھی نانی ماں نے پھر سے یادوں کے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی تھی.....وہی ہزاروں بار دہرائی ہوئی بٹوارے کی کہانی.....تقسیم کی داستان.....ہجرت کے قصے۔

جب سے ہم نے آنکھ کھولی تھی اس کہانی کے علاوہ ہم نے کوئی اور کہانی سنی ہی نہیں تھی مگر نانی کا کتھارسس کسی طرح بھی ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

''پکی عمروں میں بسے بسائے گھر، جن کی ایک ایک اینٹ کے ساتھ دکھ سکھ کی سانجھ ہو، چھوڑ دینا اور پھر بھلا دینا اتنا آسان کام نہیں ہے۔''

ہوا کے دوش پر جیسے ایک تحریر اُبھری تو میں خاموش ہو گئی۔

''جب پنڈ کے منادی گھر کے اونچے مینارے پر چڑھ کر نقارے پر ڈگا لگا کر منادی کرنے والے نے کہا کہ اب ہندوستان تقسیم ہو گیا ہے۔ بٹوارا ہو چکا ہے جسے یہاں رہنا ہے وہ رہ سکتا ہے اور جو یہاں نہیں رہنا چاہتا وہ پاکستان چلا جائے۔'' ایک دن نانی بتا رہی تھیں۔

''یہ اعلان سن کر مانو ہمارے دل جیسے ہزاروں لاکھوں ہاتھوں نے اپنی ہتھیلیوں میں لے کر مسلنے شروع کر دیئے ہوں۔ ایک تھرتھلی سی مچ گئی۔ بس حشر کا سماں تھا۔

توے پر پڑی روٹی جل کر وہیں سواہ ہو گئی۔

گھر کے در و دیوار اجنبی بن گئے۔
صحن میں پیپل کے درخت پر ہلارے لیتی ہوئی پینگ ٹہنے سمیت ٹوٹ کر زمین پر آ گری۔
پنچھی پکھیرو سب اپنے اپنے گھونسلے چھوڑ کر اڑ گئے۔''
اتنا کہہ کر نانی آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرنے لگیں۔
''نانی! آپ لوگوں کو پتہ تو تھا کہ قیام پاکستان کی تحریک کتنے زور شور سے چل رہی تھی اور ہر گزرتے سمے کے ساتھ بٹوارے کا وقت قریب آ رہا تھا؟''
میں نے نانی سے سوال کیا تو وہ بولیں:
''ہاں! ہمیں بے شک علم تھا کہ قیام پاکستان کے خواب کو تعبیر ملنے والی تھی۔ تمہارے نانا تو زیادہ تر الہ آباد میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے تھے مگر تمہارے بڑے ماموں اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے اور مسلم لیگ کے بڑے پرجوش کارکن تھے۔ وہ جب بھی گھر آتے تو ملک میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں بہت تفصیل سے ہمیں بتاتے رہتے تھے کہ کس طرح قائداعظم محمد علی جناح نے یونیورسٹی میں اپنے خطاب میں کہا تھا کہ ''پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں ابھی مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے.....وطن اور نسل نہیں۔''
''قائد نے اور کیا کہا؟'' میں نے پرسوز لہجے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ قائداعظم کہہ رہے تھے:
''ہندو اور مسلمان دو مختلف تہذیبوں، سماجوں اور متضاد طرز ہائے فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں قوموں کا آپس میں ادغام خارج از امکان ہے۔''
تو پھر کیا ہوا کہ آپ تقسیم کے اعلان پر اس قدر غیر یقینی صورت حال کا شکار ہو گئے؟
''ہم تو بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے کہ امرتسر پاکستان میں آئے گا مگر وہ تو ہندوستان کو دے دیا گیا اور.....''
نانی نے ابھی اپنی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ پاس ہی بیٹھے اخبار بینی کرتے ہوئے نانا بول اٹھے:
''دراصل پنجاب کی مسلمان آبادی کی اکثریت والی تحصیلیں اور اضلاع جن میں پٹیالہ، گورداسپور، انبالہ، جالندھر، نکودر، فیروز پور اور زیرہ شامل تھے، ابتدائی نقشوں کے مطابق پاکستان کو دیئے جانے تھے مگر نہرو، پٹیل، وی پی مینن اور گاندھی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر دباؤ ڈالا اور اسے ساتھ ملا کر ریڈ کلف ایوارڈ کو تبدیل کروایا اور یہ علاقے ہندوستان کو دے دیئے گئے۔ اس تبدیلی کا اعلان تقسیم کے اعلان کے تین دن بعد کیا گیا جس نے پنجاب میں ہر طرف گویا ایک آگ سی لگا دی۔ ظلم و جور کی آندھیاں بہت زور و شور سے چلنے لگیں، نفرت کے گہرے سیاہ بادلوں نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فتنہ و فساد کی آگ ہمارے چاروں طرف پھیل گئی اور ہم بے حد غیر محفوظ ہو گئے۔''

اتنا کہہ کر نانا ابا خاموش ہو گئے۔ شاید کسی بہت ہی تلخ یاد نے انہیں سوگوار کر دیا تھا۔

نانا ابو کی سوگواری کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی تھوڑی دیر کے لیے سوالوں کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے اٹھنا چاہا تو انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کے لیے کہا۔

''بیٹا یہ ضروری ہے کہ آپ لوگوں کو اپنی تاریخ سے مکمل واقفیت ہو کیونکہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا قیام ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں مل سکتی۔'' یہ بات ہمارے قائد نے پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقعہ پر 14 اگست 1948ء میں اپنے خطاب میں کہی تھی۔

یہ ملک بڑی قربانیوں سے حاصل کیا گیا ہے اور آپ کو اس کا علم ہونا ضروری ہے۔

نانا ابا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''دو مسلم آبادی والی تحصیلیں بٹالہ اور گورداس پور ہندوستان کو دے کر دونوں ملکوں کے درمیان ایک دائمی مناقشت کی بنیاد رکھ دی گئی۔ کیونکہ گورداس پور سے پٹھان کوٹ کے راستے ہندوستان کا ریاست کشمیر سے زمینی رابطہ کیا گیا اور یہ سب ایک گہری اور سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا۔''

نانا ابا ذرا خاموش ہوئے تو میں نے کہا:

''ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ کشمیر کا نیچرل الائنس پاکستان کے ساتھ ہی بنتا تھا۔''

''ہاں بالکل یہی بات ہے کیونکہ کشمیر جانے والے اس وقت گیارہ راستوں میں سے کل نو راستے پاکستان میں سے ہو کر گزرتے ہیں جبکہ صرف دو راستے ہندوستان کے ضلع گورداس پور میں سے زبردستی نکالے گئے۔ اسی لیے گورداس پور مسلمانوں کے حوالے نہ کیا گیا۔''

''یہ تو صریحاً بے ایمانی ہے بلکہ انتہا درجے کا ظلم ہے کشمیریوں پر'' میں نے قدرے جوش میں آ کر کہا۔ ''اس اعلان نے تو مسلمان اکثریتی آبادی والے علاقوں میں ایک قیامت برپا کر دی ہوگی؟'' میں نے بہت دکھ سے کہا تو نانا ابا بول اٹھے:

''تم ٹھیک کہتی ہو کشمیر تقسیم ہندوستان کا ادھورا ایجنڈا ہے اور اسے کسی نہ کسی روز مکمل ہونا ہی ہے.....'' ''ان شاء اللہ'' انہوں نے بڑے پرامید لہجے میں کہا۔

نانا ابا کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگے:

''دراصل قائداعظم کو اپنی عمر کی آخری منزل میں بڑے شاطر لوگوں سے واسطہ پڑا۔''

''اکیلے قائد کس کس محاذ پر لڑتے۔ ہندوؤں کی شاطرانہ چالوں کے ساتھ ساتھ سکھ لیڈروں، ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ اور ڈاکٹر نارنگ اور کئی دوسرے عناصر نے مسلمانوں کے خلاف سخت اشتعال انگیز پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا۔'' نانا ابا ذرا دم لینے کو رُکے تو میں نے کہا:

''میرے خیال میں تو سکھوں سے بہت بڑی تاریخی غلطی ہوگئی ہے۔ایسی ہی صورت حال کے لیے کہا گیا ہے۔

تاریخ نے قوموں کے وہ دور بھی دیکھے ہیں
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

نانا ابا نے میری بات کی تائید میں خاموشی سے سر ہلا دیا۔

''پھر تو سخت مشکل حالات تھے قائداعظم کے لیے؟''

''ہاں قائد پر بہت زور دیا گیا کہ وہ وزارتی مشن کے کانگریس سے منظور شدہ منصوبے میں یا تو شریک ہو جائیں یا پھر کٹا پھٹا پاکستان قبول کر لیں۔'' نانا ابا نے کہا تو میں یکبارگی بول اٹھی:

"He really had no choice. Take it or leave it."

والا معاملہ ہو گیا تھا۔

''بالکل'' نانا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو انہوں نے جیسا کہا وہی کر دکھایا۔یعنی کٹا پھٹا پاکستان ہی قائد کو دیا۔کہیں سے بازو تو کہیں سے ٹانگ کاٹ دی۔کہیں سے ہاتھ تو کہیں سے پاؤں کاٹ دیئے۔کہیں سے ناک تو کہیں سے کان کاٹ کر رکھ دیئے۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

''ہاں بیٹا اب جو ہے اس سے ہی کام چلانا ہوگا۔'' نانا ابا دانش مندانہ لہجے میں میری بات کا جواب دیتے ہوئے پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

نانی ماں کافی دیر سے بڑی خاموشی سے ہماری باتیں سن رہی تھیں..... گہری سوچ سے باہر نکلتے ہوئے انہوں نے بڑی سرد آہ بھری لیکن منہ سے کچھ نہ کہا مگر ان کی خاموشی بھی ہزار داستانیں سنا رہی تھی۔

''سونہہ گرودی..... پاکستان زندہ باد.....سونہہ گرودی.....سونہہ گرودی.....سونہہ گرودی.....''

برآمدے میں راکنگ چیئر پر بیٹھے ہوئے ارشد ماموں نے اچانک ہی نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

''اوئے اس حرام زادے کو کوئی چپ کراؤ۔سونہہ گرو کا بچہ..... باز ہی نہیں آتا۔جب دیکھو وقت بے وقت گرووں کو متھا ٹیکنے لگتا ہے۔''

نماز کے لیے وضو کرتے ہوئے نانا ابا کی غصے سے بھری ہوئی آواز ابھری تو نانی ماں خاموشی سے اٹھ کر ارشد ماموں کے پاس چلی گئیں۔

ارشد ماموں اس وقت کم از کم چالیس کے پیٹے میں ہوں گے۔بچپن میں دماغی چوٹ لگ جانے کے سبب وہ دنیا و مافیا سے بے خبر برآمدے میں اکثر اپنی پسندیدہ راکنگ چیئر پر پڑے جھولتے رہتے تھے اور دن میں چند مرتبہ اس قسم کے نعرے بلند کیا کرتے تھے جو ہم بچپن سے ہی سنتے آ رہے تھے۔

نانی ماں بتاتی تھیں کہ بٹوارے کے وقت ارشد ماموں یہی کوئی چھ سات برس کے ہوں گے۔ ان کا مستقل ٹھکانہ تو امرتسر شہر میں ہی تھا مگر نانا ابا نے امرتسر کے نواح میں فارم ہاؤس پر بڑی آرام دہ حویلی بنوا رکھی تھی جہاں نانا ابا الٰہ آباد سے آنے پر کچھ عرصے کے لیے ضرور جایا کرتے تھے۔

وہاں کے نمبردار کرنیل سنگھ سے نانا ابا کی بڑی یاری تھی بالکل بھائیوں جیسا مان سنمان کرتے تھے۔

''امرتسر شہر اور اُس کے قرب و جوار میں اور بہت رشتہ دار مقیم تھے۔ حالات جب زیادہ خراب ہونے لگے تو بہت سے رشتہ دار اٹھ کر ہمارے ہاں آ گئے۔ تمہارے نانا الٰہ آباد میں تھے اور بڑے ماموں علی گڑھ میں تھے۔ ایسے میں ان رشتہ داروں کا بڑا سہارا تھا۔ تمہاری ماں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ لاہور میں تھیں۔'' نانی اماں یادوں کی زنبیل سے قطرہ قطرہ رس ٹپکا رہی تھیں۔

''تو نانا ابا اور ماموں امرتسر کیوں نہ آئے؟'' میں نے تعجب سے سوال کیا۔

''وہ ضرور آ جاتے مگر انہی دنوں تمہارے نانا کو دمے کا شدید دورہ پڑ گیا۔ وہ دمے کے دائمی مریض تھے۔ ایسی حالت میں وہ اکیلے سفر کرنے کے قابل نہ رہے تو تمہارے بڑے ماموں انہیں لینے کے لیے الٰہ آباد پہنچ گئے مگر دیکھتے ہی دیکھتے حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔''

نانی ماں کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگیں:

''ان حالات میں کرنیل سنگھ نے ہماری بڑی مدد کی۔ ہم کُل ملا کر پچاس لوگ تھے۔ بلوے بڑھتے جا رہے تھے اور جان و مال بالکل غیر محفوظ ہو چکے تھے۔ ایسے میں کرنیل سنگھ نے ہم سب کو اپنی حویلی کے پچھواڑے بنے مکان میں پناہ دی۔

''بہن جی! میں اپنا دھرم نبھاؤں گا۔ آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں۔ اگر کوئی آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا تو وہ ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی جائے گا۔'' کرنیل سنگھ پرعزم آواز میں کہہ رہا تھا۔

''اس نے اپنے پانچ شیر جوان بیٹے بھی ہماری حفاظت پر لگا دیئے تھے مگر پنڈ میں لوگوں کے تیور دیکھتے ہوئے ہمیں بڑی سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ ہم بالکل گھر سے باہر نہ نکلیں۔ نہ بچے باہر کھیلیں نہ بولنے، ہنسنے، رونے کی آواز باہر جائے۔ کھانا پکانا، نہانا دھونا سب منع کر دیا۔ یہاں تک کہ گھر کی نالی سے پانی کی ایک بوند تک باہر گلی میں بھی آنے پر لوگوں کو وہاں ہماری موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ مکان کو باہر سے تالہ لگا دیا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں ہمیں کھانا اور ضروریات زندگی کی ضروری چیزیں کرنیل سنگھ پہنچا جایا کرتا تھا۔''

''بڑے مشکل حالات تھے؟'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''بس سمجھو ہم قید میں تھے۔ تین مہینے تک ہم ایسے ہی نظر بند رہے۔ تمہارے نانا اور ماموں کی کچھ خیر خبر نہیں تھی اور نہ ہی انہیں ہمارا پتہ تھا۔ ہم سخت خوفزدہ ہو چکے تھے۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ بس ابھی کرپانیں اور برچھیاں لے کر لوگ آتے ہی ہوں گے اور ہم سب کو ختم کر ڈالیں گے۔''

پھر ایک دن مکان کے باہر بہت سا شور سن کر ہم سب سہم گئے۔

''نکالو مُسلوں کو باہر..... ان کو ہم اپنے ہاتھوں سے ذبح کریں گے۔ حلال گوشت کھانے کا بہت شوق ہے نا ان کو۔ ہم آج ان سب کو اچھی طرح حلال کریں گے۔''

''پنڈ میں لوگوں کو پتہ چل گیا تھا کہ ہم وہاں چھپے ہوئے تھے اس لیے جوش جنون میں انسانوں کا بھپرا ہوا ہجوم ہماری جان کے درپے ہو رہا تھا۔ نمبردار بھی بے بس نظر آ رہا تھا۔'' نانی دور خلا میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھیں۔

''میں بہت شرمندہ ہوں بہن جی، بے بس ہو گیا ہوں۔'' نمبردار کرنیل سنگھ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

''ان لوگوں کا مطالبہ ہے کہ یا تو آپ سب کو سکھ بنایا جائے وگرنہ وہ آپ میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بہن جی مجبوری ہے۔ میں جانتا ہوں یہ بات آپ کے دھرم کے خلاف ہے مگر جان بچانے کے لیے سب جائز ہے وگرنہ یہ خودکشی کرنے والی بات ہو گی جو آپ کے مذہب میں حرام ہے۔ آپ وقتی طور پر ان کی بات مان لیں پھر دیکھا جائے گا۔''

نمبردار نے روہانسے لہجے میں کہا تو ہم سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اس مصیبت سے کیسے نپٹا جائے؟ بچنے کا کوئی راستہ نہ پا کر ہم نے اپنے رب کے حضور سجدے کر کے ہزاروں معافیاں مانگیں اور اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا۔

''اگلے دن مکان کا تالا کھول کر ہمیں باہر نکالا گیا اور قطار بنا کر گردوارے کی طرف لے جایا گیا۔ سارا پنڈ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا تھا۔ زبردست نعرے بازی ہو رہی تھی۔ لوگوں کو شک تھا کہ ہم دل سے سکھ مذہب قبول نہیں کر رہے بلکہ جان بچانے کی خاطر ایسا کر رہے ہیں۔''

''دیکھ لینا کرنیل سیہاں! ایہناں نے ساڈے دھرم وچ لت مار کے جانی آں۔'' غصے سے بھری ہوئی ایک آواز ابھری تو سب نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ہم سب کو لعن طعن کرنی شروع کر دی۔

''ہماری حالت تو ہانکے ہوئے ہرن جیسی ہو رہی تھی جو شکاری کتوں کے نرغے میں آ چکا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ کاش زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں زندہ سما جائیں۔ اس سے زیادہ بدنصیب منظر ان آنکھوں نے پہلے کب دیکھا تھا؟'' نانی ہچکیاں لے کر رونے لگیں۔

''گرنتھی جی نے ہمیں سکھ بنانے کی ضروری کارروائی کرتے ہوئے ہمیں نئے نام دیئے اور متھا ٹیکنے کو کہا۔ میں سینے پر پنج سورہ شریف باندھ کر لے گئی تھی۔ میں نے سینے میں شدید درد کا بہانہ بنا کر کہا کہ میں زیادہ جھک نہیں سکتی۔ اس طرح متھا ٹیکنے سے میری گلو خلاصی ہو گئی۔''

''بھلا یہ سر اپنے رب کے سوا اور کسی کے سامنے کیسے سجدہ ریز ہو سکتا تھا؟'' نانی میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں تو میں نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

سب کو متھا ٹیکنے کے بعد پرشاد کھلایا گیا۔ لڑکوں کو کڑے، کرپانیں اور کچھے پہنائے گئے۔ مردوں کے سروں پر خالصے کی سی

پگڑی، کنگے اور کیس سنوارے گئے۔ واہگورو کے نعرے لگوائے گئے..... واہگورو جی کا خالصہ..... واہگورو جی کی فتح، ہم گردوارے سے باہر نکلے تو ''راج کرے گا خالصہ..... باقی رہے نہ کوئی..... کے نعروں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

معصوم بچوں کو کیا علم کہ کیسی قیامت گزر گئی تھی۔ وہ سب خوشی خوشی باہر کھیلنے نکل گئے۔ وہیں سے ارشد نے باقی بچوں کو دیکھ کر ''سونہہ گرودی'' کہنا سیکھ لیا۔ رفتہ رفتہ خدا کی قسم کھانا جیسے بھول ہی گیا۔

ارشد دماغی طور پر کچھ پہلے ہی کمزور تھا جو بات اس کے دماغ میں ایک دفعہ بیٹھ جاتی بس اٹھتے بیٹھتے اسے ہی دہراتا رہتا تھا۔

ایک دن سب بچے باہر کھیلتے ہوئے لڑ پڑے۔ ارشد کے منہ سے ''سونہہ گرودی'' کی بجائے اس دن نہ جانے کیسے ''خدا کی قسم'' نکل گیا تو سکھ لڑکوں نے اسے بہت مارا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ سکھ نہیں مُسلا تھا۔ اس مار پیٹ کے دوران ارشد پکی زمین پر گرا تو اس کے سر پر کوئی اندرونی چوٹ آ گئی جس سے اس کی دماغی حالت اور بھی مخدوش ہوگئی۔ تب سے بس یہ ایسا ہی ہے۔''

نانی ماں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

میں سوچ رہی تھی کہ ''اوئل عمر میں معصوم ذہنوں پر بننے والے نقوش مٹانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔''

''سوونیئر شاپ سے اگر کچھ لینا ہے تو جلدی چلو وہاں رش کی وجہ سے کافی دیر ہو سکتی ہے۔''

طارق بھیا کی آواز مجھے وقت کے زینے سے اتار کر واپس واہگہ اٹاری بارڈر پر لے آئی۔

پاکستان کے مختلف علاقوں کی ثقافت کی زبردست جھلک شاپ میں موجود سبھی چیزوں میں نظر آ رہی تھی۔ ہم سب ہر چیز کو بہت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ سب بہت اشتیاق سے اپنی اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے۔

میرا دل ایک خوبصورت سی سندھی اجرک میں اٹک گیا۔

میری دلچسپی کو دیکھ کر آرمی یونیفارم میں ملبوس ایک نوجوان سیلز گرل نے شوکیس کھول کر چادر باہر نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا کہ وہ وہاں آج ہی ڈیوٹی پر متعین ہوئی تھی اور شاپ میں بکنے والی پروڈکٹس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی۔

لمبائی میں بہت زیادہ اور چوڑائی میں خاصی کم اجرک نے نوجوان سیلز گرل کو مخمصے میں ڈال دیا کہ آیا یہ ایک ہی چادر تھی یا دو چادریں تھیں؟

میں بھی اجرک کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی رہنمائی کر سکتی۔

کافی دیر سے کشمکش کا شکار ناتجربہ کار سیلز گرل نے چادر کو عین درمیان سے کاٹ کر آدھی چادر میرے حوالے کر دی اور میں انجانے میں آدھی چادر لے کر شاپ سے باہر آ گئی۔

''باجی یہ تو انہوں نے آپ کو آدھی چادر دی ہے۔''

ٹیلر ماسٹر کی آواز میرے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگی۔

''آدھی چادر.....آدھی چادر.....؟''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''دیکھیں جی اجرک کو درمیان سے کاٹ کر اس کے دونوں حصوں کو آپس میں جوڑا جاتا ہے تاکہ چادر کی چوڑائی پوری ہو سکے۔انہیں آپ کو پوری چادر دینی چاہیے تھی اس طرح کاٹنی نہیں چاہیے تھی یہ تو کسی نے نا سمجھی میں یا پھر جان بوجھ کر چادر کا ستیاناس کر دیا ہے۔''

ٹیلر ماسٹر نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اب میں واپس واہگہ اٹاری بارڈر پر باقی آدھی چادر لینے تو نہیں جا سکتی۔'' میں نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

''جو ہونا تھا ہو گیا جی اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ اس آدھی چادر کے چاروں طرف بڑے بڑے سیاہ بارڈر لگا کر اسے کچھ بڑا کر لیا جائے مگر یہ پھر بھی پوری چادر نہیں بنے گی۔اسکارف سا بن جائے گا۔بس اس سے ہی کام چلانا ہوگا۔''

ٹیلر ماسٹر نے گویا مجھے اپنے عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے کہا۔

میں آدھی چادر ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور چشم تصور میں دونوں ملکوں کو جدا کرنے والی سرسبز کھیتوں کے بیچوں بیچ گزرتی ہوئی، ٹیڑھی میڑھی سرحد کی لکیر کو دیکھ رہی تھی جس نے پنجاب کے دل کو میری چادر کی طرح دو ٹکڑے کر کے رکھ دیا تھا۔

تاریخ کے صفحات ایک بار پھر پھڑ پھڑائے۔

''آدھی چادریں..... اُدھوری چادریں..... کٹی پھٹی چادریں..... سروں سے ڈھلکی ہوئی چادریں..... خون آلود چادریں..... بین کرتی ہوئی چادریں.....وقت کی کربلا میں نیزوں پر ٹنگی ہوئی چادریں.....آدھا پاکستان.....اُدھورا پاکستان.....کٹا پھٹا پاکستان..... پنجاب کی غیر منصفانہ تقسیم.....گمراہ کن تقسیم.....ناقابل فہم تقسیم.....ہجرت کے دُکھ.....کشمیر کا رِستا ہوا زخم..... ہر شے ادھوری..... ہر چیز ہی نامکمل.....؟''

میں نے دکھ سے سوچا تو دل نے جواب دیا:

''پنجاب کی سانجھ تو ہل پنجالیوں، چرخوں، ہانڈیوں، کنالیوں، سرسوں کے ساگ، مکئی کی روٹیوں، چاٹیوں، کاڑھنیوں، مدانیوں اور مکھن کے پیڑوں کی سانجھ ہے جو ہمیشہ ہی برقرار رہے گی۔''

دل کی خلوصِ نیت سے کہی ہوئی بات سن کر میں نے کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے آدھی چادر کھول کر سر پر اوڑھ لی۔

کچھ آنکھیں ہیں، کچھ سپنے ہیں، کچھ خواب ہیں بکھرے بکھرے سے
تعبیریں ڈھونڈتی خوابوں کی مجبور کہانی ایک سی ہے

(رضیہ اسماعیل)

قُقنس

لزبن میں ایک ہفتے کی چھٹیاں گزار کر واپسی پر میں نے جیسے ہی اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا تو پورچ میں رنگ برنگے خطوں کے ڈھیر نے میرا استقبال کیا۔

''صرف ایک ہی ہفتے میں اتنی پوسٹ۔'' میں نے قدرے حیرانی سے کہا۔

''اکیلے رہنے میں بس یہی قباحت ہے۔'' میں نے بیزاری سے سوچا۔

''گھر میں اگر کوئی دوسرا ہو تو کم از کم آپ کی غیر موجودگی میں پوسٹ کو اٹھا کر کہیں سلیقے سے رکھ ہی دے تا کہ تھکا ہارا بندہ ذرا دم لے کر انہیں دیکھ لے۔'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''آزاد اور خود مختار زندگی گزارنے کی آخر کوئی قیمت تو چکانا پڑتی ہے۔'' دل نے جیسے ٹہوکا دیا۔

دل کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے خطوں کے ڈھیر کے بیچوں بیچ راستہ بناتے ہوئے سوٹ کیس اور ٹرالی کو اندر گھسیٹتے ہوئے ٹھک سے دروازہ بند کر دیا۔

سارا سامان ہال وے میں ہی چھوڑ کر میں نے کوٹ اور سکارف اتار کر ہینگر پر لٹکایا اور کچن میں جا کر کافی کا بڑا سا مگ بنا کر پورچ میں سے ساری پوسٹ اٹھا کر لونگ روم میں لے آئی۔

سارے خطوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو کئی خطوط مقامی لائبریریوں سے آئے ہوئے تھے۔

ایک خط مڈلینڈ آرٹس کونسل اور دوسرا خط آرٹس کونسل انگلینڈ والوں کی طرف سے تھا۔

رائٹرز ویسٹ مڈلینڈ نے اپنی سہ ماہی بروشر و کے علاوہ اگلے مہینے ہونے والے برمنگھم لٹریچر فیسٹیول کی تفصیلات بھی بھیجی تھیں، Fantastic!!!

میں نے خوشی سے نعرہ بلند کیا۔

دراصل میں نے کچھ عرصہ پہلے ہی کئی مقامی لائبریریوں اور آرٹس آرگنائزیشنز کو خطوط لکھے تھے کیونکہ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ اس وقت برمنگھم شہر میں مقامی آبادی میں کس قسم کی ادبی و ثقافتی سرگرمیاں ہو رہی ہیں۔

میں جس تنظیم سے کافی عرصہ سے وابستہ تھی اس کی زیادہ تر ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں ایشیائی کمیونٹی اور خاص طور پر پاکستانی

کمیونٹی اور اردو ادب تک ہی محدود تھیں۔ جس سے یوں لگ رہا تھا کہ ہم ایک سیچوریشن پوائنٹ (Saturation Point) تک پہنچ چکے ہیں اور مقامی آبادی سے الگ تھلگ ہم نے اپنی ایک دنیا آباد کر رکھی ہے۔

''مقامی انگریز کمیونٹی کے ساتھ Integration بہت ضروری ہے وگرنہ ہم زیادہ دنوں تک Survive کرتے نظر نہیں آتے۔''

میں نے پراجیکٹ منیجر کو تنظیم کے مستقبل کے بارے میں گویا پیشگی وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' میری بات غور سے سنتے ہوئے پراجیکٹ منیجر نے جواب دیا۔

''میرے خیال میں تو مقامی ادبی تنظیموں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد ان سے ذاتی رابطے کر کے کچھ ایسے ادبی پراجیکٹ شروع کیے جائیں جن سے انہیں ہمارے ادبی ورثے سے آگاہی ہو اور ہم ان کے ادب کو اپنی کمیونٹی میں متعارف کروائیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''خیال تو اچھا ہے مگر کافی بڑا پراجیکٹ ہے اور پھر ہماری کمیونٹی میں سب ہی لوگ تو انگریزی زبان اتنی اچھی طرح نہیں سمجھتے کہ انگریزی ادبی ورثے سے پوری طرح حظ اٹھا سکیں۔'' پراجیکٹ منیجر نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ اردو زبان میں ترجمے کر کے ہم انگریزی ادب کو اپنی کمیونٹی میں متعارف کروا سکتے ہیں مگر کہیں سے کام کا آغاز تو ہو۔'' میں نے کہا ''ون تھنگ ایٹ اے ٹائم۔''

''تو ٹھیک ہے پھر لٹریچر آفیسر کی حیثیت سے تم مقامی ادبی و ثقافتی تنظیموں سے رابطوں کا آغاز کرو۔'' پراجیکٹ منیجر نے گویا اپروول (Approval) دیتے ہوئے کہا۔

یہ گفتگو کوئی ایک ہفتہ قبل ہی ہمارے درمیان ہوئی تھی اور اتنے سارے رنگ برنگے خطوں کا ڈھیر دیکھ کر میں سوچ رہی تھی کہ تعلیم یافتہ معاشروں میں سینس آف ریسپونسیبلٹی (Sense of Responsibility) کی داد دینی پڑے گی۔ کچھ بھی ہو یہ لوگ آپ کے خط کا جواب ضرور دیں گے چاہے جواب نفی میں ہی ہو اور ایک ہمارے ہاں دیکھو اگر کسی نے بھولے بھٹکے سے کسی ادارے کو خط لکھ ہی دیا تو خط کو دبا کر ہی بیٹھ جائیں گے اور جواب دینے میں بھی اپنی ہتک محسوس کریں گے۔

بہت سی جنک میل بھی تھی جسے میں نے ری سائیکلنگ (Recycling) کے لیے الگ کر لیا۔

میں ایک ایک کر کے خط کھولتی جا رہی تھی اور مقامی ادبی منظر نامہ آشکارا ہوتا جا رہا تھا۔

برمنگھم میں یورپ کی سب سے بڑی پبلک لائبریری جس کا افتتاح پاکستانی نوبل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی نے کچھ عرصہ پہلے کیا تھا۔ انہوں نے شیکسپیئر میموریل روم میں باقاعدگی سے منعقد ہونے والے ادبی گروپ ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز'' (Writers without Borders) کے بارے میں کچھ مواد بھیجا تھا۔

''ویسپرز ان دی وال'' (Whispers in the Wall) کتابچے میں نئے لکھنے والوں کی شعری تحریریں تھیں جن

میں مختلف کمیونٹی کے لوگ شامل تھے۔ ان میں انگریزوں کے علاوہ جمیکن، افریقن، انڈین، پاکستانی اور بنگلہ دیشی رائٹرز تھے مگر زیادہ تر لکھنے والی خواتین تھیں۔

''رائٹ آف وے''(Right of Way) میں ایشیائی خواتین کی ادبی ورکشاپوں کے نتیجے میں لکھی جانے والی شعری اور نثری تحریروں کو یکجا کر کے اس کی اینتھالوجی (Anthology) شائع کی گئی تھی۔

کافی عرصہ پہلے برٹش ساؤتھ ایشین رائٹرز کی شاعری کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اس کی فوٹو کاپی منسلک تھی۔

ینگ ایشین وویمن رائٹرز کی شعری اور نثری تحریروں کا مجموعہ ''رائٹ ٹریک''(Write Track) ساؤتھ یارڈ لے لائبریری نے ارسال کیا تھا۔

سیفرون ٹی(Saffron Tea) ایشیائی رائٹرز کی شاعری کا ایک اور مجموعہ کسی نے ارسال کیا تھا مگر نام پتہ لکھنا بھول گئے تھے۔

اس کے علاوہ کئی ادبی گروپوں کی تفصیل تھی جو باقاعدگی سے شہر میں مختلف جگہوں پر ملنے کا اہتمام کرتے تھے جس میں ''پوئٹس پلیس''(Poets Place) کے علاوہ ''کینن ہل رائٹرز گروپ''(Cannonhill Writer Group) اور ''کینن پوئٹس''(Cannon Poets) شامل تھے۔ ''ویری گڈ اسٹارٹ'' میں نے بڑے پرامید لہجے میں کہا۔

اگلا کتابچہ ''دی سی ان برمنگھم''(The Sea in Birmingham) کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ''عجیب سا نام ہے'' میں نے سوچا۔

برمنگھم میں تو دور دور تک کسی سمندر کا گزر نہیں ہے تو یہ کس سمندر کا ذکر خیر ہے۔ سب سے قریبی ساحل سمندر بھی کم از کم 105 میل کے فاصلے پر ویسٹرن سپر میر (Westron Supermare) ہے۔

کتابچہ پڑھنے پر پتہ چلا کہ یہ برمنگھم کے شارٹ سٹوری رائٹرز کا سمندر تھا جن کی تحریریں ٹنڈل سٹریٹ فکشن گروپ (Tindal Street Fiction Group) نے شائع کی تھیں۔

''ویری انٹرسٹنگ'' میں نے کتابچہ اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

چند ایک نام تو جانے پہچانے سے لگ رہے تھے جن میں گینر آرنلڈ (Gaynor Arnold) کا نام سرفہرست تھا۔ اس کا پہلا ناول The Girl in Blue کے نام سے کچھ عرصہ پہلے ہی شائع ہوا تھا اور مین بکر پرائز کی لونگ لسٹ میں آ گیا تھا جس سے اُسے کافی پبلسٹی مل رہی تھی کیونکہ مین بکر پرائز برطانیہ میں ادب کا بہت Prestigious انعام خیال کیا جاتا ہے۔

برمنگھم لٹریچر فیسٹیول کا انعقاد اکتوبر میں پورے ایک ہفتے کے لیے ہو رہا تھا۔ کافی بھاری بھرکم بروشر تھا جس میں جوناتھن ڈیوڈسن کا نام بطور چیف ایگزیکٹو دیکھ کر میں مسکرا پڑی۔

جوناتھن کو میں اس وقت سے جانتی تھی جب وہ سنٹرل لائبریری میں لٹریچر آفیسر ہوا کرتا تھا۔ یہ کم وبیش پندرہ برس پرانی

بات تھی جب میں نے ادبی وثقافتی تنظیم ''آگہی'' کے ساتھ بطور لٹریچر آفیسر کام شروع کیا تھا۔

''آگہی'' ایک نئی ثقافتی تنظیم تھی بہت سے Teething Problems کے علاوہ فنڈز کی بھی شدید قلت تھی۔ جس کی وجہ سے تقریبات کے لیے ہم کوئی مناسب جگہ کرائے پر لینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ایسے کڑے وقت میں جوناتھن نے ہماری بہت مدد کی تھی اور ہمیں لائبریری کا وسیع وعریض تھیٹر ہال کافی مرتبہ بغیر کوئی کرایہ چارج کیے ہوئے استعمال کے لیے دیا تھا۔

اگر کبھی بڑے ہال میں کوئی اور تقریب ہو رہی ہوتی تو وہ ہمیں شیکسپیئر میموریل روم کھول دیا کرتا تھا جو اکثر چھوٹی تقریبات کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

''اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہی پائے جاتے ہیں لیکن ہم جب بھی انگریزوں کے بارے میں بات کرتے ہیں تو انہیں صرف پولیٹیکل اینگل سے ہی دیکھتے ہیں وگرنہ معاشرتی نقطۂ نظر سے تو میں نے انہیں اپنے لوگوں سے زیادہ انسان دوست اور انسانی قدروں کا احترام کرنے والا پایا ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں جیسے ایک بار پھر جوناتھن کا شکریہ ادا کیا۔

ایک ہفتہ تک جاری رہنے والا برمنگھم لٹریچر فیسٹیول خاصا دلچسپ اور Ethnically Diverse لگ رہا تھا۔ مجھے قوی اُمید تھی کہ اس میں شرکت کرنے سے بہت سی ادبی تنظیموں سے رابطے استوار کرنے میں مدد مل سکتی تھی کیونکہ فیسٹیول میں ہر رنگ اور نسل کے لکھنے والے لوکل، نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر اپنے اپنے ادب کی نمائندگی کرنے کے لیے آ رہے تھے۔

"What a city! Full of art and culture."

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''مگر ہم لوگ یہاں کس قدر الگ تھلگ سی زندگی گزارتے ہیں۔ کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی جگہ ڑاتے رہتے ہیں۔ جب تک ہم مقامی معاشرے میں ربط وضبط بڑھانے کی کوشش نہیں کریں گے تو Sense of Belonging کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکتی اور ہم ناسٹلجیا کا ہی شکار رہیں گے۔'' میں نے بڑے دکھ سے سوچتے ہوئے ساری ڈاک ایک طرف رکھ دی۔

''اسی لیے تو نسلی ہم آہنگی (Racial Harmony) پیدا نہیں ہو رہی اور ہماری نئی نسل انتہا پسندی کی طرف راغب ہو رہی ہے۔''

ذہن کے کسی گوشے نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ادب اور ثقافت انسانوں کے درمیان رابطے کا سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے انسانی تعصب بہت حد تک دور کیا جا سکتا ہے کیونکہ تعصب کی بنیاد ہی لاعلمی یا کم علمی پر ہوتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں جہالت کہہ سکتے ہیں۔''

ذہن کے اس زبردست تجزیے کو جھٹلانے کی میرے پاس قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس سال لٹریچر فیسٹیول کی تھیم (Theme) میں کافی ندرت تھی۔

"Relationship between the written word and music."

یعنی کہ ''الفاظ اور موسیقی کا ملاپ''

ان دونوں آرٹ فارمز کے علاوہ شاعری اور ناول کی ڈانس، تھیٹر اور فلم کے ذریعے پرفارمنس کے کئی پروگرام تھے۔

جس میں جنگ کے موضوع پر پچھلے سو سالوں میں لکھی جانے والی شاعری کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا جا رہا تھا۔

بہت مختصر کہانی (Very Short Story) کو صرف سات منٹوں میں ڈرامائی انداز میں سنانا تھا۔

امریکہ سے مشہور شاعرہ Rita Dove شریک ہو رہی تھی۔

لیٹویا اور لتھوانیا جیسے ممالک سے ناول نگار اور شاعرات اپنے اپنے ناول اور شاعری کو انگریزی تراجم کے ساتھ پیش کرنے کے لیے آ رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی کہ اردو ادب کے تراجم ایسے پلیٹ فارم سے پیش کرنے کا خیال ہمیں کیوں نہیں آتا؟

اس کے علاوہ شاعری پر ایک فلم "Moving Images" کے نام سے دکھائی جا رہی تھی۔

ایک ورکشاپ طنزیہ اور طربیہ تحریروں کے بارے میں تھی۔

کرائم لٹریچر اور ٹی وی سکرپٹ رائٹنگ "Page to Screen" کی دو ورکشاپس تھیں۔

بچوں کے ادب پر کافی بھرپور پروگرام تھا۔

شاعری کے دو مقابلے منعقد ہو رہے تھے۔ ایک تو "Come Write with me" تھا جبکہ دوسرا کافی خوفزدہ کر دینے والا مقابلہ تھا جس میں شاعری سے دلچسپی رکھنے والے کل 20 افراد کو دو نامور شاعروں کے ساتھ مُردوں کے لیے تابوت تیار کرنے والی ایک بہت مشہور فرم کی فیکٹری میں تمام رات جاگ کر گزارنی تھی اور اس کے نتیجے میں جو بھی جذبات و احساسات، مشاہدات اور تجربات ہوتے انہیں شعر کا جامہ پہنانا تھا..... خاصا دل گردے کا کام تھا۔ میرے وجود میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

یہ فیکٹری ایک ایسی ویران جگہ پر تھی جہاں اندھیرا ہو جانے کے بعد بہت کم لوگ جانے کا تصور کر سکتے تھے کیونکہ بھوت، پریت اور روحوں بدروحوں کی کئی کہانیاں اس جگہ سے منسوب تھیں۔

بہت اعلیٰ قسم کے تابوت تیار کرنے کے علاوہ اس فرم کی وجۂ شہرت برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل اور مادر ملکہ کے تابوت تیار کرنے کے لیے سامان فراہم کرنا بھی تھی۔

اس مقابلے کے بارے میں پڑھ کر میں کافی دیر تک لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب کے بارے میں سوچتی رہی جہاں ہمارے بہت سے مشاہیر اور خاص طور پر ادبی شخصیات مدفون ہیں۔ شاعری کا مقابلہ اگر وہاں منعقد کروایا جائے تو کیسا رہے؟

مہاتما گاندھی پرساؤتھ ایشین آرٹس جسے میرے خیال میں انڈین آرٹس کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ ان کے زیادہ تر پروگرام انڈیا اور انڈین آرٹس پر ہی ہوتے تھے، انہوں نے ایک شعری مقابلہ منعقد کروایا تھا اور اب اس فیسٹیول میں جیتنے والی نظمیں پیش کی جانی تھیں۔

میرا دھیان اب کی بار ربانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی طرف چلا گیا۔ ''ہم نے بیرون ملک تو در کنار کیا کبھی اپنے

ملک میں بھی مل گیر سطح پر ان کے لیے کسی ایسے ایونٹ کا اقدام کیا ہے؟''

جو ورکشاپس مجھے سب سے زیادہ دل چسپ لگیں ان میں ایک تو خانہ بدوشوں کے گیتوں (Gypsy Songs) کے بارے میں تھی جس میں رومانیہ، سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ سے خانہ بدوشوں کے روایتی گیت شامل کیے گئے تھے۔

خیال رہے کہ یورپ اور خاص طور پر برطانیہ میں خانہ بدوشوں کو اب زیادہ مہذب نام سے بلایا جاتا ہے یعنی ٹریولنگ فیملیز (Travelling Families)۔

اردو اور پنجابی لوریوں اور نظموں پر ایک ورکشاپ ہو رہی تھی۔ آکسفورڈ کی مشہور پاکستانی پنجابی شاعرہ، ادیبہ اور گلوکارہ نے اپنی آواز میں پنجابی اور اردو لوریاں اور نظمیں ریکارڈ کروائی تھیں جس کی سی ڈی اس فیسٹیول میں لانچ کی جا رہی تھی۔

مجھے اس ورکشاپ کے بارے میں پڑھ کر دلی خوشی ہوئی کہ چلو کہیں سے ابتدا تو ہوئی اب آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

اس کے علاوہ بھی چند اور ایشین رائٹرز اس فیسٹیول میں شرکت کر رہے تھے جن میں بطور خاص کافی مشہور ٹی وی کامیڈی اداکار اور رائٹر میرا سیال اپنے بیسٹ سیلر ناول (Anita and Me) کی ڈرامائی تشکیل لے کر تنیکہ گپتا کے ساتھ آ رہی تھیں۔ میرا نے بہت اچھے ناول اور کہانیاں لکھی تھیں جن میں Life is not all Ha Ha He He اور Bhaji on the Beach بہت مشہور ہوئے تھے۔

ست نام سانگھرا اپنے ناول میرج میٹیریل (Marriage Material) کے بارے میں بات چیت کرنے والا تھا کہ کس طرح دوسروں کی تخلیقی تحریریں آپ کو انسپائر کرتی ہیں اور آپ کے اپنے تخلیقی عمل میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

رائٹنگ ہوم (Writing Home) ورکشاپ کافی الگ قسم کی تھی جسے مختلف نسلی اور ثقافتی پس منظر رکھنے والے رائٹرز نے ترتیب دیا تھا جن کا تعلق برطانیہ، پاکستان، انڈیا، بنگلہ دیش، پولینڈ، سپین، اٹلی اور صومالیہ کے علاوہ ترکی سے تھا۔

یہ کری ایٹو رائٹنگ (Creative Writing) کی دو ورکشاپس خاص طور پر کہانی کے حوالے سے منعقد ہو رہی تھیں۔

لٹریچر فیسٹیول کی تھیم کے مطابق کہانی کو لفظوں کے علاوہ دیگر آرٹ فارمز میں بھی Explore کیا جانا تھا جن میں مصوری اور سنگ تراشی خاص طور پر شامل تھے جبکہ دوسری ورکشاپ صرف سٹوری ان ورڈز (Story in Words) کے بارے میں تھیں۔

میں نے اسی ورکشاپ کے لیے تنظیم کے چند ممبران اور اپنے لیے بکنگ کروا دی کیونکہ میرے خیال میں یہاں ہمیں کچھ اچھے کنٹیکٹ مل سکتے تھے۔

ورکشاپ کے روز ادھیڑ عمر انگریز رائٹر نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

''کہانی زندگی سے الگ نہیں ہے اور نہ ہی زندگی کہانی سے الگ کوئی چیز ہے۔ یہ دونوں ہی ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کہانی کے پردے میں زندگی دھڑکتی ہے تو کچھ غلط نہیں ہوگا کیونکہ زندگی کی کوکھ سے ہی تو کہانی جنم لیتی ہے۔''

ورکشاپ کے لیے آئے ہوئے مندوبین میں تقریباً ہر رنگ اور نسل کے لوگ موجود تھے جن میں انگریز، پولش، جمیکن، افریقن اور ایشین مرد اور عورتیں کافی تعداد میں تھے اور بڑے انہماک سے اس کی بات سن رہے تھے۔

انڈین رائٹر نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنا شروع کیا:

''اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو سبھی پرفارمنگ آرٹس میں زندگی دل بن کر دھڑکتی ہے۔ رقاص کے تھرکتے ہوئے پاؤں ہوں یا موسیقی کی مدھر تانیں۔ سنگ تراش کا خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتا ہوا مجسمہ ہو یا مصور کے برش سے کینوس پر بنی ہوئی رنگولی۔ تخیل کی اڑان ہو یا لفظوں کا اعجاز۔ سب تخلیقی جواہر پاروں میں زندگی ہی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔''

''زندگی، کہانی اور تخلیق'' کے تعلق پر غور کرتے ہوئے میرا وجدان دور اُفق کے اس پار جا پہنچا جہاں چپے چپے پر کہانیاں بکھری ہوئی تھیں۔

لفظ ''کُن'' کی کہانی جس کے کہنے پر ساری کائنات عدم سے وجود میں آ گئی تھی..... سب سے اول پیدا کیے جانے والے نورِ محمدی ﷺ کی کہانی جسے عظیم تخلیق کار نے اپنے ہاتھوں سے چار حصوں میں بانٹ کر ان سے عرش، قلم، بہشت اور عالم ارواح اور باقی ساری مخلوق کو پیدا کیا، پھر قلم کے ساق عرش پر اوّل کلمہ لکھنے کی کہانی، اور ہیبت خطاب جلِ شانہ سے قلم کے منہ پر شگاف ہونا جو قیامت تک کے لیے جاری ہوا۔ شجر ممنوعہ کی کہانی اور آدم وحوا کی نافرمانی کی داستان۔

کہیں بہت دور سے آواز آئی ''قلم کے سینہ پرسوز میں وقت کی امانتیں دفن ہوتی ہیں اور جن چنیدہ لوگوں پر تخلیق کی عطائے خاص ہوتی ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ پوری فکری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ ان امانتوں کو اپنے اپنے عہد کے سپرد کر دیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے کچھ بے یقینی سے سوال کیا تو جواب آیا:

''ہر تحریر اپنے اپنے عہد کی عکاس ہوتی ہے۔ ایک قلم کار کا وجدان، اُس کا تخیل، اُس کا مشاہدہ، اُس کا تجربہ اور علم وآگہی اس کے عہد کی تہذیب ومعاشرت کو کہانی بنا کر کاغذ کے زندان میں قید کر سکتا ہے۔''

مگر زمینی سچائیاں ایک قلم کار کے فکر ونظر کو متاثر کرتی ہیں اور شاید وہ پورا سچ بیان کرنے سے قاصر ہو؟

میرا چہرہ سوالیہ نشان بن چکا تھا۔

''تمہاری بات بھی ایک حد تک درست ہے مگر آدھا سچ پورے سچ سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ قلم کار کی فکری بددیانتی سے کہانیاں زخمی ہو سکتی ہیں اور.....''

میں بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر ہی بول پڑی۔

''زخمی کہانیاں تو بہت خطرناک ہو جاتی ہوں گی؟''

''ہاں، بالکل زخمی ناگن کی طرح..... یہ آدھی ادھوری کہانیاں بہت شوریدہ سر ہو جاتی ہیں۔ ان کی آنکھ کی پتلی میں انہیں

زخمی کرنے والے کی شبیہ ہمیشہ کے لیے ثبت ہوجاتی ہے۔''

اتنا کہہ کر کہیں دور سے سنائی دینے والی آواز معدوم ہوتی چلی گئی۔

اس کے ساتھ ہی ورکشاپ میں پاکستانی رائٹر کی آواز گونجی جو مندوبین سے چھوٹے چھوٹے گروپس میں اپنی اپنی زبان کے ادب میں کہانی کے ارتقاء پر تبادلہ خیالات کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

پاکستانی مندوبین کے گروپ میں اردو کہانی کے ارتقاء پر بات چیت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ''1970 کے بعد سے اردو کہانی میں کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ہماری کہانی کا روایتی کہانی اور اساطیری کہانی سے لے کر جدیدیت پھر مابعد جدیدیت تک کا سفر..... پھر تجریدیت کا تجربہ..... سرایلزم یعنی خوفناک علامتوں کا استعمال پھر علامتی کہانی.....'' میں نے ابھی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ ایک خاتون نے لقمہ دیا۔

''ارے علامتی کہانیاں وہی ناں جن میں گھوڑوں، گدھوں، سانپوں، چھپکلیوں اور الوؤں کی علامتیں استعمال کی جاتی ہیں۔ توبہ ہے۔'' خاتون نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

اب زندگی کو بیان کرنے کے لیے اظہار کے یہ طریقے اپنائے جائیں گے؟

''ایکسپیر یمنٹ، ایکسپیر یمنٹ''..... ایک مندوب نے جواب دیا۔

''تجربہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے مگر علامتی کہانی کا ترجمہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا؟'' ایک مندوب نے کہا۔

''سوتو ہے۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

''بھئی ترقی پسند کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ایک آواز اُبھری۔

''کہانی تو ہمیشہ ترقی پسند ہی ہوتی ہے'' دوسری آواز نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' پہلے مندوب نے سوال کیا۔

''اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ ہر قلم کار اپنے اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے تو پھر ہر عہد آنے والے عہد سے اگر اخلاقی قدروں کے لحاظ سے نہیں تو کم از کم مادی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے تو پھر کہانی ترقی پسند ہوگئی ناں۔''

اس مندوب کی انوکھی منطق سُن کر ایک زبردست قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

ایک اور خاتون کہنے لگیں ''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ منٹو نے کہا ہے کہ ''میں زندگی کو جیسے دیکھتا ہوں اس کا ویسا ہی اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں اس کا ویسا ہی اظہار کرتا ہوں'' یہ بات کس حد تک صحیح ہے؟''

یہ بات کہتے ہوئے خاتون نے سب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔

''کیا واقعی منٹو نے یہ بات کہی ہے یا اس سے غلط طور پر منسوب کی جارہی ہے؟'' سب کو خاموش پا کر خاتون نے پھر سوال کیا۔

سبھی مندوبین ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے پھر کچھ سوچتے ہوئے ایک خاتون بولیں ''میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر آپ منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' یا ''ٹھنڈا گوشت'' پڑھیں تو کیا وہ زندگی کو اس رنگ میں دیکھنے کا متمنی تھا جس میں عورت کی اس طرح سے تذلیل کی جائے؟''

''یہ بات دل کو نہیں لگتی!'' دوسری عورت بول اٹھی۔

ابھی ہماری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ورکشاپ میں پھر انگریز رائٹر کی آواز گونجنے لگی ''لندن کے بعد'' ویسٹ مڈلینڈ برطانیہ کی دوسری سب سے بڑی ریجن ہے جہاں سب سے زیادہ کثیر النسل لوگوں کا ارتکاز ہے۔ لیکن ہم ان لوگوں کے ادب کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں جو ہمارے عہد اور ہمارے معاشرے کی تشکیل میں شامل ہیں۔''

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''اس ملک میں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونے والی کتابوں میں صرف چار فیصد کتابیں دوسری زبانوں کے ادب سے ترجمہ ہو کر آتی ہیں اور وہ بھی صرف چند ممالک سے۔ اس وقت ہمارے پاس دوسرے کلچرز کا ادب پڑھنے اور یہاں ہجرت کر کے آنے والے رائٹرز کو جاننے اور سمجھنے کے مواقع بہت محدود ہیں۔''

اتنا کہہ کر انگریز رائٹر ہمارا ردعمل جاننے کے لیے خاموش ہو گیا۔

''کافی معلومات افزا بات کہی ہے آپ نے تراجم کے بارے میں۔'' ایک مندوب نے کہا۔

''مگر میری ایک ریزویشن ہے ترجموں کے بارے میں کہ ترجمہ کرتے وقت خاص طور پر شاعری میں بہت سا پوئٹک امپریشن دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا اور یوں کافی کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔'' دوسرے مندوب نے جواب دیا۔

''ہاں مگر یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ترجمہ کرنے والے کی گرفت دونوں زبانوں پر کتنی مضبوط ہے اور پھر شاعری کے ترجمے کے لیے مترجم میں Poetic sensibility and senstivity کا ہونا بہت ضروری ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔''

ایک مندوب نے میری ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ ترجمہ کرنے میں کوئی بُرائی نہیں ہے کیونکہ دوسروں تک اپنا ادبی ورثہ پہنچانے میں ایک ذہنی تعلق (Intellectual Relationship) کے ساتھ ساتھ ثقافتی ہم آہنگی (Cultural Harmony) بھی پیدا ہوتی ہے۔ ہماری تنظیم خود اس پراجیکٹ پر کام شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ وگرنہ تو ہم کبھی بھی ادبی اور ثقافتی حوالوں سے اس معاشرے میں Integrate نہیں ہو سکتے۔

میں نے تراجم کے حق میں گویا بھرپور دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بات مکمل ہوگئی ہوتو ذرا آگے بڑھیں۔'' اب کی بار پولش رائٹر کی آواز روسٹرم سے گونجی۔

''دراصل زندگی اور کہانی کے درمیان ایک بہت باریک سا پردہ ہے۔جس طرح زندگی کے راستے اچانک ہی بدل جاتے ہیں۔اسی طرح کبھی کبھی کہانی چلتے چلتے کوئی موڑ مڑ جاتی ہے اور پڑھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے کہ اب آگے سرسبز وشاداب نخلستان ہو گا؟ یا لق ودق صحرا آئے گا؟

ہم سب اس کی بات بہت دل چسپی سے سن رہے تھے۔ایک مندوب کہنے لگا:

''آپ کا کہنے کا مطلب ہے کہ جس طرح ندی میں اٹھنے والی لہر کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ اس کے راستے میں کتنے پڑاؤ آئیں گے اس طرح زندگی کی کہانیاں بھی ندی کی لہروں کی مانند ہی ہوتی ہیں۔کہانی کے آغاز میں جو لگتا ہے اس کے برعکس انجام کچھ اور ہی نکلے۔''

"Exactly"اب کی بار پاکستانی رائٹر نے مندوب کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''جس طرح زندگی کبھی کبھار چونکا دیتی ہے کہانی کا انجام بھی چونکا دینے والا ہوتو پڑھنے والے کے لیے سوچ کی ایک روشن لکیر چھوڑ جاتا ہے اور یہی ایک اچھی کہانی کا مطمع نظر ہونا چاہیے۔''

''کیا آپ نے کبھی ادھوری کہانیوں پر غور کیا ہے؟ ادھوری محبتوں کی کہانیاں.....موڑ مڑتی ہوئی کہانیاں..... بین کرتی ہوئی کہانیاں.....روٹھی ہوئی کہانیاں..... ہاری ہوئی کہانیاں.....مگر ہر لمحہ سانس لیتی ہوئی کہانیاں..... کیونکہ کہانی کبھی نہیں مرتی!!!''

اب کی بار ٹرکش رائٹر بول رہا تھا۔

بعینہٖ جیسے کسی نے کہا ہے کہ''عورت محبت کی وہ کہانی ہے کہ جب اختتام کو پہنچتی ہے تو ایک نیا آغاز پاتی ہے۔''میں نے منہ ہی منہ میں بُدبداتے ہوئے کہا۔

''اُدھوری کہانیوں میں بانسری کی سریلی تانوں کے ساتھ ساتھ پنچم کے سُروں میں محبتوں کی گنگناہٹ بھی شامل ہوتی ہے۔ جیسے ساربان پیار سے تھپکی دے تو اونٹوں کی گھنٹیوں کی آوازیں بھی محبت کے الوہی گیت الاپنے لگیں۔''

ایک مندوب نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے بڑی اداس سی آواز میں کہا تو دوسرے مندوب نے پرتفنن انداز میں اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا:

''او یار بس کرو کہتے ہیں دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اور مجھے ابھی موٹروے پر کئی میل کا سفر کر کے گھر واپس بھی جانا ہے۔'' مندوب کی بات سن کر فلک شگاف قہقہہ پڑا۔

''خاصا دل چسپ موضوع ہے ادھوری کہانیاں؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔اس وقت مجھے سلیم کوثر کی نظم ''چھاؤں'' یاد آ گئی۔

''کہانی اور محبت میں ازل سے جنگ جاری ہے

محبت میں اک ایسا موڑ آتا ہے
جہاں آ کر کہانی ہار جاتی ہے
کہانی میں تو کچھ کردار ہم خود فرض کرتے ہیں
محبت میں کوئی کردار بھی فرضی نہیں ہوتا
کہانی کو کئی کردار
مل جل کر کہیں آگے چلاتے ہیں
محبت اپنے کرداروں کو خود آگے بڑھاتی ہے
کہانی میں کئی کردار
زندہ ہی نہیں رہتے
محبت اپنے کرداروں کو مرنے ہی نہیں دیتی
کہانی کے سفر میں
منظروں کی دُھول اڑتی ہے
محبت کی مسافت راہ گیروں کو بکھرنے ہی نہیں دیتی''

میں اپنے خیالوں میں کہیں بہت دور نکل گئی تھی۔ ایک مندوب کی آواز سن کر واپس لوٹی۔

''ہر زبان کے ادب میں محبت کی ادھوری کہانیوں کا ذکر ملتا ہے جیسے ہمارے ہاں ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسی پنوں اور مرزا صاحباں کی لوک داستانیں ہیں۔ اس کے علاوہ رومیو جولیٹ، اینٹونی قلوپطرہ، شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں ابھی تک سسک رہی ہیں۔'' ایک پاکستانی مندوب نے کہا۔

''کہانی کبھی نہیں مرتی چاہے وہ ادھوری ہی کیوں نہ رہ جائے۔'' میں نے کچھ سوچ کر قدرے اداسی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ادھوری محبتیں ہی تو اصل کہانی بناتی ہیں وگرنہ مکمل ہو جانے والی محبتوں کو کون یاد رکھتا ہے؟'' میری بات سن کر ایک اور مندوب نے گویا فلسفے کی گتھی سلجھاتے ہوئے کہا:

''سوال تو صرف راستے میں رہ جانے والوں سے کیے جاتے ہیں منزل پر پہنچ جانے والوں سے نہیں۔''

''بہت خوب۔'' میں نے کہا۔

اب کی بار اٹیلین رائٹر بول رہا تھا ''اس کائنات کا ذرہ ذرہ ایک کہانی سنا رہا ہے۔ ہمارے وجود کے چودہ کھرب خلیے بھی کئی کہانیاں سنا رہے ہیں۔'' ایک مندوب جلدی سے بول اٹھا۔

''ونڈرفل.....کیا بلین ڈالر کی بات کی ہے آپ نے.....''

میں سوچ رہی تھی کہ ''اگر کہانی کبھی مکمل ہی نہیں ہوتی تو پھر بہترین سے بہترین کہانی کار بھی کبھی پوری کہانی بیان نہیں کر سکتا؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو'' وقت نے جیسے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

حقیقت کو کہانی بنا کر من وعین بیان کر دینا کسی صورت بھی ممکن نہیں ہے۔اس لیے کہ چیزوں کو دیکھنے کے لیے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ لینز ہوتا ہے جس سے ان کا اپنا اپنا سچ اور اپنی اپنی کہانی وجود میں آتی ہے۔''

''تو پھر سارتر، کامیو، والٹیر، بالزک، موپساں، ٹالسٹائی، گورکی، دوستوفسکی، چیخوف، پشکن، گوگول، جیمز جوائس اور فرانز کافکا سبھی کی بات کیا ادھوری ہی تھی؟''

میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

''قانون فطرت ہے کہ مادے کو کبھی فنا نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ مختلف شکلیں بدل بدل کر ہمارے سامنے آتا رہتا ہے جس طرح سے مادے کی ری سائیکلنگ جاری ہے اسی طرح کہانی نئے نئے چولے پہن کر ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔'' وقت نے جواب دیا۔

''ہوں'' میں نے الجھے الجھے سے لہجے میں کہا۔

''تو کیا سعدی، خلیل جبران، کرشن چندر، منٹو، پریم چند، ٹیگور، قراۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، خواجہ احمد عباس، عبداللہ حسین اور انتظار حسین کے علاوہ دنیا کے اور بہت سے کہانی کاروں کی کہانیاں نامکمل ہی رہ گئی؟''

''بالکل'' اب کی بار دل نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''زندگی اور کہانی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔اگر زندگی نامکمل ہے اور ہر لمحہ تکمیل کی طرف بڑھ رہی ہے تو پھر کہانی بھی نامکمل ہی رہے گی نا؟''

دل کی بات سنتے ہی میرا خیال اقبال کے اس شعر کی طرف چلا گیا۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

ذہن کے کسی گوشے سے جوگندر پال کی آواز سنائی دی جو اس خیال کی تائید کر رہی تھی۔

''زندگی تو اٹوٹ ہے۔کوئی ایک جنم میں کیسے پورا کرے.....ہاں اسی لیے میرا کہنا ہے کہ میں ہی چیخوف ہوں.....میں ہی پریم چند، میں ہی منٹو.....اور وہ بھی کوئی، جسے ابھی پیدا ہونا ہے.....میں اسی لیے جنم لیتا ہوں کہ اپنا کام پورا کر لوں مگر میرا کام ہر بار ادھورا رہ جاتا ہے.....''

''گروپ ڈسکشن کا وقت ختم ہو گیا ہے اور اب ورکشاپ اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔''

جیسے ہی ہال میں ٹرکش رائٹر کی آواز گونجی تو سبھی مندوبین اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''ققنس اور کہانی میں ایک گہری مماثلت ہے۔ یونانی فیمیات کے مطابق ققنس کے پروں کو لگنے والی آگ اس کے اندر سے ہی اٹھتی ہے۔ اس طرح جب ایک ققنس اپنی ہی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاتا ہے تو اس کی خاک سے ایک نیا ققنس جنم لیتا ہے۔''

سبھی مندوبین بہت غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔

''اسی طرح کہانی میں ایک رشتہ، ایک تعلق ختم ہونے پر کوئی دوسرا رشتہ، کوئی نیا تعلق اسی کہانی کی راکھ سے جنم لیتا ہے۔''

کہانی اور ققنس کی مماثلت ایک فکر انگیز بات تھی جسے سُن کر سبھی مندوبین جیسے سوچ میں پڑ گئے۔ ٹرکش رائٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''چونکہ پوری کہانی کبھی بھی لکھی نہیں جا سکتی اس لیے بظاہر مکمل ہو جانے والی کہانی بھی ایک اور کہانی کو جنم دیتی ہے۔ یوں کہانی در کہانی کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ یعنی ایک کہانی کی خاک سے ہر بار نئی کہانی پیدا ہو جائے گی ققنس کی طرح۔''

اب کی بار پاکستانی رائٹر کی آواز سنائی دی۔

''اپنے ہی خاکستر سے بار بار جنم لیتے رہنے میں ہی کہانی کا حسن پنہاں ہے۔ یہی اس کا جمالیاتی پہلو ہے۔''

ہال میں بیٹھے ہوئے سبھی مندوبین ققنس اور کہانی کے اس انوکھے تعلق پر ستائش بھرے انداز میں مسکرا رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

کبھی نہ ختم کیا میں نے روشنی کا سفر
بجھا چراغ تو دل کو جلا لیا میں نے

مٹی کی آواز

(افسانے)

انتساب

ماں کے نام

جو کبھی ایک زندہ حقیقت تھی لیکن جب مٹی نے
مٹی کو گلے لگایا تو وہ مٹی کا ڈھیر بن گئی
اور اب وہ ایک خوبصورت یاد بن کر
ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی

؎ یہ مُشتِ خاک، یہ صَرصَر، یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم، تیری لذتِ ایجاد!

(اقبال)

پیش لفظ

انسان کی حقیقت ایک مٹھی رنگا رنگ کی خاک کے سوا اور کیا ہے؟

اپنی ابتدا پر غور کرتی ہوں تو چشم تصور سے وہ منظر دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں جب روح پاک کو حکم صادر ہوا کہ بدن آدم علیہ السلام میں داخل ہو لیکن روح لطیف نے خاک کثیف میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تو خطاب رب الارباب کا روح کو پہنچا۔ ''اے جان داخل اس بدن میں ہو سو روح ڈرتے ڈرتے خاک کے پتلے کے تنگ و تاریک وجود میں داخل ہوئی مگر صرف ایک مقررہ وقت کے لیے!!!''

یعنی یہ طے پایا کہ انسان فانی ہے اور کائنات میں فرد کی وقتی موجودگی اور دائمی عدم موجودگی ہے۔

جیسے بدن کثیف اور بدن لطیف کا ملاپ تاریکی اور روشنی کا ملاپ ہے۔ ویسے ہی زمین بھی آدھی روشن اور آدھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی آسمان کی وسعت میں گھوم رہی ہے۔ جس قدر سوچتی ہوں اتنا ہی اس مسحور کن کہانی کی بھول بھلیوں میں الجھتی چلی جاتی ہوں تب کسی کی کہی ہوئی بات یاد آنے لگتی ہے کہ ''کہانی کا سحر وہ سحر ہے جو ازل سے ہی انسان کو مسحور کرتا چلا آ رہا ہے اور کرتا رہے گا خواہ اس میں راستہ بھول جانے کا ہی خطرہ کیوں نہ ہو۔''

لیکن کہانی میں راستہ بھول کر ادھر ادھر بھٹک جانا بھی کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہی سوچ کر کافکا کے بارے میں آئن سٹائن کی کہی ہوئی بات ذہن میں گونجنے لگتی ہے کہ ''کافکا کے افسانے دماغ پر خراشیں ڈال دیتے ہیں۔''

میرے خیال میں ابن آدم کی کہانی ذہن پر نہیں بلکہ روح پر خراشیں ڈالتی ہے کیونکہ اَلَستُ بِرَبِّکُم کے جواب میں قَالُو بَلٰی کہنے کے باوجود ہم مٹی کی حقیقت کا ادراک ٹھیک سے نہیں کر پاتے اور نافرمانیوں پر نافرمانیاں، کوتاہیوں پر کوتاہیاں اور نفرتوں پر نفرتیں بکھیرتے ہی چلے جاتے ہیں پھر ادراک کے کسی لمحے میں اس کھنکتی سڑی ہوئی مٹی کے پتلے سے آواز آنے لگتی ہے۔

ے ہم خاکی صورت لوگ جہاں میں
کیا کیا ڈھونگ رچاتے ہیں
سب ڈھونگ یہیں رہ جاتے ہیں
ہم مٹی میں مل جاتے ہیں

یہ مٹی اول آخر ہے
یہ مٹی ظاہر باطن ہے
اس مٹی میں ہم تیرتے ہیں
اس مٹی میں بہہ جاتے ہیں
اس مٹی سے تم پیار کرو!
جاں سو سو بار نثار کرو!
کبھی مٹی سے بھی پوچھو تم
جب چکی پاٹ پسی تھی یہ
جب آوے پارا تاری گئی
بے چین سلگتی روحوں سے
جب اس کی گود سنواری گئی
نخوت سے روندی جائے جب
کیا اس کے دل پر بیتتی ہے
یہ منہ سے چاہے کچھ نہ کہے
پر ایک حقیقت جانتی ہے
جسے ساری دنیا مانتی ہے
ہم خاکی صورت لوگوں کو
آغوش میں اک دن لے لے گی
پھر راز و نیاز کرے گی یہ
بے نور ہوئی ان آنکھوں میں
تب سو سو اشک بھرے گی یہ
جب یہ ہی اندر باہر ہے
جب یہ ہی آگے پیچھے ہے
یہی اوپر ہے، یہی نیچے ہے
کس بات پہ تم اتراتے ہو!

مٹی ہو تو مٹی بن کے رہو

اے خاکی صورت لوگو تم.....!

اب اس مشتِ خاک کے بارے میں مزید غور وفکر کرنے کا کام قارئین کے سپرد!

آپکی دعاؤں کی متمنی

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل

ایم بی ای

بروز جمعۃ المبارک

11/3/2019

شک گزیدہ

''اگر رشتوں پر شک کی گرد پڑ جائے تو لاکھ صیقل کرنے پر بھی دلوں کے آئینے کبھی اپنی اصل آب و تاب میں واپس نہیں آتے۔''

میں شہر کے جنرل ہسپتال کی تیسری منزل پر واقع برنز یونٹ (Burns Unit) کو جانے والی لفٹ میں کھڑی گرد و پیش سے بے نیاز اپنی ہی سوچوں میں مگن تھی۔

لفٹ جیسے ہی ایک جھٹکے سے رکی تو میرے خیالات کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

لفٹ سے باہر نکلی تو راہداری میں قدم رکھتے ہی جلے ہوئے انسانی گوشت اور جراثیم کش ادویات کی ملی جلی نہایت ہی ناگوار سی بو نے میرا استقبال کیا۔

میں دراصل آج یہاں بحیثیت کمیونٹی سوشل ورکر ایک پروفیشنل میٹنگ میں شرکت کے لیے آئی تھی۔

اس میٹنگ کا مرکزی کردار ایک نوجوان نرمل سنگھ تھا جسے کچھ عرصہ پہلے شدید زخمی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔

نرمل سنگھ نے گھریلو جھگڑوں سے دل برداشتہ ہو کر گھر کے گیراج میں رکھے ہوئے پٹرول کو خود پر چھڑک کر آگ لگا لی تھی جس سے وہ بہت بری طرح جھلس گیا تھا۔ وہ تو نرمل کی بیوی نے اس کی دردناک چیخیں سنکر بروقت پڑوسیوں سے مدد مانگنے کے ساتھ ساتھ فائر بریگیڈ اور ایمبولینس سروس کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ وگرنہ تو وہ آج زندہ بھی نہ ہوتا۔

''زندہ کہاں ہے مردوں سے بدتر ہے'' دل سے آواز آئی

میں نے خاموشی میں ہی عافیت جانی تو دل نے پھر کہا

''شک کی مٹی جس تن لگ جائے اسے مشکل سے ہی قرار آتا ہے۔ پھر یہی بے قراری، بے چینی اور بے یقینی ایک نہ ایک دن اپنا رنگ دکھا کر ہی چھوڑتی ہے۔''

اب تک نرمل سنگھ کے چھوٹے بڑے کئی آپریشن ہو چکے تھے اور زخم بھی خاصی حد تک مندمل ہو رہے تھے۔

مگر مکمل اسکن گرافٹنگ (Skin Grafting) کے لیے کئی بڑے آپریشن ہونا باقی تھے جن میں کافی عرصہ لگ سکتا تھا۔

آج کی ملٹی پروفیشنل میٹنگ کا مقصد نرمل سنگھ کے ہسپتال سے ڈسچارج اور گھر میں اسے جس سامان اور مدد کی ضرورت تھی

اس لائحہ عمل کو ترتیب دینا تھا۔

میٹنگ میں شرکت کے لیے نرمل سنگھ کی بیوی ڈولی کے علاوہ نرمل سنگھ کی ماں ستونت کور بھی موجود تھی۔

دونوں عورتیں وارڈ سے ملحقہ فیملی روم میں کافی دیر سے خاموش، ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھیں، دونوں کے اکھڑے اکھڑے تیور دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے کافی کبیدہ خاطر تھیں یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔

میں ان دونوں سے ابھی بات چیت میں مصروف ہی تھی کہ وارڈ نرس جولین نے اندر آ کر ہمیں میٹنگ میں چلنے کے لیے کہا۔

جولین مجھے سیدھی وارڈ میں نرمل سنگھ کے پاس لے گئی جبکہ اس نے دونوں عورتوں سے تھوڑی دیر راہداری میں رکنے کے لیے کہا۔

وارڈ میں نرمل سنگھ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی جو بستر میں جسم پر آدھی سے زیادہ سفید چادر اوڑھے داہنی کروٹ لیٹا ہوا تھا۔ جولین کی آواز سن کر اس نے جیسے ہی پلٹ کر دیکھا تو اس کے چہرے کی حالت دیکھ کر مجھے جرجری سی آ گئی۔

اس کا چہرہ دائیں طرف سے اس حد تک جل چکا تھا کہ اس کی بتیسی آدھی سے زیادہ باہر جھانک رہی تھی۔ دایاں نتھنا جل کر تقریباً معدوم تھا۔ ناک کی اندرونی گلابی جلد کافی اندر تک دکھائی دے رہی تھی۔ مزید آگے بڑھی تو دیکھا کہ دایاں کان جل کر تقریباً سارے کا سارا جھڑ چکا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی، جلی ہوئی دائیں آنکھ، اس کے چہرے کو خاصا بھیانک بنا کر پیش کر رہی تھی سر کے زخم پوری طرح مندمل نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک سر پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد نرمل سنگھ قدرے سیدھا ہو کر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تو اس کے ہاتھوں کی حالت دیکھ کر مجھے اور بھی دکھ ہوا

دراصل اپنی پوری پروفیشنل لائف میں اس سے پہلے میں نے انسانی وجود کو اس قدر ناگفتہ بہ حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انسانی ہمدردی کے شدید قسم کے جذبات نے مجھے یکدم گھیر لیا۔

میں سوچ رہی تھی کہ اتنے سیریس زخموں کے باوجود نرمل سنگھ کا زندہ بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔

اس کے دونوں ہاتھوں کی جلد جل جانے کی وجہ سے کافی سکڑ چکی تھی جیسے چمڑے کو تیز دھوپ میں رکھ کر سکھایا دیا جائے۔ ادھ جلی موم بتی کی طرح پگھلی ہوئی انگلیاں موسم خزاں میں کسی ٹنڈ منڈ درخت کی طرح دکھائی پڑتیں تھیں۔

انگلیوں کے زخم کافی حد تک بھر چکے تھے مگر وہ جذبات کی سونامی گزر جانے کے بعد اپنے پیچھے رہ جانے والی تباہی و بربادی کی عبرتناک داستان سنا رہی تھیں۔

اسی ادھیڑ بن میں میرے خیالات کی رو کہیں دور نکل گئی

کہاں پھر رہے ہو

یہاں لفظ کا کوئی معانی نہیں ہے
یہاں تو فقط گیلی مٹی ہے
مٹی کی شکلیں ہیں
بارش کا پہلا ہی چھینٹا پڑا
تو پگھل جائیں گی
اور کیچڑ سے بازار
بھر جائیں گے.....

نرمل سنگھ کا سوختہ وجود بھی اس وقت مجھے سچ مچ کسی کیچڑ سے بھرے ہوئے بازار سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

وارڈ سے فارغ ہوکر ہم میٹنگ روم میں چلے گئے تمام پروفیشنلز کا متفقہ فیصلہ تھا کہ نرمل سنگھ کو اب وارڈ میں مزید رکھنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اگلے تین مہینوں کے لیے اسے ہسپتال سے ملحقہ ری ہیب (Rehab) یونٹ میں منتقل کر دیا جائے گا جہاں سے وہ ہفتے میں ابتدا میں چند گھنٹوں کے لیے گھر جایا کرے گا۔ یہ دورانیہ بتدریج بڑھایا جائے گا اور تین مہینوں کا ری ہیب پروگرام مکمل ہونے پر اسے مستقل طور پر گھر شفٹ کر دیا جائے گا۔ جیسے ہی میٹنگ برخاست ہوئی نرمل کی ماں کچھ کہے سنے بغیر ہی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی حالانکہ میری خواہش تھی کہ میں اس سے مزید بات چیت کروں کیونکہ ایک ماں کے لیے اکلوتے جوان بیٹے کا یوں موم کی طرح پگھل جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ڈولی کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''اماں جی سمجھتی ہیں کہ نرمل کی اس حالت کی ذمہ دار میں ہوں جبکہ نرمل کی ہر وقت شک کرنے کی عادت نے ہم سب کو آج یہ دن دکھایا ہے۔ سارا قصور چاہے مرد کا ہی ہو مگر اس کی کرنی بھی عورت کے سر ہی تھوپ دی جاتی ہے۔''

ڈولی نے آنکھوں میں امڈتی اشکوں کی برسات کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

''اس دنیا میں انصاف ہے کہاں؟'' فضا میں سرگوشی ابھری۔

میں نے ڈولی کو دلاسہ دینے کے لیے اس کے ہاتھ کو ہلکے سے تھام لیا ایک طویل خاموشی کی زبان میں گفتگو کرنے کے بعد میں نے ڈولی سے پوچھا کہ ''نرمل کے اس قدر شکوک وشبہات کی آخر وجہ کیا تھی؟''

ڈولی نے کچھ توقف کیا پھر ایک گہرا سانس لے کر بولی ''یہ ہماری لو میرج تھی ہم دونوں کے سوشل اسٹیٹس میں بہت فرق تھا۔ میں والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ منہ میں سونے کا چمچہ لیکر پیدا ہوئی تھی۔ ممی پاپا کی خواہش تھی کہ اپنے سے زیادہ امیر کبیر گھرانے میں میری شادی ہو مگر نصیب سے کون جیت سکا ہے۔'' ڈولی سانس لینے کو رکی۔

''جذبات میں آ کر ہم نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی تو کر لی لیکن جب زندگی کی تلخ حقیقتوں سے واسطہ پڑا تو گھر میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ اسی تو تکار میں ایک بچے کی ماں بن گئی تو اخراجات میں مزید اضافہ ہو گیا، ممی پاپا ڈھکے چھپے ہماری مدد کرتے رہتے تھے جو نزمل کو بہت ناگوار گزرتی تھی۔'' رفتہ رفتہ وہ شدید احساس کمتری کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اسے شک تھا کہ ممی پاپا ہماری شادی ختم کروا کر کسی کھاتے پیتے گھرانے میں میرا رشتہ کر دیں گے۔''

''تم نے اس کا شک دور کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہم کا بھی کوئی علاج ہے تو پھر میں اس کے شک و شبے کو کیسے دور کر سکتی تھی۔ اس نے تو مجھ سے سیدھے منہ بات کرنا ہی چھوڑ دی تھی۔ ہر بات پر لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا تھا ان حالات میں ہمارے درمیان بات چیت کئی کئی روز تک بند رہتی تھی۔'' رک رک کر وہ پھر بولی۔

''بس ایک دن کسی ایسے ہی جھگڑے کے بعد نزمل نے خود کو گیراج میں بند کر لیا اور.....''

ڈولی بات ادھوری چھوڑ کر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

''سچ ہے کہ شک کا ناگ جب زہر بھری پچکاری مارتا ہے تو اس کی پھوار جہاں تک پڑتی ہے وہاں اعتماد اور یقین کی ہری بھری کھیتیاں بھسم ہو جاتی ہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ میرے خیال کی تائید میں دل سے ایک افسردہ سی سرگوشی ابھری۔

؎ کہاں جائے گی تو ماٹی کہاں تیرا بسیرا ہے
کہاں دکھ درد سے مکتی کہاں سکھ کا سویرا ہے

''اس اجڑے ہوئے وجود کے ساتھ نزمل اب بقیہ زندگی کیسے گزارے گا؟ کیا بنے گا ڈولی اور اس کے بیٹے کا؟'' میں نے دکھ سے سوچا، اتنے میں ڈولی کی آواز مجھے میرے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔

''دیدی! اگر نزمل کو کسی قسم کا شک تھا بھی تو اسے سوچنا چاہیے تھا کہ میں اس کے بچے کی ماں تھی۔ اپنی زمین اگر کلروالی بھی ہو تو کیا اس کی ملکیت چھوڑ دی جاتی ہے؟'' ڈولی کے اس گہرے سوال نے مجھے لاجواب کر دیا۔

تھپڑ

''مٹی محبتوں کی امین ہے ــــ بالکل ماں کی گود کی طرح ــــ بلکہ مٹی ہی وہ مقام ہے جہاں زندگی جنم لیتی اور اختتام پذیر ہوتی ہے لیکن اگر یہی مٹی نفرت سے چہرے پر تھوک دے تو پھر اس آسمان تلے چھپنے کی کوئی جگہ ہے کیا؟''

میں سوزن اور اس کی ماں کے درمیان کافی دیر سے ہونے والے جھگڑے کو سن کر سوچ رہی تھی کہ اچانک چلڈرن سنٹر کی خاموش فضا میں زناٹے دار تھپڑ کی گونج نے زبردست ارتعاش پیدا کر دیا۔ اپنے اپنے بچوں کی ملاقات کے لیے آئے ہوئے والدین خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ اب اگلا منظر کیا ہونے والا تھا۔

دراصل سوزن کی دو سالہ بیٹی شارلٹ کو گھر پر مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے سوشل سروسز کے محکمے نے ایک سال قبل (کورٹ آرڈر کے ذریعے) بہتر نگہداشت کی غرض سے فوسٹر کیررز یعنی رضاعی والدین کے سپرد کر دیا تھا اور وہ ہر ہفتے اس سے ملاقات کے لیے چلڈرن سنٹر میں آیا کرتی تھی۔

سوزن کی عمر ابھی سولہ برس سے بھی کم تھی کہ وہ ٹین ایجر ماں بن گئی تھی۔ یہ اس کے ہائی سکول کا آخری سال تھا جب شارلٹ پیدا ہوئی۔ محکمہ تعلیم کی پوری کوشش تھی کہ سوزن کم از کم اپنے سکول کی تعلیم تو مکمل کر لے تا کہ مستقبل میں اسے کسی قسم کی ٹریننگ یا ملازمت کے لیے پریشان نہ ہونا پڑے۔

اسی خیال سے سکول نے سوزن کو شارلٹ کی پیدائش سے قبل ہی شہر کے سب سے بڑے مدر اینڈ بے بی یونٹ (Mother and Baby Unit) میں منتقل کر دیا تھا تا کہ بچے کی پیدائش تک شارلٹ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔

سوزن ایک اوسط درجے کی طالبہ ہونے کے باوجود اپنی تعلیم میں کافی دلچسپی رکھتی تھی اور خاصی محنتی تھی کیونکہ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ماں کے برعکس کم از کم ہائی سکول کی تعلیم ضرور مکمل کر لے۔

سوزن کی ماں بھی سکول کے آخری سالوں میں حاملہ ہو کر ایک بچے کی ماں بن گئی تھی اور یہ بچی سوزن تھی دونوں ماں بیٹی کی عمروں میں کوئی تیرہ یا چودہ برس کا فرق رہا ہو گا اسی لیے ماں بیٹی کی بجائے وہ ایک دوسرے کی بہنیں زیادہ دکھائی دیتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں میں ماں بیٹی والے روایتی رشتے کا تقدس بہت کم تھا۔ اس لیے سوزن اکثر و بیشتر غصے میں اس رشتے کے تقدس کی حدود کو پھلانگ جایا کرتی تھی۔

سوزن اپنی ماں کو Buddy یعنی سہیلی کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ دونوں کے درمیان اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑا لگا رہتا تھا یہاں تک کہ نوبت گالی گلوچ پر جا کر ختم ہوئی تھی۔

سوزن کے رویے سے تنگ آ کر اس کی ماں نے چند ایک مرتبہ پولیس کو بلانے کی دھمکی بھی دی جس پر کبھی عمل نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ اس کی ماں جانتی تھی کہ اگر پولیس گھر پر آئی تو مسائل کا ایک نہ ختم ہونے والا پنڈورا بکس کھل جائے گا۔ بالآخر ایک روز کے شدید لڑائی جھگڑے کی اطلاع پڑوسیوں نے پولیس کے ساتھ ساتھ سوشل سروسز کے محکمے کو بھی کر دی کیونکہ اس روز روز کے لڑائی جھگڑے میں بے بی شارلٹ بری طرح سے نظر انداز (Neglect) ہو رہی تھی۔

سوزن کا بوائے فرینڈ بھی اسی کی طرح کم عمر تھا جو اس کے حاملہ ہونے کی خبر سن کر ایسا فرار ہوا کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ اس لیے بچی کی دیکھ بھال کی تمام ذمہ داری سوزن اور اس کی ماں کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔

مدر اینڈ بے بی یونٹ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد سوزن نے اپنی ماں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی کیونکہ وہ اکیلی شارلٹ کی نگہداشت کرنے کی ذمہ داری سے گھبرا رہی تھی۔ گھر میں سوزن کے علاوہ اس کے چھوٹے تین اور بہن بھائی تھے ان تینوں کے باپ الگ الگ تھے اور کبھی کبھار انہیں ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ سب سے چھوٹی بہن اور شارلٹ کی عمر میں صرف ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ گھر میں اکثر ہونے والی گالم گلوچ کو دونوں ماں بیٹی نے لگتا تھا کہ ایک نارمل بات سمجھ کر قبول کر لیا ہے مگر دوسرے لوگ ماں اور بیٹی کے تعلقات کی اس گراوٹ کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ مغربی معاشرے میں بھی والدین اور اولاد کے درمیان ادب و احترام کی حد بندی تو ضرور ہوتی ہے بلکہ اچھے سلجھے ہوئے تعلیم یافتہ مغربی گھرانوں میں تو ماں باپ کا ادب و احترام ہمارے مشرقی گھرانوں کی طرح ہی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

ادھر سوزن کی ماں کے گھریلو حالات بھی بچپن میں کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ بچپن میں اس کی ماں کے مر جانے پر باپ کی دوسری شادی اور ماں کے ناروا سلوک نے اسے کم عمری ہی میں ماں بن کر کئی نفسیاتی اور جذباتی الجھنوں میں ڈال دیا تھا۔

ماں بیٹی کے درمیان آج چلڈرن سنٹر میں ہونے والے جھگڑے کی وجہ سوشل ورکر کی حالیہ رپورٹ تھی جس میں سفارش کی گئی تھی کہ بے بی شارلٹ صرف اسی صورت میں سوزن کے پاس واپس گھر آ سکتی ہے جبکہ اس کے پاس کوئی کام اور الگ رہائش ہوتا کہ وہ پوری ذمہ داری سے ایک بہتر ماحول میں اپنی بچی کی پرورش کر سکے۔ لیکن سوزن جانتی تھی کہ اگر اس کو الگ فلیٹ کونسل کی طرف سے مل بھی گیا تو ملازمت کی گارنٹی نہیں تھی اور سوشل سروسز والے بہت زیادہ دنوں تک سوزن کا انتظار کرنے والے نہیں تھے۔ رپورٹ میں یہ بھی سفارش کی گئی تھی کہ اگر مناسب وقت میں سوزن نے اپنے آپ کو شارلٹ کی صحیح نگہداشت کا اہل ثابت نہ کیا تو وہ اسے کسی بے اولاد جوڑے کو آڈاپشن (Adoption) کے لیے دینے پر غور کریں گے۔

رپورٹ پڑھ کر سوزن کافی دل برداشتہ ہو چکی تھی اور اس کا غصہ بات بات پر وہ اپنی ماں پر نکال رہی تھی۔ دراصل بے بی شارلٹ کو کھو دینے کا احساس اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔

آج دونوں ماں بیٹی کبھی اونچی تو کبھی دھیمی آواز میں کافی دیر سے اس بات پر بحث وتکرار کر رہی تھیں دل برداشتہ سوزن آج کچھ زیادہ ہی غصے میں بدزبانی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اپنی ماں کی طرف وہ یوں خونخوار نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گی۔

منہ پر زناٹے دار تھپڑ پڑتے ہی سوزن کی ماں جو صوفے کے ایک کونے پر ٹکی ہوئی تھی اپنا جسمانی توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اوندھے منہ پکے فرش پر جا کر گری جس سے اس کی ناک سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ سوزن ماں کے زخمی ہونے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے لگاتار گالیاں بک رہی تھی یہاں تک اس نے شدید نفرت سے ماں کے منہ پر تھوک دیا۔

''یو بلڈی بچ You Bloody Bitch''

تم نے میری زندگی برباد کر دی۔

تم نے اچھی طرح سے میری پرورش نہیں کی

میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی

تم جہنم میں جلو گی

اب تمہاری وجہ سے میری بچی مجھ سے چھین لی جائے گی''

سوزن کا غصہ کسی طرح کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا جبکہ اس کی زخمی ماں کمرے کے فرش پر سر جھکائے یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے عدالت کے کٹہرے میں کسی مجرم کو پھانسی کی سزا سنا دی جائے۔ غصے سے بے قابو ہوتی ہوئی سوزن کو سنٹر کے سکیورٹی سٹاف نے بڑی مشکل سے قابو کرنے کے ساتھ ہی پولیس کو اطلاع کر دی کیونکہ اس لڑائی جھگڑے کو دیکھ کر شارلٹ کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دوسرے بچوں نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا اور کئی والدین اپنے روتے ہوئے بچوں کو سنٹر سے باہر لے گئے تھے۔

مغربی تہذیب میں رشتوں کی بے توقیری کا یہ بدصورت مظاہرہ دیکھ کر میں سوچ رہی ہوں کہ ''یہ تھپڑ سوزن نے دراصل اپنی ماں کے منہ پر نہیں مارا بلکہ اس نے اس بے راہ رو مغربی تہذیب کے منہ پر زبردست طمانچہ رسید کیا ہے۔''

تتلیاں اُداس ہیں

''ہوش سنبھالتے ہی مجھے گھر میں
مار پیٹ، گالیاں اور چیخ و پکار ہی تحفے میں ملے
مدتوں میری ماں نے ذلت سہی
ایک مرد کے ہاتھوں.....
میں اپنی ماں کی تکلیف دل میں اترتی ہوئی محسوس کرتی تھی
مگر کچھ نہیں کر سکتی تھی
سوائے خدا سے دعا مانگنے کے
لگتا تھا میری ماں
میرے باپ کا ظلم سہنے کے لیے پیدا ہوئی تھی
میں اکثر سوچتی تھی
جو کچھ ماں کے ساتھ ہو رہا ہے
کیا اسے اندازہ تھا
کہ اس کا مجھ پر کیا اثر پڑ رہا ہے؟
جب جب چوٹ ماں کے جسم پر پڑتی
تو نشان میری روح پر پڑتے تھے
ماں جانتی تھی کہ اسے ایک دن
اس عقوبت خانے سے نکلنا ہوگا
مگر اس چار دیواری کو چھوڑنے کیلئے
اسے بہت حوصلہ اور اعتماد چاہیے تھا
جو اسے اس ذلت آمیز زندگی سے نجات دلا سکے''

تانیہ نے رندھے ہوتے گلے کے ساتھ جیسے ہی اپنی انگریزی میں لکھی ہوئی نظم ختم کی تو فضا میں اس کی دبی دبی سسکیوں کی آواز نے جیسے ایک آگ سی لگا دی ہو۔

تانیہ کی سسکیاں میری سماعتوں پر انگارے برسا رہی تھیں مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ میں نے اپنی پوری پیشہ ورانہ زندگی میں اس سے زیادہ تکلیف دہ سسکیاں نہیں سنی تھیں۔ کمرے میں ہم دونوں کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔لیکن ہماری خاموشی باتیں کر رہی تھی۔موتیوں جیسی باتیں۔قوسِ قزاح جیسی باتیں۔ایسا لگ رہا تھا جیسے خاموشی ہزار رنگوں میں باتیں کر رہی ہو۔

قدرے طویل خاموشی کے بعد میں نے اٹھ کر تانیہ کے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا تو اس نے بھی جواباً اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا جیسے کہ وہ مجھ سے ایسے ہی ردعمل کی توقع کر رہی تھی۔

میں لندن میں حال ہی میں جس این جی او میں بحیثیت ریسرچ آفیسر تعینات ہوئی تھی اس کا کام یہاں کی اقلیتی آبادی کو درپیش مختلف سماجی اور ثقافتی مسائل پر ریسرچ کر کے حکومتی حلقوں میں ان کے بارے میں آگاہی پیدا کرنا تھا تاکہ اس کے لیے بہتر قوانین اور حکومتی پالیسیاں تشکیل دی جاسکیں۔ اس سلسلے میں میرا پہلا ریسرچ پروجیکٹ ڈومیسٹک وائلنس (Domestic Violence) یعنی گھریلو تشدد سے متعلق تھا۔جس میں برطانیہ کی ایشیائی کمیونٹی میں گھریلو تشدد کے نتیجے میں بچوں اور خاص طور پر لڑکیوں پر ہونے والے دوررس اثرات کا جائزہ لیا تھا تاکہ مقامی اور قومی سطح پر ان کے لیے بہتر سہولیات مہیا کی جاسکیں جن کا اس وقت دونوں سطح پر خاصا فقدان تھا۔

اس ریسرچ کے خدوخال مرتب کرنے کے لیے تنظیم کی ڈائریکٹر جولی ارونگ کے ساتھ آج میری پہلی میٹنگ تھی جس میں تنظیم کے دیگر سینئر اراکین بھی شامل تھے۔

جولی اس ریسرچ کے بارے میں کافی جذباتی تھی اور چاہتی تھی کہ صحیح معنوں میں ایک جامع ریسرچ کر کے ضرورت مند خواتین کے لیے کسی اچھی سروس کا آغاز کیا جاسکے۔ جولی کے Passionate ہونے کی بڑی وجہ اس کا خود بچپن میں خوفناک گھریلو تشدد کا شکار ہونا تھا جس کے نتیجے میں اس کی ماں نے تنگ آ کر اس کے باپ کو بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا تھا اور اپنے آپ کو فلیٹ کی بالکونی سے گرا کر زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ ریسرچ ایک بے حد حساس اور نازک سماجی مسئلے پر ہے جس کا بہت ممکن ہے کہ ایشیائی کمیونٹی کی طرف سے حوصلہ افزا جواب نہ مل سکے۔ کیونکہ لوگ عام طور پر اس موضوع پر بات چیت کرنے سے کتراتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر بات پولیس سکول یا سوشل سروسز کے محکمے تک پہنچ گئی تو اس کے نتائج کافی پریشان کن ہو سکتے ہیں۔'' جولی ارونگ نے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''گھریلو تشدد صرف برطانیہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اب یہ ایک گلوبل ایشو بن چکا ہے مگر پھر بھی لوگ اس پر کھل کر بات

کرنے سے گریز کرتے ہیں۔'' میں نے جولی کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''یہ انسانی فطرت ہے کہ خطرے کو سامنے دیکھ کر یا تو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں یا پھر شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دھنسا کر بیٹھ جاتے ہیں۔لیکن اب ان حرکتوں سے کام نہیں چلنے والا ہمیں اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھا کر اس کا سدباب کرنا ہوگا۔'' پراجیکٹ منیجر نتاشا جو ہمیں اس عرصے میں جوائن کر چکی تھیں اس نے قدرے درشتگی سے کہتے ہوئے ایک رپورٹ کی طرف اشارہ کیا۔

نتاشا نے حالیہ پولیس رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ گزشتہ دس پندرہ برسوں میں گھریلو تشدد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے اور یہ اضافہ بہت سے دوسرے جرائم کی نسبت کافی زیادہ ہے ہر ہفتے برطانیہ کی مختلف کمیونٹیز میں دو عورتیں اس تشدد کے نتیجے میں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ایک عورت زندگی میں کم و بیش پچپن مرتبہ جسمانی تشدد کا نشانہ بننے کے بعد کسی سے مدد مانگتی ہے اس میں سب سے بڑا مسئلہ عورتوں کا پولیس یا کسی دوسرے محکمے کو رپورٹ کرنے سے گریز کرنا ہے اگر وہ رپورٹ کر بھی دیں تو پھر چارجز پریس (Charges Press) کرنے سے انکاری ہوتی ہیں جس کی وجہ سے بہت سے کیس پولیس عدالت تک نہیں لے جا پاتی اور مجرم صاف بچ جاتے ہیں۔

نتاشا نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر جیکی بول اٹھی

"In a Way, they are colluding with the perpetrators"

''ہاں مگر وہ اس بات سے قطعی لاعلم ہیں کہ ان کا یہ رویہ ان کے بچوں کے لیے زہر قاتل ہے ایسے گھروں میں پلنے والے اکثر بچے عدمِ تحفظ، احساس کمتری، بے اعتمادی، خوف، بے بسی، مایوسی اور افسردگی کے ہاتھوں ڈپریشن اور P.T.S.D کا شکار ہو جاتے ہیں اس لیے یہاں کی ایشیائی آبادی میں نوجوان لڑکیوں میں خودکشی کی شرح دوسری تمام کمیونٹیز سے زیادہ ہے۔''

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس مسئلے کو ختم کرنے کے لیے کام کرنا چھوڑ دیں۔میں جانتی ہوں کہ مسئلہ بہت بڑا ہے اور ہمارے ریسورسز بھی شاید پوری طرح اس کے متحمل نہ ہو سکیں مگر We have to start somewhere''

ہماری گفتگو سن کر جولی اردنگ نے دوٹوک انداز میں بات کرتے ہوئے کہا۔

آگے دو گھنٹے ریسرچ کے ڈیزائن اور سٹائل پر بات کرنے کے علاوہ ریسرچ کے نمونے یعنی Sampling پر بات ہوتی رہی کہ اعداد و شمار کہاں سے اور کس طرح اکٹھے کیے جائیں گے۔

میرے خیال میں سروے ٹائپ Quantitative ریسرچ اس سلسلے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ ہمیں چند اچھی کیس سٹڈیز پر کام کرنا ہوگا تاکہ Qualitative قسم کا Data حاصل کیا جا سکے۔

ایک سیر حاصل بحث کے بعد طے پایا کہ میں مختلف حکومتی اور رضا کارانہ تنظیموں سے رابطہ کر کے چند مناسب کیس سٹڈیز

(Case Studies) کا انتخاب کروں۔

کافی دوڑ دھوپ کے بعد میں نے چند کیس سٹڈیز کا انتخاب کر لیا۔ جن میں تانیہ کا کیس سرفہرست تھا۔

اس سلسلے میں تانیہ سے کئی غیر رسمی ملاقاتوں کے بعد آج اس سے میری پہلی باقاعدہ میٹنگ تھی۔

جہاں تک مجھے تانیہ کے گھریلو حالات کا علم ہو سکا تھا اس کا تعلق ایک متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ والدین آپس میں رشتہ دار تھے اور شادی بھی ان کی پسند سے ہوئی تھی شروع کا کچھ عرصہ تو ٹھیک گزرا مگر بعد میں دونوں فیملیز کے درمیان کئی باتوں پر خاصی کشیدگی ہو گئی تھی جس میں تانیہ کے والد کا رویہ غیر جانبدارانہ رہا جس کے نتیجے میں دونوں والدین میں تلخیاں بڑھتی چلی گئیں اور معمولی معمولی باتوں پر بھی جھگڑا اس قدر بڑھ جاتا کہ اس کا باپ ماں پر ہاتھ اٹھا لیتا اور کئی مرتبہ تو ماں زخمی بھی ہو گئی مگر بہت سی دوسری ایشیائی فیملیز کی طرح یہ معاملہ کبھی پولیس یا کسی دوسرے محکمے تک نہ پہنچ سکا۔

ایک طویل عرصہ متشدد گھریلو ماحول میں رہنے کی وجہ سے تانیہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگی تھی اور بڑے ہو کر اس میں Anxiety نے ایک مستقل شکل اختیار کر لی تھی۔ تانیہ ڈپریشن کا بھی شکار تھی مگر وہ کوئی دوا لینے سے انکاری تھی۔ بالآخر اس نے اپنے فیملی ڈاکٹر کے مشورے سے کونسلنگ سروس سے بات چیت کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی اور باقاعدگی سے کونسلنگ کے لیے ہر ہفتے جانا شروع کر دیا تھا۔ ان نامساعد حالات میں بھی تانیہ نے یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کی اور اب وہ ایک انٹرنیشنل مارکیٹنگ فرم میں بہت اچھے عہدے پر فائز تھی۔

تانیہ قدرے پرسکون ہوئی تو میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے بہت زیادہ سوال نہیں کروں گی بلکہ وہ اپنے گھریلو حالات اور ذاتی زندگی کے بارے میں جو بھی بتانا چاہے وہی میرے لیے کافی ہوگا۔

''میں نے ہوش سنبھالتے ہی ممی پاپا کو لڑتے جھگڑتے ہی دیکھا مگر میں اتنی کم عمر تھی کہ مجھے ان جھگڑوں کی اصل وجہ کی سمجھ نہ آ سکی۔ بچپن کے کئی واقعات مجھے دھندلے دھندلے سے یاد ہیں'' تانیہ نے بات کرنا شروع کر دی۔

کونسی بات تمہیں واضح طور پر یاد ہے؟

میں نے نرمی سے پوچھا تو تانیہ نے جواب دیا۔

''ایک دن کسی بات پر غصے میں آ کر پاپا نے ممی کا بازو اتنے زور سے مروڑا کہ وہ فریکچر ہو گیا اور ممی درد کی شدت سے بری طرح بلبلانے لگیں۔ بجائے ممی کی کوئی مدد کرنے کے پاپا ممی کو گالیاں دینے لگے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ایکٹنگ کر رہی تھی اسی حالت میں انہوں نے ممی کو ایک ٹھوکر ماری اور ان کے منہ پر تھوک کر گھر سے باہر چلے گئے۔''

''اتنی کم عمری میں یہ سب تو بہت خوفزدہ کر دینے والا ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''بالکل'' تانیہ نے سختی سے جواب دیا۔

''کیا تمہارے پاپا نے کبھی تم پر بھی ہاتھ اٹھایا؟''

''چند ایک مرتبہ'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''اس وقت میری عمر کوئی سات آٹھ برس ہوگی۔ میں سکول جایا کرتی تھی۔ میں چاہتی تو ٹیچرز کو بتا سکتی تھی مگر مما نے مجھے بتا رکھا تھا کہ سوشل سروسز والے مجھے گھر سے لے جا کر کسی انگریز فوسٹر فیملی کو دے دیں گے اور پھر میں کبھی گھر واپس نہیں آسکوں گی۔ میں اپنی ممی کو بہت پیار کرتی ہوں۔ اسے کھونے کے ڈر سے میں خاموش رہی اور کسی کو کچھ نہ بتایا۔''

تانیہ بہت اداسی سے اپنے بچپن کی گرہیں دھیرے دھیرے کھول رہی تھی۔

''میری ماں ایک اچھے گھرانے کی تعلیم یافتہ عورت تھی، دن رات کی تذلیل نے اس کی عزت نفس کو بہت مجروح کر دیا تھا جس سے وہ مستقل ٹینشن کا شکار رہتی تھی اور بالآخر دو مرتبہ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہوگئی مگر اس کی ول پاور (Will Power) بہت زیادہ تھی اور وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔ ممی کو روتے ہوئے دیکھنا مجھے بہت برا لگتا تھا۔ میں اکثر سوچتی رہتی تھی کہ آخر ممی ایک مرد کے سامنے اس قدر کمزور کیوں ہے؟ ماں کو اس طرح کمزور اور بے بس دیکھ کر میرے اندر بھی زندگی کے لیے مزاحمت (Resistence) کم ہوتی جا رہی تھی میں شدید تنہائی محسوس کرتی کیونکہ ہماری فیملی بھی Social Isolation کا شکار تھی۔''

''تمہارے والد سے تمہارے ذاتی تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟''

"Almost love and hate Relationships, may be more hate than love"

تانیہ نے انگریزی میں جواب دیا۔

''پاپا کے اس رویے نے مجھے دنیا کے ہر مرد سے متنفر کر دیا ہے۔ اگر کوئی مرد ذرا بھی اونچی آواز میں یا تضحیک آمیز لہجے میں مجھ سے بات کرتا ہے تو پاپا کی شکل نظروں میں گھوم جاتی ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں جو میں بچپن میں نہ کر سکی۔''

تانیہ نے بہت غصے سے جواب دیا۔

تانیہ کافی اپ سیٹ لگ رہی تھی۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میں نے انٹرویو ختم کرنے کا اعلان کر دیا اور اٹھ کر اسے پانی کا گلاس دیا تا کہ وہ ذرا Relax ہو سکے۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر انٹرویو کا آغاز ہوا۔ میرے کسی قسم کے سوال کرنے سے پہلے ہی تانیہ بولنے لگی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے پاپا کے بارے میں مزید بات کرنا چاہتی ہے۔

''جس قسم کی روایتی سوچ رکھنے والی فیملی سے پاپا کا تعلق تھا وہاں ایک خود مختار ذہن رکھنے والی عورت کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ممی کے سوچنے کا انداز بہت مختلف تھا۔ جس کی سزا اسے بھگتنا پڑ رہی تھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ دونوں ہی اپنی اپنی اناؤں کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ پاپا اپنے سے زیادہ میری دادی کی انا کی جنگ لڑ رہے تھے کیونکہ پاپا کا ریموٹ کنٹرول دادی کے ہاتھ میں تھا۔ میں اکثر سوچتی کہ پاپا اگر اس قدر میری دادی کی بات مانتے ہیں تو پھر ہمیں چھوڑ کر انہی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟ ان کی Priority یہ گھر اور اس میں رہنے والے لوگ کیوں نہیں ہیں؟''

تانیہ ذرا سانس لینے کو رکی پھر بولنے لگی۔

''میرے خیال میں دونوں ہی خودغرض تھے۔ انہیں اس بات کا بالکل احساس نہیں تھا کہ میں ان حالات میں کیا محسوس کرتی ہوں۔ میری شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہورہی تھی۔ میں بہت ڈری ڈری اور سہمی سہمی سی رہا کرتی تھی۔ دوسرے بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق، کھیل کود کرنے کو میرا بالکل دل نہیں چاہتا تھا۔ میرا دل ہر وقت ممی میں اٹکا رہتا تھا کہ کہیں پاپا غصے میں آکر ممی کو جان سے نہ ماردیں۔''

اتنا کہہ کر تانیہ نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو آہستگی سے پونچھنے شروع کردیئے۔

''مما مجھے بتایا کرتی تھیں کہ ہمارے مذہب اسلام نے عورت کو بہت بلند مقام عطا کیا۔ بلکہ ماں کے قدموں تلے جنت رکھی گئی ہے۔ جنت میں عورتوں کی سردار حضرت فاطمہؓ کو اُمِّ اَبیہا یعنی اپنے باپ کی ماں کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ کہاں اتنی بلندی اور کہاں یہ پستی؟

''یہ سب سوچ سوچ کر میرا ذہن ماؤف رہنے لگا تھا۔

You know my soul is scarred

مگر یہ زخم کسی کو نظر نہیں آتے۔'' تانیہ نے اتنا کہہ کر جیسے اپنی بات مکمل کردی ہو۔

میں سوچ رہی تھی کہ ایسے گھروں میں پرورش والے بچے کبھی بڑے نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ ایک جذباتی گرداب میں پھنسے رہتے ہیں۔

یہ نرم و نازک تتلیاں کتنی تنہا، کتنی ویران، کتنی بے رنگ، کتنی اداس اور کس قدر زخمی ہوجاتی ہیں۔ جن کے اپنے رنگ چھین لیے گئے ہوں وہ کسی دوسرے کی زندگی میں کونسا رنگ بھریں گی؟

میری بات کے جواب میں دل نے آہستہ سے کہا۔

؎ رنگ و روغن کے تلے، تھی وہی مٹی وہی ریت
جھانک کر دیکھا تو سب گھر ہی کھنڈر سے نکلے

ڈائری

آج بڑے ماموں کی اکلوتی بیٹی زبدہ کی رسم حنا کی تقریب تھی۔
ناچتے، گاتے دوستوں کی منڈی میں دلہا جیسے ہی پنڈال میں داخل ہوا تو پورے ہال میں ایک شور سا مچ گیا۔
سب ہی لڑکیاں دولہا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے بے تابی سے لپکیں مگر دلہا کو دیکھتے ہی نور کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔
نور بت بنی ٹکر ٹکر دلہا کو دیکھے جا رہی تھی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وحشت زدہ ہرنی کی طرح لگتا تھا نور کا سارا وجود آنکھ بن گیا ہو۔
وہ آہستہ آہستہ منہ میں بُد بدا رہی تھی۔
''نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔
ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔
ہرگز نہیں۔''
پاس ہی کھڑی بڑی آپا نے نور کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ انہوں نے پریشان ہو کر نور کو دیکھا نور کیا نہیں ہو سکتا؟
بولو نور۔
کچھ تو بتاؤ؟
بڑی آپا سوال پر سوال کیے جا رہی تھیں مگر نور تو جیسے پلکیں جھپکنا ہی بھول گئی تھی۔
مہمانوں سے بھرے ہال میں کئی آنکھیں سوالیہ نشان بن کر نور کی طرف اٹھیں۔ کئی لب ہلے اور کئی سوال لبوں پر مچل کر رہ گئے۔
نور کو یوں سب کے سامنے تماشا بنتے دیکھ کر بڑی آپا اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی ہال سے باہر عقبی برآمدے میں لے گئیں۔
''یہ روشنی مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔
میں اس روشنی کے بغیر جی نہ سکوں گی۔
اندھیرے میں میرا دم گھٹ جائے گا۔''

اب کی بار نور قدرے اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

آپا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے نور کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''خدا کے واسطے نور ہوش میں آؤ، آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔کونسی روشنی.....کیا باتیں کر رہی ہو؟''

مگر نور نے جیسے آپا کی بات سنی ہی نہ ہو، وہ ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک دل خراش چیخ مار کر ایسی بے ہوش ہو کر گری کہ پھر کبھی اٹھ نہ سکی۔

آج نور کا سوئم ہے۔

نور ہماری سب سے چھوٹی خالہ کی پہلوٹی کی اولاد تھی۔ہم مزاج اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔

ویسے بھی نور کی شخصیت کچھ ایسی طلسماتی تھی جو دیکھتا اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا۔سحر انگیز شخصیت کے ساتھ ساتھ قدرت نے نور کو بہت فیاضی سے حسن کی دولت سے بھی نواز رکھا تھا۔مگر نور میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔تہذیب وشائستگی کا مرقع، بردبار، چہرے پر معصوم مسکراہٹ اور اس پر حد درجہ انکساری نے پورے خاندان کو اس کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ایسے میں نور کی قربت میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔

نور بھی ہر لڑکی کی طرح مستقبل کے سنہرے خواب بنتی تھی۔ہم اکثر لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے پھولوں، تتلیوں، جگنوؤں اور سرخ گلابوں کی باتیں کرتے۔املتاس، رات کی رانی اور بوگن ویلیا کے جھاڑ سے گرے پھولوں کو پاؤں تلے روندتے اور ہوا میں کسی کے قدموں کی چاپ سنتے مگر کسی کو وہاں نہ پا کر کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

زندگی کس قدر خوبصورت اور مہربان تھی۔لگتا تھا وقت یونہی سبک خرامی سے ہماری بلائیں لیتا ہوا چلتا رہے گا۔لمحے یونہی ہم پر نثار ہوتے رہیں گے مگر وقت کے منہ زور بہاؤ کو کون روک سکا ہے؟

بی اے فائنل کا آخری پرچہ دے کر نور اپنی امی اور ابو کے ساتھ گھر واپس آ رہی تھی کہ ایک تیز رفتار ٹرک نے ان کی گاڑی کو اس بری طرح ٹکر ماری کہ ہم سب کی زندگیاں ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو گئیں۔

نور کے امی اور ابو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے موقع پر ہی دم توڑ گئے مگر نور کو صرف معمولی زخم آئے۔لیکن اچانک صدمے نے جیسے اس سے قوت گویائی چھین لی ہو۔''محبتیں یوں بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہیں؟'' وہ اکثر بھیگی بھیگی پلکوں کے ساتھ سوال کرتی۔

دو چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری بھی اب نور کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔

لگتا تھا کہ روزِ اَلَست جو نور کی زندگی کا فیصلہ ہو چکا تھا اس نے بغیر کوئی شکوہ کیے اُس سے سمجھوتہ کر لیا۔چہرے پر نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ کے پیچھے سب کچھ چھپا لیا۔سب خواب، سب جگنو، سب گلاب، ساری تتلیاں حنوط کر کے اس نے جیسے تنہائیوں

کے کفن میں لپیٹ کر صندوق کی سب سے نچلی تہہ میں رکھ دیئے۔

نور کی یوں اچانک موت پر سب ہی شدید ذہنی اور جذباتی صدمے سے دوچار تھے بڑی آپا تو خاص طور پر بلک بلک کر روتی تھیں کیونکہ نور کی امی اور ابو کے جانے کے بعد انہوں نے ایک ماں کی طرح اس کا خیال رکھا تھا۔نور ہر قسم کی بات آپا سے بلا جھجک کہہ لیا کرتی تھی۔دونوں میں عمروں کے فرق کے باوجود محبت، احترام اور اعتماد کا ایک مضبوط رشتہ تھا۔

بڑی آپا اور میں ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بے حد پریشان تھے کہ نور نے دلہا کو دیکھ کر اس طرح کیوں ری ایکٹ کیا تھا؟ کیا وہ انہیں جانتی تھیں؟'' کیا ان کے درمیان.....

اس سے آگے میری سوچ جواب دے گئی۔

آخر یہ نور کی زندگی کا کون سا راز تھا جس کی خبر اس نے کسی کو بھی نہ ہونے دی۔الجھی ہوئی ڈور کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

سوئم کے بعد جیسے ہی لوگوں کی بھیڑ کم ہوئی میں نے نور کے کمرے کی تلاشی لینی شروع کر دی۔میں جانتی تھی کہ نور کو ڈائری لکھنے کی عادت تھی لیکن وہ اس ڈائری کی حفاظت جی جان سے کیا کرتی تھی۔مجال ہے کسی کی نگاہ غلط انداز اس پر پڑ جائے۔

نور کے کمرے میں بڑے سے بک کیس میں کافی کتابیں پڑی تھیں۔میں نے چند شیلفوں میں کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں مگر بے دلی سے واپس رکھ دیں۔کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ پھر کچھ سوچ کر میں کمرے سے جاتے ہوئے رک گئی۔

آخری شیلف پر بڑے سائز کی کافی کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔میں نے جیسے ہی ان کتابوں کو سرکانا شروع کیا تو سب سے بڑے سائز کی ایک کتاب کے پیچھے ایک سرخ رنگ کی ڈائری نظر آ گئی۔اچانک ڈائری دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یوں لگا جیسے کسی نے مجھے نور کی زندگی کی دوبارہ نوید سنا دی ہو۔

میں نے ڈائری کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔جیسے نور ابھی آ کر مجھ سے ڈائری چھین لے گی یہ کہتے ہوئے کہ کسی کی ڈائری پڑھنا بہت بری بات ہے۔''

مگر نور کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے میں نے ڈائری کھول لی۔جلدی جلدی سارے صفحے الٹ پلٹ کر دیکھنے شروع کر دیئے۔کسی بھی صفحے پر نہ دن، نہ تاریخ نہ ماہ و سال کا ذکر۔عجیب ڈائری تھی!

پہلا صفحہ پڑھنا شروع کیا تو پھر پڑھتی ہی چلی گئی۔

''یہ لمحوں کا کھیل بھی بڑا عجیب ہوتا ہے انسان جس لمحے کی چاہ زندگی بھر کرتا ہے کبھی کبھار وہ لمحہ ہماری زندگی میں آ تو جاتا ہے مگر شاید ایک پل کے ہزارویں حصے میں بس جیسے ہمیں چھو کر گزر جاتا ہے جس کا احساس بہت بعد میں ہوتا ہے۔آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

اگلے صفحہ پر لکھا تھا۔

ایک ایسا ہی لمحہ میری زندگی میں بھی آیا تھا میں خوش قسمت تھی کہ وقت پر اس کا ادراک کر لیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے صفحہ پلٹا کہ شاید کسی کا نام لکھا ہوگا۔ اب میری چھٹی حس پوری طرح بیدار ہو چکی تھی میں نے خود کو کسی تکلیف دہ انکشاف کے لیے تیار کر لیا تھا مگر مجھے مایوسی ہی ہوئی کیونکہ وہاں بھی کوئی نام نہیں تھا۔

''اس سے پہلے میری تلاش مجھے اجنبی دیاروں میں پھراتی رہتی تھی سورج، چاند، ستارے، بادل، ہوا، صحرا، دریا، سمندر، رنگ، تتلیاں، پھول، خوشبوئیں، جیسے سب ہی بے بس تھے۔''

نور کی جذباتی تحریر پڑھ کر میں بے اختیار رونے لگی۔ نور مجھے کوئی بھٹکی ہوئی روح لگ رہی تھی۔ شدید پشیمانی کے احساس نے مجھے ایک ناقابل بیان احساس جرم سے دوچار کر دیا تھا۔

آگے چل کر لکھا تھا۔

''کیا صرف خواہش کرنے سے ہی سب کچھ مل جاتا ہے؟''

آگے کے چند صفحے خالی تھے مگر جگہ جگہ پڑے آنسوؤں کے نشانات سے لگ رہا تھا کہ شاید شدت غم نے آگے لکھنے نہیں دیا۔

''بالآخر ازل سے بچھڑی ہوئی روحوں نے ایک دوسرے کو پہچان ہی لیا۔ لیکن اب ملن کا طویل انتظار۔ جدائی کی جانکاہ گھڑیاں۔ آخر کب ختم ہوں گی؟''

نور کی تحریر نے مجھے اور زیادہ اداس کر دیا تھا۔ میں جسے اس کی عزیز ترین دوست ہونے پر فخر تھا اس کے شہرِ ذات کے اندر پلنے والے دکھوں سے کتنی بے خبر رہی نور اداسیوں اور تنہائیوں کے آرے سے کٹتی رہی۔ لہولہان ہوتی رہی۔ مگر اف تک نہ کیا اور جب لب کھلے تو زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔ زبان خاموش رہے تو آنکھیں گفتگو کرتی ہیں۔ اب میں تم سے کیسے پوچھوں کہ مرنے والوں کی آنکھیں گفتگو کیوں نہیں کرتیں؟ میں نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔

چند صفحے آگے پلٹے تو لکھا تھا۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت زیادہ۔ دوسروں سے خوشی کو چھپانا بھی کتنا مشکل کام ہے۔ غم زدہ چہروں کو دیکھ کر تو لوگ کم ہی سوال کرتے ہیں مگر خوش باش مہکتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر اگر لب سے سوال نہ بھی کریں تو آنکھوں سے سو سوال کرتے ہیں۔''

''آخر وقت کا ایک انمول لمحہ میری گرفت میں آ ہی گیا۔ جسے میں نے مٹھی میں زور سے بند کر لیا۔'' آج اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''یوں مٹھیاں کیوں بینچ رکھی ہیں؟''

تو میں نے جواب دیا ''انمول لمحوں کے کھو جانے کا خوف ہے۔''

''کبھی بھلا مٹھیاں بند کر کے بھی کوئی وقت کو روک سکا ہے۔ لمحوں کو قید نہیں کیا جا سکتا..... انہیں آزاد کر دو۔''

''میں نے جیسے ہی بند مٹھی کھولی وہ لمحہ میری گرفت سے آزاد ہو کر مجھے تہی دامن کر کے چلا گیا۔''

آگے بہت سے صفحے خالی تھے۔

ڈائری کے آخر میں کچھ کاغذات تھے۔جن میں سے ایک رنگین لفافہ نکل کر نیچے گر گیا۔کھول کر دیکھا تو ایک بے نام خط تھا نور کے نام۔

''اس سارے کھیل میں تم مجھے قصوروار نہ سمجھنا۔میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔نہ تمہیں یاد رکھنا اور نہ ہی تمہیں بھول جانا کیونکہ جو چیز خون کے ساتھ وجود میں گردش کرتی ہو اسے کوئی خود سے کیسے الگ کر سکتا ہے۔اسے تو صرف موت ہی جدا کر سکتی ہے۔لیکن موت تو صرف جسم کو آتی ہے روح تو ہمیشہ زندہ رہتی ہے جیسے ہماری محبت امر ہے۔''

نور کی ڈائری پڑھ کر میں ایک بار پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''محبت تو زندگی ہے۔نمو کا زبردست احساس ہے وہ خوشبو ہے جو مہکے تو جسم و جاں کو عطر بیز کر دیتی ہے پھر نور نے اسے صرف ڈائری کے صفحوں میں کیوں قید کر دیا؟''

میری بات کی تائید میں دل بھی جیسے کہہ اٹھا:

؎ محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے، آب جو ہے
جو دلوں کے درمیان بہتی ہے، خوشبو ہے
کبھی پلکوں پہ لہرائے تو آنکھیں ہنسنے لگتی ہیں
جو آنکھوں میں اتر جائے تو منظر اور پس منظر میں
شمعیں جلنے لگتی ہیں
کسی بھی رنگ کو چھو لے، وہی دل کو گوارہ ہے
کسی مٹی میں گھل جائے، وہی مٹی ستارہ ہے
محبت ڈائری ہرگز نہیں ہے

عمر قید

میں کافی دیر سے زمین پر نظریں جمائے بیٹھی کسی گہری سوچ میں منہمک ہوں

''تم نے کبھی غور کیا ہے کہ انسانی جذبات واحساسات کی طرح مٹی بھی خوشی اور غم میں اپنے رنگ تبدیل کرتی رہتی ہے۔''

زمین نے سرگوشی کی تو میں چونک پڑی۔

''ہاں خوشیوں میں سنہری مٹی کی رنگت کچھ اور سنہری ہوجاتی ہے اس کی سوندھی سوندھی خوشبو روح کو اتنی معطر کر دیتی ہے کہ بس ایک نشہ سا طاری ہوجاتا ہے لیکن غمگین اور اداس مٹی کی رنگت کسی گہنائے ہوئے سورج کی مانند ہوجاتی ہے جیسے کسی تیرہ بخت کی خوشیوں پر سیاہی مل دی جائے۔''

میں نے آہستہ سے جواب دیا اور پھر سے پاس پڑے ہوئے اخبار کو اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔

دراصل آج کے اخبار کی شہہ سرخی دیکھ کر میری سوچوں کا سلسلہ کہیں سے کہیں جا نکلا تھا۔

''مہندر سنگھ کوہلی کو عدالت نے عمر قید کی سزا سنادی ہے''

دماغ پر زور دیا تو یاد آیا کہ یہ کم از کم کوئی پانچ چھ برس پرانا کیس ہے جس میں ایک سترہ سالہ انگریز لڑکی حنا فوسٹر کو اغوا کرنے کے بعد اس کی عصمت دری کی گئی اور پھر نہایت بے رحمی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

دوران تفتیش کرائم اسکواڈ کو ملنے والے فورنزک (Forensic) شواہد چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ قاتل کوئی اور نہیں تھا بلکہ حنا کے پڑوس میں رہنے والی اس کی دوست پدمنی کا باپ کوہلی تھا جو وقوعہ کے بعد انڈیا فرار ہوگیا تھا۔

برطانیہ میں پولیس کی تفتیشی ٹیم یہاں کے انڈین ہائی کمیشن کے توسط سے دہلی میں انڈین کرائم برانچ سے مسلسل رابطے میں تھی۔ انڈیا میں برٹش ہائی کمشن بھی مسلسل مقامی پولیس کے ساتھ رابطے میں تھا اور باقاعدگی سے برطانیہ میں پولیس کو کیس میں ہونے والی پیش رفت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ مگر اتنی کوشش کے باوجود بھی قاتل کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

قاتل کو اپنے طور پر تلاش کرنے کے لیے حنا کے والدین گزشتہ پانچ برسوں میں تین مرتبہ انڈیا جا چکے تھے۔ بالآخر سب کی مشترکہ کوششیں رنگ لے آئیں اور کوہلی کو انڈیا میں گرفتار کر کے برطانیہ کے ساتھ تحویل مجرمان کے معاہدے کے تحت واپس لا کر برٹش کورٹ آف جسٹس میں مقدمہ چلایا گیا جہاں اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

یہ خبر پڑھ کر مجھے ایک روحانی اطمینان محسوس ہوا۔ اس لیے کہ اخبار کی شہہ سرخی نے مجھے اٹھارہ برس پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''آج حنا کے والدین نے پانچ سالوں میں پہلی مرتبہ سکھ کا سانس لیا ہوگا۔'' میں نے خود سے کہا اور پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو ڈھلکنے سے پہلے ہی پونچھ ڈالا۔ میں حنا کے والدین کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیت بخوبی سمجھ سکتی تھی کیونکہ جس روز حنا کا قتل ہوا عین اسی روز اٹھارہ برس پہلے میرے نوجوان بیٹے کو بھی بیداری سے قتل کر دیا گیا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں حالات کا موازنہ کرنے لگی۔

حنا کی ماں کو کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ اس کی بیٹی کا قاتل کیفر کردار کو پہنچا مگر میرے پاس تو وہ اطمینان بھی نہیں ہے کیونکہ میرے بیٹے کے قاتل گرفتار ضرور ہوئے۔ ان پر عدالت میں مقدمہ بھی چلا مگر نا کافی شواہد کی بنا پر وہ سب چھوٹ گئے۔

کراؤن کورٹ میں پورے دو مہینے مقدمہ چلا۔ پروسکیوشن (Prosecution نے کافی زوردار دلائل دیئے۔ قوی امید تھی کہ مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق میں آئے گا مگر جب کمرہ عدالت میں جیوری کے فیصلے کے مطابق ''Not Guilty'' کی کربناک آواز گونجی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے صور اسرافیل پھونک دیا گیا ہو۔ زمین الٹ دی گئی ہو۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگے ہوں۔ جیسے میرے بیٹے کے قاتلوں کی جگہ مجھے عمر قید کی سزا سنا دی گئی ہو۔

دل چاہا کہ کمرہ عدالت میں چیخ چیخ کر کہوں کہ ''اگر میرے بیٹے کے قاتل یہ نہیں تو پھر کون ہیں؟ جاؤ انہیں گرفتار کر کے لاؤ۔ کٹہرے میں کھڑا کرو۔ کیونکہ مجھے انصاف چاہیے۔''

لیکن عدالت کا احترام مانع تھا اس لیے بغیر کچھ کہے سنے خاموشی سے آنسوؤں کو پیتی ہوئی میں کمرہ عدالت سے باہر آ گئی۔

باہر پریس والے کیمرے تھامے کھڑے تھے۔ جن کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے پہلے سے تیار کی ہوئی فائنل سٹیٹمنٹ پرزے پرزے کر کے پاس پڑے ہوئے ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اے مالک! گواہ رہنا مجھے اور میرے بیٹے کو دنیا کی عدالت سے انصاف نہیں ملا مگر تیری عدالت کا انصاف ابھی باقی ہے۔''

اخبار میں آگے کمرہ عدالت میں پڑھی جانے والی حنا کی ماں کی سٹیٹمنٹ تھی جسے ماں کی بجائے اس کی آنٹی نے آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان پڑھ کر سنایا تھا۔ لکھا تھا

''میں حنا کی ماں ہوں۔ ہم ایک عام سی فیملی تھے جو ہنسی خوشی اپنی دو بیٹیوں سترہ سالہ حنا اور چودہ سالہ سارہ کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے میرے شوہر اور میری خوشیوں کا محور ہماری دونوں بیٹیاں ہی تھیں۔ ان کے مستقبل سے وابستہ امیدیں اور ان کے آنکھوں میں جگمگاتے مستقبل کے سنہرے خواب ہی ہمارا اثاثہ تھا۔

سترہ مارچ نے ہماری زندگیاں ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیں۔ جب ہم نے اپنی بیٹی حنا کی بے جان لاش مردہ خانے میں

دیکھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ زخموں سے اٹا پڑا بے جان سرد جسم میری حنا کا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو ستارے چمکتے تھے۔ کہاں گئے وہ؟ اس کی زندگی سے بھرپور جاندار مسکراہٹ کہاں کھو گئی؟ اس کے وجود کی نرمی اور گرمی کون چرا کر لے گیا؟ حنا ایک سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ نہیں۔ یہ سب میری بیٹی کے ساتھ نہیں ہوسکتا'' حنا کی ماں کا بیان پڑھتے ہوئے میری آنکھیں چھلک پڑیں۔

آگے لکھا تھا۔

''لیکن کسی سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کی حرارت سے محروم میرے سامنے سٹریچر پر پڑا ہوا وجود حنا کا ہی تھا۔ ہماری پہلوٹی کی اولاد۔ جس کی زندگی کی لچک دار شاخ ایک ظالم نے اپنی وقتی ہوس کی خاطر بیداری سے کاٹ کر رکھ دی تھی۔ لیکن میری بیٹی حنا ہی کیوں؟ زندگی کتنا کچھ اپنے دامن میں سمیٹے میری بیٹی کو دینے کی منتظر تھی اور حنا کے پاس بھی زندگی کو لوٹانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ بہت سی ذہانت..... بہت سے وعدے..... بہت سے خواب..... بہت سی تعبیریں..... انسانی ہمدردی..... مگر بے سود!!!''

اس سے آگے کا بیان اور بھی تکلیف دہ تھا۔

''ماں جب ایک بچے کو جنم دیتی ہے تو قدرت اس میں اپنے بچے کی نمو کے ساتھ ساتھ اس کی حفاظت کا طاقت ور جذبہ بھی اسے عطا کر دیتی ہے اس خوفناک رات جو تکلیف میری بیٹی نے برداشت کی میں اس رات اپنی بیٹی کی جگہ ہونے کے لیے کوئی بھی قیمت ادا کر سکتی تھی۔ جو خوف، جو دہشت، جو سراسیمگی میری بیٹی نے اس رات برداشت کی کاش وہ میرے حصے میں آ جاتی۔ اب میں اپنی بقیہ زندگی اس احساس جرم کے ساتھ گزاروں گی کہ میری بیٹی کو جب میری مدد کی اشد ضرورت تھی تو میں اس کے پاس موجود نہ تھی۔ وہ ایک شقی القلب اجنبی کے ہمراہ اکیلی ہی خوف اور دہشت کے ماحول میں سسکتے سسکتے مر گئی۔ مجھے اب لگتا ہے جیسے بدخصلت کوہلی نے میرا دل میرے وجود سے اکھاڑ کر بیدردی سے قدموں تلے روند ڈالا ہو۔''

میں اب باقاعدہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ اخبار کو بگھو رہے تھے۔ اس سے آگے کا بیان مجھ سے پڑھا نہ جا سکا۔

میں سوچنے لگی کہ

''ایک قتل کے ساتھ کتنے اور لوگ بھی قتل ہو جاتے ہیں۔ تختہ دار پر صرف ایک مجرم ہی نہیں جھولتا بلکہ اس کی نسلیں اپنے ناکردہ جرم کی سزا بھگتتی ہیں یہ عمر قید صرف کوہلی کو ہی نہیں ہوئی بلکہ اس نے اپنے خاندان کی مٹی بھی اس طرح پلید کر کے رکھ دی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ اب وہ بھی عمر قید کی سزا کاٹیں گے''۔

مٹی کی آواز

''دیکھ فرید امٹی گھلی
مٹی اُتے مٹی ڈُلی
مٹی ہنسے، مٹی روئے
انت مٹی دا مٹی ہووے
نہ کر بندیا میری میری
ایہہ نہ تیری، ایہہ نہ میری
چار دناں دا میلہ دنیا
فیر مٹی دی ڈھیری.....''

بابا فرید کا کلام بڑے دل سوز انداز میں اک تارے پر گاتا ہوا درویش ہر جمعرات کو گلی میں سے گزرتا تھا۔ اس کے گزر جانے کے بعد بھی کافی دیر تک میں مبہوت سی ہو کر بیٹھی رہتی تھی۔

''مٹی کی پکڑ بڑی زبردست ہوتی ہے'' دل کے کسی گوشے سے آواز آئی تو میں حقیقت کی دنیا میں واپس آ گئی اور لان میں پاس ہی پڑے شادی کے دعوت نامے کو اٹھا کر اندر کمرے میں چلی آئی جہاں عینی آپا پلنگ پر لیٹی کمرے کی چھت کو یوں انہماک سے گھور رہی تھیں جیسے وہاں کوئی فلم چل رہی ہو۔

''عینی آپا۔ کیا آپ شادی پر جائیں گی؟

میرے سوال کے جواب میں عینی آپا اٹھ کر بیٹھ گئیں اور کچھ دیر تک میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھنے کے بعد بولیں۔

''کیا نہیں جانا چاہیے؟''

ان کے سیدھے سیدھے سوال پر میں سٹپٹا کر رہ گئی۔

''میں تو کبھی نہ جاؤں ایسے گھر میں جہاں آپ کے ساتھ اس قدر ہتک آمیز سلوک ہوا۔''

میرا جواب سن کر عینی آپا نے ایک لمبی سی ''ہوں'' کے سوا کچھ نہ کہا۔

''کیا آپ فرخ بھائی کو مانجھے کے جوڑے میں دیکھ سکیں گی؟'' مگر عینی آپا خاموش ہی رہیں۔

چند روز پہلے ہی اپنے سسرال سے یہاں آئی ہوئی عینی آپا سے مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں فرخ بھائی کی شادی پر جانے کا فیصلہ نہ کرلیں اور وقت نے جو زخم مندمل کر دیئے تھے وہ کہیں پھر سے نہ رِسنے لگیں۔''

فرخ بھائی ہمارے بڑے ماموں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ تین بہنوں کے چہیتے بھائی جو بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔

عینی آپا اور فرخ بھائی کی محبت کی بازگشت برسوں بعد بھی فضا میں محسوس کی جاسکتی تھی۔

ان دونوں کی شادی کے لیے خاندان بھر میں اس قدر مخالفت ہوئی لگتا تھا کہ ایک بار پھر سے پانی پت کی لڑائی لڑی جارہی ہو۔

اس مخالفت میں سب سے پیش پیش امی کی کزن ثریا خالہ تھیں۔ بظاہر ہمدرد شیریں زبان مگر حسد اور رقابت کے جذبے سے اندر ہی اندر یوں جلتی رہتی تھیں کہ مجھے حیرت تھی کہ وہ اب تک جل کر کوئلہ کیونکر نہ ہوگئیں۔

امی اپنی سادہ لوح طبیعت کے ہاتھوں ہر محبت سے بات کرنے والے کی بات کا اعتبار کرلیتی تھیں اور اپنی اس عادت کی وجہ سے اکثر خسارے میں رہتی تھیں۔

امی دراصل پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں اور چرب زبان چچازاد بہن ثریا آپا کو سگی بہنوں کی طرح ہی جانتی تھیں اس لیے اپنا ہر راز ان سے بانٹ لیا کرتی تھیں جس کا خالہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔

اس کے برعکس ہم تین بہن بھائی تھے۔ عینی آپا کے بعد میں اور مجھ سے چھوٹا ارحم تھا۔ عینی آپا شروع سے ہی کھلنڈری طبیعت کی مالک تھیں۔ ہنس مکھ عینی آپا دیکھنے میں بھی خوش شکل اور اس پر چہرے پر کھیلتی شریر مسکراہٹ ہر کسی کو اپنی طرف مائل کرلیتی تھی۔

خاندان بھر کی لڑکیوں کی بجائے وہ لڑکوں میں زیادہ ہر دلعزیز تھیں۔ اس لیے روایتی سوچ رکھنے والے خاندان میں کسی نہ کسی بات کی زد میں آجایا کرتی تھیں۔

پتہ نہیں کب چپکے سے فرخ بھائی عینی آپا کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ وہ عینی آپا کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگے تھے۔ عینی آپا سے جدائی کا سوچ کر ہی ان کے چہرے کی رنگت زرد پڑ جاتی تھی۔ یوں لگتا تھا اگر عینی آپا انہیں نہ ملیں تو وہ زندہ نہ رہ پائیں گے۔ ادھر عینی آپا کی حالت بھی فرخ بھائی سے کچھ مختلف نہیں تھی۔

امی اور ممانی کے درمیان ہم نے ہمیشہ تناتنی ہی دیکھی تھی ممانی کا تعلق ایک بااثر خاندان سے تھا اور ماموں بھی ان کی خاندانی شان وشوکت سے ہمیشہ مرعوب رہتے تھے۔ ایسے میں اگر نند بھاوج کے درمیان کوئی بات ہوجاتی تھی تو ماموں کی ہمدردی کی

چڑیا ہمیشہ ممانی کی منڈیر پر ہی چہچہایا کرتی تھی۔

ممانی کی خواہش تھی کہ وہ فرخ کا رشتہ اپنے خاندان میں کریں اپنی بہن کی بیٹی مریم سے جو فرخ کو کبھی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ادھر فرخ بھائی کی شکل وشباہت اور عادات واطوار شہزادوں جیسے تھے۔ خوش شکل، سرخ سپید، دراز قد، سیاہ گھنے بال، نرم خو اور ہنس مکھ جو اپنی دل کش شخصیت سے ہر ایک کو اپنا ہم نوا بنا لیتے تھے مریم کسی طرح بھی فرخ بھائی کے جوڑ کی نہ تھیں۔ نہ شکل وصورت، نہ عادات واطوار، تعلیم بھی واجبی سی۔ مگر بے انتہا دولت کی اکیلی وارث تھیں۔ فرخ بھائی نے سیدھے سپاٹ مریم سے شادی سے انکار کر دیا تھا جس پر ممانی بہت سخی پا تھیں۔ اور وقت بے وقت عینی آپا کو کوسنے دیتی رہتی تھیں۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی نند کی بیٹی کو خاندان کی بہو بنا کر گھر لے آئیں؟

ان دنوں فرخ بھائی بہت پریشان رہا کرتے تھے اپنی میڈیکل کی تعلیم سے فارغ ہو کر انہوں نے آرمی میڈیکل کور جوائن کر لی۔ عینی آپا کے رشتے کے لیے وہ اپنی امی سے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے مگر ممانی کی ضد بس مریم ہی تھیں۔

گھریلو حالات سے مایوس ہو کر فرخ بھائی اکثر ہمارے ہاں آجایا کرتے تھے۔ انہیں اس قدر مایوس اور پریشان دیکھ کر ایک دن امی پھٹ پڑیں۔ ''میاں اپنی اماں سے جا کر کہو روز میرے پاس کس لیے آجاتے ہو؟ تم پڑھے لکھے ہو، برسر روزگار ہو، اپنی زندگی کے فیصلے خود بھی کر سکتے ہو، آخر زندگی تو تمہیں ہی گزارنی ہے آج کل کے حالات میں ماں باپ کو کون پوچھتا ہے؟

بس امی کا اتنا کہنا ہی غضب ہو گیا۔ اڑتے اڑتے یہ بات خالہ ثریا کے کانوں میں پڑ گئی۔ اور انہوں نے پورے خاندان میں یہ بات نمک مرچ لگا کر اس طرح گھما دی کہ ماموں جو پہلے ہی کانوں کے کچے تھے وہ کھلم کھلا امی کی مخالفت پر اتر آئے۔ پورے خاندان میں حالات اس قدر کشیدہ ہو چکے تھے کہ کوئی کسی سے بات کرنے کا روادار نہیں تھا۔

اسی پر بس نہیں۔ ثریا خالہ نے اپنے چھوٹے بھائی شہباز کو بھی اپنے مکروہ کھیل میں شامل کر لیا۔ شہباز نے عینی آپا کے لیے فرضی نام کے اخلاق سوز خطوط لکھنے شروع کر دیئے اور یہ خطوط وہ ہمارے گھر کی بجائے اپنی بہن ثریا خالہ کے ایڈریس پر بھیجتا تھا۔ جیسے ہی خط موصول ہوتا ثریا خالہ چادر سنبھالتی خط لہراتی ہوئی وارد ہو جاتیں۔

''یہ دیکھو عینی کے کرتوت..... یہ شریفوں کی بہو بیٹیوں کے لچھن نہیں ہیں۔ نہ جانے کس سے یاری لگا رکھی ہے اور ادھر فرخ کو پیچھے لگا رکھا ہے۔''

ثریا خالہ کے منہ میں جو آتا کہے جاتیں ایک روز ثریا خالہ اور امی کے درمیان کھلم کھلا اس معاملے پر معرکہ ہو گیا روز روز کی کھینچا تانی سے امی زچ ہو چکی تھیں۔ ادھر عینی آپا کا رو رو کر برا حال تھا کہ کس طرح سے ان کے اپنے ہی ان کی کردار کشی کر رہے تھے۔

ابو ملازمت کے سلسلے میں بیرون ملک تھے اور خاندان میں ہونے والی محلاتی سازشوں سے بالکل بے خبر تھے۔

ان دل شکن حالات میں امی اگر اپنے ہی خاندان والوں کی غیر اخلاقی حرکتوں کے بارے میں انہیں بتاتیں تو وہ یقیناً امی کو

زندگی بھر کے لیے ان سے قطع تعلق کرنے کا کہتے۔اس لیے وہ خاموش ہی رہیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد امی نے بھی جنگ کا طبل بجا دیا۔''عینی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔اب بھائی بھاوج ننگے پاؤں چل کر بھی آئیں تو تب بھی عینی کا رشتہ انہیں نہ دوں۔ایسی بے قدری میری بچی کی۔''

بہت جلد عینی آپا کے لیے ایک خاندانی رشتہ مل گیا عینی آپا کی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی خبر خاندان بھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی جس پر سارے خاندان نے گویا سکھ کا سانس لیا ہو۔عینی آپا کی شادی کے ساتھ ہی ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔

ان دنوں مشرقی پاکستان میں حالات کافی خراب ہو رہے تھے۔فرخ بھائی نے ہر طرف سے مایوس ہو کر ڈھاکہ جانے کے لیے اپنا نام دے دیا۔ممانی کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ ڈھاکہ چلے گئے۔اور ایسے گئے کہ پھر زندگی میں ممانی سے ان کی ملاقات کبھی دوبارہ نہ ہو سکی کیونکہ ممانی فرخ بھیا کے جنگی قیدی بننے کی خبر سن کر اس قدر پریشان ہوئیں کہ دل کے دورے سے جانبر نہ ہو سکیں۔ انہیں فرخ بھیا کے جانے کے بعد احساس ہوا کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے کتنی بڑی زیادتی کر ڈالی تھی اس احساس جرم نے انہیں بُری طرح پشیمان کیے رکھا۔

ماضی کی تلخ یادوں سے باہر نکل کر میں پھر عینی آپا کی طرف متوجہ ہو گئی جنہوں نے ابھی تک میری بات کا جواب نہیں دیا تھا مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ الگ ہی بات ہونے جا رہی تھی۔

یکا یک عینی آپا بول پڑیں۔

''ہاں میں شادی میں جاؤں گی ضرور جاؤں گی۔''

''آپا مگر.....مگر.....''میں بات پوری کرتے کرتے رہ گئی کیونکہ آپا پھر بول پڑیں سنو گڑیا!

''جب سے فرخ کی شادی کا کارڈ ملا ہے میں بہت کشمکش میں تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔گزری ہوئی ہر بات ذہن کے پردے پر یوں چل رہی ہے جیسے سب کچھ کل کا ہی واقعہ ہو گو اس بات کو دس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔''

''شادی پر جانے کی کوئی خاص وجہ؟''میں نے سوالیہ نگاہوں سے عینی آپا کی طرف دیکھتے ہوئے تلخی سے کہا۔

''ہاں بہت خاص وجہ ہے''عینی آپا نے گھمبیر لہجے میں جواب دیا۔

''مگر تم نہیں جانتی مٹی کی پکڑ بڑی زبردست ہوتی ہے؟''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عینی آپا کی طرف پھر دیکھا تو وہ بولیں مگر جانتی ہو کہ''سب سے عبرتناک صورت حال کونسی ہوتی ہے؟''

''کونسی؟''میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''جب مٹی آوازیں دینے لگتی ہے اور مٹی اس وقت آوازیں دیتی ہے جب اس کی آغوش میں کوئی ایسا انسان آ بیٹھے جس نے زندگی میں کسی کے ساتھ بہت زیادتی کی ہو تو مٹی اس انسان سے بہت ناخوش ہوتی ہے۔اسے پیار سے اپنی آغوش میں سمیٹنے کی

بجائے دھتکار دیتی ہے۔ ہر وقت کی دھتکار سے تنگ آ کر مٹی مدد کے لیے پکارنے لگتی ہے۔ مٹی کے پکارنے کی یہ آواز بہت عبرتناک ہوتی ہے۔''

عینی آپا میری موجودگی سے بے خبر جیسے خواب میں بولتی جا رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے آپا کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا پھر سر جھٹک کر آپا جیسے واپس کمرے میں لوٹ آئیں۔

''دراصل چند روز پہلے میں نے ممانی جان کو خواب میں دیکھا ہے۔ بہت پشیمان، بہت نادم تھیں۔ وہ آ کر میرے بستر پر بیٹھ جاتی ہیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہیں۔

''عینی مجھ سے بہت بڑی غلطی بلکہ بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں میں تم دونوں کی سچی محبت کو پہچان نہ سکی اور اسے اپنی جھوٹی انا کی بھینٹ چڑھا دیا۔ تم مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو ورنہ مٹی کی پکڑ سے میں کبھی آزاد نہ ہو سکوں گی۔''

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ سب کچھ اتنا حقیقی لگ رہا تھا کہ جیسے سچ میں ممانی جان میرے کمرے میں موجود ہوں مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا سوائے ایک بھینی بھینی سی خوشبو کے۔

یا وحشت!

''کسی کسی مٹی میں تو ایسی بے برکتی رکھ دی جاتی ہے کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی بدنصیبی پیچھا نہیں چھوڑتی۔''

اماں نے پاندان کا ڈھکنا بند کر کے گلوری گلّے میں دباتے ہوئے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''اب پڑوس کی زبیدہ کو ہی دیکھ لو کیسی اللہ میاں کی گائے ہے۔ ماں باپ نے جس کھونٹے سے باندھ دیا بس وہیں برسوں سے سر جھکائے جگالی کر رہی ہے۔ سرفراز میں ساتوں شرعی عیب ہیں مگر مجال کہ یہ نیک بخت کبھی زبان پر حرف شکایت لائے۔ ایسی غلط عادتیں کہ بندہ پاس سے بھی گزر جائے تو بدن سے دنوں بدبو نہ جائے۔''

اماں آج زبیدہ آپا کے میاں کو بے نقط سنا رہی تھیں۔

''سنا ہے کہ بیوی اگر شوہر کی بدسلوکی پر صبر کرے تو اسے دوسرے جہان میں جنت ملتی ہے'' میں نے جلی کٹی سناتی ہوئی اماں کو اپنی دانست میں چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ اور بھی بپھر گئیں۔''

اماں نے مجھے غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسا صبر؟ زبیدہ جس جہنم سے گزر رہی ہے وہ صبر نہیں ہے۔ سراسر ظلم ہے اور ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھانا بھی ظلم ہے کیونکہ یہ ایک طرح سے ظلم کی حوصلہ افزائی کرنے کے برابر ہے۔ یہ سب مردوں کے بھاشن ہیں ارے صرف عورتیں ہی کیوں مردوں کی بدسلوکی پر صبر کریں! عورتوں کی بدسلوکی پر اگر مرد صبر کریں تو کیا وہ جہنم میں جائیں گے؟'' اماں نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

اماں نے حقوق نسواں کی چیمپئن بنتے ہوئے قدرے بلند آواز سے کہا تو میں نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔

پڑوس میں رہنے والی زبیدہ آپا کو ہر دوسرے تیسرے روز اماں کے پاس بیٹھے آنسو بہاتے ہوئے دیکھ کر مجھے ٹھیک سے کبھی اس کے رونے کی وجہ معلوم نہ ہو سکی کیونکہ وہ آپس میں کافی دھیمی آواز میں باتیں کیا کرتی تھیں مگر آج اماں ہر رازداری کو بالائے طاق رکھ کر زبیدہ آپا کے نکھٹو شوہر کے بخیے ادھیڑ رہی تھیں۔

زبیدہ آپا کی شخصیت کچھ ایسی تھی کہ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ ہی ان پر ترس کھانے کو دل چاہتا تھا۔ انتہا درجے کی عجز و انکساری جس سے انسان کو الجھن سی ہونے لگے۔

''آخر ایسی بھی کیا بات ہے۔ عورت کو اس قدر بھی کمزور نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ انسان اپنے حق کے

لیے ذرا سی آواز بھی بلند نہ کر سکے۔''

میں دل ہی دل میں زبیدہ آپا کی بے ہمتی اور بزدلی پر جز بز ہوا کرتی تھی۔

''ایک کمزور سی چڑیا کے بچے کو بھی ہاتھ لگا دو تو وہ بھی چوں چوں کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے۔ زبیدہ آپا تو آخر انسان ہے۔ روزانہ ہی شوہر سے پٹتی ہے اور کبھی کبھار تو اس مہم جوئی کی زد میں اس کے بچے بھی آ جاتے ہیں مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔''

میں خفگی سے زبیدہ آپا کے بارے میں سوچے چلی جا رہی تھی۔

مجھے زبیدہ آپا کی شخصیت میں کبھی کوئی کشش محسوس نہ ہوئی کہ میں خود کو ان سے بات چیت پر آمادہ کر سکوں۔ اس لیے وہ جب کبھی اماں کے پاس آ کر بیٹھتی تو میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جایا کرتی تھی۔

شوہر کی مار پیٹ اور گالی گلوچ کے باوجود زبیدہ آپا کی زندگی کی گاڑی ایک لگے بندھے انداز میں آہستہ آہستہ چل ہی رہی تھی۔ وہ آٹھ جماعتیں پاس تھی گھر میں محلے کے بچوں کو اردو اور عربی پڑھا کر گزر اوقات کا بندوبست کر لیا کرتی تھیں۔ زبیدہ آپا کی بڑی بیٹی سلائی کڑھائی کے ساتھ ساتھ کھانا پکانے میں ماہر تھی۔ محلے کے کئی گھروں سے اسے سلائی کے علاوہ کھانا پکانے کے لیے باقاعدگی سے کہا جاتا جس سے گھر کی آمدنی میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

زبیدہ آپا کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور سب سے بڑی بیٹی پروین تھی جس کا نکاح کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنے بڑے بھائی کے بیٹے طاہر سے کر دیا تھا۔ پروین بھی اس نکاح پر خوش تھی اور بادل نخواستہ کچھ سوچ کر باپ نے بھی نکاح کی اجازت دے دی مگر اب رخصتی کے لیے آنا کانی کر رہا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا زبیدہ آپا کو ڈر تھا۔ اس کے شوہر نے بیٹی کی رخصتی کے لیے الٹی سیدھی شرطیں رکھنا شروع کر دیں جنہیں سنکر زبیدہ آپا اور پروین بہت پریشان رہنے لگیں۔

''اب سرفراز رخصتی سے کیوں انکاری ہے؟ جب نکاح کر دیا تو پیچھے کیا رہ گیا؟'' اماں نے تفتیشی انداز میں زبیدہ آپا سے پوچھا۔

''میرے خیال میں سرفراز کی کوشش ہے کہ الٹی سیدھی شرطیں لگا کر وہ میرے بھائی سے کچھ رقم اینٹھ لے گا۔''

زبیدہ آپا جواب دیتے ہوئے روہانسی سی ہو گئی۔

''حد ہوتی ہے بے شرمی کی، ارے یہ شریفوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ گھر ہے رنڈی خانہ نہیں ہے جو بیٹی کے دام کھرے کیے جائیں'' اب کی بار ماں نے بہت غصے سے کہا۔

''سرفراز کو یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ پروین ایک شرعی رشتے میں طاہر سے بندھ چکی ہے۔ طاہر اگر چاہے تو آج ہی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر لے جائے کون روک سکے گا اسے؟ اماں نے تحکمانہ مشورہ دیتے ہوئے زبیدہ آپا کو لتاڑ ڈالا تو آج وہ معمول سے کچھ پہلے ہی اماں کو سلام کر کے جلدی گھر لوٹ گئیں۔

لگتا تھا زندگی میں پہلی مرتبہ اماں کی بات زبیدہ آپا کے پلے پڑ گئی تھی اسی لیے اس نے ہمت کر کے دوسرے ہی دن طاہر کو بلا کر خاموشی سے پروین کو اس کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد سرفراز نے گھر میں جو طوفان اٹھایا بس خدا کی پناہ۔ اللہ دے اور بندے لے۔

سرفراز کے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر اماں لگاتار یاوحشت..... یاوحشت کہے جا رہی تھیں۔

پروین کو گئے کئی ہفتے ہو چکے تھے مگر سرفراز کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے اس بات کا بہت قلق تھا کہ زبیدہ نے بیٹی کو گھر سے یوں بھگا کر اس کی سخت بے عزتی کر دی تھی۔

''بے عزتی اس کی ہوتی ہے جس کی کوئی عزت ہوتی ہے اور تمہیں عزت بے عزتی کا کیا پتہ..... اس کے لیے عزت وزت کی رٹ لگانا بند کرو۔''

ایک دن زبیدہ آپا نے غصے میں آ کر شوہر کو بالآخر ٹکا سا جواب دے ہی دیا، لگتا تھا مدتوں سے سوئی زبیدہ آپا کے اندر کی عورت آج ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی اماں کی ڈانٹ پھٹکار نے آج تو جیسے معجزہ ہی کر دکھایا تھا۔

ابھی چند دن ہی سکون سے گزرے ہوں گے کہ زبیدہ آپا کے گھر سے پھر چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں، اماں نے پھر یاوحشت یاوحشت کا ورد شروع کرتے ہوئے پاندان کا ڈھکنا زور سے بند کر دیا۔

؎ جہاں بھونچال ہر لمحہ فصیل ودر میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

صحن میں تیز تیز قدموں سے آتی ہوئی زبیدہ آپا کو دیکھ کر اقبال ساجدؔ کا شعر میرے ہونٹوں پر مچل گیا۔

''اب کیا ہوا؟''

اماں نے زبیدہ آپا کو دیکھتے ہی سوال داغ دیا ''اماں! سرفراز بغیر کچھ کہے سنے ہی اپنے دو جڑواں نوجوان نیم پاگل بھانجوں کو گھر لے آیا ہے اب بتاؤ میں کیا کروں؟''

اماں نے ایک لمبی ہوں سے جواب دیا اور کچھ سوچنے لگیں۔

''یہاں تو اپنے کھانے کے لالے پڑے رہتے ہیں اس پر دو مستقل مہمان اور وہ بھی نیم پاگل..... ان کی وحشت بھری آنکھیں دیکھ کر مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے۔ بچوں کو ہر وقت ان سے چھپاتی پھرتی ہوں کہ کہیں مرغی کی طرح ان کی گردن مروڑ کر نہ رکھ دیں۔''

زبیدہ آپا نے تیزی سے بات مکمل کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''ویسے دونوں خوبرو، تنومند نوجوان ہیں مگر ذہنی توازن کھونے کے باعث سارا دن فضا میں جیسے سایوں کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ والدین کے لیے کتنا بڑا صدمہ ہے۔'' نرم دل زبیدہ آپا نے روہانسی ہو کر کہا۔

اماں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو مگر احتیاط کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑو۔ بچوں پر نظر رکھو اور خود بھی ان کی موجودگی میں اکیلی مت رہنا۔''

زبیدہ آپا کے دن رات واویلا کرنے سے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ اب سرفراز انہیں گھر کے ایک کمرے میں باہر سے کنڈی چڑھا کر بند رکھنے لگا تھا۔ ایک دن تو غصے میں آکر دونوں نے ماموں کی خوب ٹھکائی کر دی جس پر سرفراز اب کچھ خوفزدہ سا ہو گیا تھا۔

انہیں جب موقعہ ملتا وہ گھر سے بھاگنے کی کوشش کرتے۔ کئی مرتبہ سرفراز نے دوسرے محلے والوں کی مدد سے انہیں گلی میں بھاگ کر جاتے ہوئے قابو کیا تھا۔ سرفراز اب انہیں بالکل کمرے سے باہر نہیں نکالتا تھا بلکہ ان کا کھانا بھی زبیدہ آپا کھڑکی کے آگے پڑے میز پر رکھ دیا کرتی تھی جسے کبھی تو وہ کھا لیتے اور کبھی اٹھا کر غصے میں صحن میں پھینک کر گالیاں بکنے لگتے۔

دونوں نوجوانوں کی بگڑتی ہوئی ذہنی حالت دیکھ کر سب محلے والوں نے سرفراز کو مشورہ دیا کہ وہ انہیں واپس شیخوپورہ اپنی بہن کے پاس چھوڑ آتے۔ جہاں انہیں گاؤں کی نسبت بہتر علاج معالجے کی سہولیات میسر آتیں۔

''لگتا ہے کمرے میں مستقل طور پر بند رہنے سے ان کی ذہنی حالت اور دگرگوں ہو گئی ہے۔'' سرفراز نے خود سے ہی سرگوشی کی۔

بات سرفراز کی سمجھ میں آ گئی اور دوسرے ہی دن اس نے اپنے بہنوئی کو بلا بھیجا جو ایک بڑی سی وین میں چند اور لوگوں کی مدد سے دونوں بیٹوں کو وہاں سے لے گیا تو پورے محلے نے سکھ کا سانس لیا۔

چند دن خیریت سے گزرے ہی تھے کہ زبیدہ آپا کی چھوٹی بہن دوسرے گاؤں سے اپنے چار بچوں کو لیکر وہاں آ گئی۔

''میاں نے اس حالت میں بھی اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے کئی مہینے کے پیٹ سے ہے وہ'' زبیدہ آپا اماں کے ساتھ کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولیں۔

''چار بچے تو پہلے سے ہی موجود ہیں اب پانچویں بچے کی ذمہ داری کون اٹھائے گا۔ ویسے اسے بھی مزید بچوں کی خواہش نہیں ہے اس لیے وہ حمل گرانا چاہتی ہے۔'' آپا نے اماں کے کان کے پاس جا کر رازداری سے کہا تو اماں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے ''ارے چوتھا یا پانچواں مہینہ چل رہا ہے کیا جان دینے کا ارادہ ہے ایک بچے کی خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ باقی چار بچوں کو کون دیکھے گا اگر وہ مر مرا گئی تو تم پر پولیس کیس بھی بن سکتا ہے۔ اس کام سے باز ہی رہو تم دونوں۔''

اماں نے اپنی دانست میں زبیدہ آپا کو بہترین مشورہ دے دیا مگر اس کی بہن اپنے گھریلو حالات سے اس قدر دل برداشتہ تھی کہ اس نے زبیدہ آپا کو بتائے بغیر ہی گاؤں کی دایہ سے حمل گرانے کے لیے کہہ دیا۔ پیسوں کے لالچ میں جاہل گنوار دایہ نے یہ خطرناک کام کرنے کی حامی بھر لی مگر جیسے ہی دوائی زچہ کے اندر گئی زبیدہ آپا کی بہن کی حالت بگڑنی شروع ہو گئی۔ یہ دیکھ کر دایہ تو چادر سنبھالتی ہوئی یہ جا وہ جا۔ مگر زبیدہ آپا نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ قریب المرگ ماں کو دیکھ کر چاروں بچوں نے بھی زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ عجیب وحشت کا سماں تھا۔ محلے بھر میں ایک اُدھم مچا ہوا تھا۔ سب ہی ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ادھر اماں یا وحشت۔

یا وحشت کا ورد کیے جا رہی تھیں۔

یہ رمضان کے آخری عشرے کا تقریباً آخری دن تھا۔ ممکن تھا کہ آج رات اگر عید کا چاند ہو جاتا تو دوسرے دن عید ہو جاتی۔ مگر یہاں کیسی عید۔ کیسا چاند۔ صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ اسی حالت میں زچہ کو ٹانگے میں ڈال کر قریبی شہر کے ہسپتال میں لے جانے کی کوشش شروع ہو گئی۔ ابھی سب آدھے راستے میں ہی تھے کہ عید کا چاند نکل آیا۔

زبیدہ آپا کی بہن نے بہت حسرت سے چاند کو دیکھتے ہوئے آخری ہچکی لی اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اسے واپس گاؤں لایا گیا۔ پورے گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن عید کے روز اس کی تدفین کی گئی۔

چاروں بچے ماں کی قبر کی مٹی ہاتھوں میں پکڑے ایک دوسرے سے لپٹ کر بلک بلک کر رو رہے تھے۔ اس غم انگیز منظر کو دیکھ کر ہر آنکھ پرنم تھی۔ ہر چہرہ وحشت زدہ تھا۔

زبیدہ آپا سے ان کے آئے دن کے مصائب کی داستان سن کر اماں کا ہر وقت یا وحشت یا وحشت کی گردان کرنا اب میرے پلے پڑ رہا تھا۔

مگر میں سوچ رہی تھی کہ سارا الزام صرف قسمت کو نہیں دیا جا سکتا۔ انسان کو خود بھی تو ہمت کرنی چاہیے اور کچھ سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔ اسی لیے تو دل یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

؎ الزام یونہی کس لیے میں خاک پر دھروں
میں کیوں ناں خود کو گوندھ کر پھر چاک پر دھروں

تاجو

اس کا نام تو ممتاز تھا لیکن سب پیار سے اسے تاجو کہتے تھے مگر میں نے ہمیشہ اسے ممتاز ہی کہہ کر بلایا۔ چودھری حکم داد کی نازوں پلی اکلوتی بیٹی۔ گیارہ بھائیوں کی بہن کے پاؤں زمین پر رکھنے سے پہلے باپ اور بھائی اپنی پلکیں فرش راہ کر دیتے تھے۔ بات منہ سے بعد میں نکلتی اور نوکروں کی فوج ظفر موج حکم بجالانے کے لیے آگے پیچھے دوڑنے لگتی۔

وہ صحیح معنوں میں منہ میں چاندی کا نہیں بلکہ سونے کا چمچہ لیکر پیدا ہوئی تھی کیونکہ چودھری حکم داد کے خاندان میں کئی نسلوں سے لڑکی پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے ممتاز کی پیدائش پر چودھری نے خزانے کا منہ کھول دیا تھا۔ کئی روز تک گاؤں میں جشن کا سماں رہا کیونکہ ممتاز بہت منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔

چودھری حکم داد علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ عزت، دولت، شہرت ہمہ وقت اس کی چوکھٹ پر سلامی دیتی تھیں۔ اس کے بیٹے ملک کے بہترین تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر بہت اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ جبکہ دو بیٹے آکسفورڈ اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چودھری حکم داد کی زندگی میں بس ایک ہی کمی تھی جو ممتاز کے آنے کے بعد پوری ہوگئی تھی۔ اس لیے ممتاز کو ایک پل کے لیے بھی وہ اپنی آنکھوں سے دور کرنا گوارا نہیں کرتا تھا۔

بے اندازہ دولت اور شان و شوکت کے باوجود چودھری حکم داد ایک منکسر المزاج شخص تھا۔ غرور اور تکبر سے کوسوں دور۔ غریبوں کا ہمدرد۔ حد سے زیادہ سخاوت کرنے والا۔

تب ہی تو ایک دن ڈیرے پر بیٹھے ہوئے چودھری کے دوست نے کہا تھا۔

''یار! تمہیں پتہ ہے شیطان سب سے زیادہ کس شخص سے ڈرتا ہے؟''

چودھری نے سوالیہ نظروں سے اپنے دوست کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

''شیطان سب سے زیادہ ایک سخی سے ڈرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ رب العزت سخی کی بخشش کسی وقت بھی کر سکتا ہے۔''

اپنے دوست کی بات سن کر چودھری نے مسکراتے ہوئے آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا جیسے اپنے مالک کے اس قدر انعام و اکرام پر اس سے بذات خود ہمکلام ہو کر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہو۔

چودھری اکثر کہا کرتا تھا کہ بیٹے تو خدا کی نعمت ہیں جبکہ بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔ اور قیامت کے روز نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا جبکہ بیٹیاں رحمت بن کر سیدھی جنت میں لے جائیں گی۔

علاقے کے دوسرے زمین داروں کی نسبت چودھری حکم داد قدرے پڑھا لکھا تھا۔ اور بیٹے بیٹیوں میں تفریق کا قائل نہیں تھا۔ اس لیے ممتاز کو بھی وہ اعلیٰ تعلیم دلوانے کا خواہشمند تھا جس پر دقیانوسی خیالات رکھنے والی چودھرائن ناک بھوں چڑھائی رہتی تھی۔

والدین اور بھائیوں کی محبتوں میں گھری ممتاز بغیر پنکھ ہی اڑتی رہتی تھی اور ساتھ ساتھ وقت کا پنچھی بھی اڑتا چلا جا رہا تھا یہاں تک کہ ممتاز تقریباً بارہ برس کی ہوگئی۔

ممتاز سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں ابا کے ساتھ چودھری حکم داد کے بڑے بیٹے کی شادی پر ان کے گاؤں گئی تھی۔

وہ مجھ سے عمر میں کچھ بڑی تھی مگر باپ کی طرح بے حد پیار کرنے والی اور شوخ و شنگ لڑکی تھی اسی لیے ہماری پہلی ہی ملاقات گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔

شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو ہم دونوں نے بڑی افسردگی سے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ یہ سوچ کر کہ پھر نہ جانے کب ملاقات ہو اور وہی ہوا جلد ہی ابا کو بزنس کے سلسلے میں مراکش جانا پڑا جہاں کا بود و باش ہم سب کو اس قدر پسند آیا کہ ابا مستقل وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

وقت کے ساتھ ممتاز کی یاد بھی دھندلی ہو کر ذہن کے کسی گوشے میں آرام کرنے لگی تھی۔

ابا کا رابطہ بھی چودھری حکم داد سے منقطع ہو چکا تھا۔ اس لیے ہمارے خاندان ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر تھے۔

بہت سالوں کے بعد ابا نے کاروبار واپس پاکستان شفٹ کر لیا تو ہم ایک بار پھر اپنی مٹی سے آ ملے۔

ایک مرتبہ ریل کار میں سفر کرتے ہوئے اچانک ممتاز کے ایک بھائی سے ملاقات ہوگئی تو ان کے گھریلو حالات کا علم ہوا کہ چودھری حکم داد اور چودھرائن کافی عرصہ پہلے قضائے الٰہی سے ایک ہی دن فوت ہو گئے تھے۔ ان کی اچانک موت کے صدمے کو ممتاز نے بہت بری طرح دل پر لے لیا تھا۔ ماں باپ سے بہت قریب تھی۔ کوئی بہن نہ تھی اس لیے دن بدن تنہائی کا شکار ہو کر وہ ڈپریشن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یوں تو بھائی اس کا بہت خیال رکھتے لیکن بھابیوں میں ہمدردی نام کو نہ تھی۔ اس لیے کسی ہمدرد کو نہ پا کر ممتاز روز بروز زندگی سے دور ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اسے دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر کے پاس لاہور لے جایا گیا۔

علاج معالجے سے وہ کافی ٹھیک ہونے لگی تھی اور اس کی فطری شوخی اور شرارت رفتہ رفتہ لوٹ آئی تھی۔

ڈاکٹروں نے صلاح دی کہ ممتاز کی شادی کر دی جائے مبادا وہ تنہائی کا شکار ہو کر پھر سے یاسیت کو گلے لگا لے۔

ممتاز کے بھائیوں نے نہایت سرگرمی سے کسی مناسب رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ بجائے اس کے کہ بھابیاں اس کے بیاہ کی فکر کریں الٹا طنز کے نشتر چلا چلا کر ممتاز کا سینہ چھلنی کرنے لگیں۔ ان کے نزدیک ممتاز کی شادی کسی مذاق سے کم نہ تھی۔

''سنا ہے بھائی رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں لاڈو کے لیے۔''

بڑی بھابی نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں جھلی کی شادی ہورہی ہے'' دوسری بھابی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''برابر کا جوڑ تو ملنے سے رہا۔ ہاں البتہ کوئی غریب مسکین، رنڈوا یا دوہا جومل جائے تو الگ بات ہے۔'' پاس ہی بیٹھی ہوئی چھوٹی بھابی نے لقمہ دیا۔

''ہاں زمین جائیداد کے لالچ میں بھی کوئی مرغا پھنس سکتا ہے۔'' سب نے یک زبان ہوکر کہا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگیں۔

بالآخر تلاش بسیار کے بعد بھائیوں کو ایک معقول رشتہ مل گیا۔ رشتہ ہم پلہ تو نہیں تھا لیکن لڑکا شریف پڑھا لکھا اور اچھی ملازمت پر فائز، مگر خاصا غریب تھا۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوگئی۔ بھائیوں نے شادی پر بے تحاشا خرچ کیا۔ ممتاز کا جہیز کئی ٹرکوں میں لاد کر شہر گیا جسے دیکھ کر غریب سسرالیوں کی تو آنکھیں ہی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

شادی کے بعد ممتاز کچھ عرصہ تو ٹھیک رہی اور امید سے بھی ہوگئی مگر بچے کی پیدائش سے پہلے ہی اس کی طبیعت پھر بگڑنی شروع ہوگئی۔

ممتاز کے مہنگے علاج معالجے کی سکت اس کے شوہر میں نہیں تھی اس لیے بھائی اسے اپنے ہاں لے آئے۔ وہیں اس کے بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ مگر اس کی طبیعت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی۔ کئی کئی دن دوائی کے نشے میں بے سدھ پڑی رہتی۔ ہوش آتا تو جو سامنے آتا اسے مارنے دوڑتی۔ ان حالات میں بچے کو اس سے دور ہی رکھا جاتا تھا مبادا وہ اسے نقصان پہنچادے۔

بچہ ماں کی گود کی گرمی کے لیے روتا رہتا۔ ممتاز کی چھاتیوں سے ممتا کے فوارے اُبل اُبل کر زمین پر گرتے مگر وہ بچے کو دودھ پلانے کی روادار نہیں تھی۔ نہ کبھی اسے پیار سے سینے سے لگاتی۔ بچہ اس کے پاس لایا جاتا تو اسے ٹکر ٹکر یوں دیکھتی رہتی جسے وہ کوئی خلائی مخلوق ہو۔

دیکھنے والے ممتاز اور بچے کی حالت پر بے حد دکھی ہوتے مگر تقدیر کے آگے کس کا بس چلا ہے۔ بس روز ازل جو فیصلہ ہوگیا تھا وہ تبدیل نہ ہوا۔ ممتاز کے بھائی نے آنکھوں کے کناروں سے نمی صاف کرتے ہوئے کہا۔

میں سوچ رہی تھی ''شہزادیوں جیسی ممتاز کا ایسا نصیب..... کس کی نظر کھا گئی اسے اس ممتاز محل کو کوئی شاہ جہاں کیوں نہ ملا؟''

ممتاز کے بھائی کی آواز نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کا اسٹیشن قریب آرہا تھا اس لیے اس نے قدرے جلدی سے بات مکمل کرتے ہوئے بتایا کہ ممتاز ایک دن حویلی کے صحن میں لگے تندور کے پاس کھڑی تھی۔ بے خبری میں اس کے دوپٹے نے آگ پکڑ لی۔ نائلون کا لباس آناً فاناً جسم سے چپک گیا۔ ملازمہ نے آگ بجھانے کی بہت کوشش کی مگر ممتاز کا سارا بدن شعلوں میں گھر چکا تھا۔ صحن میں تکلیف کی شدت سے چکر لگاتی ممتاز ایک آگ کے گولے میں تبدیل ہوچکی تھی۔ جب تک کوئی اور اس کی مدد کو پہنچتا وہ اس دکھ بھری زندگی سے چھٹکارا حاصل کر چکی تھی۔

بے حد اداسی سے چشم تصور سے حویلی کے کشادہ صحن میں ممتاز کی سوختہ لاش دیکھ کر دل سے آواز آئی۔

؎ میں پھر خاک کو خاک پر چھوڑ آئی
رضائے الٰہی کی تکمیل کردی

ادھورا بندھن

اسے مٹی کے پیالے میں چائے پینا ہمیشہ ہی بہت مرغوب تھا۔ آج بھی وہ مٹی کے پیالے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے کافی دیر سے بالکونی میں سردیوں کی خوشگوار دھوپ میں بیٹھی کسی بہت ہی گہری سوچ میں غرق تھی۔ اور اس بے دھیانی میں کتاب بھی پھسل کر بالکونی کے فرش پر گری پڑی تھی۔

''کوزہ گر جب چاک پر مٹی کی لوئی سے فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو اس عمل میں لوئی کا اگر ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی اپنے اصل سے جدا ہو کر زمین بوس ہو جائے تو وہ ہمیشہ ہی ایک نہ ختم ہونے والی جدائی میں تڑپتا رہتا ہوگا''

اس نے بہت گھمبیرتا سے سوچا۔

''کبھی کبھار مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ میں بھی شاید چاک سے گرا ہوا مٹی کا ایک ٹکڑا ہوں جو اصل سے جدا ہو کر ہمیشہ ہی نامکمل رہتا ہے۔''

وہ اپنے خیالوں کے مدوجزر میں کافی دیر سے ہچکولے کھا رہی تھی کہ بڑی اماں کی خاصی تیز آواز نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

''ارے کہاں ہے وہ سقراط کی اولاد مزاج ہی نہیں ملتے جب دیکھو کتابوں میں منہ دیئے بیٹھی رہتی ہے کون نبھائے گا اس کے ساتھ؟ ایسا نہ ہو کہ اپنے ہی ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پینا پڑ جائے۔''

''تو ٹھیک ہے پی لوں گی زہر کا پیالہ خوشی خوشی مگر کسی ایرے غیرے سے زبردستی کی شادی نہیں کروں گی۔''

اس نے بالکونی سے اٹھ کر کمرے میں آتے ہوئے قدرے خفگی سے کہا۔

''ارے زبردستی کون کر رہا ہے ہم تو تمہاری مرضی جاننا چاہ رہے ہیں مگر تم ہو کہ ہر رشتے میں ہی نقص نکالے چلی جا رہی ہو۔ یہ کم عمر ہے تو وہ بچہ سا لگتا ہے۔ یہ لاابالی ہے تو وہ شکل سے گاؤدی لگتا ہے کوئی مزاج کا تیز ہے تو کوئی ذہین نہیں لگ رہا۔ حد ہو گئی۔''

''بڑی اماں اب بس بھی کریں'' میں نے ان کی مسلسل تقریر سے تنگ آ کر کہا۔

''ارے کیا بس کروں؟ تم کیا بس کر رہی ہو ہم عمر لڑکوں میں سو سو نقص نکال رہی ہو حالانکہ اچھے بھلے۔ دیکھے بھالے خاندانی لڑکے ہیں۔ اب ایک نئی بات نکال لی ہے کہ وہ میچور نہیں لگتے۔'' بڑی اماں نے انگریزی لفظ میچور کو اس طرح دبا کر کہا گویا وہ چور کہہ

رہی ہوں جس پر وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بڑی اماں نے اسے یوں ہنستے دیکھ کر آخری پتہ پھینکا ''آخر تم چاہتی کیا ہو؟ کیا کسی بوڑھے سے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟ لگتا ہے تم شوہر نہیں باپ کو تلاش کر رہی ہو۔''

بڑی اماں کی چبھتی ہوئی مگر گہری بات سن کر وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی کہی ہوئی بات پر غور کرنے لگی۔ کیا واقعی میں شوہر میں باپ کو تلاش کر رہی ہوں؟ اس نے خود سے ہی سوال کر ڈالا۔ لگتا تھا جیسے بڑی اماں نے اس کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو اور وہ سوچوں کی بہت سی کھڑکیاں اور دروازے ایک ہی ساتھ کھلنے پر کسی اور ہی دنیا میں جا نکلی تھی۔

وہ ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولنے والی پانچویں بیٹی تھی والد تعلیم یافتہ تھے جبکہ ماں واجبی سی پڑھی لکھی تھیں مگر بہشتی زیور کافی آسانی سے پڑھ لیتی تھیں۔ کیونکہ اس زمانے میں شرفا میں بہو بیٹیوں کا بہشتی زیور پڑھ لینا ہی کافی تھا۔

اس سے بڑی چار بہنوں کی شادیاں تو دادی نے جیسے سب بڑی اماں کہتے تھے قبل از وقت شور مچا مچا کر کم عمری میں ہی کروا دی تھیں اور وہ اب گھر داری میں جُٹی ہوئی تھیں۔

چونکہ والد تعلیم یافتہ تھے اس لیے ان کی خواہش تھی کہ کم از کم ایک بیٹی تو ضرور اعلیٰ تعلیم حاصل کرے کیونکہ چار بڑی بہنوں کی شادیاں جلد ہو جانے کی وجہ سے وہ ان کی اعلیٰ تعلیم کے ارمان پورے نہ کر سکے۔

بڑی اماں کا خیال تھا کہ ابا کے بے جا لاڈ پیار نے اس کا ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا اس لیے اس کا دماغ ساتویں آسمان پر رہتا تھا۔ بڑی اماں سے چھیڑ خانی کرتے ہوئے وہ اکثر کہتی۔

''ساتواں نہیں بڑی اماں پانچواں آسمان کہو کیونکہ میں گھر میں پانچویں نمبر پر ہوں ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساتویں آسمان کی ٹکرا رسن سن کر باقی کی دو بھی یہاں آن ٹپکیں۔''

ارے ہٹ نا ہنجار! کیسی بدشگونی کی باتیں منہ سے نکال رہی ہے۔'' اماں لاحول پڑھتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کر فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف منہ کر کے اولادِ نرینہ کے لیے ہل ہل کر دعائیں کرنے لگتیں۔

خاندانی روایات کے برعکس اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور خاندان کی پہلی گریجوایٹ لڑکی ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ اس نے نہ صرف شاندار نمبروں سے گریجوایشن کی بلکہ یونیورسٹی میں ٹاپ پوزیشن بھی حاصل کی۔ اس کی اس قدر شاندار کامیابی پر خاندان کے باقی لوگوں اور خاص طور پر لڑکوں کو تو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا ہو۔ سب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے اماں سے ضد کر کے محلے میں سبھی رشتہ داروں کے گھروں میں لڈو بھجوائے تو تھوڑی ہی دیر میں ایک گھر سے لڈو اس پیغام کے ساتھ واپس آ گئے کہ ''ہم لڑکیوں کی تعلیم کے حامی نہیں ہیں اس لیے آپ کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے۔''

یہ پہلا پتھر تھا جو لڑکی ہونے کی پاداش میں اور روایات سے بغاوت کرنے کے جرم میں اس کی طرف پھینکا گیا تھا۔

وہ بچپن سے ہی سنتی آئی تھی کہ کس طرح اس کی نانی ماں کو اپنی اکلوتی بیٹی کے ہاں اولاد نرینہ دیکھنے کی زبردست خواہش تھی مگر یکے بعد دیگرے پانچ لڑکیوں کی پیدائش دیکھ کر وہ صرف ایک سرد آہ بھر کر رہ جاتیں۔ وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی جب نانی ماں داغ مفارقت دے گئیں۔ اس کی پیدائش پر خاندان کی بڑی بوڑھیوں نے کافی سوگ منایا تھا بلکہ کچھ رشتہ دار عورتیں تو ابا کے پاس تعزیت کرنے گھر بھی آئیں تھیں۔ جیسے وہاں ایک نئی کونپل نہ پھوٹی ہو بلکہ ایک چھتنار درخت زمین بوس ہو گیا ہو۔ جس پر ابا بہت برہم ہوئے تھے کہ ''بیٹی تو میرے ہاں آئی ہے آپ لوگوں پر کونسی مصیبت نازل ہو گئی ہے'' ابا نے سبھی کو ڈانٹ ڈپٹ کر چلتا کیا۔ یونہی بھانت بھانت کی بولیاں سنتے ہوئے اس نے بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی میں قدم رکھ دیا۔ وہ اکثر سوچتی رہتی تھی کہ شاید اسے لڑکی کی بجائے لڑکا ہونا چاہیے تھا۔ تب ہی ایک روز اس نے سکول میں لکھی ہوئی اپنی ایک نظم ابا کو پڑھ کر سنائی:

''دن رات
میری تبدیلی جنس کی
دعائیں مانگیں گئیں
بارہا.....''
سب نے آسمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا کہ شاید خدا پہلے آسمان پر ہو۔
لیکن.....
خدا تو پانچویں آسمان پر تھا
سب دعائیں رستے میں ہی رہ گئیں
منتیں، مرادیں، تعویذ، گنڈے
سب دغا دے گئے
کیونکہ.....
میری جنس تبدیل نہ ہو سکی۔''

جیسے ہی اس نے بجھے بجھے سے لہجے میں نظم ختم کی تو ابا نے اسے پیار سے گلے لگا کر کہا ''نہیں بیٹا۔ ایسا نہیں سوچا کرتے۔ تم تو میری سب سے لاڈلی بیٹی ہو۔''

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ابا نے اسے بچپن میں کبھی بھی بیٹی کہہ کر نہیں بلایا تھا بلکہ ہمیشہ بیٹا ہی کہا کرتے تھے اور وہ بھی خود کو ابا کا بیٹا ہی خیال کیا کرتی تھی۔

بچپن میں ماں سے زیادہ وہ باپ کے قریب رہی۔ ابا سے جذباتی وابستگی اس قدر زیادہ تھی کہ ہمہ وقت ابا کو خوش رکھنے کے لیے وہ ان کے گرد طواف کرتی رہتی تھی۔ ابا بھی اس کی معصوم محبت کا جواب بے حد شفقت سے دیتے تھے۔ شام کو گھر لوٹتے ہوئے

کبھی خالی ہاتھ نہ آتے۔ اس کی پسند کی کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور لیکر آتے تھے کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ وہ میٹھا پسند کرتی تھی باپ کی ناک کا بال ہونے کی وجہ سے ماں کی کیا مجال تھی کہ اسے کچھ کہہ سکیں، وگرنہ جھٹ باپ سے شکایت کرنے بیٹھ جاتی تھی۔ اماں کی سارے دن کی کارگزاری کی رپورٹ ابا تک پہنچانا جیسے اس کا اولین فرض تھی۔ کئی بار تو اماں ماتھا پیٹ لیا کرتی تھی۔

''ارے یہ لڑکی ہے کہ گھر میں دشمن ملک کا کوئی جاسوس گھس آیا ہے۔ مجال ہے کوئی بات ادھر سے ادھر ہو جائے جھٹ باپ کے کانوں میں انڈیلنے لگتی ہے۔''

ابا اس کی تعلیم پر خاص توجہ دیتے بلکہ جب بھی وقت ملتا خود پڑھانے بیٹھ جاتے۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھے کہ ان کی بیٹی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ محنتی تھی۔ تعلیم کے علاوہ غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ اس لیے کم عمری ہی میں اس نے سکول کے ڈراموں، تقریری مقابلوں اور دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں باقاعدگی سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

ابا کی مسلسل حوصلہ افزائی نے اسے باپ کے ساتھ ایک بہت مضبوط جذباتی بندھن میں باندھ دیا تھا۔ جس نے آنے والے دنوں میں اس کی شخصیت اور کردار کی مثبت تعمیر میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

باپ کے ساتھ مضبوط جذباتی وابستگی ایک ایسے بندھن میں تبدیل ہو چکی تھی جس نے اس کے اندر آئندہ زندگی میں ہر قسم کے حالات سے مقابلہ کرنے کی ہمت اور حوصلے کے لیے ایک مثالی قوت مدافعت (Resistance) پیدا کر دی تھی۔

مجھے یاد ہے اماں اکثر کہا کرتی تھیں ''تم ہار ماننے والی لڑکی نہیں ہو بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہو اور یہ سب تمہارے باپ کی دین ہے۔''

میرے خیال میں اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں کیونکہ زندگی میں میری فائٹنگ سپرٹ (Fighting Spirit) ابا کے ساتھ ایک مضبوط بندھن (Attachment) کی ہی مرہون منت تھی۔ میں اگر کبھی ذرا کمزور پڑنے لگتی تو ابا کے کہے ہوئے الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے۔

''بیٹا ہمت نہیں ہارتے۔ زندگی میں اگر ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو کئی اور دروازے کھل جاتے ہیں۔''

بچپن میں ابا کی کہی ہوئی باتیں اکثر سر کے اوپر سے ہی گزر جاتی تھیں مجھے ابا کی یہ بات زندگی میں بہت بعد میں سمجھ آئی کہ

''بیٹا زندگی میں اپنے مقاصد ہمیشہ عزت سے حاصل کرو کیونکہ ہونا وہی ہے جو نصیب میں ہے۔''

وہ یہی کوئی گیارہ بارہ برس کی ہوگی کہ موسم یکسر تبدیل ہو گیا۔ بہار سے خزاں تک کا سفر اتنی سرعت سے طے ہوا موسم خود بھی حیران و پریشان ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔

ابا نے اچانک بیرون ملک جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میری تو دنیا ہی تہہ و بالا ہو گئی۔ جیسے ایک زوردار بجلی کڑک کر گرے اور ہر چیز کو بھسم کر ڈالے۔ میں گم سم سی ہو گئی۔ نہ کوئی سوال لبوں تک آیا اور نہ کوئی شکوہ شکایت۔ اس اچانک صدمے نے جیسے میرے ذہن

اور جذبات کو شل کر کے رکھ دیا ہو۔ ابا سے جدائی مجھے کسی صورت گوارا نہ تھی مگر میں آنسو بہا کر ابا سے اپنے مضبوط انمول بندھن کی بے توقیری نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ابا بھی لگتا تھا مجھ سے نظریں چرائے چرائے پھرتے تھے جیسے نظریں ملتے ہی ان کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جائیں گے اور ان کا جانا مشکل ہو جائے گا۔

وہ بھی عجیب دن تھا جب میں نے اسٹیشن پر ابا کو بہت سے اور رشتہ داروں کی موجودگی میں خدا حافظ کہا۔ آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی ریل گاڑی کے دروازے میں کھڑے ابا کو ہاتھ ہلاتے ہوئے میں ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ شدت جذبات سے ابا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا مگر لگتا تھا کہ انہوں نے آنسوؤں کی یلغار کو بڑی مشکل سے روک رکھا تھا۔

میں نے بھی رفتار پکڑتی ہوئی ریل گاڑی کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ابا کی طرف بے دلی سے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ دیا.....

اس کے بعد تو جیسے وقت ایک نقطے پر آ کر رک سا گیا ہو جیسے ٹائم فریم فریز ہو جائے۔ انسان کسی نادیدہ لمحے کی گرفت میں آ جائے۔ جیسے کسی آسیب کا سایہ ہو جائے۔

وقت کا پہیہ چلتا رہا مگر میں سحر زدہ سی اس ایک آسیب زدہ لمحے کے گرداب میں ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی طور پر پھنس کر رہ گئی تھی۔ دل اور ذہن دونوں لگتا تھا جیسے الگ الگ سمتوں میں چل پڑے ہوں پھر میں نے خود کو کتابوں کی دنیا میں گم کر لیا..... ابا کے پیار بھرے خطوط اور تحائف آتے رہے مگر وہ سب ابا کی محبتوں کا بدل تو نہیں ہو سکتے تھے بیرون ملک ابا کا قیام طویل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے گریجوایشن کر لیا۔

اداس اداس سی، کھوئی کھوئی سی، اپنی ہی دنیا میں گم..... ادھوری محبتوں کو تلاش کرتی جس عمر میں لڑکیوں کے چہروں پر گلاب کھلتے ہیں وہاں کربناک سوچوں کے سائے لہراتے رہتے تھے۔ صنف مخالف کے ذکر پر آنکھوں میں خوابوں کی جگہ بیزاری اور بیگانگی نے لے لی تھی جیسے اُسے کسی کا بھی اب اعتبار نہ رہا ہو۔ ابا سے جدائی نے مجھ پر بے یقینی اور بداعتمادی کی ایسی کیفیت طاری کر دی تھی کہ مجھے اپنی ہم عمر لڑکیوں کی طرح لڑکوں میں قطعی کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی تھی۔ کسی پر اعتماد کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا مبادا کوئی پھر جدائی کا زخم دیکر چلا جائے۔ میں زبردست عدم تحفظ کا شکار ہو کر جیسے اپنے اندر ہی کنڈلی مار کر بیٹھ گئی تھی۔ ایسے میں قلم، کتاب اور کاغذ نے مجھے سہارا دیا۔ ایک مرتبہ کالج میں فادر ڈے پر میں نے یہ نظم لکھ کر پہلا انعام حاصل کیا۔

''ماں کی محبت اگر روح کا نور ہے
تو باپ کی محبت
ہزاروں سورجوں کی روشنی
روشنیاں بچھڑ جائیں
تو بدنصیبی دستک دینے لگتی ہے

روح آوارگی کا چولا پہن کر
اجنبی زمینوں پر دشت نوردی کرتی ہے
زندگی کے ساحل پر لنگرانداز ہونے کے لیے
ریت کو پکڑنا پڑتا ہے
وقت ہاتھوں میں سوراخ کر دیتا ہے
ریت ان سے چھن چھن کر
ساحل کی گود میں پناہ ڈھونڈ لیتی ہے
مگر.....
محروم محبت کے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں''

وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا لیکن ابا سے پھر کبھی اُن کی زندگی میں ملاقات نہ ہو سکی۔

ایک دن اچانک خبر آئی کہ ابا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں پہلے سے بھی زیادہ سراسیمہ اور گم سم ہوگئی۔ آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔ ابا کی وعدہ خلافی پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا جو ہر خط میں آنے کا وعدہ کرتے تھے مگر جب آئے تو اپنے پیروں پر چل کر نہیں بلکہ تابوت میں بند دوسرے کے کندھوں پر۔ اسی ٹوٹتی، بکھرتی ہوئی کیفیت میں میں نے ابا کے لیے یہ آخری تحریر لکھی۔

ے ''سورج کی موت پر
اندھیرے پھوٹ پھوٹ کر روئے
کائنات کی ہر شے متوجہ ہوگئی
آسمان زمین کی خبر گیری کو لپکا
ہوائیں سہم کر کونے میں جا بیٹھیں
ماؤں کی کوکھ میں پڑے کچّے پکے بچے
قبروں میں گناہ و ثواب کا حساب دیتے
زندہ و مردہ جسم
سب اندھیرے کو دلاسہ دینے کو لپکے
فرشتوں نے ڈر کر
سورج کی روح کو
اور احتیاط سے ہاتھوں میں پکڑ لیا

کیونکہ روح اگر دوبارہ بے جان وجود میں
آسراڈھونڈنے لگے تو موت کو موت آجاتی ہے''

سب کی نظر بچا کر میں نے چپکے سے اپنی آخری تحریر ابا کے تابوت میں ڈال دی تاکہ لفظوں کی زنجیر کے ذریعے ہمارا ادھورا سا بندھن تاابد قائم رہے۔

حزن وملال کی اس کیفیت میں دل شریک غم ہوتے ہوئے جیسے کہہ رہا ہو۔

؎ وہ آسمان کی مانند رہا تیرے سر پر
اُٹھا تو دھوپ کے نیزے اتر گئے تن میں

آنسو

تشکیل کائنات کے آخری آخری لمحات ہیں۔

ایک ایک روز ہزار برس کے برابر ہے۔

پہلے پانچ روز میں حاملان عرش نے سات طبق آسمان سات طبق زمین اور اس کے اندر چھپا کر رکھے گئے انواع واقسام کے بیش قیمت خزانے تخلیق کیے ہیں۔

چھٹے روز آفتاب، ماہتاب اور ستاروں کی تخلیق ہوئی ہے۔مگر ساتوں آسمانوں کو حرکت میں لائے جانے سے قبل ایک بے حد اہم چیز کی تشکیل ابھی ہونا باقی ہے۔

حاملان عرش پانچ روز کی سخت محنت وشفقت کے بعد بے حد تھکاوٹ محسوس کر رہے ہیں۔

قدرے ناتجربہ قدسی گھبرائے گھبرائے سے پھر رہے ہیں۔معصوم و پاکیزہ چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔مگر جلال خدا وندی سے زبانیں کنگ ہیں اور سوال پوچھنے کا یارا نہیں ہے۔

اتنے میں ایک اعلیٰ مناقب ومراتب والا بزرگ فرشتہ معصوم قدسیوں کی پریشانی بھانپ لیتا ہے وہ جیسے ہی ذرا ستانے کے لیے ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتا ہے دوسرے تمام فرشتے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

بزرگ فرشتہ ان پر شفقت کی نگاہ ڈال کر پوچھتا ہے۔

''تم اس قدر پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو؟ کیا تم تخلیق کائنات کی داستان سے بے خبر ہو؟''

''خدائے بزرگ و برتر کی قسم ہم تو ہمہ وقت اس کی حمد وثنا اور تسبیح وتحلیل میں لگے رہتے ہیں ہم تو بس وہی جانتے ہیں جو ہمیں بتایا گیا ہے۔اس سے زیادہ کی ہمیں کچھ خبر نہیں ہے۔''

معصوم قدسیوں نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

''آج اس قدر بھاگ دوڑ اور گہما گہمی آخر کس سلسلے میں ہے؟ کیا کوئی خاص چیز تخلیق کی جا رہی ہے؟''

ایک قدسی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''ہاں! کچھ ایسا ہی معاملہ ہے'' بزرگ فرشتے نے جواب دیا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے سب کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا'' کچھ دیر آرام کرلو۔ پھر چلتے ہیں۔''

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد بزرگ فرشتہ اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے تمام قدسی بھی اس کی تقلید میں کھڑے ہو گئے۔

''آؤ تم سب میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں کہ آج کس اہم اور انمول چیز کی تخلیق ہونے جارہی ہے۔''

بزرگ فرشتے سے کوئی مزید سوال کیے بغیر سب سر جھکا کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

''یا باری تعالیٰ! آپ اس میں بہت زیادہ ردوبدل کررہے ہیں۔'' بزرگ فرشتے نے اس خاص چیز کی تشکیل میں ہونے والے ردوبدل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تم جانتے ہو کہ جو چیز آج تخلیق کی جارہی ہے اس میں کون کون سی خصوصیات ہونی چاہیے؟''

بارگاہ خداوندی سے ارشاد ہوتا ہے۔

''آپ ہی فرمائیں میں تو لاعلم ہوں۔'' بزرگ فرشتے نے بے حد ادب سے جواب دیا۔

''میری آج کی عظیم تخلیق کو دنیا ''ماں'' کے نام سے پکارے گی۔ اس کے وجود کے ایک سو اسی حصے ہوں گے جو بوقت ضرورت باری باری کام کریں گے۔ اسے پانی اور کھانے کے بچے کھچے ہوئے ٹکڑوں پر گزارا کرنا پڑے گا۔ جب یہ سمٹے گی تو اس کی ایک محبت بھری آغوش ہوگی۔ مگر جب اٹھ کر کھڑی ہوگی تو یہ گود غائب ہوجائے گی تاکہ یہ اپنے روزمرہ کے دیگر کام نپٹا سکے۔ اس کا محبت بھرا بوسہ اور اس کے لبوں سے نکلنے والے ریشمی الفاظ اس کے بچوں کے لیے مرہم کا کام کریں گے۔ اس کے چھ ہاتھ ہوں گے۔''

رب ذوالجلال نے ارشاد فرمایا۔

''چھ ہاتھ''!

بزرگ فرشتے نے بے یقینی سے کہا۔

''مجھے اس کے چھ ہاتھ بنانے میں کوئی مشکل نہیں پیش آرہی بلکہ اس کی تین جوڑی آنکھیں بنانے کے لیے بہت سوچ بچار سے کام لینا پڑ رہا ہے۔''

بارگاہ الٰہی سے جواب آیا۔

''لیکن تین جوڑی آنکھیں کس لیے؟''

بزرگ فرشتے نے حیران ہوتے ہوئے پھر پوچھا۔

''اس کی دو آنکھیں تو بند دروازوں کے پیچھے دیکھنے کے لیے ہوں گی۔ جب وہ پوچھے گی کہ بچے اندر کیا کررہے ہیں؟ گو کہ

اسے پہلے سے ہی علم ہوگا کہ وہ اندر کیا دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔اس کی سر کے پیچھے دو آنکھیں وہ سب کچھ دیکھیں گی جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے مگر اپنے بچوں کی حفاظت اور بھلائی کی خاطر اس کے لیے باخبر رہنا بہت ضروری ہے۔''

''اور تیسری آنکھ؟'' فرشتے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ دو آنکھیں سامنے کی طرف ہوں گی جن سے وہ بچوں کو دیکھ سکے گی جب کبھی وہ اپنی شرارتوں اور حماقتوں کی وجہ سے کسی مشکل میں گرفتار ہو جائیں گے مگر زبان سے کچھ کہے بغیر یہ نگاہوں کے خاموش پیغام سے انہیں کہے گی کہ ''تمہاری حماقتوں اور شرارتوں کے باوجود میں تمہیں بے حد عزیز رکھتی ہوں۔''

باری تعالیٰ نے بہت فخر سے ارشاد کیا۔

بزرگ فرشتہ اب تقریباً لاجواب ہو چکا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اگر اس کی طبیعت قدرے ناساز ہو تو بغیر کسی علاج معالجے کے یہ خود بخود ٹھیک ہو جایا کرے۔اس قدر سگھڑ اور سلیقہ شعار ہو کہ تھوڑی سی خوراک میں پورے کنبے کو پیٹ بھر کر کھلا سکے۔''

رب العزت نے بزرگ فرشتے کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے فرمایا۔

کوئی مزید سوال کیے بغیر بزرگ فرشتے نے آہستہ سے ہاتھ آگے بڑھا کر تکمیل کے آخری مرحلے میں کھڑے ماڈل کو ہاتھ سے چھوا تو گھبرا کر ایک سرد آہ بھر کر یہ کہتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا ''یہ تو بے حد نازک معلوم ہوتی ہے؟''

''مگر بے حد طاقتور اور مضبوط ہے۔'' باری تعالیٰ نے فرمایا۔

''تم نہیں جانتے میری یہ تخلیق دنیا میں کیا کچھ کر سکتی ہے اور کس قدر قوت برداشت رکھتی ہے۔''

''کیا یہ سوچ سکتی ہے؟''

فرشتے نے تقریباً عاجز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''نہ صرف یہ سوچ سکتی ہے بلکہ بہت اعلیٰ درجے کے دلائل اور افہام و تفہیم پر بھی قادر ہوگی۔''

بزرگ فرشتے نے اب خاموشی میں ہی عافیت سمجھی اور اس نئی تخلیق کے نرم و ملائم رخساروں پر بڑی آہستگی سے انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں لیکن یکا یک اس کی انگلیاں بھیگنے لگیں تو اس نے پریشان ہو کر کہا ''اس کے رخساروں سے تو پانی ٹپک رہا ہے؟''

''یہ آنسو ہیں'' رب العزت نے فرمایا:

''یہ کس لیے؟'' فرشتے نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ خوشی، غمی، مایوسی، دکھ، درد، تکلیف اور تنہائی کے لمحوں میں اس کے ساتھی ہوں گے۔'' بارگاہ خداوندی سے مزید ارشاد ہوا:

''آپ بے شک عظیم تخلیق کار ہیں۔''

فرشتے نے تعظیمی سجدہ بجالاتے ہوئے کہا تو باری تعالیٰ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''I did n't put it there''

اب بزرگ فرشتہ بے یقینی سے کبھی ماں اور کبھی خدا کو دیکھ رہا تھا۔

(ماخوذ از انگریزی ادب۔ادیب نامعلوم)

دائروں کا سفر

(افسانچے)

انتساب

کیتھرین کے نام

جو دائرہ در دائرہ زندگی کے

دائروں کو شاید ہی کبھی کھول پائے!

ے میں دائروں کے سفر کو تمام کرتی ہوں
سحر تو ہوتی نہیں شام شام کرتی ہوں

(رضیہ اسماعیل)

پیش لفظ

ہر سفر کا انجام کسی دوسرے سفر کا نقطۂ آغاز بنتا ہے مگر دائروں کا سفر کبھی کسی انجام تک نہیں پہنچتا وہ رنڈی کے چکلے کی طرح ایک دائرے میں ہی چک پھریاں لگا تا جسم وجاں کی دھنائی کرتا رہتا ہے برسوں پہلے نہ جانے کس حال میں کس خیال میں ایک شعر لکھا تھا کہ

؎ میں دائروں کے سفر کو تمام کرتی ہوں
سحر تو ہوتی نہیں شام شام کرتی ہوں

معلوم نہیں تھا کہ ایک دن یہ شعر میری کتاب کا سرورق بن جائے گا۔ سوافسانچوں کا مجموعہ ''دائروں کا سفر'' قارئین کی نذر ہے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
ایم بی ای
24 جمادی الآخر 1440
یکم مارچ 2019ء
بروز جمعۃ المبارک

کرن

پورے چاند کی چٹکی ہوئی چاندنی جب گھنے درختوں کی اوٹ سے راستہ بناتی ہوئی چھن چھن کر میری خواب گاہ کی بڑی بڑی کھڑکیوں پر پڑتی تو یوں لگتا جیسے کچھ لہراتے ہوئے سائے کسی سے ہم کلام ہونے کو بے تاب ہوں۔

مسحور کن نقرئی کرنوں نے میرے خیالات کی رو مالک حقیقی کے حسن و جمال کی طرف موڑ دی تو میں ایک گہری سوچ میں ڈوبتی چلی گئی۔

''انسان اشرف المخلوقات ہے کیونکہ اس کی تخلیق ''احسن تقویم'' پر کی گئی ہے۔ نہ جانے رب العزت نے انسان کے اجزائے ترکیبی کی کتنی ہی تقویمیں بنائی ہوں گی تب کہیں جا کر اسے ہماری حالیہ تقویم پسند آئی اور یہی تقویم احسن قرار پائی جس کا ذکر قرآن پاک کی سورہ والتین میں ہوا ہے۔''

میری سوچ کا سلسلہ آگے ہی بڑھتا رہا۔

جب اس ''احسن تقویم'' کے ذریعے انسان کی تخلیق کا عمل شروع ہوا تو فرشتوں نے اس تخلیق کے اجزائے ترکیبی میں خیر و شر کا تناسب دیکھتے ہوئے نہایت عاجزی سے کہا تھا۔

''رب العزت آپ اس تخلیق کو روک دیجئے کیونکہ اس تخلیق کے مصالحے میں باغیانہ مزاج کی افراط ہے جس کی وجہ سے یہ زمین پر فتنہ و فساد اور حسد و رقابت کو فروغ دے گا۔''

''میں تمہاری یہ درخواست قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس تخلیق کے باغیانہ مزاج کو متوازن رکھنے کے لیے میں اس کی سرشت میں ایک انمول ''کرن'' چھپا کر رکھ رہا ہوں۔ اگر اس نے یہ چھپی ہوئی ''کرن'' اندر سے تلاش کر لی تو یہ نہ صرف اس کی رہنمائی کا خود ساختہ وسیلہ بنے گی بلکہ میری تمام مخلوق کی سرداری کا شرف بھی اسے حاصل ہوگا۔''

رب ذوالجلال نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''مگر یہ کرن ہر کوئی اپنے اندر سے کیسے تلاش کرے گا؟'' فرشتوں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''میں نے اپنے بندوں کو ایک دوسرے کا درد بانٹنے کے جذبے سے بھی نوازا ہے اور یہی جذبہ انہیں اس کرن تک پہنچنے میں مدد دے گا۔ میرے بندے جب ایک دوسرے کے لیے رضا کارانہ طور پر کام کریں گے تو ان کے اس نیک عمل کو دیکھ کر مجھے

انہیں انعام واکرام سے نوازنے کا بہانہ ملے گا۔''

بارگاہ خداوندی سے فخر وانبساط سے لبریز ندا آئی تو ملائکہ بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

پھر بارگاہِ خداوندی سے ایک بار ارشاد ہوا۔

''فرشتو! تمہاری آج کی مخالفت کو یاد رکھتے ہوئے میری یہ تخلیق اگر اس چھپی ہوئی ''کرن'' کو بروئے کار لا کر اپنے دین و دنیا کو میری خواہش اور مرضی کے مطابق سنوارنے میں کامیاب ہوگئی تو پھر تم نہ صرف اپنی مخالفت پر پچھتاؤ گے بلکہ خود انسان بننے کی خواہش کرو گے۔''

ملائکہ حیرت واستعجاب سے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد مشوش لہجے میں گویا ہوئے۔

''رب العزت اس چھپی ہوئی کرن کا کوئی نام تو ہوگا وگرنہ کوئی اسے کیسے پہچانے گا؟'' عظیم تخلیق کار نے فخر سے جواب دیا۔

''ہاں۔اس کرن کا نام ہے ''آگہی''

پروپوزل

برطانیہ کے ایک شادی دفتر کے باہر کافی گہما گہمی ہے۔

لوگوں کا جمِ غفیر ہاتھوں میں کیمرے تھامے شادی کے لیے آنے والے جوڑے کی تصاویر بنانے میں مصروف ہے۔ میڈیا والے بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ لوگوں میں ایک عجیب طرح کا جوش وخروش پایا جاتا ہے کیونکہ آج یہاں دنیا کا معمر ترین جوڑا رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے جا رہا ہے۔ جس کے نام کا اندراج ''گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' میں کیا جائے گا۔

دلہا کی عمر 102 برس جبکہ دلہن 91 سال کی ہے گویا اس وقت دونوں کی مجموعی عمر تقریباً دو صدیوں کے لگ بھگ ہے۔

دونوں گزشتہ پچیس برس سے اکٹھے رہ رہے تھے اور جب انہوں نے قانونی اور شرعی بندھن میں بندھنے کا ارادہ کیا تو حالیہ ویلنٹائن ڈے پر دلہا نے باقاعدہ طور پر پروپوز کیا۔

جیسے ہی نو بیاہتا جوڑا شادی دفتر سے باہر نکلا تو کیمروں کی آن آف ہوتی ہوئی فلیش لائٹوں کے ساتھ ساتھ میڈیا والوں نے جوڑے سے طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کر دیئے جن میں سنجیدگی سے زیادہ مزاح کا عنصر غالب تھا۔ مگر یہ جوڑا ہنس ہنس کر سب کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

''آپ کے خیال میں شادی کا بہترین وقت کون سا ہے؟''

ہجوم میں سے ایک شوخ آواز ابھری۔

''ہمارے خیال میں شادی کا بہترین وقت یہی ہے۔''

دلہا نے بھی ترکی بہ ترکی بڑے شوخ وشنگ لہجے میں جواب دیا۔

ایک تیکھا سا سوال پھر دلہا کی جانب اچھالا گیا۔

''آپ نے شادی کے لیے کیسے پروپوز کیا تھا؟''

معمر دلہا نے قدرے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

''میں نے روایتی انداز میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پروپوز نہیں کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں اس طرح بیٹھا تو پھر دوبارہ اٹھ نہیں سکوں گا۔''

دلہا کا ظریفانہ جواب سن کر فضا میں زبردست قہقہے بلند ہونے لگے تو معمر دلہا اپنی دلہن کے گال پر پیار سے بوسہ دینے لگ گیا۔

پروف

مغربی ممالک میں ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو سینئر سٹیزن (Senior Citizen) کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور آپ کئی سہولتوں کے حقدار قرار پاتے ہیں جن میں سے ایک سینما اور تھیٹر کے رعایتی قیمت پر ٹکٹ خریدنے کی سہولت ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد ہم دونوں میاں بیوی ان سہولیات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اکثر سینما یا تھیٹر کا رخ کرتے ہیں۔

آج سینما بکنگ آفس کی کھڑکی پر رش معمول سے قدرے زیادہ تھا۔ اس لیے ہمیں کافی دیر تک اپنی باری کا انتظار کرنا پڑا۔ لیکن جیسے ہی ہم کھڑکی تک پہنچے تو نوجوان بکنگ کلرک نے زندگی سے بھرپور مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا جس نے ہماری انتظار کی ساری تھکان جیسے دور کر دی اپنا آئی ڈی کارڈ تلاش کرنے کے لیے جیسے ہی میں نے پرس میں ہاتھ ڈالا تو انکشاف ہوا کہ جلدی میں ہم دونوں کے آئی ڈی کارڈ لاؤنج میں کافی ٹیبل پر ہی پڑے رہ گئے ہیں۔ میں اس صورت حال پر خاصی نروس ہو رہی تھی۔ میں نے بڑے معذرت خواہانہ لہجے میں بکنگ کلرک سے کہا۔

''بیٹا ہم اپنے آئی ڈی کارڈ تو گھر پر ہی بھول آئے ہیں اور اس وقت ہمارے پاس اپنے اولڈ ایج پنشنر ہونے کا کوئی پروف نہیں ہے۔''

میری بات سن کر نوجوان کلرک کے چہرے پر ایک شریر سی مسکراہٹ ابھرتی ہے اور وہ کچھ کہے بغیر ہی دو رعایتی ٹکٹ کاٹ کر میرے حوالے کر دیتا ہے مجھے یوں لگا جیسے اس کی خاموشی کہہ رہی ہو کہ ''آپ کو بھلا کسی پروف کی کیا ضرورت ہے پروف تو آپ کے چہروں پر موجود ہے۔''

ڈیڈی

''کرائم سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والی پاکستانی طالبہ خود کرائم کا شکار ہوگئی۔''

اخبار کی شہ سرخی دیکھ کر میں اخبار کا صفحہ پلٹتے پلٹتے رہ گئی۔

20 سالہ نادیہ کی ملاقات 68 سالہ انگریز کے ساتھ چند ماہ قبل گھر کے قریب واقع پارک میں جوگنگ کرتے ہوئے ہوئی تھی۔ بوڑھے انگریز کی شفقت اور محبت دیکھ کر نادیہ نے اسے ڈیڈی کہہ کر بلانا شروع کر دیا تھا کیونکہ اپنے والدین کی علیحدگی کے بعد نادیہ بچپن سے ہی اپنے والد کے پیار سے محروم تھی۔ اس نے اس بوڑھے انگریز کے بارے میں زیادہ کچھ جانے بغیر ہی اس سے محبت اور اعتماد کا رشتہ قائم کر لیا۔ یہاں تک کہ اپنے فلیٹ کی ایک چابی بھی اس نے ڈیڈی کو بنوا کر دے دی کہ بوقت ضرورت ڈیڈی گھر کے چھوٹے موٹے کام اس کی غیر موجودگی میں نپٹا دیا کرے۔

نادیہ کے دوست اکثر اس کے فلیٹ پر آتے رہتے تھے لیکن اگر کبھی ڈیڈی کی موجودگی میں کوئی آجاتا تو ڈیڈی اسے تکلیف دہ حد تک نظر انداز کر دیتا تھا۔

جس کا ذکر نادیہ کے دوستوں نے اس سے بارہا کیا مگر نادیہ کی آنکھوں پر تو جیسے منہ بولے ڈیڈی کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ ڈیڈی کے خلاف کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہ تھی۔

کچھ عرصہ سے نادیہ کا ایک ہم وطن کلاس فیلو بڑے تواتر سے اس کے فلیٹ پر آنے جانے کا لگا تھا۔ ڈیڈی کے لیے یہ تعلق ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔

پھر ایک رات وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس رات دیر تک نادیہ کے دوست فلیٹ پر ہلا گلا کرتے رہے۔ ڈیڈی چپکے سے فلیٹ کا تالا کھول کر اندر آ گیا۔ اور سبکی موجودگی میں ہی ڈیڈی نے نادیہ پر چاقو کے پے در پے وار کرنے شروع کر دیئے۔

سب دوستوں نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی مگر جنونی ڈیڈی نے سب کو ہی زخمی کر ڈالا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے پکڑ دھکڑ کر گالیاں بکتے ہوئے ڈیڈی کو کمرے میں بند کر دیا اور ساتھ ہی پولیس اور ایمبولینس کو اطلاع کر دی۔ منٹوں میں ہی سائرن بجاتی ہوئی گاڑیاں فلیٹ پر آموجود ہوئیں۔

زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا نادیہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے طبی امداد ملنے سے پہلے ہی زندگی کی بازی ہار گئی۔

پولیس کی تفتیش کے دوران ڈیڈی کے جرائم کی طویل تفصیل سامنے آئی تو پتہ چلا کہ اب تک وہ کئی چھوڑے بڑے جرائم میں متعدد بار جیل کی ہوا کھا چکا تھا جن میں سے ایک سنگین جرم چودہ سالہ لڑکی کا ریپ تھا جس کی سزا کاٹ کر وہ حال ہی میں جیل سے رہا ہوا تھا اور بدقسمتی سے اس نے نادیہ سے ایک پاکیزہ رشتے کی آڑ میں راہ و رسم بڑھالی تھی۔

خبر پڑھ کر میں بے حد افسردگی سے سوچنے لگی کہ باپ کی محبت سے محروم بچیاں بھی کیسے کیسے سرابوں کا پیچھا کرنے لگتی ہیں مگر نادان یہ نہیں جانتیں کہ مرد تو اپنی حقیقی بیٹی سے بھی محبت کے معاملے میں خاصا بخیل واقع ہوا ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی دوسری عورت کو اپنی بیٹی بنالے!!!

بے چہرہ نسلیں

میں آج لندن میں ایک نیشنل ایجوکیشن کانفرنس میں بحیثیت جرنلسٹ مدعو ہوں۔

ملک بھر سے اساتذہ اور شعبہ تعلیم سے متعلق سرکردہ افراد کے علاوہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی ایک بڑی تعداد یہاں موجود ہے۔

آج کی کانفرنس میں بحث طلب موضوع کا تعلق ایک حالیہ تعلیمی رپورٹ سے ہے جس کے مطابق ٹیکنالوجی کے بہت زیادہ بڑھتے ہوئے استعمال کی وجہ سے پانچ سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد بھی بچے دوسروں کے چہروں کے تاثرات (Facial Expressions) پڑھنے میں ناکام رہتے ہیں۔

''ماہرین نفسیات بچوں کی متوازن نشوونما اور بالیدگی کے حوالے سے خاصے متفکر نظر آ رہے ہیں جبکہ اساتذہ اپنی جگہ الگ پریشان ہیں کیونکہ انھیں کلاس روم میں بچوں کو بار بار وضاحت کرنا پڑ رہی ہے کہ انسانی چہرے پر مخصوص تاثرات کا مطلب کیا ہوتا ہے؟''

منتظمین نے آج کی کانفرنس کے بارے میں کچھ مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''اساتذہ کا موقف ہے کہ خواندگی (Literacy) کو فروغ دینے کے لیے ماڈرن انفارمیشن ٹیکنالوجی پر ضرورت سے زیادہ انحصار کیا جا رہا ہے۔ ورچوئیل انوائرمنٹ (Virtual Environment) کی وجہ سے بچے حقیقی زندگی کے ماحول کی تشریح کرنے اور اس کے کماحقہ سمجھنے سے ناواقف ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ ان کا زیادہ وقت ٹی وی، آئی پیڈز، سمارٹ فونز، واٹس ایپ، وائبرز، ٹیبلٹ، ٹویٹر، بلاگز اور فیس بک پر گزرتا ہے۔''

منتظمین کے تعارفی بیان کے بعد دیگر شعبوں سے مقررین کو اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ دھواں دھار تقاریر ہو رہی ہیں۔ کسی مقرر کے بہت اچھے پوائنٹ پر ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے یا پھر کچھ مقررین بہت اچھی حِس مزاح کے مالک ہیں جن کے چست فقرے کانفرنس کے شرکا کو بے حد محظوظ کر رہے ہیں اور وہ بے اختیار قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مقررین کی تقاریر سن کر میں سوچ رہی ہوں ''انسانی ترقی کے بلند و بانگ دعووں کے باوجود انسان تو پیچھے کی طرف جا رہا ہے۔ روبوٹس کی طرح کی یہ نئی نسل اگر انسانی چہروں کے تاثرات کو پڑھنے اور پہچاننے میں ناکام رہتی ہے تو کیا پھر انھیں دلوں کو ٹٹول کر انسانی جذبات و احساسات کا ادراک کرنا ہوگا؟''

دل کے اندر سے آواز ابھری ''مگر دلوں کو پڑھنا اور سمجھنا تو چہرے پڑھنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔''

میں نے دکھ سے سوچا۔ ''تو کیا پھر ہماری آئندہ نسلیں بے چہرہ ہو جائیں گی؟''

مونالیزا

میں اس وقت دنیا کے غالباً سب سے بڑے میوزیم (Louvre) میں موجود ہوں۔

''خوشبوؤں کے شہر پیرس کے عین وسط میں واقع یہ فقید المثال عمارت کسی زمانے میں فرانس کے بادشاہوں کا مسکن رہ چکی ہے جسے 1793ء میں میوزیم کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس میوزیم میں دنیائے مصوری کے بہترین نمونوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے جو کہ فنِ مصوری کی گزشتہ کم وبیش سات ہزار سال پرانی تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے۔''

گائیڈ نہایت جوش وخروش سے فنِ مصوری کے دنیا بھر سے آئے ہوئے شائقین کو بتا رہا ہے۔

''اس میوزیم کی شان فنِ مصوری کے تین مشہور زمانہ نادر شاہکار ہیں۔ جن میں ''مونالیزا'' وینس ڈی مائیلو اور ''نپولین کی تاجپوشی'' شامل ہیں۔

تقریباً پانچ سو سال قبل فلورنس میں بنایا جانے والا مونالیزا کا پورٹریٹ لیونارڈو ڈوونچی کا بہترین شاہکار ہے جس کی دنیا بھر میں سب سے زیادہ تعریف وتوصیف کی گئی ہے کیونکہ اسے دنیا کے بہترین آرٹ میں شمار کیا گیا ہے۔''

گائیڈ زسانس لینے کو رکا تو میں زبردست سکیورٹی کے حصار میں گھری۔ بلٹ پروف شیشے کے پیچھے کھڑی مونالیزا کو قدرے قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھ جاتا ہوں۔

کیمروں کے فلیش آن آف ہو رہے ہیں۔ آرٹ کے شائقین مونالیزا کی ہر ہر زاویے سے دھڑا دھڑ تصویریں بنا رہے ہیں۔ مونالیزا کے چہرے پر پھیلی ہوئی مبہم سی مسحور کن مسکراہٹ کو میں بہت غور سے دیکھ رہا ہوں ''آخر کیا ہے اس مسکراہٹ میں جس نے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے؟'' میں دل ہی دل میں سوال کرتا ہوں میرے قریب ہی کافی دیر سے کیمرہ تھامے ہوئے کھڑی ایک نوجوان لڑکی بہت غور سے مونالیزا کے پورٹریٹ کو دیکھ رہی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ کیمرہ تصویر کی طرف زوم کرتی ہے پھر کچھ سوچ کر اسے نیچے کر لیتی ہے۔

میں کن اکھیوں سے یہ آنکھ مچولی دیکھ رہا ہوں۔ بالآخر مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں نے پوچھ ہی لیا ''تم کافی دیر سے شش وپنج کا شکار ہو۔ آخر تصویر کیوں نہیں بنا رہی؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے'' لڑکی نے آہستگی سے جواب دیا۔

''مگر کیوں؟ کیا ہوا؟'' میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے تفتیشی انداز میں پھر سوال کرتا ہوں۔

''اس پورٹریٹ کا چہرہ نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟ مجھ پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ چہرہ تو موجود ہے۔'' میں نے تقریباً ہکلاتے ہوئے کہا۔

یہ مونالیزا کا چہرہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کی گود ہے۔ لڑکی نے پورے وثوق سے جواب دیا۔

لڑکی کا جواب سن کر میں مزید حیرت کا شکار ہو جاتا ہوں۔

''ڈونچی اس پورٹریٹ میں مونالیزا کو بیٹھے ہوئے بھی تو دکھا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ عورت جب بیٹھتی ہے تو ممتا کی گود بن جاتی اور جب کھڑی ہوتی ہے تو وہی گود اس کے چہرے پر جا لگتی ہے۔ تصویر تو چہرے کی بنائی جاتی ہے ناں۔ گود کی نہیں۔''

اتنا کہہ کر لڑکی میوزیم سے باہر نکل جاتی ہے۔

میں اس انوکھے انکشاف پر مبہوت سا کھڑا سوچ رہا ہوں کہ ''پاکیزہ جذبوں سے گندھی ہوئی یقیناً یہ ممتا کی ہی مسکراہٹ ہے وگرنہ چہرے پر اس قدر اُجالا ممتا کے تقدس کے بغیر ہرگز نہیں آ سکتا۔''

کالا پانی

ہم نے بچپن سے ہی ''کالے پانی'' کا ذکر اس تواتر سے اپنے بڑے بزرگوں سے سنا تھا کہ ہمیں بچپن میں ہر کالی چیز دیکھ کر لاشعوری طور پر ''کالا پانی'' یاد آجاتا تھا۔

ہندوستان پر انگریز راج کے دوران دادا ابا ہندوستان کی آزادی کی لڑائی لڑتے لڑتے انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر بغاوت کے جرم میں مختصر عدالتی کارروائی کے بعد جزائر انڈیمان میں.....سیاہ پانیوں سے گھری..... بدنام زمانہ، جیل کالے پانی بھجوا دیئے گئے۔ جہاں بہت سے آزادی کے متوالوں نے زندگی کی آخری سانس لیں کیونکہ وہاں جو ایک بار گیا پھر زندہ واپس نہیں آیا۔

دادی جان اکثر اس جیل کا تذکرہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتی تھیں۔ جس سے دادا ابو کی یاد ایک دردناک کہانی بنکر ہمیشہ ہماری زندگیوں کا حصہ بنی رہی۔

کبھی شعوری تو کبھی لاشعوری طور پر اکثر و بیشتر ہمیں ذہن کے کسی گوشے میں ''کالا پانی'' کی بازگشت وقتاً فوقتاً سنائی دیتی رہتی تھی۔

ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ بڑے بھیا نے کوکا کولا کی بوتل اٹھا کر پٹاخ سے زمین پر دے ماری۔ کالا پانی کمرے کے فرش پر ہر طرف پھیل گیا۔

میں حیرت سے اس حرکت پر بڑے بھیا کا منہ تکنے لگی تو وہ بہت غصے سے بولے ''اب کسی کو جزائر انڈیمان بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کالا پانی چل کر ہمارے گھروں تک آ گیا ہے۔ ہم آزاد ہو کر بھی ذہنی طور پر غلام ہیں۔''

بڑے بھیا کی بہت گہری چبھتی ہوئی بات نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

ڈسپوزیبل

''یار بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ آج سیٹھ صاحب کی پارٹی میں چینی کے مہنگے برتنوں کی بجائے پلاسٹک کے ڈسپوزیبل (Disposable) برتن استعمال ہوئے ہیں۔''

انواع واقسام کے لذیذ کھانوں کی تقریباً بھری ہوئی پلیٹوں کو پلاسٹک کے سیاہ بیگوں میں پھینکتے ہوئے سیٹھ آفریدی کے گھریلو ملازمین آج کی پارٹی برخاست ہونے کے بعد تبصرہ کر رہے تھے۔

''یہ امیر لوگ لگتا ہے کھانا کھاتے نہیں بلکہ صرف سونگھتے ہیں۔اب دیکھوناں ایسا کھانا تو کسی غریب نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا جو کچرے میں پھینکا جا رہا ہے'' مالی بابا نے اپنی نحیف آواز میں گویا اپنی غربت کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

میں قریبی بینچ پر اندھیرے میں بیٹھی ملازموں کی باتیں غور سے سن رہی تھی جو میری موجودگی سے بے خبر سرمایہ داری نظام اور سرمایہ داروں کے خلاف دل کے پھپھولے پھوڑ رہے تھے۔

''انسان بھی تو ڈسپوزیبل برتنوں کی مانند ہی ہیں جنہیں زندگی صرف ایک بار ہی استعمال کر کے پھینک دیتی ہے۔''

میں نے دکھ سے سوچا اور بوجھل قدموں سے اٹھ کر اپنی ڈسپوزیبل پلیٹ پاس ہی پڑے ہوئے ڈسٹ بن میں پھینک دی۔

ری سائیکلنگ

کونسل والے دو بڑے بڑے پلاسٹک کے کوڑا دان گھر کے سامنے والے صحن میں رکھ گئے تھے۔ ایک پہ لکھا تھا Rubbish جبکہ دوسرا Recycling کے لیے تھا۔

میں نے اب ان میں باقاعدگی سے پلاسٹک کی خالی بوتلیں، شیشے کے جار، کپڑے، کاغذ اور ردی اخبارات ڈالنے شروع کر دیئے ہیں۔

کوڑا دان میں ری سائیکلنگ کے لیے چیزیں ڈالتے وقت میرا ذہن سوچتے سوچتے بہت دور نکل جاتا ہے۔ قانون فطرت ہے کہ مادے کو کبھی فنا نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ مختلف شکلیں بدل بدل کر ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔ گویا ایک دفعہ جو چیز پیدا ہوگئی اسے فنا نہیں ہے۔ ایسے ہی انسان بھی ری سائیکل ہوتا رہتا ہے۔ پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور پھر زمین کا رزق اور آگے کے معاملات یعنی کسی نہ کسی شکل میں انسان کی موجودگی رہتی ہے' مگر انسانی ری سائیکلنگ کے بارے میں سوچنا ایک تکلیف دہ عمل ہے کیونکہ پھر وہ لوگ یاد آنے لگتے ہیں جو اب ری سائیکلنگ پراس (Process) کا حصہ بن چکے ہیں۔

خاندان

میں Netflix پر مشہور انڈین فلم خاندان دیکھ رہی ہوں۔ فلم کے مرکزی کردار سنیل دت اور نوتن ہیں۔
سرتا پا ایثار و قربانی کی دیوی بنی نوتن جسمانی طور پر قدرے معذور سنیل دت کے لیے بہت عقیدت اور خلوص سے گیت گا رہی تھی۔

؎ تمہیں میرے مندر ، تمہیں میری پوجا ، تمہیں دیوتا ہو

''زمانے کی قدریں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ خاندانی قدریں کس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں اب تو شادیاں چند ماہ بھی مشکل سے ہی چلتی ہیں۔''

لگتا ہے اب رول ریورس (Role Reverse) ہوں گے اور عورتوں کی جگہ مرد گایا کریں گے انہیں یاد دلانے کے لیے کہ

؎ میں ہی تیرا مندر، میں ہی تیری پوجا، میں ہی دیوتا ہوں!!!

کُتّے

میں اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں کچھ عرصہ پہلے ہی شفٹ ہوئی ہوں۔

میرے خیال میں یہاں کوئی بھی بنگلہ ہزار گز سے کم کا نہیں لگتا۔ ہر بنگلہ فنِ تعمیر کا نادر نمونہ، شاندار بنگلوں کے پورچ میں کھڑی چمچماتی بیش قیمت غیر ملکی گاڑیاں یہاں کے مکینوں کی خوشحالی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ میں نے ایک بنگلے کا اوپری پورشن کرایے پر لیا ہے مالکان میرے دور کے عزیز ہیں جو کافی عرصہ سے بیرون ملک رہائش پذیر ہیں اور چند سالوں میں ایک آدھ چکر پاکستان میں اپنی جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے لگا لیا کرتے ہیں۔

اس پورشن کا کرایہ کافی کم ہے وگرنہ مجھ جیسی ملازمت پیشہ خاتون ایسے علاقے میں رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

یہاں بنگلوں کے اصل مکین تو کم ہی نظر آتے ہیں جبکہ ان میں کام کرنے والے خانساماں، ڈرائیور، مالی اور تیز طرار ماسیاں ہی زیادہ تر بنگلوں کے باہر کھسر پھسر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس بنگلے سے کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت پارک ہے جس کے ایک کونے میں مسجد ہے جہاں سے صبح سویرے اذان کی آواز کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔

پارک میں جوگنگ ٹریک بھی بنا ہوا ہے علی الصبح یہاں کے مکین پارک میں کئی طرح کی ورزشیں کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک روز چھٹی کے دن میں بھی پارک میں واک کرنے کی غرض سے چلی گئی۔ پارک کے گیٹ پر دو کُتّے آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے مجھے قریب آتا دیکھ کر وہ لڑنا چھوڑ کر چاؤں چاؤں کرنے لگتے اور ذرا دور بھاگ جاتے۔

میں ذرا پرے ہوتی تو پھر ایک دوسرے سے آن لپٹتے ہیں۔

میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ دونوں کُتّے واقعی لڑ رہے تھے یا صرف لڑنے کا ناٹک کر رہے تھے۔ خیر کُتّوں کو نظر انداز کر کے میں پارک کے اندر چلی گئی۔

فجر کی نماز کے بعد پارک کے ایک گوشے میں یوگا کلاس ہو رہی تھی۔ ادھیڑ عمر اور بوڑھے مرد یوگا کرنے میں مصروف تھے۔ یوگا انسٹرکٹر اردو کی بجائے انگریزی میں یوگا کی ہدایات دے رہا تھا۔ یہ کوئی بیس لوگ تھے جو نہایت تن دہی سے یوگا کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے چند منٹ انہیں رک کر دیکھا اور یہ سوچ کر دل کو اطمینان ہوا کہ چلو کسی نے تو کوئی مثبت عادت اپنائی ہے۔

ابھی واکنگ ٹریک پر آئے مجھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ لوگوں کے آپس میں جھگڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو یوگا کرنے والے دو آدمی آپس میں دست و گریباں ہونے کو تیار تھے ''یو باسٹرڈ'' ایک مرد غرّاتے ہوئے آگے بڑھا۔

تو دوسرا مرد بول اٹھا کہ ''یور فادر از باسٹرڈ۔''

''میں تیرا سر توڑ دوں گا حرامی اگر بکواس کی تو۔'' پہلے والا مرد بولا۔

انگریزی کے بعد وہ مقامی زبانی میں مغلظات بکنے لگے تھے۔ تیری ماں نوں ___ تیری بہن نوں ___ پارک میں جھگڑے کی آواز سن کر دونوں کُتّے دوبارہ گیٹ پر واپس آ گئے تھے اور بڑی حیرت سے پارک کے اندر آپس میں اول فول بکتے ہوئے انسانوں کو دیکھنے میں محو تھے کہ اچانک انہوں نے (شاید ڈر کر) دوبارہ بھونکنا شروع کر دیا مگر اس بار انسانوں کی آوازیں کُتّوں کی آوازوں سے زیادہ بلند تھیں۔

حساب کتاب

میں اس وقت ایک ٹریول ایجنٹ کے آفس میں عمرے کے لیے ٹکٹ ایشو کروانے کی غرض سے موجود ہوں مگر کمپیوٹر سسٹم ڈاؤن ہونے کی وجہ سے آفس میں موجود لوگ انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے آپس میں خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔

''یار.....وہ جو مہندی رنگی داڑھی والا مولوی ہے ناں اسے یہاں آئے صرف دس سال ہی ہوئے ہیں۔مگر اس نے سات لاکھ پونڈ کی پراپرٹی بنالی ہے۔''

وہ کیسے؟ دوسرے نے استفسار کیا۔

''یار بہت سے طریقے ہیں کھانا تو وہ کبھی گھر پکاتے نہیں ہیں.....کبھی میلاد، کبھی جنازہ، کبھی گیارھویں شریف تو کبھی شادی بیاہ کی دعوت۔ بچت ہی بچت ہے۔ پیروں کے عرس پر لوگ بند لفافے ہی دے جاتے ہیں۔''

''اچھا''.....دوسرے نے اچھا پر کافی زور دیتے ہوئے کہا۔

''یار سنا ہے کہ مولوی تو مکے مدینے جا کر باقاعدگی سے نماز بھی نہیں پڑھتا۔ جب دیکھو ہوٹل کے باہر بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا ہوتا ہے۔تیسرا آدمی بولا۔

''عمرے اور حج کے ہر ٹرپ پر یہ بڑی رقم بناتے ہیں۔ دین کے نام پر بڑا کاروبار ہو رہا ہے'' پہلے شخص نے قدرے تلخی سے کہا۔

''نہ انکم ٹیکس۔ نہ وی اے ٹی۔ان کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا کیا؟ دوسرے آدمی نے بڑے غصے سے کہا۔

''نہیں۔ان کا حساب کتاب اگلے جہان میں ہوگا۔''

پہلے والے آدمی نے جل کر جواب دیا۔

نامرد

جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے آگے قطار میں کھڑا مسافر ہاتھ میں بھاری بیگ اٹھائے تقریباً ہانپ رہا تھا۔ معلوم نہیں کیا سوچ کر میرے منہ سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا تو قطار میں کھڑے ہانپتے ہوئے مسافر نے غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''محترمہ آپ اس طرح کیوں ہنس رہی ہیں کیا جہاز کے پائلٹ کی جنس تبدیل ہوگئی ہے؟''

''تبدیلی جنس میں کونسا مزاح کا پہلو نکلتا ہے؟''

میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''بالکل نکلتا ہے'' مسافر غصّے سے بولا۔

''وہ کیسے؟'' میں نے باقاعدہ جرح کرنے والے انداز میں تیوریاں چڑھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ بولا۔

''دیکھئے ناں اگر تو عورت تبدیلی جنس کے بعد مرد بنی ہے تو خوش ہونے کی وجہ بنتی ہے کہ ایک عورت کو آزادی نصیب ہوئی ہے اور اگر مرد عورت بن جائے تو پھر ہنسی کی بجائے رونا زیادہ آنا چاہیے۔''

''فرض کریں اگر جہاز کا پائلٹ نہ مرد ہے اور نہ عورت بلکہ تیسری جنس ہے تو پھر؟''

میرے سوال پر ہانپتا ہوا مسافر خاصا گڑبڑا گیا۔ تو پھر..... تو پھر..... پتہ نہیں..... مردہ سی آواز میں مرد مسافر نے جواب دیا۔

''پتہ کیوں نہیں؟ آپ کو پتہ ہونا چاہیے..... مردوں کو تو ہر بات کا پتہ رہتا ہے۔ اس بات کا پتہ کیوں نہیں'' میں نے غصے میں گویا غراتے ہوئے کہا ''نامرد کہیں کا'' اس کے ساتھ ہی بھاری بھرکم بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دھڑام سے زمین پر آ گرا۔

آوارہ کُتّے

بس سٹاپ پر روزانہ کالج جاتے ہوئے آوارہ کُتّوں کی ایک بھیڑ سی لگی رہتی تھی۔ جو ہمیں دیکھتے ہی چاؤں چاؤں کرنے لگتے مگر ان کی یہ حرکت ہمیں سخت ناگوار گزرتی اور ہم نہایت سختی سے ہش ہش کر کے انہیں وہاں سے بھگانے کی کوشش کرتے مبادا یہ کسی کو کاٹ کھائیں۔ آخر جانور ہی ہے ناں۔

ادھر کچھ روز سے دو لڑکے باقاعدگی سے بس سٹاپ پر موجود رہنے لگے تھے میں اور میری دوست جیسے ہی بس میں سوار ہوتیں وہ بھی ہمارے پیچھے اس بس میں آجاتے۔

آج صبح سویرے ہی سورج سوا نیزے پر آگیا تھا اور بس بھی خاصی لیٹ تھی دھوپ سے بچنے کے لیے ہم نے جیسے ہی قریبی درخت کے سائے میں جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے تو آوارہ کُتّے ہمارے آگے چاؤں چاؤں کرتے چلنے لگے جبکہ لڑکے ہمارے پیچھے چلے آرہے تھے۔

آج لڑکے اور کُتّے دونوں ایک جیسے ہی لگ رہے تھے۔

پھر تو حد ہی ہوگئی۔ دونوں لڑکوں نے گھٹیا عاشقانہ فقرے وقفے وقفے سے اچھالنے شروع کر دیئے۔ لڑکوں کی بکواس میں ذرا وقفہ ہوتا تو کُتّے بھونکنا شروع کر دیتے۔ میں اور میری دوست اس بدتمیزی پر سخت برہم ہو رہی تھیں اور ابھی سوچ ہی رہی تھیں کہ کیسے اس مصیبت سے چھٹکارا پایا جائے کہ ایک لڑکے نے میری دوست کا دوپٹہ کھینچنے کی کوشش کی۔ میری دوست سہم گئی مگر میں نے غصے میں آکر ایک زبردست تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

یہ سب اس قدر اچانک ہوا کہ دونوں لڑکے حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلے ''کم بخت.....حرامی.....سور کے جنے..... ہمیشہ خاموش رہنے والی میری دوست بھی آج غصے میں لال بھبھوکا ہو رہی تھی۔

''کم بخت آوارہ کُتّی پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔'' میں نے اتنی زور سے کہا کہ اصلی کُتّے بھی ڈر کر بھاگ گئے۔

اذان

مشہور پنجابی شاعر امام دین گجراتی نے جب درج ذیل شعر کہا ہوگا کہ

؎ حکومت سے کہہ دو جہازوں کو روکیں
یہ راتوں کو ہمارا تراہ کاڈتے ہیں

تو اس نے یہ کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ اسی قسم کا ناقابل عمل مطالبہ ایک دن اس کے سمندر پار رہنے والے ہم وطنوں سے وہاں کی انگریز کمیونٹی بھی کرے گی۔

برطانیہ کا ایک شہر جسے ''لٹل پاکستان'' بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں کی انگریز کمیونٹی نے مقامی کونسل کے پاس اذان سے متعلق شکایت درج کروائی ہے۔ ذرا ٹھہریے! یہ شکایت مسجدوں سے اٹھنے والی اذان کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ یہاں مسجدوں میں لاؤڈ سپیکر لگا کر اذان دینے پر پابندی ہے۔

یہ شکایت مرغوں کے خلاف ہے جو یہاں کی ایشیائی کمیونٹی نے اپنے گھروں کے پچھواڑے میں پال رکھے ہیں اور علی الصبح یہ مرغے باری باری اذانیں دینے لگتے ہیں۔ جس سے انگریز ہمسایوں کے آرام اور نیند میں خلل پڑتا ہے۔ یہاں کونسل کو ملنے والی اکثر شکایات گھروں میں رات گئے تک ہونے والی پارٹیوں میں تیز اور اونچے میوزک کا بجانا، گھروں کے سامنے کوڑا کرکٹ پھینکنا، جانوروں کی گھروں میں دیکھ بھال میں غفلت کے سبب اٹھنے والی بدبو یا پھر بچوں کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہ کرنے کے بارے میں ہی ہوتی ہیں۔ مقامی کونسل اس انوکھی شکایت پر کنفیوزڈ ہے کہ اس کا کیا سدباب کرے؟

''سنا ہے کہ پس پردہ معاملات کچھ اور ہیں۔ حالیہ الیکشن میں یہاں کے انگریز امیدوار کو ایک ایشیائی عورت نے ہرا دیا ہے اور وہ ایم پی بن گئی ہے الیکشن ہارنے کے سبب یہاں کی مقامی انگریز آبادی پہلے ہی غصے میں تھی کہ اب مرغوں نے جلدی پر تیل کا کام کر دیا ہے۔ پڑوس کی مسز خان نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔''

''میرے خیال میں یہاں اگر دوبارہ الیکشن کروا دیئے جائیں اور اگر انگریز امیدوار جیت جائے تو پھر یہ شکایت دور ہو سکتی ہے!!!'' میں نے جواباً طنزیہ فقرہ اچھالتے ہوئے کہا۔

اداکار

میں جب تک بے اعتماد تھی۔ کمزور تھی۔ وہ خوشی خوشی میرا ساتھ نبھاتا رہا کیونکہ اس سے اس کی مردانگی کے جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔

لیکن جب میرے اندر کی عورت ایک انگڑائی لیکر بیدار ہوئی تو اس نے بے اعتمادی کا چولا اتار کر اعتماد کی ردا اوڑھ لی۔ اب میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتی تھی۔

لیکن اب میں اسے زہر لگنے لگی تھی..... کیونکہ اسے ہر وقت نظریں جھکائے رکھنے والی فرمانبردار کٹھ پتلی چاہیے تھی۔

میں نے صدیوں پرانی روایت سے بغاوت کر دی ہے اس لیے کہ مجھے موت سے پہلے مرنا منظور نہیں ہے میں جان چکی ہوں کہ اگر عورت اندر سے مر جائے تو وہ اچھی رفیق زندگی کبھی نہیں بن سکتی ہاں البتہ اچھی اداکارہ ضرور بن سکتی ہے۔

سوری

مجھے اس کے گھر کی دہلیز پار کرنے کے ساتھ ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں کسی غلط جگہ پر آ گئی ہوں جہاں میرے استقبال کے لیے کسی چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔ کسی آنکھ میں روشنی نہ تھی۔ سوائے اس کے پر جوش لہجے کہ جو وقت کے ساتھ ساتھ سرد ہوتا چلا گیا پھر میرے اندیشوں پر اثبات کی مہر یہ کہہ کر لگا دی گئی۔

''سوری۔ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے۔ تم میری طرف سے آزاد ہو۔''

میں اس کی دہلیز کے باہر کھڑی سوچ رہی ہوں ''یہ کیسی آزادی ہے جو قید سے بدتر ہے؟''

آنچل

میں وہ عورت ہوں جسے شادی کے دس برس بعد یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جائے کہ ''تم محض میری جستجو تھیں.....منزل کبھی نہ تھیں.....
تم میری انا کے خاردار پودے پر اٹک جانے والا ایک ایسا آنچل تھیں جسے چھڑاتے چھڑاتے برسوں بیت گئے۔''
میں آنچل کی اس نئی توضیح پر حیرت سے اس مرد کا منہ تک رہی ہوں جو کبھی میری محبت میں نیم پاگل ہو گیا تھا۔

انفیکشن

؎ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کہ بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

''آج ہم نے مرزا غالب کے اس شعر کی تجسیم دیکھ لی ہے۔''
میں نے از راہ تفنن کہا۔
''وہ کیسے؟ سرفراز جلدی سے بول پڑا۔
''یار سنا ہے کہ کل ہی ایک قبر کو کھود کر مردے کو نکال کر جلایا گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''مگر کیوں؟ سرفراز نے پھر پوچھا۔
''کہتے ہیں'' اس قبر کے ارد گرد کافی ایریا میں انفیکشن پھیل گیا تھا'' میں نے جواب دیا۔
''لیکن مغرب میں تو لاش کو لکڑی کے تابوت میں رکھ کر دفنایا جاتا ہے اگر میت ویسے ہی زمین میں رکھ دی جائے تو بات کچھ سمجھ میں آتی ہے مگر تابوت سے نکل کر انفیکشن کا پھیلنا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا'' سرفراز نے بے یقینی سے کہا۔
کہیں یہ شخص ایڈز کا مریض تو نہیں تھا جسے غلطی سے دفنا دیا گیا ہو کیونکہ ایڈز کے مریضوں کو یہاں جلایا (Cremate) جاتا ہے سرفراز نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ نہیں یہ شخص کسی اور خطرناک وائرس کا شکار ہوا تھا مگر میت بیرون ملک سے لائے جانے کی وجہ سے وہاں اس وائرس کی تصدیق ٹھیک سے نہیں ہو سکی تھی اور اب قبر کے ارد گرد کافی دور تک انفیکشن پھیلنے کے سبب ہیلتھ اور سیفٹی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسے جلا دیا گیا ہے۔'' میں نے وضاحت کی۔
''کمال ہے یار! حضرت انسان کے نصیب میں چین ہی نہیں اگر منکر نکیر سے بچ گئے تو انفیکشن پیچھے لگ گیا۔'' سرفراز نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

دوسرا خواب

اقبال ڈے پر ایوان اقبال سے دھواں دھار تقاریر سننے کے بعد باہر نکلتے ہوئے میں نے کہا۔

''یار اگر اقبال اس زمانے میں زندہ ہوتے تو اپنے خواب کی تعبیر دیکھ کر کس قدر آزردہ ہوتے۔''

''خدا کا خوف کرو علامہ اگر واپس آ گئے تو کہیں وہ دوسرے خواب کا مژدہ سنا کر ایک اور پاکستان بننے کی پیشن گوئی نہ کر دیں۔ یہاں پہلے ہی ایک نہیں سنبھالا جا رہا تو دوسرے کو کون دیکھے گا۔''

میرے دوست نے تڑپ کر جواب دیا تو میرا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا کہ جیسے ملک چلانے کی ساری ذمہ داری صرف اس کے ناتواں کندھوں پر پڑی ہوئی ہے۔

امتیازی سلوک

''امتیازی سلوک (Discrimination) بھی کئی روپ اختیار کر سکتا ہے۔
میں نے کالج کینٹین میں کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا۔
''کیا مطلب؟'' سہیل مزید وضاحت کی غرض سے میری طرف دیکھنے لگا۔
''سنا ہے کہ آئرلینڈ میں مساوات کمیشن نے ایک بیکری کے کرسچن (کیتھولک) مالک پر ایک جوڑے کے لیے شادی کے موقع پر ایک مخصوص کیک نہ بنانے کے جرم میں پانچ سو پونڈ جرمانہ کر دیا ہے۔''
میں نے جواب دیا۔
وہ ''کیوں؟'' سہیل نے پھر وضاحت چاہی۔
''دراصل یہ جوڑا ہم جنس پرست ہے اور وہ چاہتے تھے کہ کیک پر ہم جنس پرستی کی حمایت میں نعرہ لکھا جائے۔ بیکری کا مالک پختہ مذہبی عقائد رکھتا ہے اور ہم جنس پرستی کے خلاف ہے۔ اس لیے اس نے مخصوص نعرے والا کیک بنانے سے انکار کر دیا۔''
''بڑی ہمت ہے یار۔ کیا کمٹمنٹ ہے'' سہیل نے ستائشی انداز میں جواب دیا
''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مغربی معاشرے میں بھی ہم جنس پرستی (Homosexuality) کے متعلق قوانین بنانے کے باوجود انفرادی سطح پر عوام الناس نے اسے دل سے قبول نہیں کیا۔''
''بالکل'' میں نے جواب دیا'' بلکہ اس بیکری کا مالک تو ہم خیال لوگوں کا ہیرو بن گیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں مساوات کمیشن نے بیکری کے مالک کے ساتھ امتیازی سلوک کیا ہے۔ اس لیے ایک بہت بڑی قانونی فرم نے اس کا مقدمہ کسی قسم کی فیس کے بغیر لڑنے کی پیشکش کی ہے۔''
''زندہ باد۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں''
سہیل نے تقریباً جھومتے ہوئے نعرہ بلند کیا۔

انٹیلیکچوئل

ایک نجی ادبی محفل میں شہر کے چند نامور دانشور اور ادیب کافی دیر سے ایک عجیب سی بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ آج کل لوگوں کو گدھوں اور گھوڑوں کا گوشت کھلایا جا رہا ہے۔ ''کیا یہ جائز ہے؟'' ایک طرف سے آواز آئی۔

''جائز تو بالکل نہیں مگر گدھا اور گھوڑا حرام جانور نہیں ہیں بلکہ مکروہ ہیں۔'' ایک دانشور نے وضاحت کی۔

''سنا ہے کہ شہر میں آوارہ کُتّے اور بلیاں بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید لوگوں کو کباب بنا کر کھلائے جا رہے ہیں۔'' ایک منجھی ہوئی ادیبہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے درفنتنی چھوڑی۔

کسی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہی ادیبہ پھر گویا ہوئیں۔

''بھئی اگر لوگ گدھے، گھوڑے اور کُتّے بلیاں بے خبری میں کھا سکتے ہیں تو ہم انہیں ویسے ہی دوسرے عام گوشت کی طرح کیوں نہیں کھا سکتے؟'' اس میں کیا قباحت ہے؟'' اپنی دانست میں وہ بڑی دور کی کوڑی لائیں۔

ایک باریش عمر رسیدہ ادیب نے تقریباً کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے حرام اور حلال کی وضاحت شروع کر دی کہ قرآن پاک کی سورہ مائدہ میں صراحت سے لکھا ہے کہ کون سے جانور اور پرندے حلال اور حرام ہیں اور کن وجوہات کی بنا پر.....''

کافی دیر تک وہ قرآن کریم کا نقطہ نظر بیان کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن ادیبہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

''لیکن کُتّے کا گوشت کھانا حرام کیوں ہے؟'' اس نے پھر جواب پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔

سوال سن کر میرے علاوہ کئی اور لوگوں کے چہروں پر ناگواری کے تاثرات ابھرے کہ ایک پڑھے لکھے مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے اور پرورش پانے کے باوجود یہ خاتون کیسا جاہلانہ سوال کر رہی ہیں؟ میرے پاس ہی بیٹھی ہوئی ایک کم گو ادیبہ جو کافی دیر سے بحث و مباحثہ سن رہی تھیں۔ چپکے سے کہنے لگیں۔

''لوگوں کو سب پتہ ہوتا ہے یہ جان بوجھ کر انٹیلیکچوئل بننے کے شوق میں اس طرح کے اُلٹے سیدھے سوال کرتے رہتے ہیں۔ بھئی اگر تمہیں کُتّے کا گوشت اتنا ہی پسند ہے تو شوق سے کھاؤ۔ روکا کس نے ہے!''

ریٹرن ٹکٹ

''تم کب سے اسٹیشن پر ریل گاڑی کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہو۔کئی گاڑیاں آئیں اور گزر گئیں مگر تم یہیں براجمان ہو۔ آخر تمہیں جانا کہاں ہے؟''میں نے نہایت مشوش لہجے میں اس سے پوچھا۔

''مجھے خود معلوم نہیں''مرد نے جواب دیا۔

''یہ کیا جواب ہے؟''میں نے پھر کہا۔

''میرے پاس یہی جواب ہے۔''

'''لیکن کیوں؟''تم آخر گھر سے نکل کر اس سرد رات میں اسٹیشن کے بینچ پر کافی دیر سے بیٹھے ہوئے ہو کہیں تو جانا ہوگا؟'' میں نے تقریباً زچ ہو کر کہا۔

''پتہ نہیں''میرے طویل سوال کے جواب میں اس نے بڑی بے نیازی سے مختصر سا جواب دیا۔

اس''پتہ نہیں''کے پیچھے کوئی گہری بات لگتی ہے۔میں نے خود سے کہا اس سرد تاریک رات میں اسٹیشن ماسٹر کی حیثیت سے اسے تنہا چھوڑ کر اپنے گرم کیبن میں جاتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

میں بھی اس کے پاس ہی بینچ پر بیٹھ گیا۔

کافی دیر تک ہم خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتے رہے۔پھر وہ یکا یک بول اٹھا''میرا مسئلہ یہ ہے کہ اسٹیشن پر آنے والے شخص کو اپنی منزل کا پتہ ہوتا ہے مگر مجھے اپنی منزل کی خبر نہیں ہے اس لیے کب سے اسٹیشن پر بیٹھا ہوا ہوں۔''

''تو پھر کسی بھی جگہ کا ٹکٹ خرید کر ریل گاڑی میں سوار ہو جاؤ۔جہاں ریل گاڑی کا آخری اسٹیشن ہوگا وہی تمہاری منزل بن جائے گی۔''میں نے اپنی دانست میں بڑا عالمانہ جواب دیا۔

''مگر ٹکٹ تو میرے پاس موجود ہے کیونکہ میں جہاں سے آیا ہوں وہاں سے ریٹرن ٹکٹ لیے بغیر کوئی نہیں آ سکتا۔''

''دل لگی کر رہے ہو؟''میں نے ہنستے ہوئے کہہ کر سنسان اور تاریک اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بلاوجہ ہی دور تک نظریں جما دیں۔چند لمحوں کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو بینچ خالی پڑا تھا!!!

ٹرانسپلانٹ

شہر کے سب سے بڑے چلڈرن ہسپتال کے میڈیکل روم میں طبی ماہرین کے درمیان بہت زور شور سے بحث جاری ہے۔

''یہ میڈیکل کی اخلاقیات کے بالکل خلاف ہے کہ یہ لوگ اوروں سے تو انسانی اعضا کا عطیہ قبول کرنے پر تیار ہیں مگر خود آرگن ڈونیٹ (Organ Donate) کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کیا یہ خودغرضی نہیں ہے؟

میڈیکل بورڈ کے چیئرمین نے بڑی مایوسی سے کہا۔

اس ہسپتال کی چلڈرن وارڈ میں کچھ عرصے سے دو ایشیائی جڑواں بھائی زیرِ علاج ہیں۔ بورڈ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ایک بھائی کو دوسرے کے دل اور گردے ٹرانسپلانٹ کر کے بچایا جا سکتا ہے کیونکہ دوسرے کی موت یقینی ہے۔

یہاں کی ایشیائی کمیونٹی میں انسانی اعضا کے عطیے کے بارے میں آگہی کا اس قدر فقدان ہے کہ عطیے کے انتظار میں برسوں گزر جاتے ہیں اور مریض ٹرانسپلانٹ کے بغیر ہی موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔

فیملی کا کہنا ہے کہ وہ اسی صورت میں ایک بھائی کے پوسٹ مارٹم کی اجازت دیں گے اگر اس کے دل اور گردے اس کے مرنے کے بعد دوسرے بھائی کو ٹرانسپلانٹ کر دیئے جائیں مگر ہسپتال کا موقف ہے کہ وہ صرف ایک ہی عضو ٹرانسپلانٹ کریں گے جبکہ دوسرا عضو کسی اور بچے کے کام آ جائے گا مگر فیملی اس بات پر رضامند نہیں ہے۔

فیملی کا موقف ہے کہ ان کے مذہب میں انسانی اعضا کا عطیہ کرنے کی اجازت نہیں ہے ہاں اگر یہ اعضا دوسرے بھائی کو ٹرانسپلانٹ کر دیئے جائیں تو پھر ٹھیک ہے میں مذہب کی یہ انوکھی خودساختہ تشریح سن کر سوچ رہی ہوں اگر ہمارے یہی رویے رہے تو کوئی بھی انسانی اعضا کا عطیہ نہیں کرے گا۔ اور مریض سسک سسک کر دم توڑ دیں گے۔

تضحیک

''آزادی رائے ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور اس حق کی اہمیت ایک قلمکار سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔''

برطانیہ میں آج ایک ادبی محفل میں ایک معروف شاعرہ کی کتاب کی رسم اجرا پر ہونے والی ایک ناخوشگوار حرکت کو دیکھ کر میں بددلی سے سوچ رہی ہوں۔

''اگر قلمکاروں میں برداشت کی اس حد تک کمی ہے کہ اپنی مرضی کے خلاف بات سن کر وہ اتنے سیخ پا ہو جائیں کہ دھمکیوں پر اتر آئیں تو پھر ایسے لوگوں کو اپنے قلم توڑ دینے چاہئیں۔''

میں آج کی ادبی محفل میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھی۔ پاکستان سے ایک معروف شاعرہ بھی اتفاقاً کسی دوسری خاتون کے ہمراہ وہاں تشریف لے آئیں۔ تقریب بہت اچھی جا رہی تھی۔ کتاب اور صاحب کتاب کے فن اور شخصیت پر مقالے پڑھے جا رہے تھے جنہیں سب ہی انہماک سے سن رہے تھے کہ ایک خاتون کے مقالے پر پاکستان سے آئی ہوئی شریک محفل شاعرہ بھڑک اٹھیں کہ آپ جس نامور شاعرہ کی نظم کی بات کر رہی ہیں اور اسے فحش ٹھہرا رہی ہیں وہ ان کی سب سے خوبصورت نظم ہے۔ آپ ان کی ''تضحیک'' کر رہی ہیں۔ آپ اپنے الفاظ واپس لیں وگرنہ میں تقریب سے واک آؤٹ کر جاؤں گی۔''

میں سوچنے لگی کہ کون کس کی تضحیک کر رہا ہے؟

یہ ایک ادبی تقریب ہے پاکستان کی پارلیمنٹ نہیں جہاں اپوزیشن بات بات پر واک آؤٹ کر جاتی ہے۔''

دل چاہا کہ کہہ دوں مگر آداب مہمان نوازی نے زبان روکے رکھی۔

گھر واپس آ کر میں کافی دیر تک آج کے واقعے پر غور کرتی رہی۔

ایک قلمکار کے طور پر میں جانتی ہوں کہ جب ایک تحریر دنیائے ادب کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے تو وہ ایک طرح سے پبلک پراپرٹی بن جاتی ہے اب یہ قارئین اور ناقدین پر منحصر ہے کہ وہ اسے کیا معانی پہناتے ہیں اور کس بات کا کیا مطلب اپنے علم، تجربے، شعور و آگہی اور وجدان کے مطابق اخذ کرتے ہیں۔ یہ بات ایک طرح سے لکھنے والے کے دائرہ اختیار سے باہر ہو جاتی ہے کہ قاری اس کا نقطہ نظر من وعن ویسے ہی سمجھے جیسا کہ وہ چاہتا ہو۔

''میرے خیال میں اختلاف رائے کو اگر کسی قسم کی تضحیک پر معمول کیا جائے تو یہ ایک قلمکار کی نہیں بلکہ قلم کی تضحیک ہے۔''

دو تلواریں

''ماں اور بیٹی کا رشتہ تو اٹوٹ ہے جو مر کر بھی نہیں ٹوٹتا۔ مگر بن بیاہی بیٹی اگر بہت دیر تک ماں باپ کے گھر میں بیٹھی رہے تو وہ اپنے انداز سے رہنے سہنے کی متمنی ہوتی ہے جبکہ ماں اپنی راجدھانی تیاگنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ گھر کے نظم و نسق میں بیٹی کی حد سے بڑھی ہوئی مداخلت ماں کو بسا اوقات ناگوار محسوس ہوتی ہے۔ میرے خیال میں یہ وہ وقت ہوتا ہے جب بیٹی کا گھر آباد کر دنیا چاہیے کیونکہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔''

اپنی بیٹی کی ڈائری میں لکھی ہوئی تحریر پڑھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں اور میں نے خاموشی سے ڈائری واپس دراز میں رکھ دی۔

دما دم مست قلندر

؎ چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ
پنجواں بالن آئی آں بھلا جولے لالن دے

لال شہباز قلندر کے مزار پر دھمال ہورہی ہے ایک عالم بےخودی میں لوگ دیوانہ وار رقص کررہے ہیں۔ دما دم مست قلندر.....دما دم مست قلندر

میں پرے کھڑی سوچ رہی ہوں۔

''پاکستان دنیا کی ساتویں جبکہ پہلی اسلامی ایٹمی طاقت ہے۔ عالم اسلام کا قلعہ سمجھا جاتا ہے اسے مگر پچھلے ستر سالوں میں ہم نے اس کے خدوخال خلط ملط کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی یہاں تک کہ ہمارا آدھا نقشہ خلیج فارس میں غرق ہو چکا ہے اور بچے کھچے نقشے کے نقش ونگار بھی پھیکے پڑتے جارہے ہیں۔ اب دھمال ڈالنے والوں کو میرے خیال میں یوں کہنا چاہیے کہ

؎ چار چراغ تیرے بلن ہمیشہ
پنجواں دتا اے اساں آپ بجھا جھولے لالن دے
سنڈری دا ، سہون دا، سخی شہباز قلندر
دم دما دم مست قلندر!!!

امیر غریب

زمانہ طالب علمی میں ہمیں ایک مضمون لکھنے کو دیا گیا موضوع تھا۔

''پاکستان ایک امیر ملک ہے مگر یہاں غریب لوگ بستے ہیں۔''

خیر اس وقت تو موضوع کی گہرائی کا اندازہ ٹھیک سے نہ ہو سکا مگر برسوں بعد غور کرنا شروع کیا تو سمجھ آئی کہ ''پاکستان صرف امیر لوگوں کے لیے ہی امیر ملک ہے وگرنہ نان جویں کو ترستے ہوئے غریب لوگوں کے لیے تو یہ ملک ہمیشہ سے ہی غریب رہا ہے کیونکہ

؎ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

نعت گوئی

ایک مولانا نما شاعر شہر میں ہر سال بڑے اہتمام سے نعتیہ مشاعرے کا اہتمام کرتے ہیں ہمیں بھی دعوت کلام دیتے ہیں مگر ہم ہر بار شامل ہونے سے معذرت کر لیتے ہیں۔

''آخر کیا وجہ ہے کہ آپ ہمارے نعتیہ مشاعرے میں شرکت نہیں کرتیں؟''

ایک دن مولانا صاحب خاصے جز بز ہو کر بولے:

''دراصل میں نے آج تک نعت نہیں لکھی۔''

میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''مگر کیوں؟'' مولانا جیسے باقاعدہ بحث پر اتر آئے تھے۔

''بس اللہ کا کرم نہیں ہوا کہ میں گنہ گار نعت لکھ سکوں۔'' میں نے عجز سے جواب دیا۔

''آپ نے ایسے کون سے گناہ کر لیے ہیں کہ نعت نہیں لکھ سکتیں۔''

میں ابھی ان کے اس بیان کا جواب دینے کا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ پھر گویا ہوئے۔

''ویسے نعت لکھنا کونسی بڑی بات ہے کچھ نئی پرانی نعتیں نکال کر سامنے رکھیں، ردیف، قافیے، ذرا آگے پیچھے کریں الفاظ کی بندش قدرے تبدیل کر دیں بس نعت ہو گئی۔''

میں مولانا کے اس ریڈی میڈ قسم کی نعت گوئی کے مشورے پر حیرانی سے ان کا منہ تکنے لگتی ہوں۔

دل سے ایک احتجاجی صدا بلند ہوتی ہے ''مولانا صاحب ایسی نعت گوئی آپ کو ہی مبارک ہو۔''

بابا چُھو

نوبل انعام یافتہ ادیب رابندر ناتھ ٹیگور کا مشہور افسانہ ''کابلی والا'' پڑھتے ہوئے آج مجھے بچپن میں دیکھا ہوا ایک افغانی بوڑھا بڑی شدت سے یاد آیا۔

ڈھیلا ڈھالا روایتی افغانی لباس اس پر بڑی سی اونی ٹوپی پہنے، کندھے پر ایک تھیلا لٹکائے وہ ہمیشہ سردیوں میں ہی ہمارے محلے میں آیا کرتا تھا۔

ہمیں ہمیشہ ہی یہ تجسس رہتا تھا کہ اس کے بڑے سے تھیلے میں کیا تھا۔ گھر والوں نے بہت سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کسی ایسے شخص سے بات نہیں کرنی کیونکہ یہ بچوں کو اغوا کر کے علاقہ غیر میں بردہ فروشوں کے پاس بیچ دیتے ہیں۔ خرکار کیمپوں میں ان بچوں سے سخت محنت مشقت کروائی جاتی ہے اور کچھ کے تو ہاتھ پاؤں توڑ کر اپاہج بنا کر ان سے بھیک منگوائی جاتی ہے۔

ان معلومات کی موجودگی میں ہمارا بابا سے ڈرنا ایک فطری بات تھی لیکن گھر والوں کی نظر بچا کر ہم اپنے فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر بھی بابا سے پوچھتے رہے تھے کہ اس کے بڑے سے تھیلے میں کیا تھا؟

بابا ہماری بات سن کر مسکراتا رہتا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر تھیلے کے اندر ہاتھ ڈالتا اور پھر ہم پر پھونک مار دیا کرتا تھا اس لیے ہم سب نے اسے بابا ''چُھو'' کہنا شروع کر دیا تھا جس پر وہ بہت مسرور ہوتا تھا شاید اپنا نیا نام اسے بھی پسند آ گیا تھا۔

بابا چُھو کے تھیلے کے اندر چھپے ہوئے خزانے کے بارے میں جاننے کا تجسس ایک دن یوں ختم ہوا کہ وہ ایک روز لڑکھڑا کر گلی میں گر گیا۔ آناً فاناً سارا محلہ بابا کی تیمارداری میں لگ گیا مگر بابا تو ہم سب کو چھوڑ کر بہت دور جا چکا تھا۔

بابا کے تھیلے کی تلاشی لی گئی تو پتہ چلا کہ اس کا کل اثاثہ ایک قرآن پاک، تسبیح اور نادیدہ دعاؤں کے سوا کچھ نہیں تھا جو وہ محبت سے بچوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا۔

ریموٹ کنٹرول

''یہ ریموٹ کنٹرول کئی دنوں سے ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔ پتہ نہیں کیا افتاد آن پڑی ہے اس پر''۔ میں نے بیزاری سے ریموٹ کنٹرول کو قالین پر پھینکتے ہوئے کہا۔

''آپا! یہ ریموٹ کنٹرول آپ سے چلنے سے رہا'' پاس ہی بیٹھی رسالے کی ورق گردانی کرتی ہوئی گڑیا نے جملہ اچھالا۔

''مگر کیوں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے گڑیا کی طرف دیکھا تو وہ انجان بنی رسالے پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے پھر سوال داغا۔ ''اگر تمہیں معلوم ہے کہ اس میں کیا خرابی ہے تو پھر ٹھیک کر دو۔''

''میری بات پر وہ خلاف توقع دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ناں بھئی ناں۔ میری کیا مجال کہ میں آپ کے ریموٹ کنٹرول کو ٹھیک کروں۔''

میں نے کچھ نا سمجھتے ہوئے پھر کہا۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟ پہیلیاں مت بجھواؤ۔ اگر ٹی وی آن کرنے میں میری مدد کر سکتی ہو تو کرو ورنہ اپنے کام سے کام رکھو'' میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا تو گڑیا ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''آپا، شوہر اور ٹی وی دونوں ہی ریموٹ کنٹرول سے چلتے ہیں۔ لیکن دلہا بھائی کا ریموٹ کنٹرول آپ کے نہیں ان کی اماں کے ہاتھ میں ہے تو ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول بھی ذرا اماں کے ہاتھ میں پکڑا کر دیکھئے تو ٹی وی چلنے تو کیا دوڑنے لگے گا۔''

یہ کہہ کر گڑیا نے زبردست قہقہہ ہوا میں اچھال دیا تو میں شرمندہ شرمندہ سی زمین پر پڑے ریموٹ کنٹرول کو گھورنے لگی۔

دائروں کا سفر

ہر پھر کے دائرے میں ہی رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

آج ناسخ کا شعر پڑھتے ہوئے مجھے کیتھرین جسے سب پیار سے کیتھی کہا کرتے تھے بری طرح یاد آئی۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ ہر سفر کا اختتام ایک دوسرے سفر کا نقطہ آغاز بنتا ہے۔ مگر دائروں کا سفر کبھی کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچتا کیونکہ رنڈی کے چکلے کی طرح یہ مستقل ایک دائرے میں چک پھیریاں لگاتا ہوا جسم وجاں کی دھنائی کرتا رہتا ہے۔

آج سے کافی عرصہ پہلے جب میری ملاقات کیتھی سے ایک فوسٹر ہوم میں ہوئی تو وہ بھی دائروں کے بھنور میں چک پھیریاں لگا رہی تھی۔

لگتا تھا آٹھ سالہ کیتھی نے ایک جست میں ہی بچپن سے جوانی کی حدود میں قدم رکھ دیا تھا۔ وقت سے پہلے ہی جنسی شعور کی پختگی نہ صرف اس کے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔

وہ جہاں کہیں اپنے سے چھوٹے بچوں کو اکیلا دیکھتی تو ان کے ساتھ جنسی چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتی۔ آئے روز سکول سے شکایت آتی تو کبھی فوسٹر ہوم میں دوسرے بچوں کے ساتھ وہ نازیبا حرکات کرتی ہوئی پائی جاتی۔

سکول ٹیچرز، فوسٹر ہوم، سوشل ورکر، سائیکاٹرسٹ سب ہی کیتھی کے روز بروز دگرگوں جنسی رویے سے پریشان تھے۔

دراصل کیتھی کی زندگی کے ابتدائی ایام بڑے قابل رحم تھے۔ کیتھی ابھی دو برس سے بھی کم تھی کہ اس کی ماں جو نشے کی لت کا شکار تھی اسے باپ کے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔ باپ شراب کا عادی تھا اور اکثر و بیشتر فلیٹ میں شراب پی کر پڑا رہتا۔ باپ کے کئی شرابی دوست وہاں آتے جاتے رہتے تھے معلوم نہیں کب کس نے اس کلی کو وقت سے بہت پہلے ہی پھول بنا کر ان جنسی لذتوں سے آشنا کر دیا جنہوں نے اس کے معصوم بچپن کو نگل لیا۔

کافی غور وخوص کے بعد کیتھی کا باقاعدہ ٹریٹمنٹ شروع ہو چکا تھا اسی لیے اس فوسٹر ہوم میں کسی اور بچے کو رکھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ تاکہ کیتھی کو کوئی ایسی آپر چیونٹی نہ مل سکے جس سے وہ اپنے کسی جنسی خیال کو عملی جامہ پہنا سکے۔

چند دن خیریت سے گزرتے مگر سکول سے پھر شکایت آجاتی کہ کیتھی پلے گراؤنڈ میں بچوں کے ساتھ نازیبا جنسی حرکات

کرتی ہوئی پائی گئی ہے جس سے دوسرے والدین بہت برہم ہیں۔ اب گھر کے علاوہ سکول میں بھی کیتھی کو ون ٹو ون مدد کی ضرورت تھی اتنی سخت محنت کے باوجود کیتھی Relapse کر جاتی تھی اور پھر کسی نہ کسی طرح سے اپنے نازیبا جنسی رویے کا مظاہرہ کرنے لگتی جس سے فوسٹر ہوم والے بے حد پریشان رہتے تھے کیونکہ ان کے خاندان کے کئی دوسرے بچے گھر میں گاہے بگاہے آتے رہتے تھے جن کی انہیں کڑی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔

کوئی چھ ماہ اس کیس میں سوشل ورکر کے طور پر کام کرنے کے بعد میرا تبادلہ ایک دوسری جگہ ہو گیا تو کیتھی سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔

آج برسوں بعد مجھے اچانک کیتھی کی یاد آ گئی ہے اور میں سوچنے لگی ہوں کہ کیتھی اب تو جوان ہو گئی ہو گی۔ مگر دائرہ در دائرہ زندگی کے دائروں کو کیا وہ کھول پائی ہو گی؟ کیونکہ یہ ایک ایسا چکرویو ہے جو اس میں گھر جائے وہ مشکل سے ہی راستہ تلاش کر کے باہر نکل پاتا ہے۔

تکون

انگریزی زبان کا مشہور مقولہ ہے:

"Two is company but three is crowd."

میاں بیوی کے مقدس جوڑے میں اگر کوئی تیسرا شخص شامل ہو جائے تو یہ تکون اس رشتے کو کچھ یوں نگل لیتی ہے کہ یہ ایک خطِ مستقیم میں تبدیل ہو کر میلوں تک پھیل جاتی ہے جس کے ایک سرے پر میاں اور دوسرے پر بیوی نظر آتی ہے جبکہ درمیان میں کچھ نہیں بچتا۔

زبان

آج اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو کے زیر اہتمام مادری زبانوں کا عالمی دن یعنی World Language Day کافی جوش وخروش سے منایا جارہا ہے۔

صبح سے ہی ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن مادری زبانوں کی اہمیت اور ناپید ہوتی ہوئی زبانوں کے بچاؤ پر کافی معلوماتی پروگرام پیش کررہے ہیں جنہیں میں خاصے ذوق وشوق سے دیکھ رہی ہوں۔

ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں بتایا جارہا ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں 6912 زبانیں بولی جاتی ہیں صرف پاکستان میں ہی 74 زبانیں مختلف لہجوں کے ساتھ بولی جارہی ہیں۔

دنیا بھر میں 36 زبانیں ناپید ہونے کے خطرے سے دوچار ہیں یا تقریباً ناپید ہوچکی ہیں جن میں سے صرف پاکستان میں 28 زبانوں کی بقا کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ پروگرام دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگتی ہوں کہ ہم دنیا بھر میں ناپید ہونے والی زبانوں کی بقا کے لیے کس قدر فکر مند ہیں جبکہ ہمارے منہ میں چھٹانک بھر کی زبان ہمارے قابو میں نہیں ہے یہ جب زخم لگانے پر آتی ہے تو یہ تلوار کے زخم سے زیادہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ زبان کے صحیح استعمال کی فکر ہم نہیں کرتے حالانکہ زبان کی بے احتیاطی دنیا اور آخرت میں تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔

تعزیہ

یوں تو اس چھوٹے سے شہر کے صدر بازار میں سے کئی چھوٹی بڑی، تنگ اور کشادہ گلیاں نکلتی تھیں مگر ان میں سے ایک گلی ایسی تھی جہاں تقریباً سارا سال ہی گہما گہمی رہا کرتی تھی۔

دراصل اس گہما گہمی کی بڑی وجہ اس گلی میں شہر کے مرکزی امام باڑے کا ہونا تھا جس میں محرم الحرام کے علاوہ بھی اکثر و بیشتر اعزاداری کی مجالس برپا ہوتی رہتی تھیں یہ گلی عموماً ''تعزیے والی'' گلی کے نام سے مشہور تھی۔

گلی میں داخل ہوتے ہی دونوں اطراف کئی قسم کی چھوٹی بڑی دکانیں تھیں۔ کچھ آگے جا کر گلی قدرے چوڑی ہو جاتی تھی اور وہاں سے دائیں بائیں دو گلیاں نکلتی تھیں۔ انہی گلیوں میں سے دائیں طرف کی گلی کے شروع میں امام باڑہ تھا۔ جبکہ بائیں جانب کی گلی میں اہل تشیع کے چند بڑے بڑے مکانات تھے جن میں خاص طور پر محرم کے دنوں میں اعزاداری کی مجالس کا بھرپور اہتمام کیا جاتا تھا۔

اسی گلی میں ذرا آگے جا کر لڑکیوں کے سکول کا عقبی دروازہ تھا جہاں سے لڑکیاں چھوٹے بڑے گروہوں کی شکل میں خوش گپیاں کرتی ہوئی سکول آتی جاتی تھیں۔ گلی میں داخل ہوتے ہی عین سامنے ایک بہت بڑی کریانے کی دکان تھی۔ ویسے تو اس دکان میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی بس شہر میں کریانے کی دوسری دکانوں جیسی ہی تھی مگر اس دکان کے محل وقوع نے اسے ایک مرکزی حیثیت دے رکھی تھی۔

امام باڑے میں آنے جانے والوں کے علاوہ لڑکیاں بھی سکول سے آتے جاتے ہوئے اکثر دکان سے کھانے پینے کی چھوٹی موٹی چیزیں خریدا کرتی تھیں۔

لیکن نوجوان لڑکیوں میں اس دکان کی وجۂ شہرت اس کا ادھیڑ عمر ٹھر کی مالک تھا جو لڑکیوں کو ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا اور سب کی آنکھ بچا کر کبھی تو ایک آنکھ حرامی پن سے میچ لیتا یا پھر گاہے بگاہے ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہتا تھا۔

زیادہ تیز طرار لڑکیاں تو اس کی نگاہوں کی تپش کو کچھ نہ کچھ سہتے ہوئے بچی رہتی تھیں مگر سادہ قسم کی لڑکیوں کے ساتھ وہ اکثر و بیشتر اپنے ٹھر کی پن کی تسکین یوں کرتا کہ کبھی تو سودا سلف پکڑاتے یا پھر ریزگاری لیتے دیتے وقت ان کے کومل کومل جوان ہاتھوں کو اتنی زور سے مسلتا کہ وہ بیچاری صرف سی کر کے رہ جاتیں۔ اس پر اس کی ہمت کچھ اور بڑھتی تو وہ اپنی ہوس پرست انگلی سے ان کی ہتھیلی پر

بڑے معنی خیز انداز میں گول گول دائرے بنانے لگتا۔

بھولی بھالی لڑکیاں کچھ نہ سہتے ہوئے احتجاجاً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتیں تو اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔

ایک روز تو اس نے تہذیب و شائستگی کی تمام حدود کچھ اس طرح پھلانگ ڈالیں کہ لڑکیوں میں گویا ماتم بپا ہو گیا۔

کیونکہ آج وہ اپنی دھوتی کا ایک کونہ قدرے سرکا کر اس انداز میں بیٹھا ہوا تھا کہ بے وقت کا ایک اور ''تعزیہ'' نظر آ رہا تھا۔

راکھا

گاؤں کے کچے پکے مکانوں کے آخری سرے پر جہاں سے کھیت کھلیان شروع ہو جاتے تھے اس بوڑھے راکھے کی چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔

یہ بوڑھا کافی عرصے سے نمبردار کے کھیتوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس کا اصل نام تو معلوم نہیں مگر سب اسے ''راکھا'' کہتے تھے۔

اس کی جھونپڑی کا کچا صحن کافی بڑا تھا۔ جہاں اکثر شام کے وقت گاؤں کے بچے بچیاں مختلف کھیل کھیلتے نظر آتے تھے۔

جھونپڑی کے اندر لکڑی کے بڑے سے شہتیر کے ساتھ بوڑھے راکھے نے دو جھولے ڈال رکھے تھے۔ چند قدرے بڑی عمر کی لڑکیاں راکھے کی منظور نظر تھیں۔ جنہیں وہ گاہے بگاہے جھونپڑی کے اندر بلا کر جھولے جھلایا کرتا تھا۔ جھونپڑی کے اندرونی معاملات سے بے خبر دوسرے بچے باہر کھیل کود میں مصروف رہتے جبکہ اندر بوڑھا راکھا بچیوں کی حفاظت کرنے میں لگا رہتا تھا۔

راکھے کی خباثت کا پردہ ایک دن یوں چاک ہوا کہ ایک لڑکی جھونپڑی کے اندر سے زار و قطار روتی ہوئی نکلی۔ بوڑھے راکھے نے اسے بہلا پھسلا کر چپ کرانے کی بہت کوشش کی مگر وہ کسی طرح چپ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ روتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر سب بچے کھیل کود چھوڑ کر اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔

دفعتاً ایک بچہ چلّایا ''وہ دیکھو اس کی قمیض پر خون لگا ہے۔'' ''تمہیں چوٹ لگی ہے کیا جو خون نکل آیا؟'' دوسرا بچہ بولا جس پر وہ لڑکی اور زور زور سے رونے لگی کیونکہ ''راکھے'' نے آج اسے وہ زخم لگایا تھا جس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔

انوکھی بچت

کمرے میں قدم رکھتے ہی بہت ناگوار قسم کی بو نے میرا استقبال کیا۔

بوسیدہ فرنیچر۔ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا غلیظ کارپٹ۔ ادھ ٹنگے میلے کچیلے پردے اور کافی سرد کمرے میں زمین پر بیٹھے ہوئے تین بچے جو کھلونوں کی غیر موجودگی میں ایک دوسرے کو ہی شاید کھلونا سمجھ کر آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

بحیثیت سوشل ورکر یہ کیس حال ہی میں مجھے دیا گیا تھا اور فیملی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

سوشل سروسز والے سمجھتے تھے کہ یہ ایک سنگل پیرنٹ فیملی ہے جبکہ خاتون نے بتایا کہ وہ سنگل پیرنٹ نہیں ہے بلکہ اس کا خاوند چند ماہ کے لیے پاکستان گیا ہوا ہے ''پتہ نہیں کیوں سوشل سروس والے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔'' خاتون نے جز بز ہوتے ہوئے کہا میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی اسسمنٹ (Assessment) مکمل کرنے کے لیے تمام گھر کو ایک نظر دیکھنے کی اجازت چاہی جو خاتون نے بادل نخواستہ دے دی مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سوشل ورکر کو دخل در معقولات خیال کرتی تھی۔

کچن میں ایک کوکنگ پین میں جلا ہوا دلیہ پڑا تھا جلے ہوئے دودھ کی بو بہت ناگوار تھی۔ میں نے خاتون سے کچن کی کھڑکی کھولنے کے لیے کہا تا کہ کچھ تازہ ہوا اندر آ سکے وگرنہ تو کچن میں کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا۔

فریج کھولی تو اس میں سوائے ایک دودھ کی بوتل اور آدھی ڈبل روٹی کے اور کچھ نہیں تھا۔

''تم شاپنگ نہیں کرتیں بچوں کے کھانے پینے کے لیے کچن میں تو ان کے کھانے والی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی؟'' میں نے خاتون سے سیدھا سپاٹ سوال کیا تو وہ کافی دیر جواب دیئے بغیر خاموش کھڑی رہی۔ میرے دوبارہ پوچھنے پر بولی۔

''میرے خاوند نے کہا تھا کہ سوشل سکیورٹی کے سارے پیسے خرچ نہ کر دینا بلکہ بچت کرنا''

اس کے اس بے تکے جواب پر میں نے قدرے درشتگی سے اُسے کہا۔

''گھر میں بچوں کے کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں ہے اور تمہیں پیسے بچانے کی پڑی ہوئی ہے۔ تمہیں یہ پیسے بچوں کے خرچ اخراجات کے لیے ملتے ہیں بچت کرنے کے لیے نہیں۔ ان کی ضرورت پوری کرنے کے بعد جو بچتا ہے ضرور بچاؤ۔''

''میں نے اگر بچت نہ کی تو میرا خاوند واپس آ کر بہت غصہ ہوگا اور مار پیٹ کرے گا۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''لیکن اگر بچوں کو اس طرح سے رکھا تو سوشل سروسز والے انہیں نیگلکٹ کیس (Neglect Case) بنا کر فوسٹر فیملی کے حوالے کر دیں گے۔ پھر کرتی رہنا اپنی انوکھی بچت۔'' میں نے غصے سے جواب دیا تو وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ تکنے لگی۔

مجذوب

گھر بھر میں مجذوب بابا کا چرچا بہت کثرت سے ہوتا رہتا تھا لیکن میں نے بابا کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں باقاعدگی سے بابا کو سلام کرنے جایا کرتی تھیں مگر بچوں کو اپنے ساتھ کبھی لیکر نہیں جاتی تھیں۔

مجذوب بابا کو دیکھنے کی خواہش کچھ عرصے سے میرے دل میں بڑی شدت سے مچلنے لگی تھی۔ پھر ایسا سبب ایک دن بنا کہ بڑی پھوپھو اور اماں جو بابا کے سلام کو جارہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

برگد کے بہت بڑے درخت کے نیچے لوگوں کا ایک ہجوم تھا کچھ لوگ کھڑے تھے تو کچھ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ٹولیوں میں چلے آرہے تھے تو کچھ پانی کے گھڑے بھر بھر کر کچی زمین پر انڈیل رہے تھے۔ مجھے بھی اماں نے پاس کے رہٹ سے پانی کا گھڑا بھر کر زمین پر ڈالنے کو کہا۔ اوروں کی دیکھا دیکھی میں بھی بغیر کچھ سوچے سمجھے خوشی خوشی پانی کے گھڑے بھر بھر کر زمین کے ایک مخصوص حصے پر ڈالنے لگی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہاں اس قدر پانی ڈالنے کے باوجود زمین جلد ہی خشک ہوجاتی تھی۔

منت کے گھڑے بھرنے کے بعد ہمیں بابا تک رسائی کا اشارہ ملا میں شوقِ تجسس میں پھوپھو اور اماں کے آگے آگے تیزی سے چلتی ہوئی بے دھڑک بابا کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

بابا ایک ننگی کھاٹ پر بیٹھے ہوتے تھے۔ جسم پر سیاہ کھال سوکھ کر جیسے چمڑا بن چکی تھی۔ کھاٹ کی طرح بابا بھی کپڑوں سے بے نیاز تھے لیکن وہ اس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کا ستر ظاہر نہیں ہورہا تھا۔ میں کچھ دیر کھڑی ٹکٹکی باندھے بابا کو دیکھتی رہی پھر کسی نے مجھے پیچھے سے ٹہوکا دیا کہ بابا کو سلام کرو۔ میں نے دل میں سوچا کہ ''بابا تو کسی کے سلام کا جواب ہی نہیں دے رہے بس سر جھکائے چارپائی پر خاموشی سے بیٹھے ہیں تو میں کیا سلام کروں؟'' اسی شش و پنج میں جھجکتے ہوئے میں چارپائی کے قریب چلی گئی اور بابا کو سلام کیا، خلافِ توقع بابا نے اس بار ہاتھ اٹھا کر بلند آواز سے کہا ''امر ہوجائیں گے بچہ امر ہوجائیں گے۔''

میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے واپس پلٹی تو پھوپھو اور اماں بہت خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

''تو بڑی بختاور ہے بابا نے تم سے بات کی وگرنہ تو بابا مہینوں ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتے۔'' اماں کہہ رہی تھیں۔

آج جبکہ زندگی کے سفر کا تقریباً آخری پڑاؤ آن پہنچا ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو بابا کی بات ذہن کے کسی گوشے میں گونجنے لگتی ہے۔ ایک آسودہ حال زندگی عزت، دولت، شہرت سب ہی سے مالک نے دل کھول کر نوازا تو سوچتی ہوں کہ کیا مجذوب بابا کی نگاہوں نے تقدیر کا لکھا پڑھ لیا تھا؟

ٹیں

''ٹیں طوطے کی وہ آواز ہے جو دفعتاً بلی کے دبا لینے سے اس کے حلق سے نکلتی ہے۔''

''طوطے کے علاوہ میں نے یہ آواز نوجوان لڑکیوں کے حلق سے نکلتے ہوئے بھی سنی ہے کیونکہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے جب انسانی بلے اچانک جھپٹا مار کر بے خبر شکار پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ''ٹیں'' کے علاوہ اور کوئی آواز ان کے حلق سے مشکل سے ہی نکلتی ہے۔''

شاخ پر کافی دیر سے بیٹھے ہوئے بوڑھے اُلّو نے افسردگی سے کہا۔

گولڈن آپر چیونٹی

مقامی ایشیائی کمیونٹی ریڈیو پر کئی دنوں سے بالی وڈ ہیروئن کے آڈیشن کا اشتہار آ رہا تھا۔ اشتہار کیا ایک ڈوئٹ گانا تھا۔ مرد خاموش ہوتا تو عورت بول پڑتی۔

''زندگی میں ایسا سنہری موقعہ پھر نہ ملے گا۔
گولڈن آپر چیونٹی۔
ایک ہی جست میں ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی سر کر لیں۔
آیئے نصیب آزمایئے۔
مدھو بالاؤں اور مینا کماریوں کا زمانہ گیا۔
اب قسمت کی دیوی آپ کی منتظر ہے۔
آپ کی قسمت کے بند تالے کی چابی ہمارے پاس ہے۔
آیئے اپنے حسن کی داد پایئے۔
ادائیں کیش کروایئے۔
بالی وڈ کی ہیروئن بن جایئے۔''

''عورت تو پیدائشی فن کار ہے کیونکہ وہ قدرتی تخلیق کار ہے اسے کسی ہالی وڈ یا بالی وڈ سے کوئی گولڈن آپر چیونٹی نہیں چاہیے۔''

میں نے فخر سے سوچتے ہوئے ریڈیو آف کر دیا۔

کیلے

گرلز ہاسٹل کے کمروں کے باہر پڑے کوڑا دانوں میں سے کچرا نکالتے ہوئے جمعدارنی بڑی بیزاری سے کہہ رہی تھی۔

''یہ لڑکیاں اتنے کیلے کوڑا دانوں میں کیوں پھینک دیتی ہیں؟ غریب کو تو پھل فروٹ سونگھنے کو نہیں ملتا اور یہاں جب دیکھو مسلے کچلے ہوئے کیلے کچرے میں پڑے رہتے ہیں۔''

ذرا رک کر بوڑھی جمعدارنی پھر بولنے لگی۔

''آخر یہ ان کیلوں کا کرتی کیا ہیں جو ان کی یہ درگت بن جاتی ہے؟''

پاس ہی کھڑی نوجوان جمعدارنی نے بڑے معنی خیز انداز میں جواب دیا ''یہ تو تم ان لڑکیوں سے ہی پوچھو کہ کھانے کے علاوہ کیلے اور کس کام۔۔۔۔''

فقرہ ادھورا ہی چھوڑ کر وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگتی ہے اور بوڑھی جمعدارنی کچھ نہ سمجھتے ہوئے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔

شریف

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے؟

مگر میرا ماننا ہے کہ نام میں کچھ نہ کچھ تو ضرور رکھا ہے کیونکہ بہت سے اچھے ناموں کے پیچھے مکروہ چہرے چھپے ہوتے ہیں جس سے سادہ لوح لوگ آسانی سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔یعنی نام تو شریف اور کرتوتیں بدمعاشوں والی۔

رات گئے دروازے پر دستک ہوئی تو میں سوچ میں پڑ گئی کہ یہ اس وقت کون ہوسکتا ہے کیونکہ آپا اور دولہا بھائی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے اور اگلے دن گھر لوٹنے والے تھے اور میں گھر پر اکیلی تھی۔

دروازے پر جا کر پتہ چلا کہ آپا کے دیور لاہور سے آئے ہیں اور آج رات یہاں ہی رکیں گے۔مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق میں نے بادل نخواستہ انہیں اندر آنے کا کہا اور ساتھ ہی انہیں بتا دیا کہ آپا اور دلہا بھائی گھر پر نہیں ہیں مگر انہوں نے میری بات سنی اَن سنی کر دی۔

رات کے کسی پہر سوتے میں اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی مجھ پر جھکا ہوا ہے گرم گرم سانسوں کے چہرے کو چھوتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

اتنے میں آپا کے دیور کی آواز سنائی دی۔''مجھے لگتا ہے تم نیند میں ڈر گئی تھیں اس لیے میں تمہیں دیکھنے کے لیے آ گیا۔ سو جاؤ.....سو جاؤ''اتنا کہہ کر فوراً وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گئے۔

ان کے نکلتے ہی میں نے کمرے کی چٹخنی چڑھا دی جو میں رات کو شاید لگانا بھول گئی تھی۔

بقیہ رات میں نے خوف کے مارے بستر میں جاگ کر گزاری۔صبح ڈرتے ڈرتے اٹھی تو گھر میں''شریف بھیا'' کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔لگتا تھا کہ شرمندگی سے بچنے کے لیے وہ علی الصبح بغیر کچھ بتائے ہی گھر سے چلے گئے تھے۔

کبڑا عاشق

اس کی عمر تو شاید کچھ بہت زیادہ نہیں تھی مگر اپنے حال حلیے سے وہ کسی بوڑھے سے کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے محلے کے آخر میں کوچہ بندی ہو جاتی تھی۔ جہاں وہ ایک چھوٹے سے مکان میں کافی عرصے سے اکیلا ہی رہ رہا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کو ویسے کچھ زیادہ معلومات بھی نہیں تھیں کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی دوسروں سے میل ملاقات سے احتراز کرتا تھا۔

اس چھوٹے سے شہر کی مرکزی سڑک سے ایک بہت تنگ سی گلی نکلتی تھی۔ یہ گلی اتنی تنگ تھی کہ بیک وقت دو لوگ وہاں سے بآسانی نہیں گزر سکتے تھے۔ یہ گلی اس کے گھر کو جانے والا شارٹ کٹ راستہ تھا اس لیے وہ اکثر ہی اس گلی سے گزرتا تھا۔ اس کی کمر کافی جھکی ہوئی تھی اور پشت پر اونٹ کے کوہان کی طرح کا ابھار تھا جو اسے بہت بدصورت بنا دیتا تھا۔ وجود کو سنبھالا دیتے ہوئے جب وہ تنگ گلی میں سے گزرتا تو اس کے بازو دائیں بائیں کے مکانوں کی دیواروں سے رگڑ کھا جاتے تھے جس سے اس کے بازوؤں پر کئی چھوٹے بڑے زخم آ چکے تھے۔

اسے دیکھ کر مجھے پیرس کے ناٹرا ڈیم چرچ میں گھنٹی بجانے والا کبڑا شخص (Hunch back of Notre dame) یاد آ جاتا تھا۔ اس کی ماں نے اس کی بدصورتی کو دیکھتے ہوئے کیا اسے بھی بچپن میں دھتکار دیا تھا جبھی تو وہ اکیلا ہی رہ رہا تھا۔ میں جب سوچتی تو میرا دل رحم کے جذبے سے لبریز ہو کر کبھی کبھار آنکھوں سے چھلک پڑتا تھا۔

ایک دن گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر تھی سب لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے اسی لیے پورا محلہ سنسان پڑا تھا۔ ایسے میں کوچہ بندی میں سے کسی عورت کے غصے میں چلانے کی آوازیں آنے لگیں، پل بھر میں ہی لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر کوچہ بندی کی طرف تقریباً بھاگتے ہوئے جانے لگے۔ محلے کی نوجوان جمعدارنی بوڑھے کوبڑے سے جھاڑو سے بری طرح پیٹ رہی تھی اور خاص طور پر اس کے پشت کے ابھار پر بغیر کسی وقفے کے جھاڑو سے تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی۔

''تیرے عشق کا بھوت آج میں نکالتی ہوں۔ تیری یہ کبڑی کمر آج میں نے مار مار کر سیدھی نہ کر دی تو میرا نام شیدو نہیں۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے خود کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا لیکن جمعدارنی اسے کسی طرح بخشنے پر تیار نہ تھی۔

لوگوں نے جا کر بیچ بچاؤ کروایا تو پتہ چلا کہ وہ اپنی نفسانی خواہش کی تسکین کے لیے جمعدارنی کو بہلانے پھسلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس پر وہ غصے سے بے قابو ہو گئی تھی۔

''بڑا عاشق ___ مردود کہیں کا۔ اپنا آپ نہیں دیکھتا ___ چلا ہے عشق کرنے۔'' جمعدارنی نے جاتے جاتے ایک زوردار لات اس کی کمر پر اس طرح رسید کی کہ وہ درد کی شدت سے بلبلا اُٹھا۔

نیولا

اس گلی کے بیشتر پختہ دومنزلہ مکان یہاں کے مکینوں کی خوشحالی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔گلی کی نکڑ پر واقع مکان خاصا بڑا تھا اوراکثر گرمیوں کی دوپہر میں محلے کے بچے وہاں کی بڑی سی بیٹھک میں کئی کھیل کھیلتے رہتے تھے۔

اس گھر کے مکین دونوجوان میاں بیوی تھے جو خاصے تیز طرار تھے۔ان کی تین بیٹیاں تھیں سب سے بڑی بیٹی میری ہم عمر تھی اور ہم دونوں پرائمری سکول میں ہم جماعت تھیں۔

بچوں کی اس گھر میں دل چسپی کی اصل وجہ یہاں پنجروں میں بند رنگ برنگے پرندے تھے۔خاص طور پر باتیں کرنے والے میاں مٹھو میں تو بچوں کی جان تھی۔

اس گھر میں اکثر نئے نئے پرندے اور پالتو جانور لائے جاتے تھے۔پچھلے ہی ہفتے خرگوشوں کا خوبصورت جوڑا بچوں کا مرکز نگاہ بنا ہوا تھا کچھ عرصہ پہلے بچے خوبصورت ایرانی بلی کو دیکھ کر نہال ہوئے جارہے تھے۔

آج پھر بیٹھک میں خاصا شور تھا۔بچوں کے ہاتھ ایک دلچسپ کھیل آ گیا تھا۔دراصل آج یہاں ایک نیولا لایا گیا تھا جو نہایت پھرتی سے بڑے سے کمرے کے چاروں کونوں میں یوں چکر لگا رہا تھا کہ بچے اسے پکڑنے کی کوشش میں بے دم ہوئے جارہے تھے۔اس کی نرم ملائم جلد ان کے ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتی تھی اور بار بار نیولا بچوں کے ہاتھ آتا آتا رہ جاتا تھا۔

پاس ہی پڑی چارپائی پر چودھری ٹانگیں پسارے تہبند کو کافی اونچا اٹھائے ہوئے تھا جس سے اس کی تقریباً آدھی سے زیادہ ٹانگیں ننگی ہورہی تھی۔

چودھری کن اکھیوں سے بچوں کو دیکھتے ہوئے ان کے کھیل سے لطف اندوز ہورہا تھا۔

اچانک نیولا چھلانگ مار کر چودھری کی چارپائی پر چڑھ گیا اور اس کی ٹانگوں کے بیچ میں جا گھسا۔

میں جیسے ہی نیولے کو پکڑنے کے لیے چارپائی کے پاس گئی تو چودھری کے چہرے پر بڑی معانی خیز مسکراہٹ جھلکنے لگی۔

''آؤ آؤ۔نیولا پکڑلو'' چودھری نے میری ہمت بندھاتے ہوئے کہا کیونکہ میں چارپائی کے قریب آ کر جھجک کر کھڑی ہوگئی تھی۔

چودھری نے پھر پیار سے کہا'' آؤ نیولا پکڑلو۔یہاں چھپا بیٹھا ہے۔''

میں نے جیسے ہی چودھری کی ٹانگوں میں چھپے ہوئے نیولے کو پکڑنے کے لیے ڈرتے ڈرتے ہاتھ ڈالا تو وہاں ایک نہیں دو نیولے چھپے بیٹھے تھے۔

کوکڑو

''اف۔کس قدر گندی دال ہے۔کوکڑو چنتے چنتے انگلیاں بے دم ہوئی جارہی ہیں۔''

صحن میں بیٹھی پڑوس کی آپا رشیدہ نے دال کی تھالی ایک طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

آپا رشیدہ کے مالی حالات کسی سے پوشیدہ نہیں تھے۔دو بچوں کے خرچ اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ محلے کے دو گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کیا کرتی تھی۔اس کے شوہر کافی عرصہ سے بیکار تھے۔دو بچوں کے علاوہ بوڑھی ساس کی دیکھ بھال بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔

ادھر طویل بے کاری سے تنگ آ کر آپا کے شوہر نے نشے میں پناہ ڈھونڈھ لی تھی۔

تھوڑے وقفے کے بعد آپا نے پھر دال چننے کے لیے تھالی اٹھالی اور ساتھ ہی ایک قہر آلود نگاہ صحن کے ایک کونے میں چارپائی پر بے سدھ پڑے ہوئے شوہر پر ڈالی جو اس کے لیے خصم کم اور سینے کا زخم زیادہ تھا۔

آپا نے ایک طویل ٹھنڈی سانس بھری اور دال میں سے کوکڑو نکال کر زمین پر پھینکتے ہوئے بولیں۔

''آخر ایک نکھٹو مرد اور کوکڑو میں فرق ہی کیا ہے؟ دونوں ہی بے کار''۔

لعل بادشاہ

لعل بادشاہ کی کہانی میں نے بچپن میں بہت بار سنی تھی جس میں ایک شہزادی دریا کے کنارے واقع اپنے محل کے باہر اپنی کنیزوں کے ہمراہ روزانہ سیر کرنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ ایک دن بڑے وجیہ صورت نوجوان سے دریا کنارے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ نوجوان حسن و جمال کا پیکر تھا۔ اور کسی شہزادے سے کم دکھائی نہ پڑتا تھا۔

خود شہزادی کی خوبصورتی بھی بے مثل تھی جس کا دور دور تک چرچا تھا۔ آج تک کوئی نوجوان اس کی نظروں میں نہیں سما سکا تھا لیکن دریا کنارے ملنے والے نوجوان میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ شہزادی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ چند ہی دنوں میں وہ یوں شیر و شکر ہو گئے جیسے کئی جنموں کا ساتھ ہو۔ اب شہزادی کو نوجوان سے ایک پل کی بھی جدائی گوارا نہ تھی۔

شہزادی نے اب نوجوان سے روزانہ ہی تقاضا شروع کر دیا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ مزید بتائے کہ اس کا حسب نسب کیا تھا؟ کیا ذات تھی اس کی؟ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا؟ مگر نوجوان شہزادی کے سوالوں کو کافی دیر تک ٹالتا رہا لیکن شہزادی بضد تھی کہ وہ اس کے بارے میں جان کر ہی رہے گی۔ نوجوان نے شہزادی کو اس ضد سے بہت مرتبہ روکا اور اسے کہا کہ وہ اس کے بارے میں جان کر بہت پچھتائے گی مگر شہزادی اپنی ضد سے باز نہ آئی۔

بالآخر ایک دن نوجوان اس پر اپنی اصلیت ظاہر کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور دوسرے دن علی الصبح شہزادی کو اکیلے دریا کنارے آنے کے لیے کہتا ہے۔

دوسرے دن شہزادی اکیلی ہی منہ اندھیرے دریا کی طرف نکل پڑتی ہے۔ جہاں نوجوان پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے۔ وہ آخری بار شہزادی کو اپنی ضد سے باز آنے کے لیے کہتا ہے لیکن وہ نہیں مانتی۔ کوئی چارہ نہ پا کر بہت اداسی سے شہزادی کو الوداعی نظروں سے دیکھتا ہوا وہ دریا کی طرف چلنا شروع کر دیتا ہے آہستہ آہستہ وہ پانی میں آگے بڑھ رہا ہے۔ شہزادی یہ تماشا بہت انہماک سے دیکھ رہی ہے اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ نوجوان کتنے گہرے پانی میں اتر گیا ہے۔ یکا یک نوجوان اس کی نظروں کے ریڈار سے غائب ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نہایت خوبصورت تاج سر پر سجائے بہت بڑا سانپ پانی سے سر ابھارتا ہے جسے دیکھ کر شہزادی دہشت کے مارے تقریباً بے ہوش ہونے کو ہے کہ اس کے کانوں میں آواز آتی ہے۔

''یہ ہے میری ذات شہزادی ___ میں لعل بادشاہ ہوں۔ ہر سو سال کے بعد میں انسانی شکل میں آنے پر قادر ہوں مگر اب

ہمیشہ کیلئے الوداع.....الوداع'' یہ کہتا ہوا لعل بادشاہ گہرے پانیوں میں ہمیشہ کیلئے گم ہو جاتا ہے اور شہزادی صدمے سے نڈھال روتی ہوئی محل کی طرف واپس لوٹ جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے ہم سب یہ کہانی سن کر بہت اداس ہو جایا کرتے تھے اور شہزادی سے ہمیں بہت زیادہ ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ بلکہ کچھ بچے تو رونا بھی شروع کر دیتے تھے۔ اب بڑے ہونے پر لوگوں کے ظاہر اور باطن کا تضاد دیکھ کر بے اختیار لعل بادشاہ کی کہانی یاد آ جاتی ہے۔

دُعا

''دعا عبادت کا مغز ہے بلکہ عین عبادت ہے۔''

یہ فقرہ ہم اکثر سنتے رہتے تھے۔مگر زندگی میں اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔پھر دعا بھی جب ایک ماں کی ہو تو عرش اعظم پر براجمان عظیم خالق جو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے ایک ماں کی سچی پکار کا جواب کیسے نہیں دے گا؟

ہمارے اکلوتے آصف بھائی کی طبیعت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی مگر ان کی بیماری ڈاکٹروں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ بظاہر جسمانی طور پر تو وہ دیکھنے میں بھلے چنگے لگتے تھے مگر ذہنی طور پر نہ جانے کن بھول بھلیوں میں الجھے راستے تلاش کرتے رہتے تھے۔

عبادت گزار اماں روزانہ تہجد کے وقت اس دل سوزی سے رو رو کر اپنے خالق سے آصف بھائی کی صحت یابی کی دعائیں مانگتیں کہ ہماری آنکھیں بھی نم ہو جایا کرتی تھیں۔گریہ وزاری سے فارغ ہو کر اماں اکثر مصلے پر ہی اونگھنے لگتی تھیں۔

پھر ایک روز اماں نے دیکھا کہ وہ خانہ کعبہ کے صحن میں موجود ہیں جہاں ایک بیمار نوجوان سیاہ چادر اوڑھے سر جھکائے ایک کونے میں بیٹھا ہے۔اماں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس جاتی ہیں تو ان کے کانوں میں آواز آتی ہے کہ'' آب زمزم پر سورہ فاتحہ پڑھ کر اسے پلاؤ ٹھیک ہو جائے گا''

اماں ہڑبڑا کر خواب سے بیدار ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد سورہ فاتحہ پڑھ کر روزانہ آب زمزم آصف بھائی کو پلانے لگتی ہیں تو وہ دنوں میں ہی مکمل صحت یابی کی طرف لوٹنے لگتے ہیں۔

''سچ ہے کہ ایک ماں کے دل سے نکلی ہوئی دعا کا بارگاہِ الٰہی میں مستجاب ہونے کے علاوہ اور کوئی مقدر ہی نہیں ہے۔''

جہاد

''ہاں ہمیں جہاد کرنا ہے۔ ظلم کے خلاف، غاصبانہ قبضے کے خلاف، غزہ میں ناجائز تجاوزات کے خلاف، اسرائیلیوں کے خلاف جنہوں نے فلسطین میں وحشت و بربریت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ہمیں فلسطین کو آزاد کرانا ہے۔''

فلسطینی نژاد ماں چیخ چیخ کر کیس کانفرنس میں شامل پروفیشنلز کو بتا رہی تھی۔ جنہیں اس کی دماغی حالت پر شک ہو رہا تھا۔ کانفرنس کا متفقہ فیصلہ تھا کہ ماں کو ماہر نفسیات کو دکھایا جائے اور اس کے تین بچوں گیارہ سالہ فائزہ، 9 سالہ وحید اور 7 سالہ زید کو وقتی طور پر فوسٹر فیملی کے حوالے کر دیا جائے۔ جہاں ان کی کونسلنگ (ماں سے علیحدہ رکھ کر) اینٹی ٹیررسٹ سکواڈ (Anti Terrorist Squad) کے ماہرین کریں گے تا کہ ان کے ذہن سے مستقبل میں جہاد کا خیال نکال دیا جائے۔

اس واقعے کے پس پردہ اصل بات یہ تھی کہ گیارہ سالہ فلسطینی فائزہ جس کی فیملی برطانیہ میں سیاسی پناہ پر تھی۔ ایک دن سکول میں اپنی دوست سے بات کر رہی تھی جسے ایک ٹیچر نے سن لیا کہ ''جب وہ بڑی ہو جائے گی تو فلسطین واپس جا کر اسرائیلی فوجیوں کے خلاف جہاد کرے گی اور اپنے وطن کو آزاد کرائے گی۔''

لفظ ''جہاد'' کا سننا تھا کہ سارے سکول میں تھرتھلی مچ گئی۔ سوشل سروسز، پولیس، ماہر نفسیات، اینٹی ٹیررسٹ سکواڈ کو آناً فاناً اطلاع کر دی گئی جیسے سکول میں داعش والے گھس آئے ہوں۔

گیارہ سالہ فائزہ کی بات سن کر جس قدر اوور ری ایکٹ (Over React) کیا گیا میں سوچتی ہوں کہ بڑے ہو کر اگر اس نے جہادی نہیں بھی بننا تھا تو اب ضرور بنے گی۔''

قتل

دنیا میں پہلا انسانی قتل قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کا اقلیما کے معاملے پر کیا اور آج کا قتل بھی خونی، رشتوں کے درمیان ہی ہوا مگر وجہ نزع کچھ اور تھی۔

آج مرزا غالب کا شعر ذہن کے کسی کسی کونے میں گونجنے لگا ہے۔

؎ کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

لیکن اس قتل پر کوئی بھی پشیمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے سارے کنبے نے سکھ کا سانس لیا ہو۔ جیسے قوم فرعون کو اس کے ظلم و استبداد سے نجات مل گئی ہو۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوگئی ہو۔

موسیٰ علیہ السلام کی طرح یہاں بھی فرعون وقت باپ کی بربادی کا سبب اس کا بیٹا ہی تھا لیکن یہ لے پالک نہیں بلکہ اس کا سگا بیٹا تھا۔ غضنفر بچپن سے ہی سارے خاندان پر باپ کے ظلم اور زیادتیوں کو دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ کوئی ایسا دن نہ ہوتا ہوگا جب باپ اس کی ماں کو مار مار کر لہولہان نہ کر دیتا ہوگا مگر ان کی دادرسی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ باپ کے خلاف بچپن کی نفرت اور غصہ اندر ہی اندر لاوا بن کر پکتا رہا پھر ایک دن آتش فشاں یوں پھٹا کہ چودہ سالہ غضنفر نے ماں کو بے دردی سے مارتے ہوئے باپ کا ہمت کر کے ہاتھ روک لیا اور پاس پڑی لاٹھی سے باپ کے سر پر اتنی کاری ضرب لگائی کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

؎ سچ ہے کہ ہر فرعون را موسی است

دہشت گرد

برطانیہ کی ایک مشہور یونیورسٹی کے باہر طالبات جنسی طور پر ہراساں کیے جانے کے خلاف مظاہرہ کر رہی ہیں۔ سڑک پر کافی رش ہے میں بھی رک کر دیکھتی ہوں ان کے ہاتھوں میں پکڑے پلے کارڈز پر مختلف نعرے لکھے ہوئے ہیں۔

''جنسی ہراسگی کوئی مذاق نہیں ہے''

''وسیع پیمانے پر پھیلتی اس وبا کی روک تھام ضروری ہے''

''جنسی ہراسگی نامنظور''

''یہ خواتین کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے''

''یہ عورت کی بے عزتی کے مترادف ہے''

پر جوش طالبات نعرے لگا رہی ہیں ان کے ساتھ کچھ ساتھی طالب علم بھی ہم آواز ہیں کہ اتنے میں ایک لڑکی اپنے بیگ سے میگا فون نکال کر بہت جوش و خروش سے نعرہ بازی کرنے لگتی ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ ''خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کرنے والوں کو بھی دہشت گرد قرار دیا جائے اور انہیں قانونی طور پر وہی سزا دی جائے جو دوسرے دہشت گردوں کو دی جاتی ہے۔

میں دہشت گردی کی اس نئی تعریف کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکی۔

بوسہ

''یوں تو بوسے کئی طرح کے ہوتے ہیں مگر سب سے کربناک بوسہ وہ ہوتا ہے جو ایک بوڑھی ماں اپنے جوان بیٹے کی قبر کی مٹی کا لیتی ہے۔''

میں اپنی ماں کو جوان بیٹے کی قبر کی مٹی کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھ کر بہت دکھ سے سوچ رہی ہوں۔

دُکھ سکھ

''سب سکھی گھرانے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں جبکہ ہر دکھی گھرانے کے دکھ کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے۔''

جب ٹالسٹائی نے اپنے مشہور زمانہ ناول ''اینا کرینینا'' کے آغاز میں ادب میں سب سے زیادہ دہرایا جانے والا یہ فقرہ لکھا ہوگا تو اسے کیا پتہ تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب سکھی گھرانے بھی ایک جیسے نہیں رہیں گے بلکہ ان کے سکھوں کے دکھ دیمک کی طرح انہیں الگ الگ انداز میں اندر سے کھوکھلا کرنا شروع کر دیں گے۔

''کیا سکھوں کے بھی دکھ ہوتے ہیں''؟ اندر سے آواز آئی۔

''ہاں.....حسد، لالچ، ریاکاری، نمود و نمائش، مسابقت، بے خوابی، بے چینی، ڈپریشن، جس کا اختتام کبھی کبھی خودکشی پر ہوتا ہے۔''

دل نے افسردگی سے جواب دیا۔

ادبی مکالمہ

(دو غیر ادبی دوستوں کے درمیان)

یار! آج کل اردو ادب کی صورت حال کیا ہے؟
ادب کی یا بے ادبی کی؟
ادب کی بات کر رہا ہوں۔ بے ادبی کی نہیں۔
سنا ہے آج کل ادب بڑا بے ادب ہو گیا ہے؟
وہ کیسے؟
کیونکہ اب ادب کا کوئی ایک مائی باپ نہیں رہا۔

☆

اچھا چل بتا۔ یہ عورتیں شاعری کیوں کرتی ہیں؟
ان کی مرضی۔
چپ اوئے مرضی کے بچے ٹھیک سے اندر کی بات بتا۔
جی ان پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ اس لیے دل کی بھڑاس نکالتی ہیں۔
ان پر ظلم کرتا کون ہے؟
دوسری عورتیں۔
مردوں کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ سدھر گئے ہیں کیا؟
نہیں جی۔ وہ ذرا بریک پر ہیں۔

☆

یار تم نے ٹھیک سے جواب نہیں دیا کچھ مزہ نہیں آیا ان پر تو شاعری کی جاتی ہے وہ تو خود سراپا غزل ہیں انہیں شاعری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟
منہ سے نکلنے والی چیخ کو بھی غزل کہتے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں یہ ان کی چیخ ہی ہے جو شاعری کی شکل میں باہر آ رہی ہے۔

تو ٹھیک ہے پھر۔ لکھتی رہنے دو۔ اس میں ان کا ہی فائدہ ہے۔

☆

اچھا یہ بتاؤ۔ عورتوں میں کوئی بڑی شاعرہ گزری ہے؟
عورتوں میں کوئی پیغمبر نہیں ہوئی تو بڑی شاعرہ کہاں سے ہوتی۔
لیکن عورت تو پیغمبروں کو جنم دینے والی ہے اسے پیغمبر بننے کی کیا ضرورت ہے؟
ہاں۔ یاد آیا۔ عورتوں میں ایک بڑی شاعرہ گزری ہے۔
وہ کون؟
امریکہ میں باجی افتخار نسیم عرف افتی۔

☆

یار کوئی کہہ رہا تھا کہ برطانیہ کے شہر نوٹنگھم میں اردو کی بہترین شاعری ہو رہی ہے۔
مگر وہاں شاعری کرتا کون ہے؟
رابن ہڈ

☆

ویسے تعلیم یافتہ قوموں میں شاعری سے زیادہ نثر لکھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں جہاں شاعر زیادہ ہوں وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی۔
پاکستان کی پس ماندگی کی اصل وجہ اب سامنے آئی ہے یعنی کرپشن نہیں شاعری۔

☆

اچھا چل یہ بتا۔ عورتیں مزاح کی طرف راغب کیوں نہیں ہوتیں؟
کہتی ہیں مذاق بنتا ہے۔
مذاق کون بناتا ہے۔
جی مرد۔
وہ تو خود مذاق بنے ہوئے ہیں عورتوں کے ہاتھوں اچھا۔ اب صحیح بات بتا؟
بات کچھ یوں ہے کہ اچھا مزاح اس وقت تخلیق ہوتا ہے جب دکھ حد سے بڑھ جاتا ہے یعنی بقول غالب:

؎ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں
تو کیا عورتوں کے دکھ ابھی حد سے نہیں بڑھے؟

بڑی سخت جان ہیں جی۔ برداشت بہت ہے انہیں تو ابھی رونے دھونے سے فرصت نہیں ہے مزاح کیا خاک لکھیں گی!

کہانی بول پڑتی ہے

(پوپ کہانیاں)

انتساب

شریکِ سفر

اسماعیل اعظم

کے نام

جنہوں نے میری کہانیاں نہایت دلچسپی سے سن کر فکر انگیز مشوروں سے نوازا

اور

اس کام میں میری معاونت کرتے ہوئے دو پوپ کہانیوں کے اردو تراجم بھی کیے!

پوپ میوزک سے پوپ کہانی تک

داستان گوئی یا قصہ کہانی کہنے، سننے اور سنانے کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانی تہذیب بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انسان کے اس کرّہ ارض پر قدم رنجہ فرمانے سے بہت پہلے ہی کہانی وجود میں آ چکی تھی تو اس میں شاید کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ ابتدائے آفرینش سے وجود میں آنے والی کہانی کا تانا بانا خود حضرتِ انسان ہی کے گرد گھومتا ہے۔ نیکی اور بدی کی قوتوں میں موجود ازلی کشمکش نے ایک ایسی کہانی کو جنم دیا جو انسان کے اس کرّہ ارض پر آباد ہونے کی وجہ ٹھہری۔

بالفاظ دیگر کہانی زندگی سے الگ نہیں ہے اور نہ ہی زندگی کہانی سے الگ کوئی چیز ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کو کمپلیمنٹ کرتی ہیں۔ اسی بات کو کسی صاحبِ بصیرت نے یوں بیان کیا ہے کہ ''کہانی کے پردے میں زندگی دھڑکتی ہے۔'' گویا کہانی صرف وقت گزاری کے لیے، دلچسپی یا چٹخارے کی چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کی سچی اور اصلی تصویر پیش کر کے اس کی بہت سی ایسی حقیقتوں سے پردہ اٹھاتی ہے جنہیں عام انسان کی نظر دیکھنے سے محروم رہتی ہے۔

ویسے تو اردو نثری ادب، ناول، ناولٹ، افسانہ، افسانچہ کہانی بلکہ مختصر کہانی (یک سطری دو یا سہ سطری) سے مالا مال ہے مگر کچھ عرصے سے ''پوپ کہانی'' کی بازگشت ادب کے ایوانوں میں سنائی دے رہی ہے اور ایک بحث سی چل نکلی ہے کہ آخر ''پوپ کہانی'' عام روایتی کہانی سے کس طرح الگ ہے کہ اسے ''پوپ کہانی'' کا نام دے کر اسے ایک نئی صنف تسلیم کر لیا جائے۔ آخر اس کی اپنی ہیئت، تکنیک اور پہچان کیا ہونی چاہیے کہ اسے دوسری نثری اصناف کے ہجوم میں الگ سے پہچانا جا سکے۔ جیسا کہ اردو شاعری میں غزل، نظم، آزاد نظم، نثری نظم، رباعی، ماہیا، دوہا، ہائیکو وغیرہ اپنی اپنی ہیئت اور تکنیک کی بنا پر ایک نظر میں ہی پہچان لی جاتی ہیں۔ تو اسی طرح ''پوپ کہانی'' کی پہچان کیا ہے؟ یعنی کونسی چیز ایک کہانی کو ''پوپ کہانی'' کا درجہ دیتی ہے۔ اگر اس کہانی میں کوئی انفرادیت ہے تو پھر اس کا اپنا کوئی فارمیٹ ہے یا نہیں؟ یا پھر صرف کسی بھی کہانی کے ساتھ ''پوپ کہانی'' کے الفاظ لکھ دینے سے کیا اس کے ایک الگ یا نئی صنف ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے؟ ایسے بہت سے سوال ہنوز جواب طلب ہیں!

مقصود الٰہی شیخ جو کہ ایک منجھے ہوئے قلمکار ہیں ان کی ''پوپ کہانیوں'' کی کتاب 2011ء کے اوائل میں منصۂ شہود پر آئی تو کسی نے اسے ''پو پیاں'' (مصنف نے خود بھی انہیں پو پیاں کہا ہے) تو کسی نے اسے ''پاپ کہانی'' کا نام دے ڈالا تو کسی نے اسے اردو ادب میں ایک نئی صنف کا درجہ دے کر اس کی دریافت کا سہرا شیخ صاحب کے سر باندھا!!!

کئی رسائل و جرائد میں ''پوپ کہانی'' پر کئی تبصرے نظر سے گزرے تو میرا ذوق تحقیق و جستجو بھی انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا مگر ''پوپ کہانی'' کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے میرے لیے ضروری تھا کہ میں اصل کتاب کا مطالعہ کروں۔ اولین فرصت میں شیخ صاحب سے (بریڈفورڈ) رابطہ کر کے ہدیے کا چیک سپردِ ڈاک کیا تو چند ہی دنوں میں پوپ کہانیوں کی کتاب، مخزن کا آخری (تاریخی) شمارہ اور چند اردو اخباروں کے تراشے بذریعہ ڈاک موصول ہوئے۔ ایک ہی نشست میں اپنے فکری تجسس کی تسکین کر ڈالی۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پیش لفظ علی سفیان آفاقی کا لکھا ہوا ہے جبکہ ''نئی صنف'' کے عنوان سے شیخ صاحب نے مختصر سا مضمون پوپ کہانی کی وضاحت میں قلمبند کیا ہے اور ان کی اکیس پوپ کہانیاں اس حصے میں شامل ہیں۔ اس حصے میں ممتاز حسین کا مضمون ''پپو یار تنگ نہ کر'' جبکہ دوسرے حصے میں عمران نقوی (انٹرویوز) صفیہ صدیقی، جاوید اختر پاشا، احمد صفی، ڈاکٹر عمران مشتاق، ڈاکٹر مجیبر احمد آزاد کے تبصرے اور کہانیوں کے علاوہ سیّد ظفر ہاشمی (ایڈیٹر گلین) اور تنویر اختر (ایڈیٹر ماہنامہ ساحل) کے تبصرے شامل ہیں۔ ہر ایک قلمکار اور تبصرہ نگار نے ''پوپ کہانی'' کو اپنے اپنے انداز میں دیکھنے، سمجھنے اور لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علی سفیان آفاقی رقمطراز ہیں کہ ''شیخ صاحب نے اردو ادب میں ایک نئی صنف متعارف کی ہے۔'' آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے مشرق و مغرب کے امتزاج سے کہانی کی ایک نئی صنف ایجاد کی ہے۔''

''پوپ کہانی'' کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ ''پوپ کہانی افسانہ، افسانچہ یا پارۂ لطیف سے جدا ہے۔ کچھ ہے تو اپنے گوناں گوں موضوعات اچانک آمد پر قلم بند کرنے کا نام ہے۔ جب قلم سے جڑا احساس دل کسی واردات کو تحریک و فیضان ملنے یا انسپائر ہونے پر سینے میں بند رکھنے کی بجائے عام فہم لفظوں میں سپرد قرطاس کر دے تو لفظوں کا یہی روپ پوپ کہانی ہے۔ یہی اس کا نیا پن یا اس میں ''نیا'' ہے یا پھر پوپ کہانی سے نازک سہل اور فوری تاثر پیدا ہوتا ہے۔'' صفیہ صدیقی نے اسے دل سے نکلی ہوئی آہ یا خوشی سے لگایا ہوا قہقہہ قرار دیا ہے'' مگر سید ظفر ہاشمی تو اسے کوئی نئی صنف ماننے کو تیار ہی نہیں اور لکھتے ہیں کہ ''میں نے ان کہانیوں میں کوئی بات ایسی نہیں پائی کہ جو فی الوقت اِدھر اُدھر دکھائی دینے والے افسانچوں، منی کہانیوں، یک سطری، دو سطری چٹکلوں سے مختلف ہو اور جن کی بنا پر انہیں ایک الگ صنف قرار دیا جائے بجز اس کے کہ ان پوپ کہانیوں کا ماحول اور افکار مغربی ہیں اور کردار قید و بند سے آزاد، بے لگام معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔'' مزید لکھتے ہیں کہ ''فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں پوپ کہانیوں کی نہ تو کوئی تعریف بیان کی ہے اور نہ ہی اس پر بحث کی ہے کہ ان کی ہیئت اور تکنیک کیا ہے اور کن معنوں میں یہ منی کہانیوں/ افسانچوں سے مختلف ہیں۔''

ماہنامہ ساحل کے مدیر تنویر اختر کی رائے میں ''Pop انگریزی لفظ Popular کا مخفف ہے اور اس موسیقی کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو عام طور پر کاروباری بنیادوں پر ریکارڈ کی گئی ہے۔

مزید لکھتے ہیں کہ ''ان کہانیوں کے لکھنے کے انداز میں واضح فرق موجود ہے۔ یہ نظم کے مصرعوں کی صورت، مکالمے، خود کلامی یا

روایتی کہانی کے نثری انداز میں لکھی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موضوع اور انداز کے لحاظ سے اس کی سمت ابھی طے ہونا باقی ہے مگر ایک بات مشترک ہے کہ یہ سب مختصر ہیں جیسے آپ لنچ کی بجائے سینڈوچ کھالیں۔''

مئی 2011ء کے ندائے ملت میں انور سدید نے اپنے تبصرے میں لکھا ہے کہ ''مجھے خدشہ ہے کہ پوپ کہانی کی اصطلاح تا حال اپنے خدوخال سے محروم ہے اور شیخ صاحب نے جس قسم کی پوپ کہانیاں لکھی ہیں ان سے اولیت کا دعویٰ تو کر سکتے ہیں اور موجد بھی کہلا سکتے ہیں لیکن اس سے کہانی نئی جہت کی طرف بڑھتی نظر نہیں آتی اور۔۔۔ اس میں روایتی کہانی کا پورا سٹرکچر موجود ہے۔''

علی سفیان آفاقی کا یہ کہنا کہ شیخ صاحب نے پوپ کہانی کی اصطلاح پوپ میوزک سے وضع کی ہے۔ اور مشرق و مغرب کے امتزاج سے کہانی کی ایک نئی صنف ایجاد کی ہے۔ میرے لیے سوچ کے بہت سے دریچے کھول گیا کہ اگر پوپ کہانی کی اصطلاح پوپ میوزک سے وضع کی گئی ہے تو پھر پوپ کہانی کا موسیقی سے کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور رہا ہوگا اور اگر نہیں بھی رہا تو کیا اردو ادب میں لکھی جانے والی ''پوپ کہانی'' کو مشرقی کلاسیکی موسیقی سے منسلک کر کے پوپ کہانی کے خدوخال کو پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے بہت سے سوال تھے جنہوں نے مجھے مشرقی کلاسیکی موسیقی کے مطالعے کی طرف راغب کیا۔

جس زمانے میں امریکہ میں پوپ میوزک کا آغاز ہوا تو پیش نظر یہ سوچ تھی (موسیقی جو اس وقت تک صرف خواص یعنی ایلیٹس (Elites) کے لیے مخصوص تھی۔ عام آدمی کے لیے اسے سننا سمجھنا اور ذہنی اور مالی طور پر اس سے حظ اٹھانا اتنا آسان نہیں تھا) کہ ایک ایسی موسیقی کی داغ بیل ڈالی جائے جو کہ عام فہم ہو اور ایک عام شخص کی دسترس میں ہو۔ یعنی کہ خواص کے لیے نہیں بلکہ عوام میں مقبول ہو اور یوں اسے پوپ میوزک کا نام دیا گیا۔ یہ میوزک نوجوان نسل میں انتہائی مقبول ہو کر بہت مختصر عرصے میں مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑتی ہوئی ساری دنیا میں پھیل گئی۔

اس ایک نقطہ نے میری توجہ انگریزی اور امریکن لٹریچر دونوں کی طرف مبذول کروائی مگر میں پہلے اپنی مشرقی کلاسیکی موسیقی کی تلاش و جستجو کو بیان کرنا چاہوں گی۔ مجھے برطانیہ میں مشرقی کلاسیکی موسیقی پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں مل پائی تو میں نے پاکستان میں اپنے قلمکار دوستوں زاہد مسعود اور شہناز مزمل سے رابطہ کر کے متعلقہ کتابیں بھجوانے کی استدعا کی۔ شہناز مزمل نے سید محمد اسلام شاہ کی ''غزل گائیکی'' اور ''طائرانہ نظر'' کے نام سے دو کتابیں پہلی فرصت میں مجھے برطانیہ بھجوائیں۔ زاہد مسعود نے تلاش بسیار کے بعد ''معارف النغمات، حصہ اول'' از محمد نواب علی خان جو کہ استاد بدرالزماں (صدارتی تمغہ حسن کارکردگی) کی ترتیب و پیشکش تھا، بھجوائی جو کہ اس سلسلے میں بے حد مفید ثابت ہوئی۔ جس کے لیے میں ان کی بے حد شکر گزار ہوں۔

مشرقی موسیقی کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے پیش نظر یہی نکتہ تھا کہ اگر پوپ کہانی لکھتے وقت اسے کسی نہ کسی راگ یا راگنی کے تابع کر دیا جائے یا اس سے منسلک کر دیا جائے تو شاید ہمیں پوپ کہانی کی ہیئت، تکنیک یا فارمیٹ کو مشرق میں ڈویلپ کرنے میں، اس کی الگ پہچان بنانے میں کوئی کامیابی ہو سکے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ انسانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی مانند راگ اور

راگنیاں بھی مختلف اوقات میں مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً راگ ملہار، برسات کے موسم کی کیفیت کو باندھتا ہے تو راگ بھیروی، بلاول، بیم پلاسی اور بھوپال بہت شانت، سنجیدہ اور سکون آور راگ ہیں۔ راگ پیلوا داسی کی کیفیت کا مظہر ہے تو تلک کمود اور وندا ون شوخ و چنچل راگ ہیں جبکہ بھاگیہ شری ایک گمبھیر راگ ہے۔ اسی طرح مالکوس، ایمن اور پنچم وغیرہ مختلف جذباتی کیفیات کے مظہر ہیں۔

کلاسیکی موسیقی کے مزید مطالعے سے پتہ چلا کہ موسیقی میں کل 9 ٹھاٹھ ہیں اور ہر ایک ٹھاٹھ کے اندر بہت سے راگ ہیں۔ مثلاً کلیان ٹھاٹھ (17 راگ)، بلاول ٹھاٹھ (24 راگ)، کھماچ ٹھاٹھ (18 راگ)، بھیروں ٹھاٹھ (20 راگ)، بھیرویں ٹھاٹھ (23 راگ) ٹوڑی ٹھاٹھ (6 راگ) پوربی ٹھاٹھ (14 راگ)، مارواٹھاٹھ (13 راگ) کافی ٹھاٹھ (32 راگ) پر مشتمل ہے۔ اس پر راگوں سے نکلتی ہوئی بے شمار راگنیاں اور راگوں کے کچھمن مثلاً گرہ، انش نیاس، تار، مندر، اپنایاس، سنیاس، ونیاس بہت اور الپت اور اس پر تال آستائیاں، انترے، سرتیاں اور ماترے وغیرہ وغیرہ پڑھتے پڑھتے مجھے محسوس ہوا کہ موسیقی تو ایک ایسا بحرِ زخار ہے جس میں ایک پوپ کہانی لکھنے والا ڈوب تو سکتا ہے مگر شاید پاپ کہانی نہیں لکھ پائے گا۔ سچ کہوں کہ موسیقی کے اس بحرِ بیکراں کے سامنے مجھے ننھی منی پوپ کہانی ایک ''لولی پوپ'' سے زیادہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس لیے میں نے یہ بھاری پتھر چوم کر چھوڑ دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پوپ کہانی اور مشرقی کلاسیکی موسیقی کے تال میل پہ مزید کام نہیں ہو سکتا۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!

اب آتی ہوں انگریزی اور امریکن لٹریچر کی تلاش و جستجو کی طرف۔ جیسے جیسے میری تحقیق آگے بڑھتی گئی تو میں یہ جان کر نہایت خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئی کہ امریکن لٹریچر میں پوپ کہانی ایک نہایت پختہ نثری صنف کے طور پر پہلے سے ہی موجود ہے اور بہت عرصے سے لکھی اور پڑھی جا رہی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پوپ میوزک سے پہلے ہی امریکن لٹریچر میں ''پوپ اسٹوری'' بے حد مقبول ہو چکی تھی تو کچھ غلط نہ ہوگا بلکہ امریکہ میں ایک وقت ایسا تھا کہ پوپ میوزک کی بجائے پوپ اسٹوری زیادہ مقبول تھی اور اس کے رائٹرز راک اسٹارز کی طرح سیلبرٹی کا درجہ رکھتے تھے۔ جن میں ارنسٹ ہمنگوے (Ernest Hemengway) ایڈگر ایلن پو (Edgar Alan Poe) ایف سکاٹ فٹز جیرالڈ (F. Scott Fitgerald) ڈیومس (Dumas) ارآیل سٹیونسن (R.L Stevenson) جیک لندن (Jack London) او ہنری (O,Henry) اور جارج سمنن (George Simenon) نے ناولوں کے ساتھ ساتھ بہت اچھی پوپ کہانیاں لکھ کر بے حد داد وصول کی۔ دی موسٹ ڈینجرس گیم (The most Dangerous game) اور لیڈی اور دی ٹائیگر (The Lady or The Tiger) اعلیٰ درجے کی خالصتاً پوپ کہانیاں ہیں جو اپنے وقت میں بے حد مقبول ہوئیں۔

امریکن لٹریچر میں اس سوال کا جواب نہایت سلیقے سے دیا گیا ہے کہ آخر مختصر کہانی اور شارٹ اسٹوری کے مقابلے میں پوپ اسٹوری لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ آخر وہ کونسے عوامل تھے جنہوں نے ایک روایتی کہانی کو پوپ میں تبدیل کر دیا!!

پوپ کہانی کیوں؟ (Why Pop Story)

لکھا ہے کہ ''مغربی ادب میں رفتہ رفتہ شارٹ اسٹوری کو بہت پیچھے دھکیل دیا گیا اور دیگر تمام اصناف کے مقابلے میں شارٹ اسٹوری سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ مثلاً ایک وقت تھا کہ شارٹ اسٹوریز شائع کرنے والے مختلف رسائل و جرائد بہت بڑی تعداد میں شائع ہوتے تھے پھر یہ رسائل بند ہونے لگے اس لیے کہ شارٹ اسٹوری کے قاری خطرناک حد تک کم ہوتے جا رہے تھے۔ مغرب کی تیز رفتار زندگی میں کہانی کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی اور زندگی قاری کو لے کر بہت آگے نکل گئی تھی۔''

مغرب میں آج بھی بہت اچھی شارٹ اسٹوریز لکھی جا رہی ہیں اور یہاں اس صنف کے بہت اچھے قلمکار موجود ہیں مگر زیادہ تر شارٹ اسٹوری کی کتب سٹوروں میں شیلفوں پر گاہکوں کے انتظار میں پڑی رہتی ہیں جس طرح ایک جوان طوائف کے مقابلے میں ایک ادھیڑ عمر طوائف کو گاہک کے لیے زیادہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ قاری ان کو خرید نہیں رہا اور وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ Short stories are not connecting with the American public اس کے مقابلے میں ٹی وی، کمپیوٹر، میوزک، اسپورٹ، آئی پوڈ، فیس بک، ٹوٹر اور ای بکس (E-books) نے تیزی سے اپنی جگہ بنالی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہر کوئی موٹروے کی فاسٹ لین میں جا رہا ہے اور عام کہانی بہت سست رفتاری سے تھرڈ لین میں چل رہی ہے۔ ان حالات میں پوپ کہانی نے امریکن ادب میں اپنی جگہ بنالی ہے۔

اس بات کی گواہی میں اپنی ایک انگریزی قلمکار دوست (Gaynor Arnold) کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے بھی دے سکتی ہوں۔ جس کا پہلا ناول A Girl in the Blue جو کہ چارلس ڈکنز کے ناول Great Expectations کو بنیاد بنا کر لکھا گیا تھا۔ بکر پرائز (Booker prize) کی لونگ لسٹ میں منتخب ہوا تھا۔ برطانیہ میں یہ کسی بھی لکھنے والے کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس کا ناول ہاتھوں ہاتھ لیا گیا جبکہ اس کی دوسری شارٹ اسٹوریز کی کتاب Lets lie together کو اتنا اچھا رسپانس نہیں ملا اور اب وہ پھر تیسری کتاب ناول ہی لکھ رہی ہے۔ اس لیے کہ یہاں شارٹ اسٹوری کی کوئی خاص مارکیٹ نہیں ہے۔ بقول گینا آرنلڈ'' Serious readers want to read a novel''

مغربی ادب میں شاعری کی مارکیٹ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ پورے سال میں شاعری کی غالباً دس یا بارہ سے زیادہ کتابیں نہیں چھپتیں۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو بقول شخصے ''تعلیم یافتہ معاشروں میں زیادہ نثر ہی لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔''

مغرب کے قاری کے مطابق شاعری پڑھنے کی نہیں بلکہ سننے کی چیز ہے یعنی سپیکنگ پوئٹری اور اس طرح اس کا ایمپیکٹ بھی زبردست ہوتا ہے۔ یہ تو وہ حالات ہیں جنہوں نے امریکن قاری کو پوپ اسٹوری کی طرف متوجہ کیا۔

پوپ کہانی کیا ہے؟ (What is a Pop Story)

پوپ کہانی کی تعریف کچھ یوں بیان کی گئی ہے کہ:

1- پوپ کہانی کا پلاٹ مربوط ہونا چاہیے۔ سٹرکچر مضبوط ہو مگر یہ بنیادی نوعیت کی پراثر کہانی ہونی چاہیے۔

2- پوپ کہانی میں پلاٹ یا کردار کہانی کو آگے بڑھائیں۔
3- یہ سادگی اور پرکاری کا اچھا نمونہ ہونا چاہیے۔
4- پوپ کہانی کوئی ادب پارہ نہیں ہوتی کیونکہ یہ کسی ادبی نقاد کے لیے نہیں لکھی جاتی بلکہ عام قاری کے لیے لکھی جاتی ہے۔
5- کہانی تہہ دار نہیں ہونی چاہیے۔
6- ضرورت سے زیادہ تفصیل سے احتراز کریں۔
7- مناسب طوالت ہو یعنی نہ بہت چھوٹی اور نہ بے حد طویل۔
8- کہانی اور قاری کے درمیان رابطہ ہر حال میں برقرار رہنا ضروری ہے۔

''پوپ کہانی لکھتے وقت قلمکار کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ آپ ایک کہانی سنا رہے ہیں کوئی فلسفہ، جدیدیت، مابعد جدیدیت ،علامتی یا تجریدی تجربہ نہیں کر رہے ہیں۔ بس کہانی ہی ہونی چاہیے۔ اپنے مخصوص ماحول اور حالات کے اندر کہانی ہی سب کچھ ہے یعنی "You are telling a story, that's all"

دوسرے لفظوں میں پوپ اسٹوری اور پوپ میوزک میں کوئی واضح تعلق سامنے نہیں آ سکا ماسوائے کہ اسے پوپ اس کے پاپولر ہونے کیوجہ سے کہا گیا ہے کیونکہ یہ عوام الناس کے لیے لکھی جاتی ہے اور ان میں بے حد مقبول ہے۔

یہ تو رہی میری تحقیق وجستجو کی داستان.....مگر میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ میں امریکن لٹریچر میں لکھی جانے والی پوپ اسٹوری میں سے کچھ کہانیاں نمونے کے طور پر اردو ادب کے قارئین اور قلمکاروں کے لیے پیش کروں تا کہ پوپ کہانی کے بارے میں چھڑی ہوئی بحث میں اس کہانی کے خدوخال واضح کرنے میں کچھ مدد ملے۔

دریں اثنا ای بک (E-book) پر امریکن رائٹر کنگ وینکلس (King Wenclas) کی کتاب "Ten Pop Stories" میری نظر سے گزری تو میں نے یہ کتاب خرید کر ڈاؤن لوڈ کی۔ ان کہانیوں کو پڑھا اور ان میں سے دو کہانیاں مشین (Machine) اور سرخ دروازہ (Red Door) اردو ترجمے کے لیے منتخب کر لیں مگر میں مغرب میں کاپی رائٹس (Copy rights) کی سچوایشن سے پوری طرح باخبر تھی اس لیے بغیر پبلشر یا رائٹر کی اجازت کے میں ان کہانیوں کو ترجمہ نہیں کرنا چاہتی تھی مبادا مستقبل میں کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ چنانچہ میں نے پبلشر کے نام ای میل مورخہ 14 فروری 2012ء کو بھیجتے ہوئے لکھا کہ:

> ''میں نے حال ہی میں ای بک پر کنگ وینکلس کی دس پوپ کہانیاں پڑھی ہیں میں خود بھی اردو زبان میں شاعری اور نثر لکھتی ہوں میری خواہش ہے کہ میں کنگ کی چند پوپ کہانیاں اردو میں ترجمہ کر کے اپنے قلمکاروں اور قارئین کے لیے پیش کروں تا کہ اس بات سے آگاہی حاصل کی جا سکے کہ امریکن لٹریچر میں پوپ کہانی کیسے لکھی جا رہی ہے اور ہم امریکن پوپ کہانی کے ماڈل سے اردو ادب میں پوپ کہانیاں لکھتے ہوئے کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔''

مورخہ 18 فروری 2012ء کنگ وینکلس کی جوابی ای میل موصول ہوئی کہ:

''آپ کی ای میل اور میری پوپ کہانیوں کو پسند کرنے کا شکریہ۔ میں چند سوالوں کے آپ سے جواب چاہتا ہوں۔

☆ آپ نے دس پوپ کہانیاں کیسے اور کہاں تلاش کیں؟

☆ آپ نے کتاب کب اور کہاں سے خریدی؟

☆ ان کہانیوں کے تراجم کون کرے گا؟

☆ ان تراجم کو آپ کہاں پیش کرنا چاہیں گی؟ وغیرہ وغیرہ''

میں نے جوابی طویل ای میل مورخہ 20 فروری 2012ء کو کنگ وینکلس کو لکھتے ہوئے کہا کہ:

''آپ کے جواب کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ میں کچھ عرصے سے پوپ کہانیاں پڑھنے میں کافی دلچسپی رکھتی ہوں مگر کہیں سے پوپ کہانیوں کی نشاندہی نہیں ہو رہی تھی۔ پوپ کہانی پر ریسرچ کے دوران انٹرنیٹ پر آپ کی "Ten Pop Stories" میری نظر سے گزریں۔ میرے خیال میں ایمزن کی ویب سائٹ تھی میں نے کتاب خرید کر ڈاؤن لوڈ کر لی مگر آپ کی پوپ کہانیاں میں پرنٹ کرنے سے قاصر تھی۔ (شاید تمام ای بکس کی کہانیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ رہا ہوگا) آپ کی چند کہانیاں بہت دلچسپ لگیں اور میری خواہش ہے کہ میں انہیں اردو میں ترجمہ کر کے اردو زبان و ادب کے قارئین اور قلمکاروں کے لیے پیش کروں کہ امریکی ادب میں پوپ کہانی کے خدوخال کیا ہیں کیونکہ امریکہ میں یہ ایک نہایت پاپولر فارم آف آرٹ ہے۔ میں خود ان کہانیوں کا ترجمہ کروں گی۔ میں اس وقت خود بھی پوپ کہانیاں لکھنے کے مرحلے سے گزر رہی ہوں اور بہت ممکن ہے کہ انہیں جلد ہی کتابی شکل میں شائع کرواؤں۔ آپ کی پوپ کہانیاں اس کتاب میں آپ کے نام کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔ یہ کتاب اردو زبان میں شائع ہوگی اگر آپ پسند فرمائیں تو آپ کو کتاب کی ایک جلد ارسال کر دوں گی جب کتاب چھپ جائے گی تو۔ مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کے تمام سوالوں کے تسلی بخش جواب دیئے ہوں گے تاہم اگر اس بارے میں آپ مزید معلومات کے متمنی ہوں تو براہ کرم رابطے میں تردّد نہ کریں۔ جلد جواب دینے کے لیے ایک بار پھر نہایت مشکور ہوں آپ کے جلد جواب کی منتظر رہوں گی کیونکہ میں جلد ہی بیرون ملک سفر کا ارادہ رکھتی ہوں۔''

میری ای میل کے جواب میں کنگ وینکلس کا جواب مورخہ 22 فروری کو موصول ہوا اور انہوں نے مجھے اپنی پوپ کہانیاں ترجمہ کرنے کی اجازت اس وعدے کے ساتھ دے دی کہ میں ان کے نام اور کام کو Acknowledge کروں اور ساتھ ہی انہوں نے میری پوپ کہانیوں کی کتاب کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ کنگ کو بھیجی گئی میری آخری ای میل حوالے کے لیے موجود

ہے۔

Dear Mr. Wenclas

"Thank you very much for allowing me to translate some of your work. I really appreciate.

I have selected two pop stories ie Machine and Red Door for translations and I hope it gives some idea to the Urdu readers as well as the writers as to what is a true pop story."

Warm Regards

Dr. Razia Ismail

Birmingham. England. UK

میرے خیال میں اس سوال کا جواب ہنوز تشنہ ہے کہ آخر ہم اپنے مخصوص حالات اور ماحول میں اردو ادب میں پوپ کہانی کس طرح سے لکھیں یا کس طرح سے اس کی ایک الگ پہچان بنائیں کہ ہمیں اس کے ساتھ کسی سابقے یا لاحقے کی ضرورت پیش نہ آئے اور بادی النظر میں ہی معلوم ہو جائے کہ یہ پوپ کہانی ہے۔ جیسے اردو میں ناول، افسانہ، رپورتاژ، کالم، سفرنامہ وغیرہ وغیرہ اپنی ہیئت سے ہی اپنی صنف کا پتہ دے دیتے ہیں یعنی کہ ''لفافہ دیکھ کر مضمون خط کا بھانپ لیتے ہیں''

اس ضمن میں سوچ کے کچھ زاویے ہیں جن پر مزید غور و خوض کیا جا سکتا ہے مثلاً:

1- کیا مشرق کے مخصوص حالات اور ماحول میں لکھی جانے والی پوپ کہانی کو کسی طرح مشرقی کلاسیکی موسیقی سے منسلک کیا جا سکتا ہے جو کہ ممکن ہے مشرق میں اس کی ایک الگ پہچان بنانے میں مدد و معاون ثابت ہو سکے؟

2- یا پھر ہم امریکن لٹریچر میں وضع کردہ خدوخال کے مطابق ہی پوپ کہانیاں لکھیں؟

3- یا پھر صرف ایسی کہانی کو پوپ کہانی کا درجہ دیا جائے جو کسی مخصوص مغربی سوچ یا فلسفے کی غمازی کرتی ہو۔

4- اس کے کردار بے شک مشرقی ہوں مگر مغرب سے انکا تعلق کسی نہ کسی انداز سے واضح ہوتا ہو یا وہ مغربی معاشرے میں رہ رہے ہوں یا رہ چکے ہوں یا ان کے تجربات مغربی معاشرے یا سوچ سے متعلق ہوں۔

5- عام اردو تحریر کے برعکس کیا انگریزی الفاظ کے بکثرت استعمال سے پوپ کہانی کی الگ پہچان بنائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ (اسی خیال کے پیش نظر میں نے اپنی لکھی ہوئی پوپ کہانیوں میں انگریزی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں) مگر یہ معاملہ بحث طلب ہے کہ ایک عام قاری (جس کے لیے کہانی لکھی جا رہی ہے) اگر اس کا انگریزی زبان کا علم محدود ہے تو کیا وہ اس سے حظ اٹھا سکے گا؟

میں نے نمونے کے طور پر کنگ وینکلس (امریکن پوپ سٹوری رائٹر) کی دو کہانیوں کے تراجم شامل کتاب کیے ہیں اور خود بھی امریکن لٹریچر میں دی گئی پوپ کہانی کی تعریف وتجاویز کے اتباع میں بارہ پوپ کہانیاں لکھی ہیں۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں۔ اس کا فیصلہ میں آپ سب پر چھوڑتی ہوں کیونکہ یہ کہانیاں لکھتے وقت میرے پیش نظر صرف کہانی اور قارئین تھے۔ میرے نزدیک یہ کہانیاں قاری اور رائٹر کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک مخصوص ماحول اور حالات کے اندر لکھی گئی (یہ تجرباتی کہانیاں) میری آپ کی اور ہم سب کی یعنی زندگی کی کہانیاں ہیں۔ زندگی ایک تجربہ گاہ ہے اور میرے خیال میں تجربے میں بہتری اور نکھار کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ شکریہ!

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل
برمنگھم، برطانیہ
24 فروری 2012ء

پوپ کہانی اور رضیہ اسماعیل کی کہانیاں

گزشتہ کچھ عرصہ سے پوپ کہانی کا نام سننے میں آ رہا تھا۔ ادھر اُدھر ادبی رسائل میں عام طور پر افسانچہ طرز کی کہانیاں چٹکلے کے انداز میں دکھائی دے رہی تھیں۔ جوگندر پال کے افسانچے پڑھنے کے بعد کسی چٹکلا نما چیز کی طرف دھیان دینے کا موڈ ہی نہ بنا۔ لیکن حال ہی میں مقصود الٰہی شیخ کے ساتھ ایک طویل وقفہ کے بعد رابطہ ہوا تو انہوں نے پوپ کہانی کی جانب توجہ دلائی۔ نہ صرف توجہ دلائی بلکہ اپنی کتاب ''پوپ کہانیاں'' بھی عنایت کر دی۔ عجیب اتفاق ہے کہ عین انہیں دنوں میں جب ہماری مراسلت جاری تھی مجھے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی حال ہی میں شائع ہوئی شعری کلیات ''خوشبو، گلاب، کانٹے'' کا تحفہ ملا۔ اس میں رضیہ اسماعیل کی کتابوں کی لسٹ دیکھ رہا تھا تو سال ۲۰۱۲ء میں ان کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' (پوپ کہانیاں)، کا نام دیکھ کر چونک گیا۔ ان سے رابطہ کیا کہ مجھے یہ کتاب درکار ہے۔ پھر ان کے ساتھ اس موضوع پر تھوڑی سی گفتگو بھی ہوئی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جو سوالات میرے لیے الجھن کا باعث بنے ہوئے ہیں، وہ کہیں زیادہ رضیہ اسماعیل کے لیے بھی الجھن کا باعث بنے ہیں۔ اور انہوں نے ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کے لیے پوپ کہانی کے مرکز امریکہ کے انگریزی پوپ کہانی نگاروں سے بھی رابطے کیے تا کہ اگر یہ کوئی نئی صنف ہے تو اس کے خدوخال دوسروں سے الگ دیکھے جا سکیں۔ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے بتایا کہ ان کی کتاب ''کہانی بول پڑتی ہے'' پبلشر کے پاس ہے اور پروف ریڈنگ کی وجہ سے اشاعت میں دو تین ماہ کی تاخیر ہو رہی ہے۔ میری درخواست پر انہوں نے مجھے اس کتاب کی ان پیج فائل عنایت کر دی۔ یوں مجھے پوپ کہانی کے مسئلہ کو برطانیہ کے دو تخلیق کاروں کے کام کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کا تھوڑا سا موقعہ مل گیا۔

مقصود الٰہی شیخ کے ساتھ میری جو مراسلت ہوئی، اس میں میری طرف سے ایک دو بنیادی سوال اٹھائے گئے تھے۔ مراسلت کے نتیجہ میں بھی اور کتاب ''پوپ کہانیاں'' کو پڑھنے کے بعد بھی مجھے نہ صرف ان سوالات کے جواب کی ابھی تک تلاش ہے بلکہ ان کے ساتھ مزید چند سوالات بھی پیدا ہو گئے ہیں۔

۱۔ پوپ کہانی کے بنیادی خدوخال کیا ہیں؟

۲۔ جس طرح افسانچہ، افسانہ، ناولٹ اور ناول کی پہچان بالکل سامنے کی بات اور قابلِ فہم ہے، اسی طرح پوپ کہانی کو افسانچہ یا افسانہ سے کس طرح الگ پہچانا جا سکتا ہے؟ کسی مابہ الامتیاز اور کسی تخصیص کے بغیر پوپ کہانی کو افسانچہ یا افسانے سے الگ کر کے کیونکر دیکھا جا سکتا ہے؟

مقصود الٰہی شیخ کی پوپ کہانیوں میں بعض افسانچوں کی طرح ہیں، بعض نثری نظم کے انداز میں، بعض میں خلیل جبران جیسا رنگ

درآیا ہے تو بعض ڈرامہ کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔اس ہیئتی منظرنامہ سے مسئلہ سلجھنے کی بجائے مزید الجھ جاتا ہے۔

چونکہ پوپ کا لفظ پاپولر میوزک والے پوپ سے لیا گیا ہے۔اس پر ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے تو ایک اور نکتہ اٹھا دیا ہے کہ اگر یہ تعلق کسی موسیقیت کی بنیاد پر ہے تو پھر اردو میں پوپ کہانی کو کلاسیکی موسیقی کے ساتھ بھی جوڑا جا سکتا ہے۔ان کے بقول: ''اگر پوپ کہانی لکھتے وقت اسے کسی نہ کسی راگ یا راگنی کے تابع کر دیا جائے یا اس سے منسلک کر دیا جائے تو شاید ہمیں پوپ کہانی کی ہیئت ،تکنیک یا فارمیٹ کو مشرق میں ڈویلپ کرنے میں، اس کی الگ پہچان بنانے میں کوئی کامیابی ہو سکے''۔

لیکن اگر یہ لفظ محض پاپولر کہلانے کی خواہش کا اظہار ہے تو بات بنتی دکھائی نہیں دیتی۔کیونکہ پریم چند سے لے کر منٹو تک ہمارے ابتدائی اور اہم لکھنے والوں کی کہانیاں تو اردو میں مقبولیت کے سات آسمان چھو چکی ہیں۔اور آج بھی کہانی پڑھنے والوں میں مقبول ہیں۔ان سے زیادہ پاپولر کہانیاں کس نے لکھی ہیں!

پوپ کہانی کے بنیادی خدوخال کو واضح کیے بغیر اور افسانہ وافسانچہ سے اسے الگ دکھائے بغیر اس کی شناخت کا مسئلہ پہلے قدم پر ہی رکا رہے گا۔جہاں تک دوسرے بیان کردہ اوصاف کا تعلق ہے۔مثلاً مقصود الٰہی شیخ کے بقول: ''پوپ کہانی، افسانہ، افسانچہ یا پارۂ لطیف سے یکسر جدا ہے۔کچھ ہے تو اپنے گوناں گوں موضوعات اچانک آمد پر قلمبند کرنے کا نام ہے۔جب قلم سے جڑا حساس دل کسی واردات کو تحریک و فیضان ملنے یا انسپائر ہونے پر سینے میں بند رکھنے کی بجائے عام فہم لفظوں میں سپردِ قرطاس کر دے تو لفظوں کا یہی روپ پوپ کہانی ہے''۔۔۔

ان اوصاف کی تو تخلیقی ادب کی تمام اصناف میں ایک جیسی اہمیت اور حیثیت ہے۔اچانک آمد پر کچھ لکھنا یا کسی واردات کو تحریک ملنے پر لکھ دینا صرف فکشن میں نہیں دوسری تمام تخلیقی اصناف میں بھی ہوتا رہتا ہے۔مقصود الٰہی شیخ نے ''عام فہم لفظوں'' میں لکھنے کا ذکر بھی کیا ہے۔انہوں نے خود زندگی بھر جو لکھا ہے وہ سارا عام فہم ہی ہے۔سو یہ ساری لفظیات ادب کی جملہ اصناف پر عمومی طور پر لاگو کی جا سکتی ہے۔مجھے احساس ہے کہ مقصود الٰہی شیخ بعض مخالفین کی مخالفت کے باعث اس موضوع پر لکھتے ہوئے تھوڑا سا غصہ میں آجاتے ہیں۔تاہم میں امید کرتا ہوں کہ وہ ایک مضمون ایسا ضرور لکھیں گے جس میں اپنے مخالفین کو یکسر نظر انداز کر کے ان لوگوں کے لیے پوپ کہانی کے خدوخال کو بیان کریں گے جو نیک نیتی کے ساتھ پوپ کہانی کو سمجھنا چاہتے ہیں۔تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ پوپ کہانی، افسانہ اور افسانچہ سے کیونکر مختلف اور الگ ہے۔اور اس کی کون سی خصوصیات ہیں جو ادب کی دوسری اصناف سے مختلف ہیں۔یہ اعتراض نہیں، سوالات ہیں اور ان کا مقصد پوپ کہانی کی شناخت کو واضح طور پر سمجھنا ہے۔کیونکہ عام فہم لفظوں میں لکھی جانے والی صنف کی شناخت بھی عام فہم/ قابلِ فہم ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل برطانیہ کے لکھنے والوں میں اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کا نتیجہ تو ان کے پانچ شعری مجموعوں کی کلیات کی صورت میں سامنے آچکا، جس کا ذکر شروع میں کر چکا ہوں۔نثر میں ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''چاند میں چڑیلیں'' سال ۲۰۰۰ء میں چھپ گیا تھا۔ان کے لکھے ہوئے متفرق تاثراتی مضامین ادھر اُدھر مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔اور اب پوپ کہانی کی جستجو میں انہوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے'' تیار کر لیا ہے۔اپنے تحریر کردہ

پیش لفظ ''پوپ میوزک سے پوپ کہانی تک'' میں انہوں نے پوپ کہانی کے مسئلہ پر کسی جذباتیت کے بغیر اس کے خدوخال کو سمجھنے کی کاوش کی ہے۔ امریکہ میں پوپ کہانی کو کیسے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے؟ اس کا بیان بھی اس پیش لفظ میں مل جاتا ہے۔ ''پوپ کہانی کیوں؟'' اور ''پوپ کہانی کیا ہے؟'' کے ذیلی عناوین کے تحت انہوں نے مغربی تناظر میں پوپ کہانی کا مسئلہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پوپ کہانی کیوں؟ میں تو جدید تر میڈیائی چیلنجز کے سامنے افسانے کی بے بضاعتی کا ذکر ہے۔ لوگ ناول پڑھ لیتے ہیں لیکن افسانہ کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ (میڈیائی یلغار ہی صرف مسئلہ ہے تو پھر ناول کیوں پڑھا جا رہا ہے؟)، شاعری تو بہت پہلے سے نظر انداز کی جا چکی ہے، وغیرہ۔ جدید تر میڈیائی یلغار بلاشبہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس کے سامنے صرف افسانہ نہیں، پورا ادب ہی نظر انداز ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس چیلنج سے عہدہ براء ہونے کے لیے ''پوپ کہانی'' نام رکھ لینے سے لوگ اس طرف راغب نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے ادب کی مجموعی اور عالمی صورت حال کے پس منظر میں ہی سب کو اپنے اپنے حصہ کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ یہ موضوع بجائے خود ایک الگ مکالمہ اور الگ بحث کا تقاضا کرتا ہے۔ اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے عام کہانی کا نام پوپ کہانی رکھ دینا مناسب نہیں۔ رضیہ اسماعیل نے مشرقی موسیقی کے سامنے پوپ کہانی کو ''لولی پوپ'' قرار دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جدید تر میڈیائی چیلنجز کے سامنے پوپ کہانی کو پیش کرنا بھی ''لولی پاپ'' دینے کے مترادف ہے۔

''پوپ کہانی کیا ہے؟'' کے تحت مغربی دنیا کے پوپ کہانی والے اسے جن اوصاف کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ سب عمومی اوصاف ہیں، جنہیں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ادب کی جملہ اصناف میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ ادب کو درپیش نئے چیلنجز کے سامنے بعض لکھنے والے سراسیمگی کی کیفیت میں ہیں۔ ایک پاپ اسٹار کی مقبولیت کے سامنے اپنی انتہائی عدم مقبولیت سے دل برداشتہ ہو کر بعض ادیبوں نے جیسے پوپ کہانی کی راہ اپنا لی ہے۔ صرف کہانی کیوں؟ آپ ادب کی ساری اصناف کو بھی پوپ کے سابقہ کے ساتھ جوڑ لیجیے۔ لیکن اس سے مقبولیت تو ملنے سے رہی۔ ادب کے دیار میں قبولیت اور مقبولیت دونوں کی اپنی اپنی جگہ ہے۔ کسی ادیب کو اچھا لکھنے کی توفیق مل جانا، قبولیت کے زمرہ میں آتا ہے اور ایک اچھے ادیب کے لیے توفیق مل جانا ہی بڑی بات ہے۔ مقبولیت ایک دوسرا موضوع ہے۔ سر، دست اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ قناعت پسند ادیب قبولیت پر ہی خوش رہتے ہیں۔ آگے جو ملے، نہ ملے، توفیق دینے والے کی مرضی۔

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے امریکہ کے پوپ کہانی لکھنے والے ایک مصنف کنگ وینکلس سے رابطہ کیا اور ان کی دو منتخب پوپ کہانیوں کو اپنے مجموعہ میں شامل کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ ''مشین'' اور ''سرخ دروازہ'' کے نام سے ترجمہ کی گئی ان دونوں کہانیوں کا ترجمہ اسماعیل اعظم نے بہت عمدگی سے کیا ہے۔ ان دونوں کہانیوں کو پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ یہ دونوں کہانیاں نیم علامتی پیرائے میں لکھی ہوئی ہیں۔ اور وہ جو پوپ کہانی کا مطالبہ تھا کہ کہانی عام فہم لفظوں میں ہو، وہ یہاں پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔ کہانی ''مشین'' سے مجھے ایسا لگا کہ کنگ وینکلس نئے لکھنے والے ہیں۔ ان میں صلاحیت ہے لیکن ابھی تک ادب کی بڑی سطح پر ان کا اعتراف نہیں کیا گیا، یا مناسب پذیرائی نہیں کی گئی۔ چنانچہ وہ بڑے لکھنے والوں اور اہم نقادوں کو کہانی میں تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔

''سُرخ دروازہ'' مختلف رنگوں کی علامات کے سہارے کہانی کو دلچسپ اختتام تک پہنچاتا ہے۔دونوں کہانیوں سے ایسا تاثر بھی ملتا ہے کہ امریکہ میں آزادئ اظہار کے باوجود بہت کچھ کہنے میں مسائل کا سامنا ہوسکتا ہے۔چنانچہ کنگ وینکلس نے علامات کا سہارا لے کر اپنے مخصوص نیم علامتی پیرائے میں اپنے دل کی بات کہہ دینے کی کوشش کی ہے۔''مشین'' میں تو نیم علامتی پیرایہ نیم سے کچھ زیادہ کھلتا دکھائی دیا تو انہیں آخر میں یہ اضافی نوٹ دینا پڑ گیا:''اس کہانی میں جس سوسائٹی کی منظر کشی کی گئی ہے۔امریکی معاشرے سے اس کی کوئی مماثلت نہیں ہے۔''

کنگ وینکلس کی دو کہانیوں کے بعد ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نے اپنی بارہ کہانیاں شامل کی ہیں۔ان کی پہلی کہانی ''تھرڈ ورلڈ گرل'' کے اختتام تک پہنچا تو ایسا لگا کہ سچ مچ کوئی گونگی کہانی بول پڑی ہے۔''ائر فریشنز'' صرف برطانیہ ہی کی نہیں اب تو یورپ بھر کے پاکستانیوں کی مجموعی فضا کی ترجمانی کر رہا ہے۔اور''آنر کلنگ'' پڑھتے ہوئے ایسے لگا کہ کہانی صرف بول نہیں پڑتی بلکہ بعض اوقات چلّاتی بھی ہے۔قبل از اسلام کے مکہ میں زندہ گاڑ دی جانے والی بیٹیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی جیسے اکیسویں صدی کی انوکھی آنر کلنگ میں شامل ہوگئی ہیں۔تب اس ظلم کو غیرت کے جاہلانہ تصور پر تحفظ حاصل تھا اور اب اسے خود مذہب کے نام پر تحفظ حاصل ہے۔''تھرڈ ڈائمنشن'' برطانیہ میں اسائلم لینے کی سہولتوں سے سچ جھوٹ بولنے کی کسی حد تک چلے جانے والوں کی دلچسپ کہانی ہے۔باقی ساری کہانیاں بھی اپنی اپنی جگہ دلچسپ ہیں۔''ریڈیو کی موت'' کہانی کو میں نے یہ سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تھا کہ سیٹلائٹ اور ٹیلی ویژن چینلز کی نت نئی کرشمہ سازیوں کے سامنے ریڈیو کے دَم توڑنے کی کہانی ہوگی۔لیکن یہ تو ایک بھلی مانس سی کہانی نکلی۔لیکن اپنی بھل منسئی کے باوجود کہانی اچھی ہے۔''کہانی بول پڑتی ہے'' میں شامل ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی بارہ کہانیاں ان کے اندر کی افسانہ نگار کا پتہ دیتی ہیں۔یہ کہانیاں برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی مختلف النوع کہانیاں ہیں۔خامیاں اور خوبیاں، دوسروں کی ہوں یا اپنوں کی، ان سب کو ایک توازن کے ساتھ نشان زد کیا گیا ہے۔کہیں کہیں تبلیغی رنگ غالب ہونے لگتا ہے لیکن صرف ایک دو کہانیوں میں ایسا ہوتا ہے۔بیشتر کہانیوں کا اختتام جیسے ہلکا سا ادھورا چھوڑ دیا جاتا ہے، لیکن یہ عمل کسی نوعیت کا ابہام پیدا نہیں کرتا، بلکہ قاری خود کہانی میں شریک ہو کر اسے مکمل کر لیتا ہے، کیونکہ اختتامی ادھورا پن ایک واضح اشارا چھوڑ جاتا ہے۔اس سے کہانی کا سادہ بیانیہ ایک رنگ میں علامتی سا بن جاتا ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی یہ کہانیاں اردو افسانے کے سفر کا تسلسل ہیں۔افسانہ غیر مقبول ہے یا سارا ادب ہی غیر مقبول ہوتا جا رہا ہے؟ وہ مقبولیت کے کسی پھیر میں نہیں پڑیں۔ان کے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ انہیں یہ کہانیاں تخلیق کرنے کی توفیق مل گئی۔قبولیت نصیب ہوگئی۔توفیق ملنے کی اس قبولیت پر میری طرف سے دلی مبارک باد!

حیدر قریشی

مدیر **جدید ادب** جرمنی

۱۴ر مئی ۲۰۱۲ء

خواندنی اور جاذبِ نظر کہانیاں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل نظم ونثر میں کہانیوں کے زیرِ نظر مجموعے ''کہانی بول پڑتی ہے'' سے پہلے بھی بہت کچھ تصنیف کر چکی ہیں لیکن یہ مجموعہ کئی خصوصیات کے باعث خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے ان کہانیوں کو 'پوپ سٹوریز' کا نام دیا ہے اور پیش لفظ میں اس اصطلاح کے مفہوم پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔ پوپ سٹوریز درحقیقت پوپ میوزک کے زیرِ اثر وجود میں آنے والی اصطلاح ہے۔ دونوں میں قدرِ مشترک صرف مقبولیت ہے۔ مصنفہ امریکی پوپ سٹوری رائٹر کنگ وینکلس (King Wencles) سے متاثر ہوئی ہیں مگر یہ کہانیاں علامتی ہیں جبکہ ڈاکٹر صاحبہ کی کہانیاں واقعات کو براہِ راست اور اکہرے انداز میں بیان کرتی ہیں جن کے کردار خصوصاً نسوانی کردار ایک خاص کشش کے حامل ہیں۔ یہ پڑھی لکھی، ذہین، متجسس، دلکش اور متنوع صلاحیتوں کی حامل لڑکیاں ہیں جو اکثر شادی کے بعد انگلینڈ میں سکونت پذیر ہو گئی ہیں مگر ابھی اپنی روایات، عقائد اور اندازِ بود و ماند میں بہت حد تک پاکستانی ہیں۔ وہ اپنے نئے ملک میں نسلی تفاوت اور ماحول کی اجنبیت سے دوچار ہیں مگر ان میں سے بعض رفتہ رفتہ اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جبکہ کچھ ایسی بھی ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے نئے ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتیں اور مشکلات کا شکار رہتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں مقیم متوسط طبقے کے پاکستانی تارکینِ وطن کے کئی مسائل مزاجی تضادات ان کہانیوں میں منعکس ہوئے ہیں اور ہمیں غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں۔

ان کہانیوں میں سے اکثر کے عنوانات انگریزی میں ہیں اور اسلوب میں بھی جگہ جگہ انگریزی الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے لیکن یہ سب اس لیے بُرا معلوم نہیں ہوتا کہ جس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اس کے لیے یہ بہت حد تک ضروری ہے تاہم ڈاکٹر صاحبہ جہاں خالص اردو میں لکھتی ہیں وہاں اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ رواں اور زبانِ اردو کے مزاج کے مطابق نثر لکھنے پر بھی قدرت رکھتی ہیں۔

مصنفہ کے نزدیک 'پوپ کہانیاں' دلچسپی کے عنصر کی حامل ہونی چاہئیں اور یقیناً اس مجموعے کی ہر کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ سہولت کے ساتھ دس پندرہ منٹ میں آسانی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ پاپولر لٹریچر کا بڑا مقصد یہی ہوتا ہے۔ یہ قاری کو فلسفیانہ، مابعد الطبیعاتی اور گہرے نفسیاتی مسائل میں الجھانے کی بجائے وہی کچھ پیش کرتا ہے جو دلچسپی برقرار رکھے۔ اس قسم کے ادب کا قاری کبھی کبھی ''پاپولر'' کی حد کو عبور کر کے گھمبیر مسائل پیش کرنے والے ادب کی طرف پیش رفت کر جاتا ہے۔

بہر حال میں نے ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی ان کہانیوں کو بہت دلچسپی توجہ طلب اور جاذب پایا ہے اور امید ہے کہ دیگر پڑھنے والے بھی انھیں خواندنی (Readable) اور جاذبِ نظر پائیں گے۔

خواجہ محمد زکریا
پروفیسر امریطس (اردو) پنجاب یونیورسٹی، لاہور

'پوپ کہانی' از کنگ وینکلس
اُردو ترجمہ: اسماعیل اعظم

مشین
(The Machine)

یہ بات قدرے حیران کن تھی کہ فنلے بڑا ہو کر ایک رائٹر بننا چاہتا تھا۔ اس کا تعلق ایک آسودہ حال مڈل کلاس گھرانے سے تھا جہاں کتاب کو فنون لطیفہ کا درجہ حاصل تھا۔ کتاب کو سنبھال کر رکھنے اور اس کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرنے کو ایک اہم فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پڑوس میں بچوں کو اپنے گھروں سے باہر کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ اس میں کسی قسم کے خطرات تھے۔ دیگر بچوں کی طرح وہ بھی گھر کے اندر زیادہ تر کمپیوٹر سکرین پر ہی مصروف رہتا۔ تاہم اس نے اس ماحول سے بغاوت کا اعلان اپنے والدین کی احتیاط سے جمع شدہ کتب کے مطالعہ سے شروع کیا۔ وہ کتابیں پڑھنے کے بعد انہیں اس قدر احتیاط سے صاف کر کے رکھتا کہ اس کی انگلیوں کے نشان تک ان پر نظر نہیں آتے تھے۔

بس اس کتب بینی کے دوران ہی اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ ایک رائٹر بننا چاہتا تھا۔ مقامی کالج سے رائٹر ٹریننگ کا امتحان اُس نے بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ گو کہ یہ ٹریننگ کافی مہنگی تھی مگر اس کے مالی طور پر خوشحال والدین کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔

اس کے والدین اس کے رائٹر بننے کے فیصلے سے ناخوش تھے کیونکہ یہ فیصلہ ان کی توقعات کے برعکس تھا۔ اس نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی جب وہ پہلے دن رائٹرز ٹریننگ اکیڈمی گیا۔ اس کے والدین نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار الفاظ میں تو نہیں کیا (کیونکہ ساری زندگی انہوں نے کبھی بھی زبانی طور پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا) مگر وہ ان کے چہروں کے تاثرات واضح طور پر پڑھ سکتا تھا۔

رائٹر ٹریننگ اکیڈمی بھی کسی فوجی کیمپ سے کم نہ تھی۔ جہاں دوسرے طالب علم اس کی کہانیوں کے خوب خوب بخیے ادھیڑتے اور پھر وہ کہانی کو دوبارہ سے درست کرتا۔ اس نے یہاں ایک بات خاص طور پر سیکھی کہ وہ کیا کہہ سکتا تھا اور کیا نہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم کہ اُسے کیا سوچنا چاہیے اور کیا نہیں سوچنا چاہیے! آخر کار سخت مشقت کے بعد اس نے اپنی ٹریننگ مکمل کر کے ڈگری وصول کی جو کہ حقیقتاً صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ہی تھا۔ مگر اس کا بات کا ثبوت تھا کہ اب وہ ایک رائٹر بن چکا ہے۔ فنلے کو ایک ادبی پوزیشن پر تعینات کر کے ہدایت کی گئی کہ وہ اگلے ہفتے کے آغاز میں لٹریچر بلڈنگ میں رپورٹ کرے۔

لٹریچر بلڈنگ ایک سفید رنگ کی بدہیبت اور بے ہنگم سی عمارت تھی۔ اگر وہاں انٹرس کا سائن نہ لگا ہوتا تو اسے شاید دروازہ بھی نظر نہ آتا۔ عمارت کے اندر داخل ہوتے ہی ایک گائیڈ نے اس کے کوٹ کے کالر پر اس کے نام کی چٹ لگا دی اور اسے اپنے ساتھ آنے کی درخواست کی۔ وہ دونوں سفید راہ داریوں کی بھول بھلیوں میں تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ گائیڈ نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ ''میں مسٹر بینک ہوں اور تمہیں اس بلڈنگ کے بارے میں معلومات دوں گا۔'' وہ دونوں ایلوویٹر کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچے۔ مسٹر بینک نے جمپ سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا تاہم اس کی امتیازی خصوصیت اس کے چہرے پر اس کی بڑی بڑی قلمیں اور تنگ شیشوں کی عینک تھی۔ جونہی وہ ایلویٹر سے نکل کر سفید راہ داری میں آئے اس نے دیکھا کہ وہاں سب حضرات نے تنگ شیشوں والی نظر کی عینکیں لگا رکھی تھیں اور ان کی قلمیں بھی مسٹر بینک کی طرح بڑھی ہوئی تھیں۔ جبکہ خواتین نے اپنی امتیازی حیثیت کا مظاہرہ ناک میں نتھتیاں پہن کر کیا ہوا تھا۔

اگلے ہفتے شاید ڈریس کوڈ قدرے مختلف ہوتا۔ تاہم اس ہفتے کا ڈریس کوڈ۔ تنگ شیشوں والی عینکیں، لمبی لمبی قلمیں۔ اور ناک میں نتھیاں تھی۔

فنلے اپنے گائیڈ کے ساتھ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں تین دروازے تھے جن پر ترتیب وار لکھا ہوا تھا ''ناول'' ''کہانیاں'' اور ''شاعری'' مسٹر بینک نے ناول کی تختی والا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سارا کمرہ رائٹرز سے بھرا ہوا تھا جو کہ کمپیوٹر ٹرمینلز پر پوری تندہی سے کام میں مصروف تھے۔

مسٹر بینک نے کہا کہ ان کا کام ناقابلِ فہم نثر کی طویل کتابیں لکھنا ہے جنہیں لٹریچر بلڈنگ کے باہر کوئی نہیں پڑھتا۔ اچانک مسٹر بینک نے سوال کیا کہ ''کیا تم پچھلی قطار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہے ہو۔ یہ ناول کے نقاد ہیں۔ ان کا کام ناقابل فہم نثر کے طویل تنقیدی مضامین لکھنا ہے جنہیں لٹریچر بلڈنگ کے باہر کوئی بھی پڑھنا پسند نہیں کرتا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ صرف تین افراد پر مشتمل گروپ ہے۔''

اب دونوں اس دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے جن پر کہانیوں کا سائن لگا ہوا تھا۔ یہ کمرہ ناول لکھنے والے کمرے کی طرح رائٹرز سے بھرا ہوا تھا۔ تاہم یہاں خواتین کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ تھی جبکہ ناول روم میں مردوں کی تعداد خواتین سے زیادہ تھی۔ وہ مردوں اور خواتین رائٹرز کے اس تناسبی فرق کو بالکل نہ سمجھ سکا۔ مسٹر بینک نے اسے قدرے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا کہ ''اس کمرے میں صرف گھریلو کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں صرف ایسی کہانیاں جو کہ لٹریچر بلڈنگ کے باہر صرف تھوڑے سے لوگ پڑھتے ہیں۔''

مسٹر بینک نے شاعری کے سائن والا دروازہ کھول کر فوراً ہی بند کر دیا۔ اور منہ سے ایک بے معنی سی آواز نکالی۔ فنلے نے اس فوری عمل کے دوران کمرے کی ایک جھلک دیکھ لی۔ جہاں رائٹرز بڑی سنجیدگی اور محنت سے سفید سفید کاغذوں پر بڑی سرعت سے کچھ لکھ رہے تھے مگر وہ شاعرانہ کام نظر نہیں آتا تھا۔ مسٹر بینک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ سب لوگ جان بوجھ کر ڈسپلن کا

خیال نہیں رکھتے۔ان کے کام کا بنیادی نقطہ عام لوگوں کے بارے میں غیر دل چسپ باتیں لکھنا ہے جو کہ کوئی بھی نہیں۔ یہاں تک اس بلڈنگ والے بھی کبھی نہیں پڑھتے۔اگر تم وہ الفاظ سن لو جو یہ لکھ رہے ہیں تو تم فوراً نیند کی وادیوں میں اتر جاؤ۔میرے خیال میں لٹریچر بلڈنگ میں ہر فرد ایک نہایت سنجیدہ فن پارے پر کام کر رہا ہے۔جو کہ میوزیم میں محفوظ کر لیا جائے گا تا کہ آنے والی نسلیں اس سے فیض یاب ہو سکیں۔تاہم میں اس کمرے کے رائٹرز کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھوں گا۔'' مسٹر بینک نے ہلکے سے اپنی ایڑھی فرش پر مار کر سر کو جھٹکا دیا اور جو کچھ کمرے میں دیکھا تھا اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

بعد ازاں وہ ایک ایسی راہداری میں پہنچے جہاں کچھ اور دروازے تھے جن پر مختلف ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔مسٹر بینک نے ان دروازوں کی طرف دیکھتے ہوئے فنلے سے کہا کہ ''ان کمروں میں جانا وقت کا زیاں ہے اور تمہیں شاید اپنی پوری ملازمت کے دوران کبھی اس کی ضرورت نہ پڑے۔تاہم فنلے نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جس پر ایڈوکیسی کی تختی لگی ہوئی تھی کہ اس کے بارے میں کچھ بتائیں۔مسٹر بینک نے اس کمرے کا دروازہ کھول دیا۔کمرہ بالکل خالی تھا۔نہ کوئی ساز و سامان اور نہ ہی کوئی لوگ۔صرف کمرے کی سفید دیواریں ایک دوسرے کو گھور رہی تھیں۔''یہ ایڈوکیٹس کا سیکشن ہے جہاں بیٹھ کر وہ رائٹرز کی تحریروں پر کھلم کھلا اپنی مخالفانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔اس سیکشن کے تمام اعلیٰ عہدیدار موسمی تعطیلات کی وجہ سے ساحل سمندر پر گئے ہوئے ہیں۔''

فنلے نے سوال کیا کہ باقی ملازمین کہاں ہیں۔مسٹر بینک نے استفہامیہ نظروں سے فنلے کی طرف ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ یہاں کوئی بھی نہیں ہے بلکہ پورے ملک میں مخالفانہ رائے رکھنے والا کوئی بھی رائٹر نہیں ملے گا۔تھوڑا اور چلنے کے بعد وہ ایک اور دروازے کے پاس پہنچے۔جس پر آویزاں تختی پر درج تھا۔'' The Club of Insiders ''اور اس تختی کے پیچھے ایک اور چھوٹی تختی لگی ہوئی تھی۔جس پر تحریر تھا ''Private'' پوری بلڈنگ میں صرف اس کمرے کے اندر سے گہما گہمی کی مدہم سی آوازیں راہداری میں سنائی دے رہی تھیں۔مسٹر بینک نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھول کر دیکھا۔دونوں نے شراب کے گلاسوں کے آپس میں ٹکرانے کی مدہم آواز اور چرمی صوفوں اور سگار کی ملی جلی باس محسوس کی اور اس کے ساتھ ہی مسٹر بینک نے قدرے زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا کہ یہ ''لوگ بالکل کوئی توجہ نہیں دیتے کہ یہاں کون آیا اور کون گیا، مجھے یقین ہے کہ یہ سب اپنی کسی اگلی سمندری پارٹی کی منصوبہ بندی کر رہے ہوں گے۔یہ سب لوگ گذشتہ دور کے ادب کی نشانیاں ہیں۔ان کا سورج اب غروب ہو رہا ہے۔مسٹر بینک نے کہا کہ اس سارے سیکشن کو ختم کر دینے کا پروگرام ہے کیونکہ یہ فنڈز کا انتہائی غیر ضروری استعمال ہے۔''

اس دروازے سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور دروازہ تھا۔جس پر آؤٹ سائیڈرز کی تختی لگی ہوئی تھی۔مسٹر بینک نے وہ دروازہ کھولا تو اس کمرے میں ویسے ہی رائٹرز کمپیوٹر ٹرمینلز پر بیٹھے ہوئے تھے جیسے کہ ساری عمارت میں تھے مگر کسی نے بھی سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ان سب کی نظریں کمپیوٹر سکرین پر جمی ہوئی تھیں۔''لیکن یہاں آؤٹ سائڈرز بھی رکھنے پڑتے ہیں اور یہ سب آؤٹ سائڈرز ہیں۔''مسٹر بینک نے وضاحت کی مگر کمرے میں موجود رائٹرز نے اپنی تیز رفتار ٹائپنگ ویسے ہی جاری رکھی جیسی کے

ان دونوں کی آمد سے قبل تھی۔

فنلے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا کہ دوسرے آؤٹ سائڈرز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔مسٹر بینک نے قدرے حیرت سے منہ بنا کر پوچھا۔''دوسرے کون؟''فنلے نے وضاحت کی کوشش کی لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ جو پوچھنا چاہتا ہے وہ کہیں اس کے ذہن میں تحلیل ہو رہا ہے۔تاہم اس نے سرعت سے کہا کہ''میرا مطلب ہے میں ان آدمیوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جو اس عمارت کے باہر ہیں۔''مسٹر بینک نے بڑے استہزائیہ انداز میں کہا''واقعی کوئی ہیں عمارت سے باہر کیا تم انہیں دیکھ سکتے ہو؟'' فنلے خاموش رہا۔مسٹر بینک نے پھر پوچھا۔''کیا تم انہیں دیکھ سکتے ہو۔''فنلے نے جواب دیا کہ''بے شک میں انہیں نہیں دیکھ سکتا کیونکہ اس عمارت میں کوئی کھڑکی ہی نہیں ہے۔''"Exactly"مسٹر بینک نے جواب دیا۔

ابتدائی تعارف کے بعد فنلے کو ایک اسائنمنٹ دی گئی اور وہ یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوا کہ اسے شاعری یا آؤٹ سائڈرز کی بجائے ناول کے سیکشن میں اسائنمنٹ ملی ہے۔تاہم اسے ایک غیر معینہ مدت تک اپرینٹس کے فرائض انجام دینے تھے۔فنلے قدرے پریشان سا تھا کہ کہیں ٹریننگ کے دوران اس کے منہ سے یونہی کوئی غلط سلط بات نہ نکل جائے۔اگلے روز وہ اپنے نامزد کردہ کمرے میں پہنچا جو کہ عمارت کی بالائی منزلوں میں واقع ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔اس نے بھی وہی لباس زیب تن کر لیا جو بلڈنگ میں باقی ماندہ رائٹرز نے پہنا ہوا تھا۔تنگ شیشوں والی عینک بھی اس نے آنکھوں پر لگائی تھی اور اپنی قلمیں بھی بڑھانی شروع کر دی تھیں۔وہ اپنے رائٹر سرٹیفکیٹ کو اس دیوار پر آویزاں کرنا چاہتا تھا مگر کوئی صورت نہ نکلنے پر اس نے سرٹیفکیٹ کو اپنے کی بورڈ اور مانیٹر کے درمیان پھنسا کر رکھ دیا۔

اس تمام کارروائی کے بعد فنلے اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر اپنے غیر مجتمع خیالات کو ایک شکل دینے کے لیے تیزی سے ٹائپ رائٹر پر اپنے ہاتھ چلانے لگا۔سب سے پہلے تو اسے اس بات کا شدید افسوس تھا کہ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔اس کے لیے اپنے ذہن سے کھڑکی کو جھٹک دینا اس قدر آسان نہیں تھا۔کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بچپن میں اس کے کمرے میں ایک کھڑکی تھی جس سے وہ اکثر باہر کے مناظر دیکھتا رہتا تھا۔مگر کچھ دیر افسوس کرنے کے بعد اس کے ذہن سے کھڑکی محو ہونے لگی اور اس کے اندر سے کہیں ایک آواز ابھری۔

''کھڑکی کے بغیر تو کوئی کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی!''

☆ (مصنف کی طرف سے تاکیدی نوٹ کہ اس کہانی میں جس سوسائٹی کی منظر کشی کی گئی ہے۔امریکی معاشرے سے اس کی کوئی مماثلت نہیں ہے)

'پوپ کہانی' از کنگ وینکلس
اُردو ترجمہ: اسماعیل اعظم

سرخ دروازہ
(The Red Door)

''سرخ دروازے سے ہشیار رہیں''"Beware the Red Door"

ایڈم اپنے غبار آلود ذہن سے نشہ آور دوائیوں کے اثرات جھٹکنے کی کوشش میں پوری طرح مصروف تھا مگر اس کے ذہن میں یہ آواز مسلسل گونج رہی تھی۔

وہ سیاہ دیواروں والی نیم روشن راہداریوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں نو ملی میٹر کا ایک آٹو میٹک پستول تھا۔ یہ ہتھیار اسے کس نے فراہم کیا تھا اور وہ یہاں سے کیسے بچ کر نکل سکے گا؟ ''سرخ دروازے سے ہوشیار رہیں۔'' اس آواز کی بازگشت ایڈم کے ارتعاش زدہ ذہن میں مسلسل گونج رہی تھی اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ آواز کس کی تھی۔

ایڈم گرانٹ ایک سابقہ امریکی فوجی تھا جسے سیکرٹ گورنمنٹ انٹیلی جنس ٹریننگ پروگرام کا حصہ بننے پر آمادہ کیا گیا تھا۔

اس ٹریننگ پروگرام میں شمولیت کے بعد ایڈم کو محسوس ہوا کہ ٹریننگ پروگرام چلانے والے اہلکاروں کو یقین ہے کہ ایڈم کے پاس کچھ بہت اہم خفیہ معلومات تھیں جو اس نے افغانستان میں لڑائی کے دوران حاصل کی تھیں۔

ٹریننگ یونٹ کے کرتا دھرتا نے ایڈم سے اس سلسلے میں کئی سوالات بھی کیے تھے۔ تاہم یہ صرف سوالات نہیں تھے بلکہ ایک باقاعدہ تفتیش تھی۔ جو کہ کنٹرول آفیسر ہنڈرسن کی نگرانی میں ہو رہی تھی۔ مسٹر ہنڈرسن گھنی مونچھوں والا ایک دراز قد آفیسر تھا۔ جو کہ دبیز شیشوں کی عینک استعمال کرتا تھا۔ اسے دیکھنے سے یوں لگتا تھا جیسے اس کے ظاہری چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ چھپا ہوا تھا۔ مسٹر ہنڈرسن اپنی تفتیش کے دوران بار بار یہ فقرہ دہراتا رہا کہ ''تم ہمیں ضرور بتاؤ گے'' اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر آنکھیں چندھیا دینے والی تیز روشنیاں ڈال دی جاتیں۔

ایڈم نے اس سے پوچھا کہ ''تم کیا چاہتے ہو؟ اگر مجھے کچھ معلوم ہے بھی تو۔۔۔'' اور اسکے ساتھ ہی اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

نشے کے اثرات، غبار آلود ذہن، نہ ختم ہونے والی تیز روشنیاں اور مسلسل بے خوابی، کبھی تو اسے لگتا جیسے ہنڈرسن کی آواز

کہیں اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تو نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔ پھر وہ یہ خیال ذہن سے یکسر جھٹک دیتا۔ کیونکہ سرخ دروزے کے بارے میں جو آواز اس نے سنی تھی وہ ہنڈرسن کی آواز سے ذرا سی بھی مماثلت نہیں رکھتی تھی۔ اچھی اور بری آواز کے فرق کو وہ واضح طور پر جانتا تھا۔ اچھی آواز جانی پہنچانی سی، قابل بھروسہ حوصلہ بڑھانے والی اور اپنے اندر نرم گرم تمازت رکھتی تھی لیکن وہ ذہن میں مسلسل گونجنے والی آواز کے ماخذ کو پہچاننے میں ناکام تھا۔ عمارت کی بھول بھلیاں سیکرٹ یونٹ کی ٹریننگ کا ایک اہم حصہ تھیں کیونکہ ٹریننگ یونٹ کے اہل کار چاہتے تھے کہ ایڈم اپنی حرکات وسکنات سے خود اپنی حقیقت آشکارا کردے۔

مسٹر ہنڈرسن نے اسے خبردار کیا کہ آگے دروازوں کی ایک قطار آرہی ہے جو اسے مختلف آپشنز دے گی۔ تفتیشی افسر کا خیال تھا کہ وہ جو بھی راستہ منتخب کرے گا اور جس طرح کا عمل روا رکھے گا اس سے ان پر اس کی حقیقت کھل جائے گی۔

ایڈم کو لگ رہا تھا کہ جیسے اسے کسی سازش میں ملوث کیا جارہا ہو۔ ''آخر اس پستول کا کیا مطلب ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے سر کا درد اور بھاری پن یکدم کافور ہوگیا اور وہ اپنی دماغی صلاحیتوں کو مجتمع کرتے ہوئے ایکدم چوکنا ہوگیا۔

ذرا آگے بائیں ہاتھ پر سیاہ دیوار میں ایک نمایاں سفید دروازہ نظر آرہا تھا۔ ایڈم دروازے کے باہر کھڑا ہوکر اس کا جائزہ لینے لگا۔ جس پر ایگزٹ یعنی ''باہر نکلنے کا راستہ'' لکھا ہوا تھا۔ ''کیا اسے دروازہ کھولنا چاہیے؟ ان سرخ اور سفید رنگوں کا کیا مطلب ہے'' اسی شش وپنج میں مبتلا ایڈم نے دروازے کے ہینڈل کو چھوا مگر دروازہ نہیں کھولا۔ اس کے بجائے وہ سیدھا آگے کی طرف بڑھ گیا۔ ''کیا وہ یاد رکھ پائے گا اگر اسے سفید دروازے تک پلٹ کر آنا ضروری ہوا تو کیا وہ واپس آسکے گا؟'' اس نے سوچا اسی اثنا میں سفید دروازہ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور وہ ایک بار پھر وہاں کی بھول بھلیوں میں گم ہوگیا۔

آگے نظر آنے والا دروازہ سبز رنگ کا تھا۔ یہ سبز رنگ کیوں؟ وہ گہری سوچ میں تھا کہ مخصوص رنگوں کے استعمال کا یقینا کوئی مطلب ہے اور یہ کسی نہ کسی خاص بات کی غمازی کرتے ہیں ایڈم نے ذہن پہ زور دیتے ہوئے کہا سوچو ایڈم۔۔۔ سوچو کیونکہ اسے یہ احساس تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ "Choices" وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے صحیح دروازے کا انتخاب کرلیا تو وہ وہاں سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ غلط انتخاب کی صورت میں ایک ٹریجڈی اس کی منتظر تھی۔

وہ مسلسل بھاگ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک ہی دائرے میں لگاتار چکر لگا رہا ہے۔ اگلا دروازہ۔ پھر ایک اور دروازہ۔ سفید اور سبز دروازے جنہیں وہ دوبارہ نہیں دیکھ سکا جس سے اسے احساس ہوا کہ وہ کسی دائرے میں چکر نہیں لگا رہا تھا بلکہ مسلسل آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''سرخ۔۔۔ سفید۔۔۔ سبز!'' وہ دہراتا جارہا تھا۔ ''سبز رنگ سے گھاس۔ فطرت اور مٹی یا زمین کا مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے اگر سبز رنگ زمین کی نمائندگی کرتا ہے تو پھر سرخ رنگ کو آگ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔'' ایڈم ان تمام رنگوں کا مطلب ڈھونڈنے کی کوشش میں اپنے ذہن پر بار بار زور دے رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہ پا کر اس نے خود کو سرزنش کی کہ ''نہیں۔۔ نہیں۔۔ یہ سب بکواس ہے۔

بس ابھی سوچتے رہو۔سوچتے رہو۔۔۔''اس نے پھر سے بھول بھلیوں میں بھاگنا شروع کر دیا۔سیاہ اور تاریک راہداری میں سخت گرمی تھی۔شدید حبس میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔پسینے کے قطرے مسلسل اس کے چہرے سے نیچے گر رہے تھے۔اس نے سیاہ رنگ کا سوئٹر اور جین پہن رکھے تھے اور آٹو میٹک پستول پر اس کی گرفت مضبوط تھی مگر عدم تحفظ کا احساس بہت واضح تھا۔

ہوا کی کثافت سے وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ جگہ زیرِ زمین ہے اور کافی گہرائی میں ہے۔اسے یقین تھا کہ یہ جگہ ٹریننگ یونٹ کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے بالکل نیچے تھی۔جہاں وہ ٹریننگ کے لیے پہلے دن آیا تھا۔''کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے۔چند ہفتے یا چند دن!''اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔اسے یاد آ رہا تھا کہ''جب اس نے پہلی مرتبہ ٹریننگ یونٹ میں رپورٹ کیا تھا تو اس کی ملاقات مسٹر ہنڈرسن سے ہوئی تھی مگر ہنڈرسن تو محض ایک سراب تھا۔اسے لگ رہا تھا کہ وہ مسٹر ہینڈرسن کو پہلے بھی مل چکا تھا۔شاید یہ بھی کسی اہم راز کا ہی حصہ تھا۔اسے یقین تھا کہ اس کی ملاقات مسٹر ہنڈرسن سے افغانستان میں ہوئی تھی۔کہاں۔۔۔۔کیسے۔۔۔۔!''

ایڈم کا مسئلہ ابھی تک جوں کا توں تھا۔اسے ابھی تک سرخ دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔جس کے بارے میں اسے نیم غنودگی کی حالت میں ایک آواز نے مطلع کیا تھا۔''سرخ دروازے سے ہوشیار رہنا۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ''سرخ دروازہ ملنے پر اس کا ردعمل کیا ہوگا اور شاید یہی چیز اس کی زندگی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوگی!''

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ''آگ اور مٹی چار علامتوں میں سے دو علامتیں ہیں جبکہ ہوا اور پانی دیگر دو علامتیں ہیں۔اس نے سوچا کہ سفید دروازہ یقیناً ہوا ہوگا۔تو کیا وہ اس دروازے سے بچ کر نکل سکتا تھا!''

''آگ، ہوا، پانی۔مٹی''وہ سوچتا رہا کہ رنگوں کی طرح چاروں عنصری علامات کا بھی یقیناً کوئی مطلب ہے اور ان بھول بھلیوں کا خالق یقینی طور پر قدیم میتھالوجی سے باخبر معلوم ہوتا ہے۔ایڈم نے اس سبجیکٹ کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔اس لیے اس کے ذہن نے اس کی یادداشت کے بند دروازوں پر دستک دینی شروع کر دی۔تاہم انسانی علم کی بنیاد اور تہذیب کے اسرار اس کے لیے کلی طور پر ناقابل فہم تو نہیں تھے لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں تھا۔وہ اس دوران مسلسل بھاگتا رہا اس امید پر کہ اسے دوسرے دروازے بھی نظر آ جائیں تو وہ کسی فیصلے پر پہنچ سکے کیونکہ وہ پوری تیاری کے بغیر کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ سوچ کے گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ''سفید رنگ کی اگر ہوا سے مماثلت ہے تو پھر یہ جھگڑے، تضاد اور کشمکش کی نشانی ہے۔سبز رنگ زمین سے نسبت رکھتا ہے اور اس کی مماثلت۔۔۔۔؟ان چار عناصر کی ترتیب اور کیا ہے''اس کا ذہن الجھ سا رہا تھا۔اس نے چاروں عناصر کی ترتیب کو تاش کے پتوں سے منسلک کر کے کچھ مزید سمجھنے کی کوشش کی۔اس کے خیال میں تاش کے پتوں کی ایک قدیم تاریخ ہے جس کا آغاز قسمت کا حال بتانے والے ٹارو کارڈز سے جا کر ملتا ہے۔وہ سوچنے لگا کہ''ٹارو کارڈز کی چار علامات کونسی ہیں۔اگر سپیڈز کو تلوار سمجھ لیا جائے۔لڑائی جھگڑے یا تضاد یا کشمکش کو ہوا (سفید رنگ) خیال کر لیا جائے۔ڈائمنڈ والے کارڈز کو پینٹی کلز مان لیا جائے۔زمین، سبز رنگ کی ہے جو کسی شخص کی پریکٹیکل فطرت کو ظاہر کرتے ہیں یعنی ڈالرز بزنس کاروبار وغیرہ وغیرہ۔''

تلوار تو پھر ملٹری یعنی فوج کا سمبل بھی ہے ان سب چیزوں پر غور و فکر کرتے کرتے اسے یہ سوچ کر قدرے مسرت کا احساس ہوا

کہ اس نے سفید دروازہ نہیں کھولا وگرنہ وہ وہاں سے کب کا فرار ہو چکا ہوتا۔

تاش کے پتوں میں کلبز کا سمبل ٹارو میں وانڈز سے آیا ہے جو کہ خیالات کی نمائندگی کرتا ہے جس میں تخلیل سوچ بچار ذہنی استعداد اور ذہانت شامل ہیں یعنی اس لفظ کے بہت سے مطلب ہو سکتے ہیں۔

آگ کا نشان۔۔۔اسے علم تھا کہ یہ اس کا دشمن تھا۔اور یہی سرخ دروازہ تھا جس سے اسے ہشیار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ چلتے چلتے اسے نیلے رنگ کا دروازہ دکھائی دیا۔ایک ایسا رنگ جس کے بارے میں اس نے ابھی تک کچھ سوچ بچار ہی نہیں کی تھی۔اس نے بائیں ہاتھ سے دروازے کے ہینڈل کو پکڑا، جبکہ دائیں ہاتھ میں پستول پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔اور وہ اسے چلانے کے لیے بالکل مستعد تھا۔اس نے دروازہ پوری طرح کھول دیا مگر فائر نہیں کیا کیونکہ اس کے ذہن میں نیلے رنگ کا مطلب یکدم واضح ہو گیا۔ ارے یہ تو پانی کی نشانی ہے۔جو کہ ٹارو کارڈز میں کپس، ہارٹس، آرٹسٹ، جذبات، محبت اور خوبصورتی کی علامت تھا۔

اس کے ساتھ وہ جیسے ہی اپنی سوچ کی گرفت سے آزاد ہوا ایڈم نے اپنے آپ کو ایک نہایت حسین وجمیل اور نازک اندام حسینہ کے بازوؤں میں پایا۔اس نے اپنی ساری زندگی میں اس قدر خوبصورت عورت شاید ہی دیکھی تھی۔وہ اس کی چمکیلی زلفوں کی مسحور کن مہک سے مدہوش سا ہو رہا تھا۔اسے خوشی تھی کہ اس نے اس عورت کو قتل نہیں کر دیا تھا۔وہ اس کے وجود کی نرماہٹ اور گداز سے لطف اندوز ہو رہا تھا جس کی اسے اشد ضرورت تھی۔اسے یوں مدہوش دیکھ کر عورت نے کہا کہ ''تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔تمہیں ابھی ایک اور دروازہ تلاش کرنا ہے۔'' ایڈم نے عورت سے پوچھا ''کیا تم ایجنٹ ہو'' عورت نے پلکیں جھپکتے ہوئے کہا ''ہم تمہارے مخالف نہیں ہیں بلکہ تمہارے حلیف ہیں۔''

''شاید یہ ان تمام لوگوں میں سے ایک ہے جو اس سے خفیہ راز جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' یہ سوچ کر ایڈم نے خود کو جلدی سے اس عورت سے الگ کیا۔عورت تحکمانہ انداز میں بولی کہ ''سوچو۔اپنے ذہن پر زور دو کہ تم کیا جانتے ہو اور تم کچھ تو جانتے ہو۔''

ایڈم نے جواب دیا ''ہاں میں جانتا ہوں سرخ دروازہ'' یہ کہہ کر وہ راہداری کی طرف بھاگا۔جس سرخ دروازے کے بارے میں اسے خبردار کیا گیا تھا وہ اس کے سامنے آگ کے ایک گولے کی مانند چمک رہا تھا جو کبھی سرخ تو کبھی نارنجی رنگ میں تبدیل ہو جاتا۔اس نے اپنے خیالات کو مجتمع کیا تو اسے ایسا لگا کہ جو آواز اس نے سنی تھی وہ یونٹ کے اندر سے نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ اس کے اپنے ذہن میں ابھری تھی۔اس نے سوچا اس کا ضمیر نہیں۔۔۔آواز باہر سے آئی تھی جو اسے بچانا چاہتی تھی۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی یادداشت پر چھائے ہوئے گہرے بادل چھٹ گئے۔اسے یاد آیا کہ ہنڈرسن افغانستان میں ظلم وتشدد روا رکھنے والے مرکز میں انٹیلی جنس آفیسر تھا۔بہت سی اموات، بُری طرح جھلسے ہوئے مردہ جسم، کئی دل خراش مناظر اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔اب تک وہ ان مناظر کو یاد کرنے سے احتراز کرتا رہا تھا۔وہ سوچ رہا تھا۔''کیا اس نے وہ سب کچھ دیکھا تھا یا اس کا وہم تھا کیا وہ وہاں پر موجود تھا۔یا نہیں تھا۔مگر وہ تو اس علاقے میں موجود تھا۔ہاں اس نے سب دیکھا تھا۔۔۔!''

اب سرخ دروازہ۔۔۔اب وہ وقت آن پہنچا تھا جس کا وہ کافی دیر سے منتظر تھا۔ایک نہایت زیرک صورتِ حال پیدا ہو چکی

تھی۔جس طرح کہ قرون وسطیٰ کے عہد میں ایک گنہگار اور مجرم کے درمیان فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہو۔

ایڈم نے زور سے دھکا دے کر جیسے ہی سرخ دروازہ کھولا۔ ہنڈرسن وہاں پہلے سے موجود تھا۔ دونوں کے پستول سے بیک وقت گولیاں نکلیں۔ ہنڈرسن کی گولی ایڈم کے بازو کی کھال کو چیرتی ہوئی نکل گئی جبکہ ایڈم کا نشانہ بہتر تھا اور اس کے پستول کی گولی سیدھی ہنڈرسن کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان پیوست ہو کر اس کے ماتھے پر ایک سرخ نشان چھوڑ گئی، جس طرح ہندو عورتیں اپنے ماتھے پر تلک لگاتی ہیں۔

''دشمن مر چکا تھا.....سرخ دروازہ تسخیر ہو چکا تھا۔''

عورت نے متجسس نگاہوں سے ایڈم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''کیا تمہیں افغانستان میں ہونے والے ظلم وتشدد کے واقعے کا علم تھا۔'' ایڈم نے اسے پیار سے بوسہ دیتے ہوئے جواب دیا ''ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن کیا ہوا تھا۔۔۔!''

تھرڈ ورلڈ گرل

(The Third World Girl)

عائشہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا جہاں زندگی ابھی تک رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مذہب، تہذیب اور روایت کے نام پر اگر کوئی نشانے کی زد پر تھا تو صرف عورتیں۔۔۔۔۔! عائشہ زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ کھل کر ہنسنا، مسکرانا بلکہ جی بھر کر قہقہے لگانا چاہتی تھی۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں گم ہو جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ اس کے پر نکل آئیں تو وہ اڑتی اڑتی کوہ قاف میں جا نکلے۔ مگر۔۔۔۔۔ گھر کے گھٹن زدہ ماحول میں اس کی بے سروپا باتوں پر ماں اکثر اسے برا بھلا کہتی اور یہ مت کرو۔ وہ مت کرو کی رٹ لگائے رکھتی۔ عائشہ بے حد ذہین تھی۔ ہر امتحان امتیازی پوزیشن سے پاس کیا۔ کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ پائلٹ بن جائے اور کبھی وہ جرنلزم کی طرف متوجہ ہو جاتی مگر گھر میں اس کے کیریئر ایسپریشن کو کسی نے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

وہ چار بہنوں میں تیسرے نمبر پر تھی۔ والد ایک سرکاری دفتر میں معقول مشاہرے پر ملازم تھے مگر مہنگائی کے اس دور میں تنخواہ ملنے سے قبل ہی اخراجات کی ایک طویل فہرست تیار ہوتی۔ زندگی کو زندگی کرتے کرتے صبح سے شام ہو جاتی مگر کسی بات کا کوئی سرا ڈھنگ سے ہاتھ نہ آتا۔

عائشہ کی والدہ کو اگر سب سے زیادہ کسی کی فکر تھی تو صرف عائشہ کی، انہیں کبھی کبھی تو اس کی باتوں سے سخت وحشت ہونے لگتی کہ خدا جانے یہ لڑکی کیا گل کھلائے گی۔۔۔؟''

یہ عائشہ کی خوش قسمتی تھی کہ گریجویشن کرتے ہی ایک خوشحال گھرانے سے اس کے لیے شادی کا پیغام آ گیا۔ عدنان اس کی سہیلی کا کزن تھا اور عائشہ کو کسی خاندانی تقریب میں دیکھ کر اس کی شوخ و شنگ شخصیت کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات ہو گئی۔ عائشہ تو بغیر پروں کے ہی اڑ رہی تھی۔ عائشہ کا قدم عدنان کے لیے بہت سعد ثابت ہوا اور شادی کے چند ہی ماہ بعد کمپنی نے اس کی پوسٹنگ لندن میں کر دی۔ عائشہ کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ خوابوں کی تعبیر کبھی اتنی جلدی بھی مل جاتی ہے۔۔۔۔ ''اے کاش کچھ اور خواب دیکھ لیتی تو سب ایک ساتھ ہی پورے ہو جاتے۔۔۔۔'' وہ اکثر سوچتی!

عائشہ کو لندن آئے تقریباً سات برس ہونے کو آئے تھے۔ پہلا سال تو دونوں نے سیر سپاٹے کرنے میں ہی گزار دیا۔ جی بھر کر لندن دیکھا۔ برٹش میوزیم، میڈم تساؤ، ٹرافل گر اسکوائر، پکاڈلی، کاونٹ گارڈنز، دریائے ٹیمز، بگ بین۔ بکنگم پیلس، ہائیڈ پارک،

ہاؤسز آف پارلیمنٹ، آکسفورڈ سٹریٹ، ہیرڈز، ہر وہ جگہ جس کے بارے میں کہیں بھی سن اور پڑھ رکھا تھا۔ عائشہ نے دریافت کر ڈالی۔

طویل ہنی مون کا اختتام ہوا تو اگلے چند سالوں میں دو گول مٹول بچوں نے اس کا سارا وقت اپنے نام لکھوا لیا۔ عدنان اکثر بزنس ٹورز پر رہتے کبھی یورپ کبھی مڈل ایسٹ تو کبھی فار ایسٹ۔۔۔۔ ایسے میں عائشہ دوشرارتی سے بچوں کی دیکھ ریکھ کرتے ادھ موئی سی ہو جاتی۔ نہ کوئی عزیز نہ رشتہ دار۔۔۔ کسی سے ڈھنگ سے میل جول بھی نہ بڑھا کیونکہ صرف چند ہی ایشیائی گھرانے ان کے علاقے میں تھے۔ زیادہ تر تو انگریز لوگ تھے۔ کتنا ارمان تھا کہ لندن جا کر کچھ مزید پڑھے گی اور جب وہاں سے ڈھیر ساری ڈگریاں سمیٹ کر واپس پاکستان آئے گی تو سب بہنوں اور سہیلیوں کو کیسی جلن ہوگی۔۔۔ مگر سب خواب آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ عدنان سے شکایت بے کار تھی کیونکہ وہ تو دن رات کولہو کے بیل کی طرح اپنے کام میں ہی مصروف رہتا۔ یہ سب سوچ سوچ کر عائشہ پر ایک پژمردگی سی طاری ہوتی جا رہی تھی۔۔۔۔!

کتابوں سے اسے شروع ہی سے عشق تھا۔ یہاں بھی ہر ہفتے مقامی لائبریری میں جا کر کم از کم ایک درجن کتابیں ایشو کروا کر گھر لے آتی جنہیں پڑھنے کا وقت اسے کم ہی ملتا۔ اکثر و بیشتر کتابیں اسے پڑھے بغیر ہی جرمانے کی رقم دے کر لوٹانی پڑتیں۔ ایسے میں اسے اپنے آپ پر بہت غصہ آتا کہ کہاں تو وہ کتابی کیڑا تھی مجال ہے کہ کوئی اخبار کا تراشہ بھی اس کی نظر بچا کر نکل جائے مگر اب۔۔۔۔۔!

جب وہ کتابیں واپس کرنے لائبریری جاتی تو شرمندہ شرمندہ سی کاؤنٹر پر کھڑی رہتی۔ جیسے ریسپشن پر کھڑی انگریز لڑکی کو پتہ چل گیا ہو کہ اس نے ان میں سے کوئی کتاب بھی نہیں پڑھی تھی۔

آج انہی سوچوں میں گم جیسے ہی وہ لائبریری کے ریسپشن ہال میں داخل ہوئی تو ایک بڑے سے رنگین پوسٹر کو دیکھ کر چونک سی گئی۔

"Speaking Poetry Session" کیا مطلب ہے اس کا؟'' تو کیا کوئی گونگی پوئٹری بھی ہوتی ہے۔'' مارے تجسس کے اس نے اندر آتے ہی کاؤنٹر پر کھڑی انگریز لڑکی سے ایک ساتھ ہی کئی سوال کر ڈالے تو وہ اطمینان سے بولی کہ'' دراصل ان کی لائبریری پوئٹری کی پروموشن کے لیے نامزد ہوئی ہے۔ اب یہاں اکثر و بیشتر نامور شعرا اپنا کلام پیش کیا کریں گے۔''

اس نے اگلا سوال داغ دیا، کیا صرف انگلش پوئٹری ہی ہوگی یا ملٹی لینگول شاعری بھی سننے کو ملے گی''۔ ابھی تو میرے خیال میں انگلش پوئٹری سیشن ہی ہوں گے۔ بعد میں کچھ سلسلہ بن جائے تو الگ بات ہے مگر فی الحال کچھ کہنا مشکل ہے۔'' لڑکی نے شائستگی سے جواب دیا عائشہ کا تجسس ابھی تک برقرار تھا۔'' یہ سپیکنگ پوئٹری کیا ہوتی ہے؟'' اس نے بے تابی سے سوال کیا۔'' ایک بہت مشہور سیاہ فام شاعرہ ہے جو یہاں اپنی پوئٹری پریذنٹ کرنے آ رہی ہے۔ وہ اتنے زبردست ڈرامائی انداز میں اپنا کلام پیش کرتی ہے۔ لگتا ہے کہ ہال کے درودیوار تک اس کے ساتھ ہر مصرعہ دہرا رہے ہوں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ شاعرہ کی اتنی زبردست قسم کی تعریف سن کر

عائشہ نے پکا ارادہ کرلیا کہ وہ ضرور سپیکنگ پوئٹری سیشن اٹینڈ کرے گی۔ انگریز لڑکی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی سیٹ پیشگی ریزرو کروالے کیونکہ ممکن ہے کہ اس دن ہال میں کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملے۔ عائشہ اپنی سیٹ ریزرو کروا کر بڑے فاتحانہ انداز میں لائبریری سے باہر نکلی جیسے لائبریری کی کتابیں ڈھنگ سے نہ پڑھنے کی اس نے آج تلافی کر دی ہو۔۔۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ تاریک سے روشنی میں آ گئی ہو۔

پوئٹری سیشن پر جانے کی تیاری اس نے ہفتہ بھر پہلے ہی شروع کر دی۔ بچوں کے لیے بے بی سسٹر کا انتظام کیا۔ اس روز صبح ہی صبح اٹھ کر تمام کام نپٹائے اپنے لیے سینڈوچ بنائے۔ فلاسک میں کافی ڈالی۔ ساتھ میں کولڈ ڈرنکس بھی رکھ لیے۔ گویا آج اس کا پوئٹری انجوائے کرنے کا زبردست پروگرام تھا۔

دو بجنے میں ابھی کافی وقت تھا کہ وہ لائبریری چلی گئی تاکہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر تقریب سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکے۔ ابھی صرف چند ہی لوگ ہال میں آئے تھے۔ آہستہ آہستہ ہال بھرنا شروع ہو گیا۔ عائشہ سوچ رہی تھی کہ ہال کی آرائش کتنی سادہ سی ہے۔ بس دیوار پر شاعرہ کے نام کا ایک بینر۔ نہ اسٹیج پر میز نہ کرسیاں۔ بس ایک چھوٹی سی تپائی اور مائیک۔ پانی کا جگ اور گلاس، یہی کل کائنات تھی۔ اور اردو شاعری میں کیا طمطراق۔ رونمائیاں، صدارتیں، مہمانانِ خصوصی، تقدیم و تاخیر اور نظامت کے جھگڑے، داد دینے اور نہ دینے کی پالیٹکس، کھانوں کی زبردست مہک۔ جیسے کسی شادی کی تقریب میں آئے ہوں۔۔۔ اور یہاں۔۔ کیسی بے رونقی ہے جیسے شاعرہ کے سوئم پر آئے ہوں۔۔۔!

ٹھیک دو بجے منتظمین نے مائیک پر آ کر حاضرین کو ویلکم کہا اور شاعرہ کا مختصر سا تعارف کروایا۔ اس کے ساتھ ہی ہال کی روشنیاں قدرے مدھم ہو گئیں۔ ماحول کچھ خوابناک سا ہو گیا تھا۔ اچانک اسے اسٹیج کی ایک جانب سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی ایک شبیہ سی نظر آئی ابھی وہ اندھیرے میں اسٹیج پر نظر آنے والے ہیولے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اچانک سٹیج سے ایک زوردار نعرہ بلند ہوا۔ عائشہ اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھی اور کرسی سے تقریباً گرتے گرتے بچی۔ ہال میں باقی حاضرین کی بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی اتنے میں اسٹیج کی روشنیاں ذرا تیز ہو گئیں اور بیک گراؤنڈ میں ہلکا ہلکا سا میوزک شروع ہو گیا۔

شاعرہ کی شبیہ اب واضح ہو چکی تھی یہ ادھیڑ عمر کی دبلی پتلی سیاہ فام عورت تھی۔ بغیر کسی تمہید کے اس نے آتے ہی نہایت ڈرامائی انداز میں پوئٹری پیش کرنی شروع کر دی۔ اس کا جوش و جذبہ دیدنی تھی۔ جیسے اس پر شاعری نازل ہو رہی ہو۔ ایک کے بعد ایک نظم۔ ہاتھ ہلاتی۔ سٹیج پر گھوم گھوم کر بل کھاتی شاعرہ کی سیاہ رنگت جوش خطابت سے اور چمک رہی تھی اوپر سے میوزک کا زیر و بم، پوئٹری واقعی بول رہی تھی۔ ہر نظم کے اختتام پر حاضرین بھرپور تالیاں بجا کر اسے داد دے رہے تھے۔ ہال میں ایک مسحور کن ماحول تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

اب شاعرہ نے اپنی آخری نظم ''تھرڈ ورلڈ گرل'' یعنی تیسری دنیا کی لڑکی سنانی شروع کی۔ بہت پاور فل نظم تھی۔ ہال میں مکمل سناٹا چھا گیا ایک کے بعد ایک مصرعہ۔ سوچ پر تازیانے کا کام کر رہا تھا۔

''میں تیسری دنیا کی لڑکی
اک ناتراشیدہ ہیرا
اک نادر یافت موتی
میرے عہد سے بہت پہلے
مجھے میرے خواب سے جگا دیا گیا
میرے اندر۔۔۔کئی ان کہی کہانیاں مچل رہی ہیں
میں جوان۔ناجہاندیدہ۔۔۔۔
مگر پیدائش سے پہلے ہی عمر رسیدہ!''

''میں تیسری دنیا کی لڑکی۔۔۔'' یہ مصرعہ وہ بار بار دہرا رہی تھی۔

شاعرہ پورے اسٹیج پر لٹو کی طرح مقناطیسی انداز میں چکر لگا رہی تھی۔لامتناہی دکھ۔تکلیف اور درد اس کے انگ انگ سے چھلک رہا تھا۔تیسری دنیا کی لڑکی کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھی۔زبردست ہیجانی کیفیت میں مبتلا۔بے کل،مضطرب۔بے چین جیسے بھٹکی ہوئی روح۔۔۔۔جیسے بارش کا قطرہ سیپ میں بند ہو کر موتی میں تبدیل ہو رہا ہو۔۔۔کوئلہ ہیرا بننے کے عمل سے گزر رہا ہو۔۔۔جیسے تخلیق کے کرب سے دوچار۔۔۔۔دردزہ میں مبتلا۔۔۔وہ بچہ جننے کے آخری مرحلے تک آ پہنچی ہو۔

اسی جوش وجذبے اور ہیجان میں سیاہ فام شاعرہ اسٹیج کے کنارے کے بے حد قریب آ چکی تھی۔چشم زدن میں وہ دھڑام سے اسٹیج سے نیچے تاریکی میں جا گری۔سپیکنگ پوئٹری یک لخت خاموش ہوگئی۔سب ہیرے موتی بکھر گئے۔کہانی ادھوری رہ گئی۔تیسری دنیا کی لڑکی پھر تاریکی میں جا گری تھی۔

''کیا تھرڈ ورلڈ گرل کبھی اندھیروں سے باہر نکل سکے گی؟ عائشہ یہ سوچتی ہوئی۔آنسو پونچھ کر ہال سے باہر نکل آئی۔

ائیر فریشنر
(Air Freshner)

زوبی کو انگلینڈ آتے ہی جن چند چیزوں سے عشق ہوا تھا ان میں فش اینڈ چپس، باؤنٹی چاکلیٹ، سالٹ اینڈ وینگر کریسپ، ڈائی جیسٹو بسکٹ، بگ بین اور ائیر فریشنز تھے۔ رنگ برنگی ائیر فریشنز کو جمع کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ہوا ذرا کثیف ہوئی۔ کوئی ناپسندیدہ ناخوشگوار بو ناک کی مہمان بننا چاہتی تو زوبی جھٹ ائیر فریشنز نکال کر لے آتی۔ سب ہی زوبی کے اس کریز سے واقف تھے اور اسے دیوانوں کی طرح ائیر فریشنز چھڑکتے دیکھ کر صرف زیرِ لب مسکرا کر رہ جاتے تھے۔

پاکستان سے گریجویشن کر کے جب وہ انگلینڈ آئی تو اسے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ جس ولایت کے دیومالائی قصے کہانیاں وہ بچپن سے سنتی آئی تھی یہاں تو ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ دودھ اور شہد کی نہریں تھیں۔ نہ درختوں پر پتوں کی جگہ پاؤنڈز۔۔۔ نہ ہی سڑکیں اتنی صاف شفاف تھیں کہ آئینہ دیکھنے کی نوبت نہ آئے۔ بلکہ جس زمانے میں زوبی انگلینڈ آئی اس وقت تو یہاں بجلی کا بحران چل رہا تھا۔ سڑکوں پر روشنیاں کم کم ہی تھیں۔ اور جو نظر آتیں وہ بھی زرد زرد سی۔ جیسے باقی ماندہ روشنیوں سے بچھڑ کر اداس ہو گئی ہوں۔ بے سورج موسم۔ گہرے گہرے بادل دیکھ کر تو وہ گھبرا سی گئی۔ یا خدایا۔۔۔ یہ کیسا ملک ہے۔ نہ دن کی خبر نہ رات کا پتہ، بے رنگ سی گوری چمڑیاں۔ جن کی خوبصورتی کے قصے عظیم ماموں سناتے نہ تھکتے تھے جیسے پرستان کی پریاں راستہ بھول کر انگلینڈ میں آ اتری ہوں۔ انگلینڈ کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر تو زوبی اداس سی ہو گئی جتنے جوش و خروش سے دوستوں کو الوداع کہتے ہوئے جہاز کی سیڑھیاں چڑھی تھی لگتا انگلینڈ میں آ کر پاتال میں جا گری ہو۔۔۔ یعنی مکمل کلچر شاک۔

انگریزی زبان و ادب سے اسے ہمیشہ سے ہی دلچسپی رہی تھی۔ انگریزی کے ہر امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کرتی۔ لگتا تھا انگلینڈ میں تو انگریزی کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہو گا۔ گھر کی مرغی جب چاہے حلال کر ڈالیں۔ مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ پاکستان میں کلاس روم میں پڑھائی جانے والی انگریزی۔ کتابوں میں چاہے ویسی ہی ہو۔ لکھنے لکھانے میں بھی ویسی ہی ہو۔ مگر لب و لہجہ الگ ہے اور اسے سمجھنے کے لیے اس کلچر میں رہنا پڑے گا۔ مقامی لوگوں سے گھلنا ملنا اور بات چیت کرنا ہو گی کیونکہ زبان ایک زندہ چیز ہے۔ یعنی Language is a living thing۔

جب کبھی اس نے کارنر شاپ کی انگریز عورت سے بات کرنے کی کوشش کی۔ اس کا لب و لہجہ زوبی کے سر کے اوپر سے گزر جاتا اور وہ مروت میں مسکراتی ہوئی دکان سے باہر آ جاتی۔ چھوٹے بھائی جو انگلینڈ کافی عرصہ پہلے آ گئے تھے یہاں کے سکولوں اور کالجوں

میں پڑھ رہے تھے۔ ان سے انگریزی لب ولہجہ سمجھنے کی کوشش کرتی تو وہ اس کا مذاق اڑاتے۔ درمیان والا بھائی تو اس کی ٹانگ ضرور کھینچتا۔ غصے میں وہ اسے شٹ اپ کہہ کر بیڈ روم میں جا گھستی۔ ایک دن بڑے بھیا نے اسے سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ ''یوں گھر میں پڑے رہنے اور جلنے کڑھنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ بہتر ہے کہ باہر نکلو اور مقامی ایڈلٹ ایجوکیشن سنٹر میں پارٹ ٹائم انگریزی بول چال کی کلاسز جوائن کرلو پڑھی لکھی ہو دنوں میں ہی رواں ہو جاؤ گی تو پھر نوکری ڈھونڈنے میں بھی مشکل نہ رہے گی کام مل گیا تو یہاں دل بھی لگ جائے گا۔ ویسے کوشش کرو کہ زیادہ سے زیادہ باہر جا کر مقامی لوگوں سے انگریزی میں بات چیت کرو۔ کچھ تو پلے پڑے گا۔'' بھیا کا مشورہ اسے اچھا لگا اب روزانہ دو گھنٹے وہ لینگویج ٹرپ پر نکل جاتی۔ اور چند ہفتوں میں ہی اسے محسوس ہونا شروع ہو گیا کہ اسے مقامی ایکسنٹ کچھ کچھ سمجھ آنا شروع ہو گیا ہے۔

ایوننگ کلاسز میں ایک ہی ٹرم کے بعد وہ کافی حد تک انگریزی کے مقامی لب ولہجہ کو سمجھنے لگ گئی تھی۔ اگلی ٹرم کے لیے اس نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ وہاں پر انگلش لیکچرار کی ساری بات اس کو سمجھ آ رہی تھی۔ وہ شش وپنج میں تھی کہ آخر باہر سڑکوں بازاروں، دکانوں میں گھومنے پھرنے اور عام لوگوں کی انگریزی سمجھنے میں اسے کیوں دشواری ہو رہی تھی تو بھیا نے بتایا کہ ''جن لوگوں سے تم انگریزی سیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں وہ تو بیچارے ہمارے ہاں کے نیم خواندہ لوگوں جیسے ہی ہیں وہ کونسا کوینز انگلش بولیں گے کہ تمہاری سمجھ میں سو فیصد بات آ جائے۔ تم پڑھی لکھی ہو تو پڑھے لکھے لوگوں کی انگریزی تمہیں سمجھ آ جائے گی کیونکہ اکیڈیمیا کی انگریزی پر مقامی لب ولہجہ کا رنگ نہیں چڑھا ہوتا۔'' بھیا کی بات سن کر میری جان میں جان آئی وگرنہ تو لگ رہا تھا سب پڑھا لکھا اکارت گیا۔ سوچ رہی تھی میں نالائق ہوں یا مجھے پڑھانے والے۔ مگر دونوں ہی باتیں غلط تھیں۔ کالج میں دو ہی ٹرم گزار کر زوبی کو انگریزی بولنے اور سمجھنے پر کافی عبور ہو گیا تھا۔

ایک دن بھیا نے مشورہ دیا کہ ''تم جاب سینٹر میں جا کر اپنا نام رجسٹر کروا لو تا کہ کوئی مناسب جاب کی تلاش کی جا سکے۔'' بھیا کے ساتھ بڑے فخر سے جا کر زوبی جاب سینٹر میں رجسٹر ہو گئی۔ ہر ہفتے وہاں جا کر حاضری لگانا پڑتی اور اس اقرار نامے پر دستخط کرنا پڑتے کہ ''میں ملازمت کرنا چاہتی ہوں۔ بالکل تندرست ہوں۔ اور پوری دیانتداری سے ملازمت تلاش کر رہی ہوں۔'' اس کے بدلے میں بیس پونڈ کا چیک ہر ہفتے بذریعہ ڈاک موصول ہو جاتا۔

روز روز جاب سینٹر کے چکر لگاتے لگاتے زوبی کچھ بور سی ہو گئی۔ ایک دن سینٹر والوں نے اسے پیکنگ کی جاب کے لیے ایک ویئر ہاؤس میں بھیجا۔ بلکہ وہ جگہ کافی دور تھی۔ راستہ پوچھتی پوچھتی وہ آخر وہاں پہنچ ہی گئی۔ ویئر ہاؤس میں کچھ نوجوان انگریز لڑکے لڑکیاں پیکنگ کے کام میں مصروف تھے اسے کن اکھیوں سے دیکھ کر کھی کھی کرنے لگ گئے۔ ان کے رویے سے اسے بڑی کوفت ہوئی۔ خیر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ان سے منیجر کے بارے میں پوچھا کہ وہ انٹرویو کے لیے آئی ہے۔ اسے لگا جیسے جواب میں ایک انگریز لڑکے نے اسے ''پاکی'' کہا ہو۔ جسے سن کر اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے ان سے منہ ماری شروع کر دی۔ اتنے میں ویئر ہاؤس کا منیجر آن پہنچا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک لڑکے سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو لڑکے کی بجائے زوبی نے غصے سے جواب دیا کہ ''میں

پیکنگ کی جاب کے لیے جاب سینٹر کی طرف سے انٹرویو کے لیے آئی ہوں مگر انہوں نے مجھے پاکی کہا ہے۔'' انگریز لڑکے نے کہا کہ ''نہیں انہوں نے پیکر کہا تھا۔'' بس اس بات پر تکرار ہوگئی۔ وئیر ہاؤس منیجر واضح طور پر اپنے ملازمین کا دفاع کر رہا تھا۔ اس کا موقف تھا کہ زوبی کو ان کی بات سمجھنے میں غلطی لگی تھی۔ انہوں نے پاکی نہیں بلکہ پیکر کہا تھا۔ زوبی کو پتہ تھا کہ لڑکے سراسر جھوٹ بول رہے تھے اور دونوں لفظ خلط ملط کر کے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ زوبی گٹ لوسٹ کہہ کر جاب پر لعنت بھیجتی ہوئی وہاں سے آ گئی۔ اور ساتھ ہی پکا ارادہ کر لیا کہ اب وہ اس قسم کی جگہوں پر نوکری کے لیے نہیں جائے گی بلکہ بہتر قسم کے پڑھے لکھے لوگوں کے ماحول میں جاب کرے گی۔ ''ایسی جگہیں تو بالکل بھی اس کے کام کرنے کے لائق نہ تھیں۔ فضول سا ماحول، فقرے بازی، جسم کو چیرتی نگاہیں، گندی ذہنیت۔۔۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل آئی۔

زوبی اگلے ہفتے پھر جاب سینٹر جا دھمکی اور اب کی بار جاب سینٹر کی ایڈوائزر سے شکایت بھی کی کہ اسے اس قسم کی جگہوں پر انٹرویو کے لیے مت بھیجا جائے۔ جہاں لوگوں کے رویے اس قدر غلط ہوں۔ اس کی بات سن کر جاب سینٹر ایڈوائزر اسے کچھ بے یقینی کی سی کیفیت سے گھورنے لگی۔۔۔۔! انگریز عورت نے اس کی بات کا تو کوئی جواب نہیں دیا مگر اسے ایک مشہور ڈیپارٹمنٹل سٹور میں سیلز گرل کی نوکری کے لیے انٹرویو لیٹر بنا کر دے دیا۔ دوسرے روز وہ انٹرویو کے لیے گئی تو چند اور انگریز لڑکے لڑکیاں انٹرویو کے لیے لابی میں منتظر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ان پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ ابھی وہ ادھر ادھر کا جائزہ لے رہی تھی کہ اس کا نام پکارا گیا۔ ''شاید وہ انٹرویو کے لیے پہلی امیدوار تھی'' اسنے سوچا جیسے ہی وہ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی انٹرویو لینے والی انگریز عورت نے کمرے میں ائیر فریشنر سپرے کرنا شروع کر دیا۔ زوبی سراسیمگی کی حالت میں کرسی کے سرے پر ہی ٹک گئی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ جیسے وہاں سے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گی۔ دماغ جیٹ کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔۔۔ وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ائیر فریشنر تو بوجھل گندی، کثیف ہوا کو صاف کرنے کے لیے سپرے کیا جاتا ہے۔ اس انگریز عورت نے ائیر فریشنر کیوں سپرے کیا؟ کیا میرے کمرے میں آنے سے۔۔۔۔؟ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔۔۔۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔

چند رسمی سی باتیں پوچھنے کے بعد انگریز عورت نے اسے پچیس پونڈ ہفتہ پر ملازمت کی پیش کش کر دی مگر زوبی اس کی ائیر فریشنر والی حرکت سے سخت غصے میں تھی کیونکہ "It was Shear insult" سراسر بے عزتی۔۔۔ مکمل توہین! ایسی اہانت۔۔۔!

زوبی نے سختی سے ملازمت کی پیشکش ٹھکراتے ہوئے کہا۔ ''بیس پونڈ تو مجھے جاب سینٹر والے بغیر کام کے ہر ہفتے گھر بھیج دیتے ہیں۔ کیا میں صرف پانچ پونڈ کے لیے تمہارے یہاں کام کروں گی؟''

انگریز عورت زوبی کے دلیرانہ جواب پر حیران سی رہ گئی۔ زوبی اسے اسی حالت میں چھوڑ کر دھڑام سے دروازہ بند کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے جاب اس کے منہ پر مار کر اس نے تمام نسل پرستوں سے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا ہو۔

گھر آنے کے بعد زوبی نے سارے ائیر فریشنرز ڈسٹ بن۔۔۔۔!

آنرکلنگ

(Honour Killing)

مولوی امیرالدین کا پارہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ساتویں آسمان پر تھا۔ گرجتے برستے مولوی کا ہوائی فائر کرنے میں تو کوئی ثانی ہی نہیں تھا۔ حالانکہ سیّدانی بھی بڑی دل گردے والی عورت تھی۔ زبان کی کافی تیز۔ کرنے پر آتی تو ذرا لحاظ نہ کرتی مگر جب مولوی امیرالدین فائر کھولتے تو سیّدانی سیز فائر کر دیتی۔ زندگی کی گاڑی بس یونہی چھک چھک کرتی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کسی اسٹیشن پر ذرا زیادہ دیر رک جاتی اور جب تک سبز جھنڈی ہلتی نظر نہ آتی زمین و آسمان سانس روکے رکھتے۔

مگر آج تو حد ہی ہوگئی تھی مولوی امیرالدین کو رہ رہ کر غصے کے دورے پڑ رہے تھے۔ سب بچے اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے بس تیروں کی بوچھاڑ سہنے کے لیے سیّدانی میدان میں ڈٹی ہوئی تھی بات کچھ بھی نہ تھی بڑی بیٹی شرمین نے کالج میں داخلے کی ضد کر ڈالی تھی مولوی امیرالدین کو یوں لگا جیسے اس نے باپ دادا کی عزت پر کالک پوت دی ہو۔ بیٹی بھی دھن کی پکی تھی۔ ایک ہی رٹ تھی کہ ''آخر وہ کب تک گھر میں بیکار بیٹھی رہے گی۔ نہ آگے پڑھنے کی آزادی۔۔۔ نہ ہی کوئی ملازمت کرنے کا ماحول۔۔۔ ایسے میں کوئی کرے تو کیا کرے؟ انگلینڈ میں رہتے ہوئے بھی اس قدر دقیانوسی ماحول۔۔۔؟'' شرمین اکثر بڑبڑاتی۔۔۔! مولوی امیرالدین بیوی اور بیٹیوں کو تو تہہ خانے میں چھپا کر رکھتا مگر محلے بھر کی نئی نئی جوان ہوتی ہوئی شوخ و شنگ لڑکیوں کو کن اکھیوں سے دیکھنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ مولوی کے اسی دوغلے پن سے اس کی بیٹی شرمین کو چڑ تھی کہ ''خود میاں فصیحت اور دوسروں کو نصیحت۔۔۔!'' مولوی کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ شرمین اور ریان جڑواں بہن بھائی تھے اس کے بعد نرمہ اور کامران۔۔۔ بچے ماں باپ کے درمیان ہونے والی سرحدی جھڑپوں میں ملوث نہ ہوتے وگرنہ ماں کی طرفداری کرنے کی پاداش میں ان کی شامت آ جاتی۔

سیدانی محلے بھر کی بچیوں کو قرآن پاک پڑھا کر ثوابِ دارین حاصل کرتیں۔ بسم اللہ۔ آمین۔۔۔ عقیقے۔۔۔ میلاد۔۔۔ گیارہویں۔۔۔ نذر نیاز۔۔۔۔ نذرانے بس ایک شور سا مچا رہتا۔ چند ایک عورتیں ہمیشہ سیّدانی کے پاس دعا کروانے کی غرض سے موجود رہتیں۔ ہر جمعرات کو خاص دعا کا اہتمام کیا جاتا۔ درود سلام کی محفل منعقد ہوتی۔ جو مولوی امیرالدین کے گھر لوٹ آنے سے پہلے ہی ختم کر دی جاتی۔

اگر کبھی عورتوں کو اٹھنے میں دیر ہو جاتی اور مولوی امیر الدین گھر لوٹ آتا تو اس کے قدموں کی چاپ سن کر سبھی عورتیں دوپٹے، چادریں دوبارہ سے درست کرنے لگ جاتیں۔ سیّدانی ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کو کہتی کہ ''مولوی امیر الدین راہداری سے گزر جائیں تو وہ پھر نکلیں۔'' گویا ایک ہنستا بستا گھر نہ ہوا بیگار کیمپ ہو گیا۔ جہاں ہر وقت کسی انہونی کا دھڑکا لگا رہتا۔

مولوی کی بڑی بیٹی شرمین زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ جی بھر کر جینا چاہتی تھی۔ ہنسنا۔ کھیلنا۔ کودنا چاہتی تھی مگر گھر کا ماحول یوں تھا جیسے شہرِ خموشاں۔ ایسے میں تنہائی سے گھبرا کر وہ کسی نہ کسی سہیلی کو گھر پر بلاتی کیونکہ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

چھوٹی بیٹی فرمین اللہ میاں کی گائے تھی۔ سکول ختم کرتے ہی گھر کی زیادہ تر ذمہ داری اس کے کندھوں پہ ڈال دی گئی تھی۔ کیونکہ اس کے اندر ایک فطری رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا جو کہ شرمین میں قدرے کم تھا۔ اس کی نٹ کھٹ طبیعت اسے کبھی سنجیدہ ہونے کا موقعہ ہی نہ دیتی۔ جبکہ فرمین بہت کم ہنستی اور بولتی۔۔۔ اس نے کبھی شکایت کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں شرمین ہمیشہ مولوی کے لیے دردِ سر بنی رہتی۔ شکل وصورت اور رنگ روپ میں فرمین سے کافی دبتی تھی اس لیے اور کئی حیلوں بہانوں سے نمایاں ہونے کی کوشش میں لگی رہتی۔ کبھی بھڑکیلا لباس تو کبھی تیز میک اپ بات بے بات قہقہے لگانا۔ جن کی آواز سے مولوی کو سخت چڑ تھی۔ مولوی کا بس نہیں چلتا تھا کہ بے فکری سے قہقہے لگاتی ہوئی شرمین کا گلا دبوچ لے کیونکہ مولوی کے خیال میں ''عورتوں کو زیادہ وقت گھر داری، عبادت، توبہ استغفار اور گریہ زاری میں گزارنا چاہیے کیونکہ اپنے ناشکرے پن کی وجہ سے جہنم میں زیادہ عورتیں ہی ہوں گی اور انہیں اس دنیا میں ہی اپنی بخشش کا سامان کرنا چاہیے۔''

مولوی امیر الدین کو فکر تھی کہ کسی طرح شرمین کے ہاتھ پیلے کر دے۔ کئی جاننے والوں سے رشتے کے بارے میں کہہ رکھا تھا مگر جب بھی کوئی رشتہ آتا شرمین کوئی نہ کوئی ڈرامہ رچا کر لوگوں کو گھر سے بھگا دیتی اور سیّدانی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اس کی نادانیوں پر پردہ ڈال دیتی۔ دراصل شرمین کو شادی کے نام سے ہی نفرت تھی۔ ابا اور اماں کے بے جوڑ رشتے کی نوعیت دیکھ کر تو وہ شادی کے نام سے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتی تھی کیونکہ وہ ابا جیسے کسی اور شخص کے پلے پڑ کر گھٹ گھٹ کر مرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس قدر بے رنگ زندگی سے شرمین سمجھوتہ نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک دن بڑے بھائی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اس نے رنگین ٹی وی اور وی سی آر کرایے پر لے لیا۔ مولوی امیر الدین جیسے ہی گھر میں داخل ہوا۔ غیر مانوس سی آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ لونگ روم میں ٹی وی اور وی سی آر دیکھ کر تو وہ جیسے پاگل ہی ہو اٹھا۔ پہلے تو بیوی کی خوب خبر لی۔ کہ وہ جہنمی عورت تھی جو اولاد کو غلط راہ پر لگا رہی تھی۔ سیدانی کے ترکی بہ ترکی جواب کے نتیجے میں آج پہلی بار مولوی امیر الدین کا ہاتھ اس پر اٹھ گیا تھا۔

''ہائے پاجی۔ مردود۔ ظالم۔ ارے لوگو دیکھو۔ بڑھاپے میں زندگی بھر کے صبر کا کیا صلہ مل رہا ہے۔ ارے میں تو سہاگن سے رانڈ بھلی۔ یہ خصم نہیں۔ سینے کا زخم ہے۔ ہائے کدھر جاؤں میرے مولا۔ ایسے دوزخی سے کب رہائی ملے گی۔'' آج سیدانی کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔ ''ٹھہر جا حرامزادی۔ حرافہ۔ ابھی مزہ چکھاتا ہوں تجھے۔۔۔'' ایک اور زناٹے دار تھپڑ سیدانی کا دوسرا گال بھی گلال کر گیا۔ سیدانی نے سینہ پیٹ پیٹ کر لال کر لیا۔ مولوی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ شرمین بھاگ کر بیڈ روم میں

جا چھپی۔ بڑا سا لوہے کا راڈ اٹھا کر مولوی نے پوری قوت سے ٹی وی اور وی سی آر توڑنے شروع کر دیئے۔ جیسے اس کے اندر الہ دین کے چراغ کا جن گھس گیا ہو۔ ٹی وی اور وی سی آر پر زور آزمائی سے تھک جاتا تو بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیتا۔ بیٹا بھی ایسا بسم اللہ کا تخم کہ اُف تک نہیں کی۔ وگرنہ کڑیل جوان تھا۔ باپ کا ہاتھ تو روک ہی سکتا تھا۔ مگر مولوی امیر الدین نے گھر میں اپنی کچھ ایسی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ کوئی اس کے مقابل نہ آتا۔ سیدانی اپنے گال سہلاتی ہوئی جھر جھر روئے جا رہی تھی۔ آج تو اس نے مولوی امیر الدین کو بے نقط سنا ڈالیں گویا اگلے پچھلے سب حساب برابر کر ڈالے۔ ''بے غیرت، رانڈ۔ تیری کبھی بخشش نہ ہوگی۔ تو دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں پھینکی جائے گی۔۔۔ ناشکری۔۔ بے حیا۔'' مولوی بکتا جھکتا گھر سے باہر چلا گیا۔

گھر میں درجہ حرارت ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ دوسرے دن پھر ہنگامہ ہو گیا۔ مولوی کا خیال تھا کہ شرمین اور ریان دونوں کی اب شادی کر دینی چاہیے۔ ریان کے لیے تو اس نے رشتے کے بھائی کی بیٹی سے۔ بغیر کسی سے مشورہ کیے۔۔۔ پاکستان میں بات طے کر لی تھی، آج سیدانی نے اسے فون پر بات کرتے سنا تو گھر پھر سے پانی پت کا میدان بن گیا۔ سیدانی کا موقف تھا کہ ''بچے جب پاکستان میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتے تو تم کیوں بضد ہو؟'' ''دیکھتا ہوں کس میں میرے فیصلے کے خلاف جانے کی مجال ہے۔ یہ سب تیری ہی شہہ کا نتیجہ ہے۔ تو ہی ایک دوزخن ہے اس گھر میں۔ اور سب کو اپنے ساتھ جہنم میں لے کر جائے گی۔'' مولوی امیر الدین پھر شعلہ بیانی پر اتر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سیدانی کوئی جواب دیتی۔ دروازے پر کسی نے کال بیل بجا دی۔ اور سیز فائر ہو گیا۔ اب ہر دوسرے تیسرے روز شادی کے مسئلے کو لے کر جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ پھر یوں ہوا کہ مطلع بالکل صاف ہو گیا۔ شادی کے ذکر سے جیسے مولوی کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ گھر بھر پر سکون سا ہو گیا تھا۔ اس کایا پلٹ پر سب حیران سے تھے۔ مولوی اور سیدانی میں بات چیت ابھی تک بند تھی۔

چند ہفتوں کے بعد مولوی امیر الدین نے ایک دن اچانک اعلان کر دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے پاکستان جا رہا تھا۔۔۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔۔۔ تقریباً دو ماہ پاکستان میں رہ کر مولوی امیر الدین واپس انگلینڈ آیا تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ خوشی چہرے سے پھوٹی پڑتی۔ بات بات پہ باچھیں کھل جا رہی تھیں۔ سیدانی اور بچوں نے اسے اس سے پہلے کبھی اتنا نرم خو، ہنس مکھ اور مرنجاں مرنج نہیں دیکھا تھا۔ انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس پر سکون تالاب کی تہہ میں کیسے کیسے طوفان چھپے بیٹھے تھے۔ مگر پوچھنے کی جرات کس میں تھی؟

چند روز بعد مولوی امیر الدین نے بیوی بچوں کو لونگ روم میں بلا کر ایک لرزہ خیز انکشاف کر دیا۔ ''ہم عزت دار خاندانی لوگ ہیں۔ باپ دادا کی قائم کی ہوئی روایات پر مرنے والے۔ زبان کا پاس رکھنے والے۔ غیرت مند لوگ اپنی منگ کبھی نہیں چھوڑتے۔ اس لیے خاندانی عزت اور ناموس کو بچانے کی خاطر میں نے ریان کی منگیتر سے پاکستان میں شادی کر لی ہے۔''

بچوں کے چہرے شرم سے زمین میں گڑ گئے۔۔۔ سیدانی کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی اور اس نے آہ و بکا شروع کر دی۔ ''ہائے ہائے اٹھارہ سال کی معصوم بچی تیری ان بیٹیوں سے چھوٹی۔ یہ کیا ظلم کیا تو نے۔ ہائے ہائے وہ اپنا سر پیٹتی جا رہی تھی۔

کیسے لوگوں سے نظر ملاؤں گی۔ان بیٹیوں کی ڈولیاں اس گھر سے کیسے اٹھیں گی۔اے میرے مولا۔ مجھے اٹھالے۔اب کچھ اور دیکھنے کی حسرت نہیں ہے۔۔۔'' وہ انتہائی دردناک انداز میں بین کر رہی تھی۔مگر مولوی امیر الدین سنی ان سنی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شرمین کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باہر سڑک پر جا کر چیخ چیخ کر لوگوں کو بتائے کہ غیرت کے نام پر صرف جسموں کا قتل ہی آنر کلنگ نہیں بلکہ معصوم لڑکیوں کے ارمانوں۔ان کے جذبوں،ان کی آرزوؤں ان کی امنگوں اور خوابوں کا قتل بھی آنر کلنگ ہی ہے۔۔۔!

مگر ایسے قتل کی سزا۔۔۔۔؟

تھرڈ ڈائمنشن

(Third Dimension)

عنائیہ کافی عرصہ سے آڈاپشن ایجنسی کے ساتھ بحیثیت سوشل ورکر کام کر رہی تھی ڈیوٹی ڈیسک پر آج سارا دن اسے ہی رہنا تھا کیونکہ مسلمان آڈاپٹرز کی ریکروٹمنٹ کا ایک خاص کیمپین چلایا جا رہا تھا اور توقع تھی کہ اس ہفتے میں مسلمان آڈاپٹرز کی طرف سے کافی انکوائریز آئیں گی۔

آڈاپشن ایجنسی کے پاس یوں تو بہت سے مسلمان بچے آتے رہتے تھے مگر یہ خالصتاً پاکستانی بچے نہیں ہوتے تھے۔ اکثر و بیشتر یہ ملٹی ایتھنک بیک گراؤنڈ کے بچے ہوتے یعنی اگر ماں انگریز ہوتی تو باپ پاکستانی، عراقی، ایرانی یورپین یا ایسٹ افریقہ سے تعلق رکھتا۔ کبھی کبھار ماں کا تعلق کثیر الثقافتی پس منظر سے ہوتا۔ مگر آڈاپشن کے لیے آنے والے اکثر خاندان پاکستانی مسلمان بیک گراؤنڈ سے تھے جس میں اکثریت کی خواہش ہوتی کہ وہ بہت چھوٹا بچہ ہی گود لیں اور وہ خالصتاً پاکستانی بیک گراؤنڈ سے ہو۔ یا پھر وہ پاکستان، انڈیا، یا بنگلہ دیش سے اپنے عزیزوں میں سے کسی کا بچہ گود لینا چاہتے تھے۔

آج بھی ڈیوٹی پر کیمپین کے نتیجے میں ایسی ہی انکوائریز کی بھرمار تھی۔ عنائیہ تمام دن یہ بات دہراتے دہراتے تھک سی گئی تھی کہ ''اگر بچے کے والدین حیات ہیں تو آپ ایسے بچے بیرون ملک سے گود نہیں لے سکتے۔ کیونکہ آڈاپشن ایجنسی کو ان کی اسسمنٹ کرنا ہوتی ہے اور ہم کبھی بھی اس بات کو پروموٹ نہیں کریں گے کہ بچہ کسی دوسرے بے اولاد جوڑے کو گفٹ کر دیا جائے۔ کیونکہ بچہ کوئی کموڈٹی تو نہیں ہے جسے تحفے میں دے دیا جائے۔ اس میں آگے چل کر بہت سی قباحتیں ہو جاتی تھیں اور ایسے بچے شدید عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے کہ ان کے والدین نے صرف انہیں ہی کیوں اپنے باقی ماندہ خاندان سے اور خود سے جدا کر کے کسی اور کا گھر آباد کر دیا۔ اس کے علاوہ انٹر کنٹری آڈاپشن میں پندرہ سے بیس ہزار پونڈ کی لاگت بھی آتی ہے کیونکہ گود لینے والے خاندان کو آڈاپشن ایجنسی کی فیس، ٹریننگ کے اخراجات، وکیل کی فیس، ملک میں آنے جانے کا کرایہ۔ ایمرگریشن کے اخراجات سب خود ہی اٹھانے پڑتے جبکہ لوکل آڈاپشن کی صورت میں کوئی لاگت نہیں آتی۔ اور آڈاپشن کے تمام مراحل بھی کم وقت میں طے پاتے ہیں۔''

آج صبح ہی صبح ایک انکوائری نے اس کا کافی وقت لے لیا۔ آڈاپشن کرنے والے پاکستانی جوڑے کا اصرار تھا کہ وہ بہت چھوٹا

بچہ گود لینا چاہے تھے تا کہ وہ ''اسے بریسٹ فیڈنگ کر سکیں تا کہ بچے سے والدہ کا حرمت کا رشتہ برقرار ہو سکے وگرنہ بڑے ہو کر تو وہ بچہ ماں کے لیے نامحرم ہی رہتا۔'' عنائیہ ان کے مسئلے کو سمجھتی تھی اور کئی بار یہ بات آڈاپشن ایجنسی کے باس سے کہہ چکی تھی کہ جب تک وہ مسلمان بچوں کے آڈاپشن کے سلسلے میں باقاعدہ لائحہ عمل اختیار نہیں کریں گے۔ گود لینے والے مسلمان خاندان اس طرح کے بہت سے سوالات اٹھاتے رہیں گے۔ اور مسلمان بچوں کی مسلمان گھرانوں میں آڈاپشن تقریباً ناممکن ہو جائے گی۔ کئی بار اس نے تجاویز دیں کہ انہیں مقامی مساجد کے علماء اکرام سے اس سلسلے میں گفتگو کر کے مسئلے کی نوعیت بتا کر کوئی فتویٰ لینا چاہیے تا کہ آڈاپشن کرنے والے مسلمان جوڑے جائز شرعی تقاضوں کے مطابق اطمینان سے بچوں کو گود لے سکیں۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔۔۔ صرف زبانی جمع خرچ ہوتا یعنی Lip service۔۔۔۔۔!

اور مسلمان جوڑوں کا مسئلہ جوں کا توں رہتا۔

ان حالات میں اکثر مسلمان بچے غیر مسلم گھرانوں کو گود دے دیئے جاتے کیونکہ ایجنسی کا موقف تھا کہ بچوں کو ایک پیار محبت کرنے والا خاندان چاہے جو اس کی مثبت نشوونما میں معاون ثابت ہو۔ مذہب کے بارے میں ان کا نقطہ نظر سیکولر تھا مگر عنائیہ کو اس بات سے بہت پریشانی لاحق ہوتی کہ غیر مسلم گھرانے ایک مسلمان بچے کو کب اسلامی تشخص کے ساتھ پروان چڑھائیں گے۔ بچہ مذہب سے دور ہو جائے گا اور کل کو وہ مذہبی اور ثقافتی شناخت کے مسئلے سے دوچار ہو جائے گا۔ مگر یہاں کس کو اس بات کی پرواہ تھی ایجنسی کا مقصد تو بچوں کے لیے ایسے خاندان تلاش کرنا تھا جو ان چکروں میں پڑے بغیر بچوں کو گود لے سکیں۔

آج ایجنسی کا دفتر بند ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا کہ ایک ایشیائی نوجوان آڈاپشن انکوائری کے لیے دفتر میں آ گیا۔ اس کی باڈی لینگوئج اور حرکات وسکنات سے لگ رہا تھا کہ اس کا تعلق تیسری ڈائمنشن سے ہے یعنی کہ وہ Gay ہے۔ مگر عنائیہ کچھ کنفیوز سی لگ رہی تھی اس کی سیکیشوالیٹی کے بارے میں تاہم ریسپشن پر موجود انگریز لڑکیوں کا خیال تھا کہ ''وہ اصلی Gay نہیں تھا بلکہ پوز کر رہا تھا۔'' ''اس میں بھلا پوز کرنے والی کونسی بات ہے؟'' پھر عنائیہ کا ذہن الجھ سا گیا۔ بحر حال اس سے بات کرنا ضروری تھا۔ عنائیہ نے ریسپشن میں جا کر اپنا تعارف کروایا تو وہ بے حد خوش ہو گیا کہ سوشل ورکر اس کی ہم وطن تھی اور انگریزی کے علاوہ اردو اور پنجابی زبان بولنے میں بھی مہارت رکھتی تھی۔

عنائیہ اسے انٹرویو روم میں لے گئی اور انکوائری کے کاغذات مکمل کرنے کی غرض سے کئی سوالات کر ڈالے۔ ندیم نے بتایا کہ ''اس کا تعلق پاکستان کے ایک بڑے شہر سے تھا اور وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس کی منگنی اپنی کزن سے ہو چکی تھی مگر اسے عورتوں سے کوئی رغبت نہ تھی اس لیے اس نے ملک سے بھاگ کر یہاں آ کر پولیٹیکل اسائلم لے لی ہے۔''

عنائیہ کا ذوق تجسس بڑھ رہا تھا تو اس نے مزید سوال کر دیا کہ ''کیا اس کے گھر والوں کو علم ہے کہ وہ Gay ہے؟'' تو وہ کہنے لگا ''نہیں یہ بات ان کے علم میں نہیں ہے اور میں بتا بھی نہیں سکتا تھا وگرنہ مجھے اتنے جوتے پڑتے کہ خدا کی پناہ۔۔۔ آپ کو تو پتہ ہے ناں باجی اسلام میں یہ منع ہے مگر میں کیا کروں۔ میری مجبوری ہے۔ مجھے صرف مرد ہی اچھے لگتے ہیں'' اب وہ زیادہ تر گفتگو اردو میں

ہی کر رہا تھا۔ ''میں شادی کر کے کسی عورت کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں کچھ بتائے بغیر ملک چھوڑ کر آ گیا ہوں مگر میں باقاعدگی سے گھر والوں کو خرچہ بھیجتا رہتا ہوں۔ میں نے اپنے دوسری ذمہ داریوں سے منہ نہیں موڑا۔'' اس نے گویا ہمدردی سمیٹنے کے لیے مزید وضاحت کی۔

عنائیہ کی دل چسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے مزید کریدا کہ ''اس قسم کی زندگی گزارتے ہوئے کیا وہ آئسولیٹڈ نہیں ہو جاتا یا ایسے مزید ایشائی لوگ موجود ہیں جن نے وہ اپنی نیٹ ورکنگ کر سکے؟'' تو ندیم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ''یہاں بہت سے ایشیائی مسلمان Gays ہیں اور باقاعدہ ان کے کلب ہیں جہاں ہم سب باقاعدگی سے ملتے ہیں۔'' ''اس وقت تمہارا کوئی پارٹنر ہے یا اکیلے ہی ہو۔'' عنائیہ نے آڈاپشن کے نقطہ نظر سے پوچھا کیونکہ اگر اس کا پارٹنر ہوتا تو اسے بھی آڈاپشن کے لیے اکٹھے درخواست دینا پڑتی۔ تاکہ ان دونوں کی اسسمنٹ اکٹھی کی جائے۔ ندیم نے بتایا کہ ''اس کا پارٹنر اسے کچھ عرصہ پہلے چھوڑ گیا تھا اور آج کل وہ اکیلا ہی ہے۔'' انکوائری مکمل کر کے عنائیہ نے اسے باقی کا طریق کار سمجھا دیا اور کہا کہ جلد ہی ایجنسی کی سوشل ورکر اس سے رابطہ کر کے مزید معلومات کے لیے گھر پر آئے گی۔''

ندیم کے جانے کے بعد عنائیہ سوچتی رہی کہ لواطت کے بارے میں کتنی سخت وعید آتی ہے اسلام میں۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا کیا حشر ہوا تھا؟ اس کا دل چاہتا تھا کہ ایسے کڑیل جوان کو اس قسم کی غیر اخلاقی زندگی سے روکے۔ جہنم کے عذاب کا خوف دلا کر باز رکھے مگر اس کی پروفیشنل مجبوریاں اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

جب کبھی بھی ایجنسی میں GLB ٹریننگ ہوتی یعنی Gay, Lesbian and Bisexual تو وہ منافقوں کی طرح وہاں خاموش بیٹھی رہتی کیونکہ یہ سب اس کے اسلامی عقائد کے خلاف تھا اور وہ دل میں اس قسم کی جنسی زندگی کی قائل نہیں تھی مگر ''ہر ایک کی اپنی اپنی زندگی ہے۔ اس میں میں کیا کر سکتی ہوں۔'' عنائیہ نے بے چارگی سے سوچا۔

چند ہفتوں کے بعد ندیم کا فون آ گیا کہ باجی مجھے اب نیا پارٹنر مل گیا ہے میں نے اسے سمجھایا کہ اب نیا پارٹنر ملنے کی صورت میں اسے کم از کم دو سال تک انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ آڈاپشن میں آپسی تعلقات کے لیے یہ کم سے کم مدت رکھی گئی ہے تاکہ گود لینے والے جوڑے پہلے اپنے تعلق کو اچھی طرح سمجھ کر مضبوط کر سکیں۔ ندیم کی انکوائری بند کر دی گئی۔ چند مہینے کے بعد ندیم پھر ایجنسی کے دفتر آ گیا۔ اب کی بار اس کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا۔ اس نے اس کا تعارف راشد کہہ کر کروایا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس کا نیا پارٹنر تھا اور دونوں جلد ہی شادی کرنے والے تھے۔ ریسپشن میں کھڑے کھڑے باتیں کرنا مناسب نہ تھا کیونکہ سب ہی لوگ متوجہ ہو رہے تھے۔ اس لیے عنائیہ انہیں انٹرویو روم میں لے گئی تاکہ اطمینان سے بات کر سکے۔

عنائیہ کچھ متجسس تھی اور ان سے Gay میرج کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی۔ بیٹھتے ہی اس نے سوال کیا کہ ''کیا ایسی شادیوں میں بھی میاں بیوی کا کوئی تصور ہوتا ہے یا نہیں؟'' ندیم نے وضاحت کی کہ ''ہاں بالکل ہوتا ہے جیسے میں بیوی ہوں گا اور راشد میرا خاوند ہو گا ہم اسے ٹاپ اور باٹم پوزیشن کہتے ہیں۔ میں سب بیوی والے کام کروں گا۔'' عنائیہ نے پھر سوال کیا کہ ''بیوی

والے کام'' سے اس کا کیا مطلب ہے؟'' کھانا پکانا۔صفائی ستھرائی سوداسلف۔بل اوراخراجات کا حساب کتاب وغیرہ وغیرہ۔'' ندیم نے جواب دیا''اور بچے پیدا کرنا کہاں گیا جو کہ بیوی بننے والی عورت کا اہم فریضہ ہے اورعورت اگر ماں نہ بن سکے تو بانجھ عورت کوتو معاشرہ عورت تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔'' عنائیہ نے چبھتا ہوا سوال کر کے گویا ندیم کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ندیم نے شرمندگی سے جواب دیا۔''باجی یہ تو ہماری مجبوری ہے ناں۔اسی لیے تو ہم آڈاپشن کرنا چاہتے ہیں کیونکہ مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں اورفطری طریقے سے تو ہم بچے پیدانہیں کر سکتے۔'' عنائیہ کا دل چاہا کہ اسے دوتھپڑ رسید کر کے کہے کہ''پھر یہ غیر فطری حرکتیں کیوں کر رہے ہو۔کچھ خوف تمہیں آخرت کا ہے کہ نہیں!'' مگر وہ خاموش رہی۔

اس تمام گفتگو کے دوران اس کا پارٹنر راشد بالکل خاموش تھا۔اوراس نے گفتگو میں بالکل حصہ نہیں لیا حالانکہ ساری بات چیت اردو اور پنجابی میں ہورہی تھی۔عنائیہ نے مزید نوٹ کیا کہ راشد اس سے آئی کونٹیکٹ نہیں کر رہا تھا بلکہ مسلسل زمین کی طرف سر جھکائے گھور رہا تھا۔جس سے عنائیہ کو شک ہورہا تھا کہ وہ واقعی Gay تھا یا۔۔۔؟ اس نے مزید کریدتے ہوئے راشد کے حالات کے بارے میں سوالات کرنے شروع کر دیئے تو ندیم نے بتایا کہ''وہ کچھ عرصہ پہلے ہی پاکستان سے یہاں آیا ہے اور پولیٹیکل اسائلم ویزے پر ہے۔شادی کے بعد میں اس کے پرمنٹ ویزے کے لیے درخواست دوں گا۔''

پہلی بار راشد نے زبان کھولی اور کہا''ہم دونوں چاہے شادی کر لیں لیکن میں اس کی اصلی شادی ضرور کرواؤں گا۔''

راشد کا یہ جملہ عنائیہ کے لیے بہت بڑا سوال چھوڑ گیا کہ کیا یہ دونوں واقعی Gay ہیں یا پھر صرف پولیٹیکل اسائلم اور ویزے کے چکر۔۔۔۔!!!

گلاس کٹر

(Glass Cutter)

ماہین جس نئے محلے میں شفٹ ہوئی تھی وہاں ان کی سٹریٹ کے کونے پر ہی ''گلاس کٹر'' کا بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہ جب بھی وہاں سے گزرتی تو بچپن میں سکول میں پڑھی ہوئی وڈکٹر کی کہانی پتہ نہیں اسے کیوں یاد آ جاتی۔ اب اتنے برسوں بعد اسے کہانی پوری طرح تو یاد نہیں تھی بس اتنا ہی یاد آ رہا تھا کہ ایک بڑا ایماندار وڈکٹر ہوتا ہے۔ اسے کئی طرح کے لالچ دیئے جاتے ہیں اور آخر میں اس کا کلہاڑا سونے کا بن جاتا ہے۔ یہ اس کی ایمانداری کا صلہ تھا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ وہ ''گلاس کٹر اور وڈکٹر'' دونوں میں مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کیوں کر رہی تھی۔ اوہ۔۔ ''مگر وہ کب مماثلت تلاش کر رہی ہے۔ یہ تو خود بخود ہی وڈکٹر اور کلہاڑا اس کے ذہن میں چلے آتے ہیں۔'' وہ خود کو جواب دیتی۔ آتے جاتے وہ اکثر ایک ادھیڑ عمر انگریز کو وہاں کھڑے دیکھتی تھی۔ ''شاید وہاں کام کرتا ہوگا۔'' اس نے سوچا۔ ''یا پھر اس کا بزنس ہو گا۔'' مگر چہرے سے وہ بہت معصوم سا لگتا تھا۔ جب کبھی وہ گزرتی مسکراہٹوں کا تبادلہ ضرور ہوتا مگر کبھی انہوں نے ایک دوسرے سے ہیلو ہائے نہیں کیا تھا۔

نئے گھر کو سیٹ کرنے میں مہینوں لگ گئے۔ کتنا کاٹھ کباڑ اکٹھا کر رکھا تھا۔ پرانا گھر بہت بڑا تھا اور بچے بڑے ہو کر ملازمتوں کے سلسلے میں شہر سے باہر چلے گئے تو پانچ بیڈ روم کا گھر ان کی ضرورت سے بہت بڑا لگتا۔ اس عمر میں مکان کی دیکھ ریکھ سلمان سے نہیں ہو پا رہی تھی۔ کمر کا درد انہیں بیٹھنے کی اجازت نہ دیتا۔ اگر کبھی ایک آدھ گھنٹہ گارڈننگ کر لیتے تو دونوں ہائے ہائے کرتے رہتے۔ بڑے گھر کا کونسل ٹیکس۔ واٹر ریٹ بھی زیادہ تھا۔ مکان کی ہیٹنگ پر بجلی گیس کا کافی خرچ اٹھ جاتا۔ بچے تو کبھی کبھار گھر آتے اور ایسے میں دو افراد کونے میں دبکے رہتے۔ ڈاؤن سائزنگ کر کے انہوں نے تین بیڈ روم کا گھر لے لیا تھا مگر ماہین میں اتنی ہمت نہ تھی کہ پرانے گھر میں سب چیزوں کو سارٹ آؤٹ کرتی کیونکہ مکان بہت جلدی بک گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کم از کم چھ ایک ماہ تو لگ ہی جائیں گے بکتے بکاتے مگر جیسے ہی مکان مارکیٹ میں آیا۔ پہلے ہی گاہک کو مکان پسند آ گیا اور تین مہینے کے اندر اندر کنٹریکٹ ایکسچینج ہو گئے تو مقررہ تاریخ پر انہیں گھر خالی کرنا پڑا۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں بھی من پسند علاقے میں تین بیڈ روم کا صاف ستھرا مکان جلد ہی مل گیا جو ان کی ضرورتوں کے عین

مطابق تھا۔ کپڑوں اور چیزوں کی سارٹنگ کرتے ہوئے ماہین نے کئی طرح کے بیگ تیار کر لیے تھے۔ جن میں ایک تو بہت اچھی حالت کے کپڑوں کا بیگ تھا جسے اس کا خیال تھا۔ رشتے کی بہنوں کو دے دے گی۔ یا اگر کوئی پاکستان جانے والا ہوا تو وہاں غریب رشتہ داروں کو گرم کپڑے بھجوا دے گی۔ بیچارے دعائیں دیں گے۔ ایک بیگ اسلامک ریلیف کے لیے تھا۔ اور بہت زیادہ استعمال شدہ کپڑے اس نے ری سائکلینگ کے لیے نکال دیئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کافی اچھی اچھی چیزیں تھیں، زیادہ تر بچوں کے استعمال کی جواب اس کے کسی کام کی نہ تھیں مگر پھینکے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ جس کے لیے اس نے اوپن ہاؤس تقریب کرنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ سب سہیلیاں عزیز رشتہ دار آ کر جو کسی کو لینا ہو مفت لے جائیں۔

کئی ہفتے اسی انتظام وانصرام میں گزر گئے بہت سی غیر ضروری چیزیں گھر سے رخصت ہوئیں تو جیسے ماہین نے سکون کا سانس لیا گھر ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ اب جو چیزیں گھر میں رہ گئی تھیں ماہین نے ان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ''اب ان کو بھی اٹھا کر باہر نہ پھینک دینا۔'' اس طرح سنجیدگی سے ایک بار پھر سامان کا جائزہ لیتے دیکھ کر سلمان نے فقرہ اچھالا۔ ''سلمان میں اچھی چیزوں کو تو اٹھا کر باہر نہیں پھینک رہی۔ جو چیزیں ہمارے کام کی نہیں رہیں کسی اور کے کام آ جائیں گی۔ آخر پیسے خرچ کر کے خریدی تھیں۔ مفت تو نہیں ملی تھی۔'' ''میں نے کب کہا کہ تم اچھی بھلی چیزوں کو باہر پھینک رہی ہو۔ بس ایسے ہی دل لگی کر رہا تھا تمہارے ساتھ'' سلمان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ماہین کی نظر اچانک اپنی مہاگنی کی کافی ٹیبل پر پڑی۔ جو اس نے کافی عرصے پہلے منجھلی بیٹی کی پیدائش پر خریدی تھی۔ بلکہ سلمان نے اسے گفٹ کی تھی اور ساتھ میں ایک ٹیبل نیسٹ بھی تھا۔ بیٹی کی طرح اسے اس کافی ٹیبل سے بہت انس تھا۔ ''کس قدر گرد وغبار بیٹھ گیا ہے کافی ٹیبل پر''۔ وہ خود سے گویا ہوئی۔ ''یہ گھر کی ادل بدل میں تو اچھے خاصے فرنیچر کی درگت بن گئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ سب فرنیچر درست حالت میں نئے گھر میں پہنچ گیا ہے۔'' مگر جیسے ہی اس کی نظر ٹیبل نیسٹ پر پڑی اس کا دل دہل گیا۔ ایک درمیانے سائز کی ٹیبل کا شیشہ بری طرح چکنا چور ہو چکا تھا۔ ''اب کیا ہوگا۔ کہاں سے اس کا شیشہ آئے گا۔ شیشہ نہ ملا تو؟ اس کا لیدر تو ستیاناس ہو جائے گا۔'' اس نے خود سے کئی سوال کر ڈالے۔

سلمان نے اسے یوں پریشان دیکھ کر کہا کہ ''اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ تمہاری گلی کی نکڑ پر تو اتنا بڑا گلاس کٹر کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ پوری فیکٹری ہے یہاں گھر کے پاس اور تم اتنے سے شیشے کے لیے پریشان ہو رہی ہو۔ سارے گھر کے شیشے بھی توڑ ڈالو تو پرواہ نہیں ہے وہ بوڑھا انگریز جو تمہیں آتے جاتے مسکراہٹیں پھینکتا رہتا ہے۔ وہ آخر کس دن کام آئے گا۔''

ماہین نے سلمان کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے سوچا کہ پتہ نہیں اسے آج گلاس کٹر کیسے بھول گیا تھا۔ ''اوہ یس'' وہ جیسے خوشی سے جھوم اٹھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ گلاس کٹر کے ریسپشن میں کھڑی تھی اور وہی بوڑھا انگریز وہاں پر موجود تھا۔ مسکراہٹوں کا ایک بار پھر تبادلہ ہوا اور ماہین نے اسے بتایا کہ ''اس کے چھوٹے ٹیبل کا شیشہ چکنا چور ہو گیا ہے اور یہ کافی پرانا کافی ٹیبل کا سیٹ ہے۔ معلوم نہیں س طرح کا میچنگ شیشہ اب ملے گا بھی یا نہیں۔'' وہ کہے جا رہی تھی۔ اس کی بات سن کر بوڑھے انگریز نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''

''Don't worry, we will sort it out for you, Madam.''

شیشے کا سائز ساتھ لے کر آنا وہ بھول گئی تھی۔تو بوڑھے انگریز نے کہا کہ وہ اس کے ساتھ گھر جا کر خود اس کی پیمائش کرے گا اور شام تک اسے شیشہ کاٹ کر ٹیبل میں سیٹ کر دے گا۔

شام ٹھیک سات بجے دروازے کی گھنٹی بجی تو ماہین نے جا کر دروازہ کھولا کیونکہ سلمان گھر پر نہیں تھا۔سامنے بوڑھا انگریز ہاتھ میں ٹیبل کا شیشہ پکڑے کھڑا تھا۔ماہین نے اسے اندر آنے کو کہا تو اس نے اندر آ کر ٹیبل پر شیشہ فٹ کرنا شروع کر دیا اور ساتھ پچیس پونڈ کا بل ماہین کے ہاتھ میں تھما دیا۔بوڑھے کو ذرا انتظار کرنے کا کہہ کر وہ پرس میں سے پیسے لینے گئی۔دیکھا تو پرس میں ایک پانچ پونڈ کے نوٹ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔وہ پریشان سی ہو اٹھی۔''اب اس کا بل کیسے چکائے گی؟'' آئی ایم شور۔میرے پرس میں کم از کم پچاس پونڈ تھے۔تو پیسے کہاں گئے؟ کیا سلمان نے لیے ہیں،مگر کیوں؟ سلمان نے تو کبھی بتائے بغیر میرے پرس سے پیسے نہیں لیے۔''اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔اب وہ کیسے جا کر اسے بتائے کہ اس کے پاس اس وقت پیسے نہیں ہیں۔کس قدر شرمندگی ہو رہی تھی اسے۔کیا سوچے گا وہ۔۔۔!'' یہی سوچ سوچ کر وہ پشیمان ہو رہی تھی۔وہ اب اسے مزید انتظار نہیں کروا سکتی تھی اور نہ ہی سلمان کے گھر لوٹ آنے کا انتظار کر سکتی تھی۔اس نے واپس جا کر بوڑھے انگریز کو دیکھا وہی معصوم سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ فرنٹ روم میں کھڑا تھا۔اس نے جھجکتے جھجکتے اسے بتایا کہ''بل ادا کرنے کے لیے اس وقت اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔چاہے تو وہ شیشہ واپس لے جا سکتا ہے یا پھر ہم کل بل ادا کر دیں گے۔'' ماہین کی بات سن کر بوڑھے انگریز نے اسی مسکراہٹ سے کہا:

"Don't worry, I trust you....you. have an honest face"

اتنا کہہ کر وہ بائے بائے کہتا ہوا چلا گیا اور ماہین کو وہیں سراسیمہ سا چھوڑ گیا۔وڈ کٹر۔۔۔گلاس کٹر۔۔۔ایمانداری۔۔۔۔پر خلوص چہرہ۔۔۔سب گڈ مڈ سے ہو رہے تھے۔آج یہ عجیب سا تعلق ماہین کی سمجھ میں آ رہا تھا۔اور وہ سوچ رہی تھی کہ اچھے برے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔انگریزوں میں بھی اچھے لوگ ہیں اور ہمارے اپنوں میں بھی برے لوگ ہیں۔ہمیں تعصب کی عینک اتار کر ۔۔۔۔۔!

گاربیج

(Garbage)

سدرہ کو شروع سے ہی کوڑا کرکٹ اٹھانے والی بڑی سی گاڑی بہت فیسی نیٹنگ لگتی تھی۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ عین مقررہ وقت پر بڑے بڑے پہیوں والی گاڑی زوں زوں کرتی سڑک پر شور مچانا شروع کر دیتی تھی۔ کچرے کا تماشہ دیکھنے کے لیے وہ ہمیشہ ہی کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ جاتی اور جب تک گاڑی ان کے محلے سے کچرا اٹھا کر چلی نہ جاتی وہ کھڑکی سے چپک کر بیٹھی رہتی۔

وہ جب بھی گاربیج اٹھانے والی گاڑی کو دیکھتی۔ کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی مگر کوئی تعلق کوئی نسبت، کوئی واسطہ اسے کچرا اٹھانے والی گاڑی سے بتا سجھائی نہ دیتا۔۔۔!

کرسمس کے لیے خاص طور پر کچرا اٹھانے والی گاڑی کے ملازمین ہر گھر کے دروازے پر نوک کر کے ہیپی کرسمس کہتے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ انہیں عیدی چاہیے۔ پہلے پہل تو اسے اس بات کی سمجھ ہی نہ آئی مگر جب کامران نے ہنستے ہوئے اسے بتایا کہ ''نیک بخت۔ اسے کچھ پیسے دیدو۔ اپنے لیے کوئی ڈرنک ورنک خرید لے گا'' تو وہ سخت جُز بُز ہوتی تھی۔ ''ہائے تو کیا میں اسے شراب خریدنے کے لیے پیسے دوں؟ ناں بابا ہماری حق حلال کی کمائی شرابیوں کے لیے نہیں ہے۔''

کامران ہنستے ہوئے دلیل دیتا کہ ''تمہارے پیسے نہ دینے سے کیا وہ ڈرنک کرنا چھوڑ دے گا۔ تمہیں اس سے کیا غرض ہے کہ وہ ان چند پونڈز کا کیا کرتا ہے۔ بس اب اسے اور زیادہ انتظار مت کرواؤ وہ کب سے دروازے پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔'' اور وہ بادلِ ناخواستہ پانچ پونڈ کا نوٹ نکال کر آہستہ سے اس کی طرف بڑھا دیتی۔ جسے وہ بہت شاندار مسکراہٹ کے ساتھ تھینک یو تھینک یو کہتا ہوا وصول کر لیتا۔

سدرہ اکثر سوچتی کتنا اچھا انتظام ہے یہاں کچرا اٹھانے کے لیے۔ عام کوڑے کرکٹ کے بیگ الگ ہیں۔ ری سائیکلنگ کے لیے کاغذ۔ شیشے کی بوتلیں۔ پلاسٹک اور میٹل ٹن الگ سے اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ اور گارڈن ویسٹ اور ہیوی آئٹمز کے الگ سے دن مقرر ہیں۔

اس قدر اچھے انتظام وانصرام کے باوجود سدرہ کبھی کبھی تو بہت چڑ جاتی کیونکہ سارا ہفتہ کچرے کو الگ الگ بیگوں اور رنگ برنگ ڈبوں میں ڈالنے کی ذمہ داری اس کی ہی تھی۔ کامران تو صرف انہیں اٹھا کر ہفتے میں ایک بار باہر رکھنے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ کبھی کبھی

تو اسے لگتا کہ جیسے زندگی کا مقصد صرف کچرے کی خانہ شماری کرنا ہی رہ گیا ہو۔ کبھی ایک بیگ تو کبھی دوسرے ڈبے کو دیکھو جا کر۔ آج پھر کچرے والی بڑی سی زوں زوں کرتی گاڑی کو دیکھ کر اس کا ذہن پھر کہیں بھٹک سا گیا تھا۔ اسے ایکدم عرب کی وہ بڑھیا یاد آ گئی جو ہمارے حضور نبی اکرم ﷺ پر ہر روز کوڑا پھینکا کرتی تھی مگر ایک روز جب وہ بیمار ہوگئی اور کسی نے آپ ﷺ پر کوڑا نہ پھینکا تو آپ اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر تشریف لے گئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے حسن سلوک سے وہ کافر بڑھیا اتنی متاثر ہوئی کہ کلمہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی۔ آج سدرہ کے ذہن کی گتھی سلجھ گئی تھی کہ یہی بات تھی جسے وہ بہت عرصے سے سوچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر یاد نہ کر پاتی تھی۔ آج اسے کچرے، کوڑا کرکٹ اور گاڑی کے تعلق کا پتہ چل گیا تھا۔۔۔!

سدرہ کی زندگی بس ایک ہی ڈگر پر چل رہی تھی۔ دونوں بچے اسکول سے نکل کر کالج اور پھر یونیورسٹیوں میں چلے گئے۔ اس نے ان کی دینی اور دنیاوی تعلیم و تربیت پہ بہت زور دیا تھا۔ خاص طور پر اردو زبان و ادب سے خاص محبت اور انس پیدا کر رکھا تھا جبھی تو دونوں نے ہی اردو میں اولیولز بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر لیے تھے۔ چھوٹی بیٹی وردہ کی اردو قدرے کمزور تھی جبکہ بڑی بیٹی ثنا تو فر فر اردو بولتی تھی کیونکہ وہ کئی مرتبہ پاکستان جا چکی تھی اور اسے زبان بولنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔

چھوٹی بیٹی میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے اب ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ اکثر اس کا واسطہ ایسے ایشیائی مریضوں سے پڑتا رہتا تھا جنہیں انگریزی میں بات چیت کرنے اور سمجھنے میں دقت پیش آتی۔ وہ اکثر ہی فون کر کے سدرہ سے مختلف باڈی پارٹس کے اردو نام پوچھتی رہتی تھی تاکہ اسے مریضوں کو سمجھانے میں آسانی رہے۔ جب سے اس نے فاؤنڈیشن ٹریننگ شروع کی تھی، اس کی اردو کافی بہتر ہوگئی تھی۔ سدرہ اکثر اس کا مذاق اڑاتی کہ بچپن میں وہ اردو پڑھنے سے کتنا جی چراتی رہتی تھی۔ سو سو بہانے کرتی۔ کبھی کہتی ممی میری ٹنگ کام نہیں کرتی اردو بولنے کے لیے۔۔۔ یا پھر اپنا قاعدہ کہیں چھپا دیا کرتی تھی۔

"Whats the point in learning Urdu?"

اکثر بحث کرنے لگتی کہ ممی یہ اردو کونسی یہاں ہمارے کام آئے گی۔ اور وہ اکثر اسے کئی قسم کے دلائل دے کر اردو پڑھنے پر آمادہ کرتی کہ ''اپنی مادری زبان ہے۔ ضرور سیکھنی چاہیے۔ چین، جاپان کو دیکھو، کیسے ترقی یافتہ ممالک ہیں مگر اپنی ہی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا رکھا ہے۔ انگریزی ضرور سیکھو مگر اپنی زبان کو کم تر مت گردانو۔۔۔!''

وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تقریر جھاڑ دیتی۔ آج پھر شام کو وردہ کا فون آ گیا۔ وہ ہسپتال میں سارے دن کی روئداد گوش گزار کر رہی تھی۔ سدرہ کو بیٹی کے کنسلٹنٹ، رجسٹرار، ایس ایچ اوز اور جونیئر ڈاکٹرز تقریباً سبھی کے نام معلوم تھے روز روز کے قصے کہانیاں سن سن کر، آج وردہ بڑی خوش لگ رہی تھی ''ممی آج پتا ہے کیا ہوا۔ ایک انکل جی ہمارے وارڈ میں ہیں۔ میرے کنسلٹنٹ نے وارڈ راؤنڈ میں مجھے کہا کہ ذرا ان کو اپنی زبان میں سمجھا دو کہ ہمارا ٹریٹمنٹ پلان کیا ہے۔ تو میں نے اردو میں انکل جی سے بات کی ہے اس پر میرا کنسلٹنٹ بہت امپریس ہوا تھا کہ مجھے اردو بولنی آتی ہے۔ آپ ٹھیک کہتی تھیں ہمیں Bilingual ضرور ہونا چاہیے وگرنہ تو ہم انگریزوں کی طرح ہی ہو جائیں گے۔ جو صرف انگریزی ہی بولتے ہیں۔'' بیٹی کی بات سن کر سدرہ مسکرا دی کہ

بچوں کو بات سمجھنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ بس والدین میں حوصلہ اور صبر ہونا چاہیے۔ چاہے فوری طور پر نتائج برآمد نہ ہوں مگر بعد میں جا کر پتہ چلتا ہے کہ بچپن کی تعلیم و تربیت ایک لونگ ٹرم انوسٹمنٹ ہے۔ بچپن میں بچوں پر کئی گئی محنت اکارت نہیں جاتی۔

آج پھر وردہ کا فون آ گیا اور کہنے لگی ''ممی جلدی سے مجھے بتائیے کہ مجھے اپنے مریض کو بتانا ہے کہ'' He has cancer growth in his brain، میں اردو میں اسے کیسے کہوں گی۔'' سدرہ نے اسے کہا کہ وہ کوشش کر کے بتائے کہ اس کی اردو کیا ہونی چاہیے۔ وردہ نے سوچ سوچ کر بتایا کہ میں کہوں گی ''انکل جی آپ کے سر پر کینسر اگ رہا ہے۔'' سدرہ بیٹی کی بات سن کر زور سے ہنس پڑی کہ ''تم کینسر اگ رہا ہے تو ایسے کہہ رہی جو جیسے اس کے سر پر کوئی درخت اگ رہا ہے۔'' بس اسی طرح کی باتوں میں وقت گزر رہا تھا۔

سدرہ کو بچے بڑے ہو جانے کے بعد فرصت ہی فرصت تھی۔ اب وہ ایک ہی طرح کے لگے بندھے روٹین سے بوریت محسوس کرنے لگی تھی۔ کامران اپنی کتابوں یا پھر اسپورٹس چینل میں ڈوبے رہتے۔ اور وہ ساری شام ادھر ادھر فون پر گپیں ہانک کر گزار دیتی۔

ایک دن کامران نے اسے مشورہ دیا کہ ''وہ کوئی پارٹ ٹائم جاب کیوں نہیں تلاش کر لیتی۔ کم از کم دن کے چند گھنٹے تو مصروفیت میں گزریں گے۔'' وگرنہ دونوں بیٹیوں کے بڑا ہو جانے کے بعد اب گھر میں کام ہی کیا رہ گیا تھا۔ صفائی، ستھرائی آئرنگ تو انگریز کلیز کر جاتی تھی۔ ایسے میں سوائے کچن کے تھوڑے سے کام کے کرنے کے لیے اور کیا تھا وہ سوچتی۔۔۔

سدرہ کو کامران کی تجویز کچھ اچھی لگی تو وہ اگلے ہی دن جاب سینٹر جا پہنچی۔ ایک دفتر میں فائلنگ کلرک کی اسامی خالی تھی۔ انٹرویو اچھا رہا اور انہوں نے اسے ہفتے میں اٹھارہ گھنٹے کام کی ملازمت پر رکھ لیا۔ کام پر زیادہ تر انگریز لوگ تھے۔ چند ایک ایشیائی بھائی بند تھے۔ سب انگریزی میں ہی بات چیت کرتے۔ سدرہ کا تو منہ دکھ جاتا انگریزی بولتے بولتے۔ اس کا بہت دل چاہتا کہ وہ اپنی مادری زبان میں دوسرے ایشیائی لوگوں سے بات چیت کرے مگر سب جیسے جھجکتے تھے اپنی زبان میں بات کرنے سے۔۔۔ سدرہ نے گاہے بگاہے دوسرے ایشیائی کولیگز سے اردو میں بات کرنا شروع کر دی۔ اس کا انگریز سپروائزر اکثر اسے اردو میں بات چیت کرتے وقت گھور گھور کر دیکھتا مگر وہ اسے نظر انداز کر دیتی۔ ایک دن جبکہ وہ دوسری ایشین کولیگ سے ہنس ہنس کر کینٹین میں اردو میں باتیں کر رہی تھی تو انگریز سپروائزر کے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز سا ہو گیا۔

"Stop speaking Garbage."

اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

سدرہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے عرش سے اٹھا کر فرش پر پھینک دیا ہو۔ اس کے اندر کوئی چیز۔۔۔ ٹوٹ سی گئی۔۔۔ اس دن کے بعد سے اس نے کچرا اٹھانے والی گاڑی کو پھر کبھی بھی نظر بھر کر نہیں دیکھا۔۔۔۔!

شادی ڈاٹ کوم

(Shadi.com)

کئی مہینوں کی سوچ بچار اور منصوبہ بندی کے بعد مسز شاہ نے آج شہر کے ایک شاندار ہوٹل میں میرج انٹروڈکشن ایونٹ کا اہتمام کیا تھا۔ اس تقریب کی خاص پبلسٹی مقامی ریڈیو، نیشنل نیوز پیپرز اور انٹرنیٹ پر کی گئی تھی اس لیے لوگ برطانیہ بھر سے جوق در جوق تقریب میں شرکت کرنے کے لیے اپنے نوجوان بچوں کے ہمراہ آ رہے تھے گویا ایک میلے کا سا سماں تھا۔ زرق برق لباس۔ جیولری، میک اپ، نئے نئے ہیر اسٹائل، گویا رنگ و بو کا ایک سیلاب سا امڈ آیا ہو۔

میں مسز شاہ کے ساتھ کئی مہینوں سے اس تقریب کے انتظامات اور انہیں عملی شکل دینے کے کام میں مصروف تھی۔ ہماری پوری کوشش تھی کہ تقریب کامیاب ہوتا کہ یہاں کی ایشیائی مسلمان کمیونٹی کو اپنے بچوں کے شادی بیاہ کے معاملات طے کرنے کے لیے کوئی مناسب پلیٹ فارم مہیا ہو سکے۔ میٹنگ کا انتظام دو لیولز پر کیا گیا تھا۔ ''ایک سیکشن میں تو صرف فیملز بیٹھیں گی اور دوسرے سیکشن میں ڈنر کے بعد صرف لڑکے لڑکیاں ہی جائیں گے تاکہ وہ اپنے والدین کی غیر موجودگی میں آپس میں گھل مل کر بات چیت کر سکیں۔'' مسز شاہ نے کہا کھانے کا انتظام بفے کی شکل میں کیا گیا تھا۔ تھری کورس میل تھا تقریباً دو بجے تک تمام مہمان کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ لوگ آپس میں خوش گپیوں میں مشغول تھے اور نیٹ ورکنگ ٹائم کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

میری اور مدیحہ کی ڈیوٹی ہر ٹیبل پر جا کر لوگوں سے ہیلو ہائے کرنا اور تقریب کے بارے میں ان کی رائے جاننا تھا۔

مسز رحمان شہر کی ایک معروف سماجی کارکن تھیں۔ ان کے اپنے بچوں کی تو شادیاں ہو چکی تھیں۔ غالباً کسی فیملی کو ساتھ لے کر آئی ہوئی تھیں۔ ''بھئی شادی تو بور کے لڈو ہیں۔ جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کھائے۔۔۔۔ وہ زیادہ پچھتائے۔'' مسز رحمان کہہ رہی تھیں۔ ان کی بات مسز اویس نے آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''تو پھر کیوں ناں بندہ لڈو کھا کر ہی پچھتائے۔'' اور اس کے ساتھ ہی ان کے ٹیبل پر زبردست قہقہہ پڑا۔

دوسرے ٹیبل پر اریجنڈ شادیوں پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ ایک خاتون کافی شاکی لگ رہی تھیں کہ اس ملک میں انگریزوں نے اریجنڈ شادیوں کی نیگیٹو پبلسٹی کر کے انہیں فورسڈ میرج بنا دیا ہے۔ حالانکہ اریجنڈ میرج میں کوئی ایسی قباحت نہیں ہے بلکہ کسی

زمانے میں تو اس ملک کے شرفاء میں بچوں کی شادیاں اریجنڈ ہی ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے کہ شادی صرف لڑکے لڑکی کا نجی معاملہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ دو خاندانوں کا ملن تھا۔''

ان کی بات کے جواب میں دوسری خاتون نے منہ کھولا۔ میں آپ کی بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں کیونکہ جیسے ہی اس زمانے کے انگریز گھرانوں میں لڑکیاں شادی کی عمر کو پہنچتی۔ والدین انہیں سجا بنا کر تقریبات میں ساتھ لے کر آتے تھے تا کہ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی پسند بتا سکیں۔ مگر اب تو یہاں کی سوسائٹی کا تار پود ہی بگڑ گیا ہے۔ شادیوں سے زیادہ تو طلاقیں ہو رہی ہیں اس لیے اب اکثریت تو شادی کے بغیر ہی رہنے کو ترجیح دے رہی ہے۔ جب جی چاہا۔ کپڑے سمیٹے اور چل دیئے۔ کوئی لمبا چوڑا بکھیڑا پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

پہلے والی خاتون پھر گویا ہوئیں'' بھئی اب اپنے لوگوں میں بھی شادیاں کہاں کامیاب ہو رہی ہیں۔ پہلے کہا کرتے تھے چٹ منگنی پٹ بیاہ مگر اب تو چٹ شادی پٹ طلاق۔ محاورہ ہی بدل گیا ہے۔ کئی ایک شادیوں سے واپس آ کر تو ابھی کپڑے بھی ڈھنگ سے نہیں سمیٹ پائے تھے کہ دو ہی ہفتوں میں علیحدگی ہوگئی بلکہ ہنی مون پر ہی دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اور چند ہفتوں کے اندر معاملہ ختم۔''''خدا کی پناہ'' دوسری عورت نے لقمہ دیا۔'' سب قیامت کے آثار ہیں۔ اسلام سے دوری کا نتیجہ ہے۔ بچوں کی تربیت ہی صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو رہی ہے۔'' خاتون مسلسل دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ ہم نے تو وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی کہیں ان خاتون کے زوردار لیکچر سے لوگ شادیوں سے ہی متنفر نہ ہو جائیں اور ہماری تقریب دھری کی دھری رہ جائے۔

ایک کونے میں کھڑی چند خواتین اپنے اپنے ملکوں کی یاد تازہ کر رہی تھیں کہ انڈیا اور پاکستان میں کس طرح رشتہ کرانے والیاں گھر گھر کی خبر رکھتی تھیں۔ جہاں کہیں بچے بچیوں نے ذرا سر اٹھایا بی اماں فوراً پہنچ جاتیں شادی کا پیغام لے کر۔ ان وقتوں میں ادب آداب اور رکھ رکھاؤ تھا۔ آنکھ میں شرم تھی۔ باپ دادا کی عزت کا لحاظ ہوتا تھا۔ ماں باپ نے جہاں مناسب گھرانہ دیکھ کر بات چیت پکی کر دی۔ وہیں خاموشی سے سر جھکا دیا۔

ڈاکٹر رابعہ کافی دیر سے خاموشی سے ان خواتین کی گفتگو سن رہی تھیں۔'' ہم بچیوں کی تعلیم و تربیت پر تو بہت زور دیتے ہیں مگر لڑکوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لڑکیاں ذہنی طور پر لڑکوں سے بہت آگے نکل گئی ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں مگر لڑکے ابھی تک روایتی ذہن رکھتے ہیں۔ چاہتے تو ہیں کہ بیوی پڑھی لکھی ہو۔ پروفیشنل بھی ہو مگر اس کے ساتھ ہی امور خانہ داری میں ماہر۔ میاں کے گھر آنے سے پہلے ہی گرم گرم کھانا پکا کر کلیوں کے گجرے سجا کر ادائے دلربائی سے دروازے پر استقبال کے لیے تیار کھڑی ہو۔ مگر اب یہ سب ہوتا نظر نہیں آتا۔'' وہ کافی غصے میں نظر آ رہی تھیں۔ دراصل کچھ ہی عرصہ پہلے ان کی ڈاکٹر بیٹی کی شادی اسی قسم کے چکر میں ٹوٹ گئی تھی جس کی تلخی کی بازگشت ان کی باتوں میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

''مسز خان کب سے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ دیکھ رہی ہیں۔ ہر گھر میں جھانک چکی ہیں۔ اب تو لوگ ان کے نام سے ہی کتراتے ہیں۔ جہاں جاتی ہیں واپس آ کر لڑکی والوں میں سو کیڑے نکالتی ہیں۔'' بیگم الطاف کہہ رہی تھیں۔''اسی لیے تو بیٹا تیس

کے پیٹے میں چلا گیا ہے مگر رشتہ ہونے کی ابھی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ان کے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔کبھی تو کہتی ہیں کہ پروفیشنل لڑکی چاہے اور کبھی ہاؤس وائف کی رٹ لگا دیتی ہیں۔''

اب اس ٹیبل پر بحث پروفیشنل اور ہاؤس وائف کے گرد گھومنے لگی۔''بھئی یہ ہاؤس وائف آخر کیا چیز ہے؟ ہم نے بھی زندگی بھر ملازمت کی ہے اور گھر بھی چلایا ہے۔آج کی عورت اپنے دونوں محاذ اچھی طرح سے سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔'' ڈاکٹر رابعہ نے لقمہ دیا''بھئی بہت سی ماؤں کا خیال ہے کہ لڑکی تعلیم یافتہ ضرور ہو کیونکہ بیٹے کی ڈیمانڈ یہی ہے مگر صرف گھر کی ہو کر رہ جائے۔بس اس کو وہ ہاؤس وائف کہہ رہی ہیں کہ ملازمت کے چکر میں نہ پڑے۔'' اب کی بار مسز ملک نے زبان کھولی''آخر اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے اپنے بھی کچھ خواب ہوتے ہیں۔اتنی تعلیم حاصل کر کے اسے چولہے کی نذر تو کرنے سے وہ رہیں۔اگر وہ گھر اور کیریئر کی ذمہ داریاں بخوبی نبھا سکتی ہیں تو پابندیاں لگانے کی تو ضرورت نہیں ہے۔اس کی وجہ سے لڑکیاں روایتی سوچ رکھنے والے گھرانوں میں شادی کرنے سے کترا رہی ہیں جہاں لڑکے کی بجائے ساس کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنا پڑے۔''

ذرا آگے بڑھے تو چند اور خواتین محوِ گفتگو نظر آئیں۔''ارے یہ مسز افتخار یہاں کیا کر رہی ہیں۔'' مدیحہ نے چونک کر پوچھا۔ ''ان کا تو ایک ہی بیٹا ہے اور پچھلے سال تو یہ شادی پاکستان سے کر کے لائی ہیں۔اس قدر پیاری بہو ہے ان کو۔بڑی ہی با اخلاق اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔'' مسز افتخار ایک دوسری عورت سے کہہ رہی تھیں''ایک ہی بیٹا ہے، ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔بہو اچھی نہیں ملی۔بس بات ختم ہو رہی ہے۔۔۔مدیحہ حیران تھی کہ ابھی کل ہی تو یہ اپنی بہو کے ساتھ برٹش ہوم اسٹور میں ملی تھیں اور آج یہاں بیٹے کے لیے دوسری بیوی تلاش کرنے آ گئی ہیں؟ میں نے گرہ لگائی اس کو کہتے ہیں۔Thinking Ahead اور ہم آگے چل دیں۔

اگلی ٹیبل پر مسز مرزا کچھ خواتین کو گھیرے بیٹھی تھیں اور آج کے ایونٹ کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تین ڈاکٹر بیٹوں کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی تھیں۔''مجھے تو بس ڈاکٹر بہوئیں ہی چاہئیں۔سرو قد، خوبصورت، نازک اندام، کھاتے پیتے گھرانے سے ہوں۔'''' ارے یہ تو ظاہر کی بات ہو گئی مگر اصل آدمی تو اپنے کردار، تربیت، سوچ، انداز فکر اور صحیح قدروں سے ہی بنتا ہے۔اس کے بارے میں آپ نے کبھی کچھ نہیں کہا۔'' ایک دوسری خاتون نے چبھتا ہوا سوال کر دیا، تو نیم خواندہ مسز مرزا نے انہیں گھور کر دیکھا کہ شاید ان کے کم پڑھی لکھی ہونے کا وہ مذاق اڑا رہی تھیں۔انہوں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا یا شاید اس خاتون کی اتنی سنجیدہ بات کا مسز مرزا کے پاس جواب ہی نہیں تھا۔جن کا سارا زور ظاہری رکھ رکھاؤ۔ٹیپ ٹاپ اور اسٹیٹس پر تھا۔

میں اور مدیحہ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگیں کہ کیسی کیسی چیزیں اللہ میاں نے بنا کر اس زمین پر پھینک دی ہیں۔اب یہ تین ڈاکٹر بیٹوں کو ماں آئیڈیکل ڈاکٹر بہوؤں کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دے گی۔کتنی ہی لڑکیوں کو بلاوجہ ریجکٹ کرے گی۔کتنوں کے دل توڑے گی۔کتنوں کی بددعائیں سمیٹے گی۔اور اگر کوئی ان کے بیٹوں سے پوچھے کہ انہیں ڈاکٹر بیویاں ہی چاہیے تو ایمان سے کہتی ہوں وہ کہیں گے یہ صرف اماں کی خواہش ہے وگرنہ ہم تو ایک ایسی لڑکی کے خواہش مند ہیں جو صحیح

معنوں میں ایک اچھی لائف پارٹنر ثابت ہو سکے۔ بس تعلیم یافتہ ضرور ہو۔

نیٹ ورکنگ پورے عروج پر تھی۔ مسز شاہ بہت ایکسائٹڈ تھیں اور ہر ایک ٹیبل پر جا کر لوگوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں کہ اتنے میں مائیک پر آواز گونجی کہ ''شادی کے امیدوار سب لڑکے لڑکیاں ہال کے دوسرے کونے میں مخصوص نشستوں پر تشریف لے جائیں۔'' اعلان سن کر بیٹوں کی ماؤں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ جیسے ہی لڑکے لڑکیاں مخصوص کونے کی طرف بڑھے۔ سب مائیں چوکنا ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگیں اور منتظمین کے ہزار منع کرنے کے باوجود بچوں کے گرد جمگھٹا بنا کر کھڑی ہو گئیں اور وہاں سے کسی طرح ٹل ہی نہیں رہی تھیں۔ بیٹا اگر کسی لڑکی سے بات کرنے کے لیے آگے بڑھتا تو فوراً اماں آنکھ، ناک اور سر ہلا کے اشارے سے بیٹے کو منع کر دیتیں۔

میں اور مدیحہ سارا تماشہ کافی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ ''اس طرح تو لڑکوں کی شادیاں نہیں ہوں گی جو حرکتیں یہ مائیں کر رہی ہیں۔'' مدیحہ نے غصے سے کہا۔ ''دراصل وہ چاہتی ہی نہیں ہیں کہ بیٹا جی خود لڑکی پسند کریں۔ وہ پہلے لڑکی خود پسند کرنا چاہتی ہیں اور چاہیں گی کہ بیٹا بھی اسی لڑکی کو پسند کرے۔'' جبھی تو آنکھ، کان، ناک کے اشارے کر رہی ہیں۔'' میں نے کہا ''تو یہ سارا ڈرامہ رچانے کی کیا ضرورت ہے کہ بیٹے کی پسند کی لڑکی ڈھونڈھ رہی ہوں۔ پھر یہ کہنا کہ اسے کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی۔ سراسر بکواس ہے۔ دراصل ماں کو ہی لڑکی پسند نہیں آتی اور بیٹا کاٹھ کے اُلّو کی طرح پیچھے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔'' مدیحہ جل کر بولی۔ ''آجکل کی لڑکیاں اسی قسم کے لڑکوں سے تو الرجک ہیں۔ جن کے اپنے کوئی ذہن ہی نہیں ہیں اور اماں کا پلو پکڑ کر چل رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

ہال اب آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا تھا۔ لوگ آپس میں ٹیلی فون اور ای میلز ادل بدل کر رہے تھے کہ اتنے میں مسز مرزا پاس سے گزریں جو کسی دوسری خاتون سے کہہ رہی تھیں۔ ''بس سوشل ایونٹ ہی تھا، کھانا بھی ٹھیک تھا مگر لڑکی کوئی ہماری پسند۔۔۔! اس سے تو شادی ڈاٹ کوم ہی بہتر ہے کہ گھر بیٹھے بٹھائے بیسیوں رشتے دیکھ لو۔ اور وقت کی لمبی بچت۔۔۔ میں اور مدیحہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔۔۔! کہ ایسی منافقت۔۔۔! ایسا دوغلہ پن۔۔۔!

ریورس گیئر

(Reverse Gear)

روپا کو اس پراسرار سی کائنات اور اس پر بسنے والے انسانوں کے بارے میں جاننے میں بچپن سے ہی بہت دل چسپی تھی۔ اس لیے اسے پامسٹری، ٹاروکارڈز۔علم حروف اور علمِ نجوم کے بارے میں جہاں کہیں کوئی مواد نظر آ جاتا اسے پڑھے بغیر چین سے نہیں بیٹھتی تھی۔ ہر سال بڑے اہتمام سے نئے سال کے لیے ہاروسکوپ کی کتاب خرید کر دیکھتی کہ آنے والے سال کی پیشن گوئیاں کیا تھیں۔اخباروں رسالوں میں چھپنے والے ''آپ کا ہفتہ کیسا ہوگا۔'' کے صفحات ہمیشہ اس کی دل چسپی کا مرکز ہوتے مگر یہ الگ بات تھی کہ پڑھنے کے فوراً ہی بعد اسب اس کے ذہن سے محو ہو جاتا گویا اسے صرف پڑھنے کی حد تک دل چسپی تھی مگر عمل کا خانہ خالی ہی تھا۔

میں اکثر اس کی اس عادت سے چڑ جاتی تھی ''کیا تم ہر وقت برجوں اور ستاروں کے چکر میں پڑی رہتی ہو۔'' تو وہ ہنس کر جواب دیتی کہ ''یار بس ذرا انٹرسٹنگ ہے اس میں کیا ہرج ہے ہم کون اس پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔ ویسے تم اگر تھوڑا بہت علم نجوم کے بارے میں جان لو تو کوئی نقصان نہیں ہو جائے گا۔کریکٹر ریڈنگ تو ہمیشہ بڑی زبردست ہوتی ہے ان کتابوں میں۔کم از کم لوگوں کی شخصیت بارے میں کچھ معلومات ہی مل جاتی ہیں۔''

آج کالج میں پورے دو پیریڈ زفری تھے اور میری شامت آ گئی تھی کیونکہ روپا کہیں سے علم نجوم کی دو موتی موٹی کتابیں اٹھا لائی تھی گویا آج اس نے علم نجوم پر مجھے لکچر دینے کا پورا پورا پروگرام بنا رکھا تھا۔

میں اگر اسے کہتی کہ یہ میرے مذہب کے خلاف ہے کہ ہم مستقبل کا حال جانتے پھریں تو وہ تنک کر کہتی کہ ''مذہبی نقطہ نظر سے علم نجوم نہ تو مذہب کا حصہ ہے اور نہ ہی عقیدہ۔۔۔۔فقط حساب کا ایک قاعدہ ہے۔جیسے ہر شخص واچ دیکھ کر ٹائم بتا سکتا ہے۔اسی طرح ستاروں کا حساب دیکھ کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کون سا ستارہ کس برج میں ہے۔اور اس وقت دنیا پر اپنے کیسے اثرات چھوڑ رہا ہے۔'' وہ بالکل جوتشیوں کے سے انداز میں مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی۔اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولی کہ ''ستارے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک سٹیشنری یعنی جامد اور دوسرے جو اپنے محور اور دوسرے ستاروں کے گرد گھومتے ہیں البتہ جامد ستاروں کے گرد گھومنے

والے ستاروں نے اپنے ایسے مقام بنائے ہوئے ہیں جنہیں علم نجوم میں برج کہا جاتا ہے۔ اور کل بارہ برج ہیں۔ کچھ پتہ چلا تمہیں میڈم۔۔۔'' روپا نے اپنے علم کا روپ جھاڑتے ہوئے کہا۔

میں روپا کی ستاروں کے بارے میں ایوئرنس سے کچھ مرعوب سی ہوگئی تھی اور اس بارے میں کچھ مزید جاننے کی خواہش میرے اندر انگڑائیاں لینے لگی تھی۔

''اچھا چلو بولو کیا کہتے ہیں تمہارے برج۔'' میں نے قدرے لاپرواہی سے کہا۔ تو روپا تو بس ایسی رواں ہوئی کہ وہ کہے اور سنا کرے کوئی۔۔۔ ''ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ کل بارہ برج ہوتے ہیں۔ اور ان کے مختلف نام ہیں۔ ہر برج ایک نہ ایک ستارہ کی ملکیت ہوتا ہے یعنی کوئی نہ کوئی اس کا حاکم یعنی رولنگ پلینیٹ ہوتا ہے اور یہی برج انسانوں کی طرح آپس میں دوستی اور دشمنی بھی رکھتے ہیں۔'' علم نجوم میں میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی اور میں نے منہ سے کچھ کہے بغیر ہی روپا کی طرف پرشوق نگاہوں سے دیکھا تو وہ بغیر رکے کہنے لگی ''ہر ایرہ غیرہ نتھو خیرہ قسمت کا حال نہیں بتا سکتا۔ اس کے لیے علم نجوم سے پوری طرح واقفیت بے حد ضروری ہے کہ ایسے شخص کو برجوں اور ستاروں کے چکر کا علم پوری طرح آتا ہو اور اگر اس کا علم ادھورا اور ناقص ہوگا تو خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔'' وہ اپنی ہی لہر میں بولے چلی جا رہی تھی۔

میں نے بے صبری سے پوچھا ''برجوں اور ستاروں کے بارے میں کچھ اور بھی کہو گی کہ نہیں میڈم جوتشی'' تو وہ زیر لب مسکرا کر گویا ہوئی ''کل بارہ برج ہیں جن میں حوت، حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، دلو اور جدی ہیں۔ آسمان میں گھومنے والے سات ستارے ہیں۔ اور دو ستارے ان کے امدادی یعنی ہیلپرز ہیں۔ ان ستاروں میں سورج، قمر، مریخ، زحل، مشتری، عطارد، اور زہرہ ہیں جبکہ امدادی ستارے یورنیس اور نیپ چون ہیں اور ان تمام ستاروں اور برجوں کے یونانی زبان میں مختلف نشانات یعنی سمبل دیئے گئے ہیں۔'' How Interesting''۔۔۔ میں اپنے ذوقِ جستجو کو مزید نہ چھپا سکی تو روپا خوش ہو کر بولی۔ ''اب آئی ہو ناں سیدھی راہ پر میڈیم۔۔۔۔'' بالکل جیسے ہم میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اسی طرح ستاروں کی بھی دشمنیاں اور دوستیاں ہوتی ہیں۔'' ''اچھا تو بتاؤ کہ ہمارے ستاروں میں آپس میں دشمنی ہے کہ دوستی۔'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

روپا میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''خاک دوستی ہوگی ہر وقت تو تکرار ہوتی رہتی ہے۔ پھر بھی بتاتی ہوں۔ تمہارا برج جوزا ہے اور تمہارا حاکم ستارہ عطارد ہے۔ اور اس کے دوست ستارے قمر، زحل اور زہرہ ہیں۔ مریخ اور مشتری اس کے پکے دشمن۔ جبکہ سورج نہ اس کا دوست ہے نہ دشمن۔'' میں نے جلدی سے لقمہ دیا روپا تمہارا ستارہ ضرور سورج ہی ہوگا کیونکہ کبھی تو تم بڑی دوستی بھگارتی ہو اور کبھی جانی دشمن نظر آتی ہو۔'' ''نہیں میڈم میرا ستارہ زہرہ ہے۔ دوست ہوں تمہاری بیوقوف لڑکی۔'' اس نے جل کر کہا۔ بس تمہارا لیکچر پورا ہو گیا یا ابھی کچھ اور باقی ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو روپا بے صبری سے بولی۔ ''ارے نہیں بھئی۔ ابھی

تو بہت کچھ ہے بتانے لائق۔۔۔جانا مت۔'' وہ التجا کرتے ہوئے بولی۔

''ان ستاروں کی رنگت بھی الگ الگ ہوتی ہے۔جیسے سورج، سرخ اور قمر سفید ہوتا ہے۔زہرہ سفید سیاہی مائل تو مریخ سرخ۔ مشتری پیلے رنگ کا جبکہ عطارد سبز اور زحل جیٹ بلیک'' اوہو تو جبھی کہوں یہ سفید رنگت ہر وقت دھواں دھواں سی کیوں رہتی ہے۔تمہاری زہرہ کی بچی۔۔۔۔میں نے طنزاً کہا تو روپا کہاں پیچھے رونے والی تھی فوراً بولی اور تم عطارد کی اولاد ساون کے اندھے کی طرح تمھیں ہر طرف ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔'' اس نے سبز رنگ پر بھرپور وار کیا۔تو میں بجائے غصے میں آنے کے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔'' اور سنو میڈم ستارے مذکر اور مونث بھی ہوتے ہیں۔ان کی نحوست بھی ہوتی ہے اور یہ الٹی چال بھی چلتے ہیں۔'' روپا نے مزید علمیت بھگارتے ہوئے کہا۔'' تمہارا ستارہ تو مذکر ہی ہوگا روپا جو ہر وقت جوشیلے مردوں کی طرح لڑائی جھگڑے پر آمادہ رہتی ہو۔'' میں نے گویا اس کا مذاق اڑایا تو روپا تنک کر بولی'' نہیں زہرہ مونث ستارہ ہے۔یعنی خالص فیمنسٹ اور عطارد مخنث ہے یعنی نہ مرد نہ عورت۔بس دونوں کے درمیان کی کوئی چیز ہے میرے بجائے تم اپنی فکر کرو جان من۔'' روپا نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔'' یہ کیا بیہودگی ہے میں نے قدرے غصے سے کہا، تم بکواس کر رہی ہو۔'' قسم لے لو ایسا ہی لکھا ہے کتاب میں۔لو دیکھ لو۔'' اس نے کتاب میرے آگے کرتے ہوئے کہا۔

مجھے کوئی کتاب نہیں دیکھنی ہے یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ'' ہر عوت کے اندر کچھ مرد اور ہر مرد کے اندر کچھ عورت ہوتی ہے تو تمہارا ستارہ کونسی نئی بات بتا رہا ہے۔افلاطون کی اولاد۔۔۔'' اسی بحث وتکرار میں کافی وقت گزر چکا تھا۔میں نے تقریباً اٹھتے ہوئے کہا کہ'' بس اب اگلا پیریڈ شروع ہونے والا ہے۔چلتے ہیں، آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

روپا نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر گویا اٹھنے سے منع کر دیا۔'' اب کیا ہے۔'' میں ذرا جُز بُز ہو کر بولی۔'' مگر سب سے زیادہ دل چسپ بات ستاروں کے بارے میں تو تم نے سنی ہی نہیں۔'' اب وہ کیا ہے۔جلدی سے بتا دو۔'' میں نے بے صبری سے کہا۔

'' ذرا دم تو لو۔غور سے سننے والی بات ہے میڈم۔ستارے سیدھی اور الٹی چال بھی چلتے ہیں۔جب سیدھے جا رہے ہوں تو ایسی حالت کو مستقیم یعنی صراط مستقیم کہتے ہیں جیسے تم چلتی ہو۔اسے ہندی زبان میں مارگی کہا جاتا ہے۔مگر جب کوئی دوسرا ستارہ اپنی کشش سے سیدھی چال والے ستارے کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو اس کی چال الٹ ہو جاتی ہے۔جسے اردو میں رجعت، ہندی میں وکری اور انگریزی میں ریٹروگریڈ موومنٹ کہتے ہیں۔جیسے گاڑی ریورس گیئر میں جاتی ہے۔''' اچھا تو تم ہو وہ الٹی چال والا ستارہ جو مجھ جیسی سیدھی سی لڑکی کو اپنی کشش سے الٹا سیدھا کرتی رہتی ہو۔'' میں نے مذاقاً کہا تو روپا برا سا مان گئی۔

'' ارے سوائے چاند اور سورج کے باقی سب ستارے الٹی سیدھی چال ہی چلتے ہیں۔اس لیے تمہارے ستارے کی کشش مجھے بھی الٹی سیدھی کرتی رہتی ہے۔صرف میں ہی مجرم نہیں ہوں۔تم بھی برابر کی شریک ہو۔'' روپا نے گویا بدلہ لیتے ہوئے کہا تو ہم دونوں نے ہی زبردست قہقہہ لگا دیا۔'' اچھا تو اب چلو۔پیریڈ تو مس ہو گیا۔گھر جلدی پہنچنا ہے ورنہ اماں میری چال الٹی کر دیں گی۔'' یہ کہہ کر

میں تو وہاں سے گیٹ کی طرف بھاگی جہاں طارق بھیا نہ جانے کب سے گاڑی لیے میرا انتظار کر رہے تھے اور میں علم نجوم کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھی۔

آج سڑک پر ٹریفک کا رش معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا کیونکہ ایسٹر کی چھٹیوں کے لیے آج سکولوں کا آخری دن تھا اور حد نظر تک سڑک پر گاڑیوں کی طویل قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ بھیا اپنی نئی نویلی دھان پان سی اسپورٹس منی کو پر بڑے اسٹائل سے چلا رہے تھے جبکہ مجھے اتنی ٹریفک سے سخت وحشت ہو رہی تھی کیونکہ اماں نے آج گھر جلدی آنے کے لیے کہا تھا۔ ''پہلے تو روپا کی بچی کے ستاروں اور برجوں نے سارا وقت لے لیا اور اب ٹریفک نے گویا رینگنے کی قسم کھا رکھی تھی۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ یونہی چلتے رکتے ٹریفک ایک ڈھلوانی سڑک پر آ گئی۔ ہمارے بالکل آگے ایک بڑی سی لینڈ کروزر جا رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یوں لگا جیسے وہ گاڑی آگے کی بجائے پیچھے کی طرف آ رہی ہے یعنی ریورس گیئر۔ میں نے جلدی سے بھیا کو خبردار کیا کہ ''صرف مجھے ہی ایسا لگ رہا ہے یا واقعی یہ گاڑی پیچھے کی طرف آ رہی ہے۔'' بھیا نے یکدم ہارن بجانا شروع کر دیا کیونکہ گاڑی واقعی پیچھے آ رہی تھی۔ خدا جانے کیا معاملہ تھا۔ آگے والا ڈرائیور نشے میں تھا یا اناڑی تھا کہ اتنے ہارن بجانے کے باوجود لینڈ کروزر نے بھیا کی نئی نویلی گاڑی کا حشر کر دیا گویا ستارے الٹی چال چل رہے تھے۔

بھیا غصے میں پھنکارتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلے تو دوسری طرف لینڈ کروزر سے نکلنے والی ایک ادھیڑ عمر ایشین عورت تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر عورت کی بجائے ڈرائیور مرد ہوتا تو بھیا اس کی ایسی خبر لیتے کہ وہ زندگی بھر کے لیے ڈرائیونگ کرنا بھول جاتا۔ مگر بھیا نے دھیرج رکھتے ہوئے خاتون سے اس کی انشورنس کی تفصیلات طلب کیں تو وہ بحث پر اتر آئی کہ ''اس ملک میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ اگر میں ریورس گیئر میں کسی گاڑی کو ٹکر ماروں تو میں ہرجانہ بھروں۔'' اب تو بھیا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ ایسی احمقانہ بات سن کر میری تو ہنسی ہی نکل گئی۔

یہ محترمہ کہاں رہ رہی ہیں۔ انگلینڈ یا چیچو کی ملیاں۔ اور جس قانون کا یہ ذکر کر رہی ہیں۔ شاید انہوں نے اپنی کچن کیبنٹ میں بنایا ہے۔ اب تو بھیا کا پارہ بہت اونچائی پر جا رہا تھا۔ ''قد سے بڑی گاڑی لے کر باہر نکلی ہو ڈرائیونگ تو سیکھ لینی تھی۔ اتنی ٹریفک میں تم ریورس گیئر کس خوشی میں لگا رہی تھیں کیا تمہیں نظر نہیں آ رہا تھا کہ پیچھے گاڑی ہے۔'' بھیا اسے بے نقط سنا رہے تھے۔ ''دراصل آپ کی گاڑی اتنی چھوٹی ہے کہ نظر ہی نہیں آئی۔'' عورت نے دلیل پیش کی۔ بجائے کسی قسم کی شرمندگی یا افسوس کے وہ عورت عجیب ڈھٹائی سے باتیں کر رہی تھی۔

بھیا نے مزید انتظار نہ کرتے ہوئے پولیس کو فون کرنا چاہا تو اس عورت نے جھٹ سے پینترا بدل لیا۔ ''دراصل میرا خاوند ہی انشورنس کے کام کو ڈیل کرتا ہے۔ مجھے اپنی انشورنس کمپنی کا علم نہیں ہے۔ مگر گھر جا کر آپ کو فون کر کے بتا دوں گی۔'' بھیا نے اپنا وزٹنگ کارڈ اسے دیا تو وہ اسے پڑھتے پڑھتے چونک سی گئی۔ کنسلٹنٹ سائیکاٹرسٹ ''تو آپ پاگلوں کے ڈاکٹر ہیں۔

اور مجھے بھی پاگل سمجھ کر مجھ پر چلاّ رہے ہیں۔ میں تو بس گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈال کر ٹریفک میں سے نکلنا چاہ رہی تھی کہ آپ سے جا ٹکرائی۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ تم ضرور کسی دماغی خلفتار کا شکار ہو وگرنہ ایسی بیہودہ حرکت ٹریفک کے ایسے رش میں۔کوئی سمجھ دار انسان نہیں کرسکتا۔'' بھیا دھاڑے۔۔۔۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ آج تو واقعی ستارے الٹی چال چل رہے ہیں وگرنہ ایسی بھیڑ میں ریورس گیئر۔۔۔۔۔!

پاکی

(Paki)

''دلوں کے آئینے مختلف ہوتے ہیں۔حادثات اور واقعات کے عکس ان میں ایک طرح نہیں اترتے۔''

لاریب کافی دیر سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول پر غور وفکر کر رہی تھی۔ چند سال قبل وقوع پذیر ہونے والا واقعہ اب بھی رہ رہ کر اسے کچوکے لگا رہا تھا۔اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کے سر سے چادر کھینچ کر اس کی روح تک کو برہنہ کر دیا ہو۔ بے بسی اور بے چارگی کے جان لیوا احساس نے اسے اتنے برسوں میں جیسے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔

کئی برسوں سے وہ اس علاقے میں رہائش پذیر تھے۔کئی اور عزیز رشتہ دار بھی قرب وجوار میں آباد تھے۔جس سے وطن سے دور ہونے کا احساس ہی نہ تھا۔انگلینڈ آتے ہوئے اسے تقریباً چالیس برس ہونے کو آئے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ اب یہی اصل وطن ہے۔ پاکستان آنا جانا ویسے ہی بہت کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ سب بہن بھائی اور دیگر قریبی عزیز اب وہاں سے امریکہ، کینیڈا، سپین، اٹلی سعودی عرب اور فار ایسٹ میں جا بسے تھے۔ایسے میں اس کی ملاقات اگر کسی ایسے ہم وطن سے ہوتی جو حال ہی میں اس ملک میں آئے ہوں اور خود کو تارکین وطن میں شمار کرتے تو لاریب کو بڑا عجیب سا لگتا کیونکہ اس نے خود کو کبھی تارکین وطن میں شمار ہی نہیں کیا تھا بلکہ یہاں کی شہریت حاصل کرنے کے بعد میاں بیوی یہیں پر اچھی سرکاری ملازمتوں پر فائز تھے۔تینوں بچے بھی اب اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے۔ ہر طرف سکھ کی ہوائیں چل رہی تھیں کہ چند برس قبل وقوع پذیر ہونے والے اس واقعہ نے لاریب کی سوچ کا دھارا ہی بدل دیا۔

وہ شروع میں جس تین بیڈروم کے سیمی ڈیٹیچڈ گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔وہ کئی برس بعد ان کی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہو گیا تو انہیں چار بیڈروم کے بڑے گھر کی تلاش ہوئی۔تلاش بسیار کے بعد انہیں اس علاقے میں چند ایک سٹریٹس چھوڑ کر چار بیڈروم، تین ریپشن رومز اور کافی بڑے گارڈن والا گھر بہت پسند آ گیا۔مگر گھر میں کچھ کام ہونے والا تھا ورنہ سپیس بہت تھی۔ بچے جیسے چاہتے اچھلتے کودتے، پرواہ نہیں تھی۔ بچوں کو تو تین اسٹوری گھر، تہہ خانہ، بڑا سا گارڈن بڑے بڑے کوریڈور سبھی بہت اچھے لگ رہے تھے کہ وہ وہاں اپنے دوستوں کے ساتھ خوب ہلا گلا کر سکتے تھے۔''گارڈن پارٹیاں باؤنسی کاسل اور باربی کیو کا تو اپنا ہی مزہ ہے۔'' بڑے بیٹے شبلی نے خوش ہو کر کہا۔اگر کوئی قباحت تھی تو ساتھ والا گھر، جو کہ نہایت خستہ حالت میں تھا۔دونوں میاں بیوی کو فکر تھی کہ اگر

ساتھ والا گھر اسی حالت میں رہا تو ان کی پراپرٹی کی مارکیٹ ویلیو بھی متاثر ہوگی۔ یہی سوچ کر وہ کچھ گومگو کی حالت میں تھے۔

ذرا تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ اس خستہ حال مکان میں ایک نوے سالہ بوڑھا انگریز اکیلا رہتا ہے۔ مکان کی دیکھ بھال کرنے کی اس میں سکت نہیں بس اس کا مسکن تو نیچے کا ایک کمرہ ہے۔ وہی اس کی کل کائنات ہے۔ اوپر والے کمروں کی حالت خستہ تھی۔ بیڈ رومز میں کبوتروں نے گھونسلے بنا رکھے تھے اور ہر وقت غٹرغوں کی آوازیں کانوں کو چھیدتی رہتیں تھیں۔

مکان پر فائنل آفر دینے سے پہلے وہ دونوں میاں بیوی اس بوڑھے انگریز سے ملنے کے لیے گئے تاکہ اس کے مستقبل کے پروگرام کا کچھ پتہ چل سکے۔ بوڑھا انگریز بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ اور بتانے لگا کہ ''جب یہ مکان آج سے سو سال قبل بنے تھے۔ تو اس کے والدین نے یہ گھر خریدا تھا۔ ان کی وفات کے بعد یہ گھر ترکے میں اسے ملا تھا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ کسی اولڈ پیپلز ہوم میں چلا جائے مگر سمجھ میں نہیں آتا مکان کو کس طرح فروخت کرے کیونکہ ایسی حالت میں اسے خریدنے کو کوئی تیار نہ ہو گا۔''

لاریب نے بوڑھے انگریز سے پوچھا اگر وہ پسند کرے تو وہ اپنے اسٹیٹ ایجنٹ سے کہہ کر اس گھر کو بکوانے کی بات چیت کر سکتی ہے۔ بوڑھے ولیم نے اسے بخوشی اجازت دے دی اور چند ہی دنوں میں کسی پراپرٹی ڈیولپر نے یہ مکان خرید کر کسی اور کے پاس مزید منافع پر فروخت کر دیا۔ اس طرح چند مہینوں کے اندر اندر یہ مکان کئی بار فروخت ہوا۔ آخری بار یہ مکان ایک آئرش بلڈر نے خریدا اور مرمت وغیرہ کروا کر اسے کرایہ پر اٹھا دیا۔ اس دوران وہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔ بظاہر تو ساتھ والے مکان کی حالت کافی بہتر ہو گئی تھی مگر ہر دوسرے تیسرے مہینے نئے نئے کرائے دار آتے رہے اور صحیح معنوں میں یہ مکان اتنے برسوں میں کبھی گھر نہ بن سکا۔ خیر ہمارا کیا مسئلہ ہے۔ As long as ہمیں یہ آنے جانے والے کرایہ دار کسی طرح کی تکلیف نہیں دیتے تو ٹھیک ہے۔ لاریب خود ہی سوال کرتی اور خود ہی جواب دے دیتی۔ مگر اس کا دل چاہتا تھا کہ پڑوس میں کوئی اچھے ہمسائے ہوں۔ ذرا میل جول رکھنا اچھا لگتا ہے۔ مگر ان حالات میں آنے جانے والوں سے کیا میل جول رکھا جا سکتا تھا۔

اب کی بار آنے والے کرایہ دار بے حد گھٹیا ثابت ہوئے۔ ان کے چار بچے جن میں دو تو ٹین ایجر تھے ان کے دوست ہر وقت فرنٹ روم اور پھر فرنٹ گارڈن میں ہنگامہ مچاتے رہتے۔ اکثر فرنٹ گارڈن کی فینس پر چڑھ کر بیٹھے رہتے۔ لاریب جب بھی کام سے واپس آتی ان سب کو اس طرح باہر پنکھ پھیلا کر بیٹھے دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو جاتا۔ چند ایک مرتبہ دبی دبی زبان سے اس نے انہیں اس طرح بیٹھنے سے منع بھی کیا مگر وہ سنجیدگی سے اسکی بات کا نوٹس ہی نہ لیتے۔ ان کی انگریز ماں کبھی اسے نظر ہی نہ آتی تھی۔ بچوں کو چند مرتبہ کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حالات سدھرنے کی بجائے مزید بگڑ گئے جیسے بچوں کے ہاتھ کوئی تماشہ آ گیا ہو۔ اب وہ اکثر چیونگم کے ریپنگ پیپرز اور کرسپس کے خالی پیکٹ ان کے فرنٹ گاردن کی طرف اچھالتے رہتے۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی انہوں نے فرنٹ ڈور کے Keyhole میں چیونگم بھر دی جس سے لاریب کو دروازہ کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ اتنی سردی میں باہر کھڑے کھڑے اس کی قلفی جمی تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے غصے میں پڑوسیوں کی کال بیل بجائی تو آج ان

کی انگریز ماں نے دروازہ کھولا تو اس نے بتایا کہ وہ مقامی اسپتال میں نرس کا کام کرتی ہے۔ کیونکہ شفٹ ورک ہے اس لیے دن کے وقت وہ گھر پر نہیں ہوتی تا کہ دیکھ سکے کہ بچے اور ان کے دوست کیا کرتے رہے ہیں بہر حال وہ بچوں سے بات کرے گی اور ان کے دوستوں کو بھی Fence پر چڑھ کر بیٹھنے اور ان کے گارڈن میں کاغذ پھینکنے سے منع کرے گی۔ لاریب نے سکھ کا سانس لیا کہ بچوں کی ماں تو کچھ معقول لگ رہی تھی۔ مگر صرف چند دن ہی خیریت سے گزرے پھر وہی شور وغوغا شروع ہو گیا۔

کبھی تو آدھی رات کو میوزک اس قدر اونچا لگاتے کہ سونا مشکل ہو جاتا تو کبھی لیٹ نائٹ ویکیوم کرنا شروع کر دیتے۔ عجیب مصیبت تھی۔ آخر کیا کیا جائے۔ دن کے وقت اکثر ڈاگ فوڈ باہر گارڈن میں پڑی رہتی۔ بڑی بڑی ہڈیاں اور گوشت جس پر مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ سخت ناگوار قسم کی بو گھر کے قریب آتے ہی آنے لگتی۔ لاریب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے تو اس نے انوائرنمنٹ ہیلتھ والوں سے شکایت کر دی کہ ان کا یہاں رہنا مشکل ہو رہا ہے۔ بس بات یہیں سے بگڑ گئی۔ انگریز پڑوسن کو اس بات پر غصہ تھا کہ ان کی شکایت کیوں کی گئی ہے۔۔۔ اگلے چند مہینے آن آف قسم کے حالات میں گزرے۔ کبھی تو قدرے سکون ہو جاتا اور کبھی پھر وہی شور شرابا۔۔۔ زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک مرتبہ آدھی رات کو پڑوسن کی ٹین ایجر لڑکی اور اس کے ایشین بوائے فرینڈ میں جھگڑا ہو گیا تو اس نے اینٹ مار کر پڑوسن کی کھڑکی کا شیشہ توڑ ڈالا۔ لاریب اور عزیز بھاگ کر بیڈ روم سے نیچے آئے کہ شاید ان کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہے۔ مگر جیسے ہی فرنٹ ڈور کھول کر دیکھا۔ دو پولیس آفیسر لڑکی کے بوائے فرینڈ کو اریسٹ کر رہے تھے جبکہ وہ Resist کر رہا تھا۔ جس پر پولیس اسے فٹ پاتھ پر لٹا کر اس کی خوب دھنائی کر رہی تھی۔ عزیز کو ان پڑوسیوں پر اس قدر غصہ تھا کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ان سب حرامی لونڈوں کو پکڑ کر پولیس کے ساتھ مل کر ان کی خوب مرمت کرے۔

عزیز نے با آواز بلند کہا کہ ''اس کو چھترول کروا چھی طرح سے۔'' میرے خیال میں پولیس والے عزیز کی بات سمجھ گئے اور بولے۔

''Don't worry we will sort him out.''

غرضیکہ آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کرتے رہتے لگتا تھا کہ They are neighbours from hell. گویا زندگی جہنم بن گئی تھی۔ اب دونوں میاں بیوی سنجیدگی سے یہاں سے شفٹ ہونے کے بارے میں سوچنے لگے کیونکہ ان سے روز روز کی بک بک برداشت نہیں ہوتی تھی۔ خوامخواہ کی ٹینشن لگی رہتی۔ کام سے گھر واپس آتے ہوئے یہی دھڑکا لگا رہتا کہ پتہ نہیں اب کونسی نئی مصیبت منہ کھولے کھڑی ہو گی۔

ایک مرتبہ تو حد ہی ہو گئی۔ آدھی رات کو اس قدر تیز میوزک بجا رہے تھے کہ سارا محلہ ڈسٹرب ہو رہا تھا مگر سب سے زیادہ مسئلہ لاریب کو ہو رہا تھا کہ ان کا گھر سب سے زیادہ قریب تھا بلکہ ایک طرف کی دیواریں بھی ملی ہوئیں تھیں۔

چھوٹی بیٹی کے جی سی ایس سی کے ایگزمز ہو رہے تھے اور صبح اس کا پرچہ تھا مگر وہ سو نہیں پا رہی تھی۔ تقریباً رات کے ایک بجے

لاریب نے باہر نکل کر ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ میوزک کی آواز کم کریں۔مگر پڑوسن شاید ڈرنک تھی اور اول فول بکنے لگی۔تم لوگ ہماری شکایت کرتے ہو۔"We will kill you" لاریب نے اسے کہا کہ ''اتنے رات گئے میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔صبح بات کروں گی بلکہ پولیس کو اطلاع کروں گی کیونکہ تم قتل کی دھمکیاں دے رہی ہو۔''

دوسرے دن لاریب صبح سویرے پولیس کو اطلاع کر کے آفس چلی گئی۔مگر جیسے ہی شام کو واپس گھر آئی۔گھر کے دروازے پر لوگوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔اس کا دل بیٹھ سا گیا یا اللہ خیر، یہ کیا ماجرا ہے۔جلدی سے سڑک پر گاڑی پارک کر کے وہ گھر کی طرف لپکی تو دیکھا کہ پڑوسن اور اس کے بچے اور ان کے چند دوست عزیز سے جھگڑا کر رہے تھے کہ ہم نے پولیس کو اطلاع کیوں کی۔اب وہ مکمل طور پر لڑائی بلکہ ہاتھا پائی کے موڈ میں لگ رہے تھے۔لاریب بھاگ کر گھر کے اندر آئی اور پولیس کو فون کر دیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ سب مل کر ان پر اٹیک نہ کر دیں۔وہ عزیز سے کہتی کہ گھر کے اندر چلو۔۔۔ان کے منہ مت لگو۔مگر عزیز کا غیرت مند۔۔۔پنجابی خون۔۔۔تو رگوں کی دیواریں توڑ کے باہر آنے کو بے قرار تھا۔

عزیز سخت غصے میں تھے اور لاریب کی بات سننے کو بالکل تیار نہیں تھے۔وہ ڈر کر دوبارہ پولیس کو فون کرنے کے لیے گھر کے اندر بھاگی۔اور جیسے ہی فون کر کے باہر واپس آئی پڑوسوں نے چھوٹی فرنٹ فینس پھلانگ کر اور کچھ نے گیٹ توڑ کر فرنٹ گارڈن میں آ کر عزیز پر حملہ کر دیا۔بڑی بیٹی باپ کی مدد کو آگے آئی تو اس کے چہرے پر کچھ مار کر اسے بھی زخمی کر دیا۔سب مل کر عزیز کو زدوکوب کر رہے تھے۔لاریب ان سب کو چھڑانے کے چکر میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی اس کے ہاتھوں اور چہرے پر کئی زخم آ چکے تھے۔وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو مدد کے لیے بلا رہی تھی مگر کوئی بھی آگے نہیں آ رہا تھا۔سارے انگریز ہمسائے کھڑکیوں میں سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔انگریز پڑوسن نے پاکی باسٹرڈز، پاکی باسٹرڈز کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔اتنے میں پولیس وین سائرن بجائی نظر آئی شاید کسی محلے دار نے بھی فون کر دیا تھا۔۔۔ایسا بلوہ دیکھ کر۔۔۔

عزیز کے سر اور ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔لاریب کے چہرے پر بھی کئی زخم تھے۔بڑی بیٹی کی آنکھ بھی زخمی ہوئی تھی پولیس کے آتے ہی شہہ پا کر انگریز پڑوسن نے زور زور سے پھر پاکی، پاکی کہنا شروع کر دیا کہ انہوں نے ہمیں مارا ہے۔

لاریب پولیس کو بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ''انہوں نے ہمیں مارا ہے۔ہم پر ریشلی موٹیوٹڈ اٹیک کیا ہے۔قصوروار وہ ہیں۔ہم نہیں، ہم نے تو پولیس کو خود بلایا ہے۔'' مگر پولیس آفیسر لاریب کی بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دے رہا تھا بلکہ انگریز پڑوسن کی بات زیادہ توجہ سے سن رہا تھا۔لاریب نے آفیسر سے کہا کہ ''وہ اسے منع کرے کہ وہ کب سے پاکی پاکی چلا رہی ہے وگرنہ وہ آفیسر کی شکایت کرے گی کیونکہ وہ ان کی بے عزتی کر رہی ہے اور Racist ریمارکس دے رہی ہے مگر پولیس کچھ بھی نہیں کر رہی۔''

پولیس آفیسر نے لاریب کی بات سنی ان سنی کر کے انہیں تحکمانہ لہجے میں گھر کے اندر جانے کے لیے کہا کہ وہ ان سے بعد میں بات کرے گا۔پہلے انگریز عورت کی بات سن لے۔چند منٹ کے بعد دونوں پولیس آفیسر گھر کے اندر آ گئے۔اور آتے ہی کہا۔

''Mr. Aziz, you are under arrest for assaulting your neighbour and

attacking a police officer....!''

لاریب اس سفید جھوٹ پر تقریباً چیخ اٹھی۔۔۔What۔۔۔الفاظ جیسے اس کے حلق میں اٹک سے گئے۔۔۔عزیز نے اسے ہاتھ کے اشارے سے کچھ مزید کہنے سے منع کر دیا۔۔۔لاریب نے بہت دکھ سے سوچا۔۔۔ایک گھٹیا انگریز کے مقابلے میں ۔۔۔ہمارا اسٹیٹس چاہے کچھ بھی ہو۔۔ہم چاہے جتنا عرصہ بھی اس ملک میں گزار لیں۔۔۔مگر ہم ہمیشہ پاکی۔۔۔!!

بھائی جان

سوہا کو اپنی دوست ثوبیہ کی ہر مرد کو بھائی جان کہنے کی عادت سے سخت چڑ تھی۔ جان نہ پہچان۔ بھائی جان سلام۔۔۔سوہا اسے گاہے بگاہے ٹوکتی رہتی تھی اور اگر اس کی اس عادت سے زیادہ ہی عاجز آ جاتی تو اسے باقاعدہ ڈانٹ پلا دیتی۔سوہا کا نقطہ نظر تھا کہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو بھائی جیسے مقدس رشتے سے نتھی کر لینا درست نہیں ہے۔اور پھر مرد ذات کا کیا بھروسہ۔۔۔!''آج کل کے زمانے میں تو اپنے سگے بھائی ڈھنگ سے اپنے نہیں بنتے تو تم غیروں کو بھائی اور وہ بھی جان بنانے پر تلی ہوئی ہو۔'' وہ ثوبیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی۔کالج جاتے ہوئے اکثر دونوں میں اس موضوع پر تکرار ہوتی رہتی تھی۔

ثوبیہ کا موقف تھا کہ جس شخص سے کوئی خونی رشتہ نہ ہو تو پھر اس کو بھائی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے مگر سوہا کے خیال میں یہ لفظ بھائی کی توہین تھی۔وہ ثوبیہ کو طرح طرح کے دلائل دے کر قائل کرنے کی کوشش کرتی کہ ''بھائی تو اصل معنوں میں وہی ہے جس کے ساتھ ماں کے پیٹ میں پیر پسارے ہوں اور باقی سب۔۔۔۔نامحرم!''

آج بھی دونوں کالج جانے کے لیے جیسے ہی بس میں سوار ہوئیں۔کنڈیکٹر نے ذرا سا اخلاق سے راستہ کیا چھوڑا۔ثوبیہ رشتوں کی پستک نکال کر بیٹھ گئی۔۔۔''بھائی جان ہمیں ریگل کے اسٹاپ پر اترنا ہے۔بس میں رش بہت ہے۔کچھ نظر بھی تو نہیں آ رہا۔کہیں ایسا نہ ہو کہ پاؤں منزل سے آگے جا نکلیں۔'' اور ساتھ ہی اس نے ایک استفہامیہ نگاہ سوہا پر ڈالی۔گویا اسے اپنی دانست میں کنڈیکٹر کو بھائی جان کہنے کا جواز بتا رہی ہو۔مگر سوہا کا موڈ صبح صبح ہی آف ہو چکا تھا۔ثوبیہ کی بات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے وہ بس کی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ٹکٹیں کاٹتے ہوئے کنڈیکٹر کا دونوں اور خاص طور پر سوہا کو کن اکھیوں سے دیکھنا سوہا کو زہر لگ رہا تھا۔

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ چلتی ہوئی بس میں سے چھلانگ لگا دیتی مگر مجبوری تھی کیونکہ کالج وقت پر پہنچنا بہت ضروری تھی اس لیے کہ پہلے ہی پریڈ میں کیمسٹری کی کھڑوس میڈم کا ٹسٹ تھا۔لیٹ ہونے پر تو وہ کبھی معاف نہ کرتی کیونکہ ڈسپلن کے معاملے میں وہ بہت سخت تھی۔

میڈم کھڑوس دیر سے آنے والی لڑکیوں کے اس قدر لتے لیتیں کہ خدا کی پناہ میڈم کا بس نہیں چلتا تھا کہ لیب میں موجود سارے کیمیکل اکٹھے کر کے۔کاک ٹیل بنا کر۔لیٹ لطیف قسم کی لڑکیوں کو پلا دیتیں کہ مرو کم بختو۔لیٹ آنے کا اتنا شوق ہے تو اب مستقل ہی لیٹ ہی جاؤ۔

سوہا کو اچھی طرح یاد تھا کہ ابا مرحوم زندگی بھر اس بات پر سختی سے کاربند رہے کہ جن مردوں سے عورتوں کا نکاح ہوسکتا ہے وہ سب نامحرم ہیں اور ان کے ناموں کے ساتھ سابقے لاحقے لگا کر انہیں حرمت والے رشتوں کے برابر کرنا۔ ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا۔ ننگے سر اور کھلے منہ ان کے پاس بیٹھنا۔ شرعی احکامات کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ جسے ابا مرحوم نے کبھی قبول نہ کیا۔ اس لیے انہوں نے رشتے کے جتنے کزن تھے۔ ان سب کا گھر میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا کیونکہ ''بھائی جان کے پردے میں کیا کیا گل کھلتے ہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ابا کہتے اور اکثر ''گل'' لفظ پر بہت زور دیتے۔

بی اے کا امتحان ہوتے ہی دونوں سہیلیوں کے لیے اچھے رشتے آ گئے۔ سوہا بیاہ کر لندن چلی گئی اور ثوبیہ امریکہ۔ شروع شروع میں تو دونوں کا کبھی خطوط تو کبھی ٹیلی فون اور ای میل سے رابطہ رہا مگر رفتہ رفتہ گھریلو ذمہ داریوں میں پڑ کر دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن ہوگئیں مگر جب کبھی ثوبیہ سے بات ہوتی۔ سوہا اس کا مذاق اڑاتے ہوئے پوچھتی۔ ''ارے کتنے اور بھائی جان بنا لیے ہیں یا اب تم سدھر گئی ہو۔'' ثوبیہ ہنستے ہوئے جواب دیتی ''ارے یار وہ تو بس یونہی ذرا بھائی جان کہنے سے چٹخارہ بڑھ جاتا تھا۔ اور تم تو ہر بات پر ہی سنجیدہ ہوجاتی تھی۔''

لندن آنے کے بعد سوہا کچھ زیادہ ہی مذہبی ہوگئی تھی۔ دوپٹہ تو شروع سے ہی سر پر اوڑھتی تھی۔ اب باقاعدہ سکارف یعنی حجاب اوڑھنا شروع کر دیا تھا۔

اب رفتہ رفتہ سوہا نے یہاں کے اسلامک سرکلز میں بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بڑے دینی اجتماعات۔۔۔۔ مگر اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ نوجوان لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو برادرز اور سسٹرز کہتے نہ تھکتے کچھ عرصے بعد پتہ چلتا کہ برادر اور سسٹر کے درمیان رومانس چل رہا ہے اور کتنوں کی تو دیکھتے ہی دیکھتے شادیاں بھی ہوگئیں۔ برادرز، سسٹرز سب ہی ایک دوسرے کا Biodata حاصل کرنے میں چپکے چپکے لگے رہتے۔ وہ یہ سب حرکات دیکھتی اور حیران ہوتی رہتی کہ یہ کونسا اسلامک کلچر ہے؟ کہاں تو مرد اور عورت کو نگاہیں نیچی کرنے کا حکم۔ عورت کو حکم کہ آواز میں بے جا لوچ پیدا نہ کرے مبادا مرد کے دل میں کوئی برا خیال راسخ ہو جائے۔ مگر یہ سب کیا ہے؟ جسے دیکھو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ بہت سی لڑکیاں تو حجاب میں بھی بے حجاب نظر آتیں۔ اتنے چست لباس زیب تن کئے ہوتے۔۔۔۔! وہ اکثر سوچتی کہ کیا سر ڈھانپ لینے کا نام ہی حجاب ہے؟ اصل حجاب تو عورت کی نگاہ میں ہوتا ہے۔ اس کی چال ڈھال۔ اس کے نشست و برخاست، اندازِ گفتگو، آواز، یہ سب حجاب کا حصہ ہیں مگر یہاں تو۔۔۔۔۔!

سوہا نے رفتہ رفتہ ایسے اجتماعات میں بھی جانا کم کر دیا۔ زندگی اپنی پوری رفتار سے سرپٹ بھاگ رہی تھی۔ تینوں بچے آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے۔ سکول، کالج اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیوں میں چلے گئے۔ بڑا بیٹا صائم میڈیکل کی تعلیم مکمل کر کے ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ منجھلی بیٹی شزہ اب بیرسٹر بن چکی تھی جبکہ سب سے چھوٹی کسوٹی میڈیکل کے فائنل ائیر میں تھی۔

اس کے میاں جواد رائے بزنس کی دنیا میں ایک بہت جانا پہچانا نام تھے۔۔۔۔ کسی بزنس ٹائیکون سے کم نہ تھے۔ معاشرے میں بڑی عزت تھی۔ سوہا اکثر اپنی پرسکون گھریلو زندگی، وفادار اور محنتی شریک حیات اور فرمانبردار اولاد کے گن گاتی رہتی۔ زیادہ

رطب اللسان ہوتی تو اماں ٹوک دیتیں کہ ''اتنی تعریفیں کرنا اچھا نہیں۔لوگ بھی حسد کرنے لگتے ہیں۔اور پھر سکھیوں سہیلیوں کے سامنے تو میاں کی بالکل بھی تعریفیں مت کرو۔مبادا تمہارے ہی گھر کے درپے ہو جائیں۔اور شوہر کے سامنے تو کبھی بھی سہیلیوں کی تعریفوں کے پل مت باندھو۔نہ ہی انہیں شوہر سے زیادہ گھلنے ملنے دو،کیا پتہ میاں کو کب۔ان کی کون سی ادا بھا جائے پھر روتی پھرو گی۔'' جب بھی پاکستان فون کرتی بس اماں کے پاس ایسا ہی نصیحتوں کا پلندہ تیار ہوتا جسے سنتے سنتے وہ کچھ بورسی ہوگئی تھی۔''اچھا اماں اب بس بھی کریں۔میں کوئی دودھ پیتی بچی تو نہیں ہوں کہ مجھے کوئی ورغلا لے گا۔جواد بھی ایک ذمہ دار اور وفادار شوہر ہیں'' وہ اماں کو قائل کرنے کی کوشش کرتی۔اماں چمک کر کہتیں ''ارے مرد تو ہمیشہ ہی دودھ پیتا بچہ رہتا ہے۔اس کے اندر کا بچہ تو کبھی بڑا نہیں ہوتا۔ذرا کوئی اچھی صورت دیکھی تو بچے کی طرح ہمک ہمک کر گود میں سر رکھنے کے لیے بے چین۔۔۔'' اور سوہا ہنستے ہنستے فون بند کر دیتی۔

آج جواد کو آفس سے آنے میں بہت دیر ہوگئی تھی۔سوہا کب سے ڈائننگ ٹیبل پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔کئی مرتبہ فون کر چکی تھی مگر جواد کا موبائل بند تھا۔شاید کسی ضروری میٹنگ میں ہوں۔۔۔مگر اتنی دیر تو کبھی نہیں ہوتی۔اکثر فون کر دیتے ہیں اگر لیٹ آنا ہو تو۔۔۔سوہا سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی اتنے میں جواد کی گاڑی ڈرائیو پر آ کر رکی تو وہ بھاگ کر دروازہ کھولنے کے لیے گئی۔

جواد بہت تھکے تھکے قدموں سے ڈرائیو پر گاڑی پارک کر کے نکلے تو سوہا اس کی حالت دیکھ کر مزید پریشان ہو اٹھی۔خیریت تو ہے جواد۔اتنی دیر کیوں ہوئی۔۔۔سب ٹھیک تو ہے ناں۔کہیں کوئی۔۔۔!اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔جواد نے جواب دینے کی بجائے سوہا کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کے لیے کہا اور گھر کے اندر آ گیا۔جواد صوفے پر جیسے ڈھیر سا ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سوہا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔''میرا بزنس پارٹنر ارسلان آج صبح ٹریفک کے خوفناک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا تھا۔میں سارا دن اسی چکر میں رہا۔ہسپتال میں تھا۔ڈاکٹروں نے جان توڑ کوشش کی مگر جس کا وقت پورا ہو چکا ہو اسے کون بچا سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر جواد باقاعدہ ہچکیاں لینے گئے اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''مجھ سے اس کی بیوی بچوں کی حالت نہیں دیکھی جا رہی تھی۔اسی لیے جلدی نہ آ سکا۔ان کا اور کوئی عزیز رشتہ دار اس شہر میں نہیں ہے۔زیادہ تر رشتے دار ملک سے باہر ہیں۔ہمیں ہی سب انتظامات کرنا ہوں گے۔'' یہ کہہ کر جواد پھر آبدیدہ ہو گئے۔

اگلے چند ہفتے پوسٹ مارٹم۔تدفین،سوئم،چہلم کی نذر ہو گئے۔ارسلان کی بیوہ تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی سکتے کی حالت میں تھی، بچے الگ بلک رہے تھے۔ڈاکٹرز اسے رُلانے کی کوشش کر رہے تھے وگرنہ اس صدمے کا اس کے ذہن پر مستقل طور پر برا اثر پڑنے کا خدشہ تھا۔

جواد اور ارسلان کافی عرصے سے بزنس پارٹنر تھے۔دونوں ہی محنتی اور ایماندار تھے اس لیے شراکت داری اچھی طرح چل رہی تھی مگر ان کا زیادہ میل ملاقات باہر ہی ہوتا۔گھروں میں آنے جانے کا زیادہ چکر نہیں تھا۔اس لیے وہ ارسلان کی بیوہ سے صرف چند مرتبہ خاص موقعوں پر ہی ملی تھی۔

زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آتی جا رہی تھی۔ جواد نے ارسلان کی بیوہ کو بزنس میں ارسلان کی جگہ پارٹنرشپ دے دی تھی اور ہر طرح سے گھر اور بچوں کی ذمہ داریوں میں مدد کر رہا تھا۔ اب ارسلان کی بیوہ کے فون اکثر آنے لگے۔ وہ اب جواد کو بھائی جان کہنے لگی تھی۔ جس سے سوہا کو بڑی وحشت ہوتی۔۔۔ کبھی کبھی تو فون کافی رات گئے آ جاتے تو سوہا کو کچھ ناگواری کا احساس ہوتا مگر یہ سوچ کر کہ بیوہ عورت ہے۔۔۔ اکیلی ہے۔۔۔ شاید کچھ کام ہوگا۔ کبھی تو وہ ان کی گفتگو پر دھیان دیتی اور کبھی نہیں۔ شکی طبیعت کی وہ نہیں تھی۔

آہستہ آہستہ فون سرگوشیوں میں بدلنے لگے۔ اسے کوفت تو بہت ہوتی مگر جواد سے کچھ کہتے ہوئے ہچکچائی تھی کہ کہیں برا نہ مان جائے کہ وہ اس پر شک کر رہی تھی۔ کیونکہ ان کی تیس سالہ ازدواجی زندگی پر کبھی شک کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔

چند ماہ بعد اڑتی اڑتی خبر آئی کہ جواد اور ارسلان کی بیوہ نے نکاح کر لیا ہے۔ سوہا اس خبر پر کسی طرح بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔۔۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔۔۔ وہ جواد کے بارے میں ایسا سوچ کر بھی شرمندہ ہو جاتی کیونکہ وہ اس قدر چاہنے والا شوہر تھا۔

بال آخر جواد سے اس خبر کی تصدیق کرتے ہی بن پڑی تو اس نے بات کنفرم کر دی۔۔۔ سوہا کے بدن سے مانو کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ جواد نے بزنس، دوستی اور مذہب کے حوالے دے کر سوہا کو قائل کرنا چاہا مگر اس کے دل کا آئینہ چکنا چور ہو چکا تھا۔ اس کے اندر سے آواز آ رہی تھی۔

ٹوٹ کر دل کا شیشہ کبھی پھر سے جڑتا نہیں ہے
توڑ کر عکس سب وہ محبت بھری اک نگاہ ڈھونڈتا ہے

سوہا نے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا۔۔۔ آج پھر ایک بھائی۔۔۔ جان کی بہن نے۔۔۔ ایک دوسری عورت کی دنیا اجاڑ ڈالی تھی۔۔۔ زندگی بھر جس لفظ سے وہ وحشت زدہ رہی آج۔۔۔!

ریڈیو کی موت

مومنہ کو بچپن سے ہی صداکاری کا شوق تھا۔ ریڈیو سے تو اسے عشق تھا پاکستان ریڈیو کے علاوہ ریڈیو سیلون بڑے شوق سے سنتی تھی۔

کچھ پیش کاروں کی آوازوں پر تو وہ جنون کی حد تک فریفتہ تھی۔ ان کے کہے ہوئے جملے اکثر نوٹ کر لیا کرتی اور پروگرام ختم ہونے کے بعد ان جیسی آواز میں بولنے کی پریکٹس کرتی۔ آواز کا زیر و بم دکھانے کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ ڈبیٹنگ سوسائٹی، ڈرامہ سوسائٹی اور نہ جانے کن کن سوسائٹیوں میں جا کر وہ آواز کا جادو جگاتی۔ کچھ لکھنے لکھانے کا بھی شوق تھا۔ طبیعت وزن میں تھی۔ ذرا سی مدد سے اچھے خاصے مصرعے سیدھے کر لیا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ شعر و شاعری میں پختگی آتی گئی تو مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے۔ ایک تو اچھی شاعری۔ اس پر ترنم گویا دو آتشہ ہو جاتا اور ہر محفل لوٹ کر واپس آتی۔

چند ایک نیوز ریڈرز کی تو وہ دیوانی تھی۔ اکثر ان کی آواز ٹیپ کر کے ویسی ہی خبریں پڑھنے کی کوشش کرتی اور کبھی کبھار اخبار میں سے کچھ خبریں خود بنا بنا کر اپنی آواز میں ٹیپ کر لیتی۔ آہستہ آہستہ اسے خبریں پڑھنے میں اعتماد آتا چلا گیا۔ ایک دن تو لطیفہ ہی ہو گیا۔ مومنہ نے اردو خبریں ریکارڈ کر کے بارہ بجے کے قریب ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا تا کہ ذرا چیک کر سکے کہ گھر میں کوئی اس کی آواز پہچان سکتا ہے کہ نہیں! ابھی اسے ٹیپ ریکارڈر آن کیے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ بڑے بھیا گھر کے اندر آتے دکھائی دیئے۔ ''بھیا آج معمول سے جلدی ہی گھر آ گئے عموماً ایک بجے کی خبریں وہ گھر آ کر ہی سنتے ہیں'' اس نے سوچا۔ مگر ٹیپ ریکارڈر بند نہ کیا۔ بھیا نے جیسے ہی خبریں سنیں۔ پریشان سے ہو اٹھے۔ ''ارے ایک بج گیا مجھے تو گھر آتے آتے بہت دیر ہو گئی ہے۔ میٹنگ کے لیے مجھے ابھی نکلنا ہو گا۔'' اماں نے کہا بھی کہ ''ذرا آرام کر لو۔ ابھی تو آئے ہو۔ یہ موئی خبریں بھی ایک منٹ آگے نہ پیچھے عین ایک بجے شروع ہو جاتی ہیں۔'' اماں ریڈیو والوں کو کوسنے دینے لگیں۔

بھیا اور اماں کی سراسیمگی سے مومنہ پورا پورا لطف لے رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ خبریں پڑھنے کے آڈیشن میں کامیاب ہو گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔ بھیا کو شک سا گزرا تو ایک لمحے کے لیے رک کر غور سے خبریں سننے لگے۔ ''ارے مومنہ کی بچی یہ تو تم ہو۔ بھیا دھاڑے۔ ٹھہر تو ذرا تیری خبر لیتا ہوں۔ اُلو بنا کر تماشہ دیکھ رہی ہو۔'' اس کے ساتھ ہی اماں بھی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''یہ لڑکی تو آفت کی پرکالہ ہے۔'' اماں کو مومنہ کی شرارت پر جیسے ٹوٹ کر پیار آ رہا

تھا۔ ''اللہ اسے ہنستا کھیلتا ہی رکھے۔'' ساتھ ہی اماں نے ڈھیروں دعائیں دینا شروع کر دیں۔ یونہی ہنستے کھیلتے شرارتیں کرتے بچپن کب گزرا۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ جیسے ہی مومنہ نے بی اے کا امتحان دیا گویا رشتوں کی قطار سی لگ گئی۔ چند ہی مہینوں میں مومنہ اپنے کزن ماجد سے بیاہ کر لندن سدھار گئی۔۔۔۔

ساڈا چڑیاں دا چنبہ وے، بابل اساں اڈ جاناں
ساڈی لمبی اڈاری وے بابل کہیڑے دیس جاناں

اماں آنسو چھپاتے چھپاتے اکثر گنگناتی رہتیں تو مومنہ کی آنکھیں بھی بھر آتیں مگر دونوں ہی ایک دوسرے سے نظریں ملانے سے کتراتیں مبادا ضبط کے بندھن ٹوٹ کر سب کچھ بہا کر لے جائیں۔

لندن آ کر سب سے پہلا کام مومنہ نے جو کیا وہ ایشائی ریڈیوز کے بارے میں معلومات تھیں۔ صبح سے ریڈیو لے کر بیٹھ جاتی اور ہر فریکونسی پر بٹن گھما گھما کر ریڈیو لگاتی۔ کبھی لونگ ویو تو کبھی میڈیم۔ کبھی شارٹ ویو تو کبھی ایف ایم۔ بالاخر چند دنوں کی ہی مشقت کے بعد اسے بی بی سی کے علاوہ چند اور کمیونٹی ریڈیوز کے بارے میں پتہ چل گیا۔ ایک ہی ہفتہ کے پروگرام سننے کے بعد اس نے پروگراموں اور پیش کاروں کی استعداد کار کا اندازہ لگا لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے سبجیکٹ پر ریسرچ کئے اور یونہی بغیر تیاری کے ریڈیو پر آ کر سامعین کو آوازیں دے دے کر بلاتے کہ بھئی کہاں ہو۔ آواز دو۔ جلدی آؤ ورنہ میری قابلیت کا پول کھل جائے گا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کہ لاری اڈے پر بسوں کے کنڈیکٹر آوازیں لگا لگا کر مسافروں کو بھرتی کرتے اور دوسری بسوں کے مسافروں کو جلدی جانے کا چکمہ دے کر اپنی بس میں لے آتے۔ چاہے وہاں مسافروں کو گھنٹوں انتظار ہی کرنا پڑتا۔ کیا مجال جو مسافر بس سے اتر جائے۔ ایک دفعہ بس کے اندر گیا تو دونوں جہانوں سے گیا۔۔۔۔!

بی بی سی کے اردو سروس کے پروگرام اچھے تھے مگر یہ پروگرام تو وہ اکثر پاکستان میں بھی سنتی رہتی تھی۔ لوکل بی بی سی ایشیا نیٹ ورک کے ڈسکشن پروگرامز، البتہ زیادہ جاندار تھے اور حالاتِ حاضرہ کے بارے میں پوری ریسرچ ان کے ہاں موجود ہوتی مگر چند ایک کمیونٹی ریڈیوز تو بس گزارا ہی تھے مگر میوزک اچھی سناتے تھے جس سے مومنہ کا سارا دن مزے سے گزر جاتا۔

ایک ہی مہینے کے اندر مومنہ ریڈیو پر باقاعدگی سے کال کرنے والوں کے ناموں سے بھی واقف ہو گئی تھی چند لوگ گھوم پھر کر ہر ریڈیو پروگرام میں فون کرنا گویا اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے کچھ آوازوں اور اندازِ گفتگو سے تو وہ سخت الرجک تھی آدھی آدھی رات کو چند خواتین فون کر کے بیکار گفتگو کرتیں۔ مومنہ اکثر سوچتی کہ ان عورتوں کو آدھی رات کو ریڈیو پر فون کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔۔۔۔۔!

چند ایک پیش کاروں کا اردو تلفظ تو اس قدر خراب تھا کہ اس کا دل چاہتا انہیں بے بھاؤ کی سنا ڈالے۔ ایک دو مرتبہ تو اس نے کنٹرول روم میں فون کر کے سرزنش بھی کی کہ ''ڈھنگ کے لوگ پروگرام کے لیے بھرتی کیوں نہیں کرتے کیا فی سبیل اللہ کام کر رہے ہیں کہ جو منہ میں آئے بولتے چلے جائیں۔۔۔!'' بعد میں مومنہ کو پتہ چلا کہ بعض کمیونٹی ریڈیوز پر لوگ واقعی مفت کام کرتے ہیں

کیونکہ انتظامیہ کا موقف ہے کہ ''ہم آپ کو شہرت دے رہے ہیں۔۔اور کیا چاہیے آپ کو۔۔۔۔!''

جیسے جیسے مومنہ کی یہاں کی ایشائی کمیونٹی سے واقفیت بڑھتی گئی اس پر اور کئی انکشافات ہوتے چلے گئے۔ چند ایک مسلمان پریزینٹرز نے اپنے نام انگریزوں جیسے رکھ چھوڑے تھے۔جس سے بالکل پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کا مذہبی تشخص کیا ہے۔مثلاً کوئی صاحب اے بی سی تو کوئی محترمہ ایکس وائی زیڈ بنی ہوئی تھیں۔

جیسے ہی مسلمانوں کے مذہبی تہوار آتے تو ایک مسلمان پیش کار تو حد ہی کر دیتیں کیا مسلمان، کیا ہندو، کیا سکھ، کیا عیسائی۔سب کے لیے ایسی ایسی دعائیں اور نالہ شیون کرتیں کہ عرش والوں کو بھی پریشان کر کے رکھ دیتیں۔وہ اکثر سوچتی ''کہ جس شخص کا اللہ پاک کی وحدانیت کے بارے میں عقیدہ ہی درست نہ ہو۔اس کے لیے ایک مسلمان کا دعائیں کرنا کہاں تک واجب ہے۔ان کی تو صرف ہدایت کی دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اللہ ان کا دل ایمان کی روشنی سے منور کر دے۔مگر یہ سب۔۔۔!اسے درست نہیں لگ رہا تھا!

ادھر ایک غیر مسلم پیش کار کچھ عرصے سے قرآن کا ترجمہ پڑھ پڑھ کر دماغ خراب کر رہا تھا۔ایسے کلمے اور درود کا ورد کرتا جیسے اللہ کے احد و واحد ہونے کی دل سے گواہی دے رہا ہو'' اور اس سے بڑا موحد اور کوئی نہیں ہے۔مومنہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟''ایک شخص جس کا عقیدہ ہی مختلف ہے۔کیا وہ ہی قرآن پڑھنے اور اس کا مطلب سمجھانے کے لیے رہ گیا ہے۔یہ تو کھلی منافقت ہے۔مذہب کا مذاق اڑانے والی بات ہے!اگر مذہب اسلام اتنا ہی اچھا ہے جتنا تم پرچار کر رہے ہو تو پھر مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟''اس سے آگے اس کا ذہن مفلوج ہو جاتا! ہفتے میں ایک مرتبہ غزل (گجل) کا پروگرام ہوتا اور ایسی ایسی شاعری اور تلفظ سننے کو ملتا کہ بندہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔کبھی کبھار چند ایک کالرز معیاری شاعری پیش کرتے مگر اکثریت تو۔۔۔۔!

ایک کمیونٹی ریڈیو کو محدود مدت کے لیے لائسنس ملا تو وہ مختلف پروگراموں کے لیے اسٹاف بھرتی کر رہے تھے۔مومنہ نے فون کر کے اپوائنٹمنٹ لیا اور آڈیشن کے لیے چلی گئی۔آواز، ادائیگی اور تلفظ سب برابر تھے۔سیلیکٹ نہ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔معمولی سے معاوضے پر انہوں نے مومنہ کو ہفتہ وار اردو خبریں اور ایک ڈسکشن پروگرام کے لیے جاب کی آفر کر دی۔تنخواہ تو بہت کم تھی مگر اپنے شوق کے سامنے مومنہ کو اس کی پرواہ نہ تھی۔

جیسے ہی مومنہ کی آواز آن ائیر ہوئی۔ ہر طرف سے توصیفی جملے سننے کو ملنے لگے۔رفتہ رفتہ اس کا فین کلب بنتا جا رہا تھا اور اسے اس کام میں لطف آنے لگا۔جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔اچھی فیڈ بیک اور پریکٹس سے مومنہ کے کام میں نکھار آتا گیا۔

چند ہفتوں کے بعد یہ کمیونٹی ریڈیو بند ہو گیا تو اس سے ایک دوسرے ریڈیو اسٹیشن کی انتظامیہ نے رابطہ کیا کہ ''بیساکھی پر خاص پروگرام کرنے ہیں اگر آپ کچھ وقت نکال سکیں۔'' پروگرام کنٹرولر نے پوچھا۔مومنہ مزید بات چیت کرنے کے لیے ریڈیو کے بگ باس سے ملنے ریڈیو اسٹیشن چلی گئی۔''ہم نے آپ کی آواز سنی ہے۔بہت اچھی ہے۔آپ کا فین کلب بھی ہے۔اب وہ ریڈیو تو بند ہو چکا ہے آپ ہمارے ریڈیو پر کام کریں۔'' ادھیڑ عمر اور ویٹ باس نے تمہید باندھی اس کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا

جیسے مومنہ کی طرف سے کسی سوال کا منتظر ہو۔۔۔۔ مومنہ کو خاموش دیکھ کر اس نے بات آگے بڑھائی کہ ''دراصل یہ بیساکھی کا پروگرام ہے تو یہ پروگرام کرنے کے لیے مناسب یہی ہوگا کہ آپ اپنا نام بدل کر رنجیت کور رکھ لیں۔'' وہ مومنہ کے جذبات سے بے خبر بولے جا رہا تھا۔

ادھیڑ عمر اوورویٹ باس کی بات سن کر مومنہ کا تو جیسے خون ہی کھول اٹھا۔ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے سختی سے کہا ''الحمدللہ میں ایک مسلمان ہوں اور اپنے اسلامی تشخص پر فخر کرتی ہوں۔ میں دو ٹکے کے ریڈیو پر اپنی آواز سننے کے لیے اپنی عاقبت خراب نہیں کر سکتی۔''

یہ کہہ کر ادھیڑ عمر باس کو سراسیمہ سا چھوڑ کر وہ بڑے بوجھل قدموں اور دکھی دل سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج ''ریڈیو کی موت'' ہوگئی ہو۔۔۔۔!

ٹک ٹک دیدم۔۔۔

''حساس لوگ عمر کی نقدی جلدی ختم کر دیتے ہیں''۔

رابعہ اکثر اس فقرے پر غور کرتی رہتی۔ وہ ایک ممتاز سماجی کارکن تھی اور قدرت نے اسے ایک نہایت حساس اور دردمند دل کی نعمت سے نوازا تھا۔ خدمت خلق کو بس اس نے زندگی کا اوڑنا بچھونا بنالیا تھا۔

پچھلے پچیس برسوں سے وہ ایک NGO نہایت کامیابی سے چلا رہی تھی۔ جس کا نصب العین ہی دکھی دلوں کی خدمت کرنا تھا۔ وہ جب بھی کسی ضرورت مند کی مالی یا اخلاقی مدد کرتی تو اس کی روح طمانیت کے احساس سے سرشار سی ہوجاتی۔ اسے اکثر عربی زبان کی مشہور کہاوت یاد آجاتی کہ ''زمین کو فیاض لوگوں کے جام سے حصہ ملتا ہے۔'' اس کی شدید خواہش تھی کہ اپنے حصے کا سارے کا سارے جام ہی تشنہ لبوں سے لگا دے۔ کسی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا بن جائے۔ دکھیوں کی مدد کرتے ہوئے اسے صرف اگر کوئی لالچ تھا تو ڈھیروں دعائیں سمیٹنے کا۔۔۔ جب وہ کسی کی مدد کرتی اور جواب میں اس سے پوچھا جاتا کہ وہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں تو مسکرا کر کہتی ''بس میرے حق میں دعا کر دیں۔ میری محنت کا اجر اگلے جہان میں خدا خود عطا کرے گا۔''

یوں تو سماجی خدمت کرتے ہوئے رابعہ کو کافی عرصہ گزر گیا تھا مگر اس طویل عرصے میں اسے چند واقعات آج بھی روزِ اول کی طرح یاد تھے جب اس نے ضرورت مندوں کی مدد کی تھی تشکر کے احساس سے ان کی آنکھیں کیسے بھیگ بھیگ جاتی تھیں اور ساتھ ہی رابعہ کی آنکھیں بھی نم سی ہوجاتیں۔ برسوں پہلے اس نے ایک ایشیائی خاتون کی مدد کی تھی جو کہ خانگی تشدد کے سبب ایک ریفوج میں رہائش پذیر تھی اور مقررہ وقت کے بعد اسے کمیونٹی میں ہاؤسنگ تلاش کرنا تھی۔ ریفوج والے یوں تو ایسی خواتین کی کافی مدد کرتے مگر جہاں انہیں کچھ زیادہ دقت پیش آتی وہ لوکل کمیونٹی آرگنائزیشن کو ایسے کیسز ریفر کر دیا کرتے تھے۔ شاہ جہاں کا کیس بھی ایسا ہی تھا۔

جب وہ پہلی مرتبہ شاہجہاں کی اسسمنٹ کرنے ریفوج میں گئی تو شاہ جہاں سخت پریشان تھی کہ ریفوج سے نکل کر وہ کہاں جائے گی۔ جوان بچیوں کا ساتھ تھا اور ایسے میں کسی بھی علاقے میں رہائش اختیار کرنے سے ڈرتی تھی مبادا کس قسم کی نسل پرستی کا نشانہ بن جائے۔ ریفوج میں رہنے والی انگریز عورتوں کے رویوں سے وہ پہلے ہی دل برداشتہ تھی جو بات بات پر لڑائی جھگڑا کرنے کا بہانہ تلاش کر لیتیں تھیں۔ بچے الگ مار ماری پر اتر آتے۔ کئی مرتبہ تو ان کے بچوں نے شاہ جہاں کے بچوں کو پاکی کہتے ہوئے ان پر

تھوکا بھی۔مگر وہ خود کو بہت بے بس اور مجبور پاتی تھی۔ریفوج کے منتظمین اچھے تھے مگر ہر وقت کی چخ چخ اور شکوے شکائتوں سے وہ بھی بیزار سے ہوجاتے تھے۔اس لیے شاہ جہاں ان سے شکایت کرتے ہوئے ذرا گھبراتی تھی مبادا ریفوج سے ہی نکال دیں۔

شاہ جہاں اور اس کی بہن کی شادی بیس برس قبل ان کے دور پار کے عزیزوں میں دو بھائیوں سے ہوئی تھی۔کچھ عرصہ تو خیریت سے گزرا۔پھر شاہ جہاں کے شوہر کو نشے کی لت پڑ گئی۔ایسی حالت میں وہ شاہ جہاں کو کافی زدوکوب کرتا۔بچے سہم کر رہ جاتے۔بہن اور بہنوئی جو ساتھ والے گھر میں رہتے تھے چیخ و پکار سن کر بیچ بچاؤ کرانے کے لیے آتے تو وہ انہیں بھی بے عزت کر دیتا رفتہ رفتہ انہوں نے ان کے معاملے میں دخل اندازی بند کر دی۔ایسے میں شاہ جہاں کو خدا کے سوا کسی کا سہارا نہیں رہا۔بچے بہت چھوٹے تھے وہ ماں کا کیا سہارا بنتے انہیں تو خود سہارے کی ضرورت تھی۔

ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔شاہ جہاں کا شوہر کسی معمولی سی بات پر اس قدر برہم ہوا کہ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور نیم برہنہ حالت میں اسے گھسیٹا ہوا گھر کے پچھواڑے میں گزرنے والی ریلوے ٹریک پر لے گیا ''آج تو تیرا خاتمہ کر کے ہی دم لوں گا، تجھے ریل کی پٹڑی سے باندھ کر ٹرین سے تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔حرامزادی۔۔۔۔''اس کے منہ میں جو آتا بکتا جا رہا تھا۔بچے الگ رو رہے تھے، آدھی رات کا وقت تھا۔کہیں سے بھی مدد ملنے کی امید نہ تھی۔ایسے میں شاہ جہاں بلک بلک کر رونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔اس کی بے بسی پر قدرت کو رحم آ گیا۔جیسے ہی دور سے آتی ہوئی کار کی تیز روشنیاں شاہ جہاں کے چہرے پر پڑیں تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔کار قریب آئی تو پتہ چلا کہ وہ پولیس کی گشتی کار تھی جو آدھی رات کے وقت گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں کوئی امن عامہ کا مسئلہ نہ ہو یا کسی کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔

پولیس نے شاہ جہاں کے شوہر کو گرفتار کر کے اس غریب کی جاں بخشی کروائی اور اسے بچوں کے ساتھ ایک ریفوج میں بھیج دیا۔

اپنی کہانی سناتے سناتے شاہ جہاں ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔'' میری بہن اور بہنوئی میرے شوہر کے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر انگلینڈ چھوڑ کر اسکاٹ لینڈ چلے گئے تھے اور میرے خیال میں وہ ایڈنبرا میں رہتے ہیں مگر میرا ان سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔عرصہ بارہ سال سے میں نے ان سے بات نہیں کی۔باجی اگر آپ میری بہن کا پتہ لگا دیں تو میں آپ کو زندگی بھر دعائیں دوں گی۔میں بوڑھے والدین کو ملک میں اپنے حالات بتا کر۔اس عمر میں پریشان کرنا نہیں چاہتی۔ہمیشہ انہیں یہی بتایا ہے کہ میں سکھی ہوں۔۔۔۔!''

میں نے شاہ جہاں کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی کہ اس کی بچھڑی ہوئی بہن کو تلاش کرنے میں اس کی مدد کروں۔'' شاہ جہاں سے ضروری کوائف لے کر میں واپس دفتر آ گئی اور مقامی اردو اخبار کے دفتر فون کر کے ایک اشتہار شائع کروا دیا۔دو ہی دن بعد دفتر میں سکاٹ لینڈ سے ٹیلی فون آ گیا کہ ''ہم اس فیملی کو جانتے ہیں اور ایک دو روز میں پتہ کر کے آپ کو اطلاع کریں گے۔''میں نے فون کرنے والے صاحب کا فون نمبر ازراہ احتیاط نوٹ کر لیا مگر شاہ جہاں کو ابھی مطلع کرنا نہیں چاہتی تھی مبادا اس کے بچھڑے ہوئے عزیزوں کا پتہ نہ چلے اور وہ بیچاری ایسے ہی اپنی امیدوں کے چراغ روشن کر کے بیٹھ

جائے۔

میں دل ہی دل میں دعا گو تھی کہ شاہ جہاں کی بہن اور بہنوئی کا اتا پتہ مل جائے تو اسے کس قدر خوشی ہوگی۔ کس قدر سلجھی ہوئی عورت ہے۔ بات کرتی ہے تو لگتا ہے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اور کس مصیبت کا شکار تھی غریب۔ پھر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرتی رہی۔ میں اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی کہ تیسرے دن اسکاٹ لینڈ سے انہی صاحب کا پھر فون آ گیا کہ انہیں اس فیملی کا پتہ چل گیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس نے ان کا فون نمبر مجھے دے دیا۔ جس کے لیے میں نے بے حد شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔

میں نے اسکاٹ لینڈ فون کر کے شاہ جہاں کی بہن اور بہنوئی سے بات کی تو اس کی بہن کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ میں نے شاہ جہاں کا نمبر اسے دے کر کہا کہ ''پہلے مجھے شاہ جہاں سے بات کر لینے دو اور اس کے بعد اس سے رابطہ کرنا۔''

جیسے ہی میں نے شاہ جہاں کو فون پر اطلاع دی کہ اس کے بچھڑے ہوئے بہن بہنوئی مل گئے ہیں تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کہنے لگی کہ ''باجی مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ روتی جا رہی تھی مگر یہ خوشی کے آنسو تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ ''اس کی بہن کچھ ہی دیر میں اسے فون کرے گی وہ تیار رہے'' اور ساتھ ہی میں نے اس کی بہن کا نمبر اسے ازراہ احتیاط دے دیا۔ شکریہ کہتے کہتے اور دعائیں دیتے دیتے شاہ جہاں کی زبان نہ تھک رہی تھی۔ میں نے اسے مستقبل کی ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں اور رندھی ہوئی آواز اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ فون بند کر دیا۔

''خوبصورتی امید خوشی اور وقار اس دنیا کو رہنے کے قابل بناتے ہیں'' دیوار پر آویزاں کتبے کو پڑھتے ہوئے میں نے رب العزت کا شکریہ ادا کیا کہ میں کسی دکھیا کے کام آ سکی۔ کسی کی زندگی میں امید اور خوشی لا کر اس کے لیے زندگی کی خوبصورتی میں اضافہ کر سکی اور ایک دکھی انسان کو باوقار انداز میں جینے کی نوید سنا سکی۔ وگرنہ تو عزتیں، ذلتیں، بخشنے والی خدا کی ذات ہے!

برسوں پہلے ہونے والا یہ واقعہ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔ پتہ نہیں کیوں اچانک آج یہ واقعہ مجھے یاد آ گیا تو دفتر میں بیٹھنے کا مزید من نہ چاہا۔ میں نے سوچا باہر نکل کر کچھ چھوٹے موٹے کام ہی کر لوں۔ ساتھ میں پوسٹ آفس ہے۔ آج کی ڈاک بھی پوسٹ آفس چھوڑ آؤں گی۔ جیسے میں باہر نکلی تو پوسٹ آفس کے راستے میں مجسٹریٹ کورٹس کے پاس ایک خستہ حال انگریز نوجوان مجھے بڑے غور سے ایک ٹک دیکھتے جا رہا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ شاید وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے مگر پھر میں اسے اپنا وہم سمجھ کر آگے بڑھ گئی۔ نہ جانے مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ دو آنکھیں میرا اب بھی تعاقب کر رہی ہیں مگر میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

آج پوسٹ آفس میں معمول سے زیادہ رش تھا اور مجھے قطار میں کھڑے کھڑے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ اور کوئی دن ہوتا تو شاید میں اتنا انتظار نہ کر سکتی مگر آج ہفتے کا آخری ورکنگ ڈے تھا اور خطوط سپرد ڈاک کرنا بے حد ضروری تھا۔

پوسٹ آفس سے نکل کر میں واپس دفتر آ رہی تھی کہ وہی خستہ حال انگریز نوجوان مجھے پھر نظر آ گیا۔ وہ پھر مجھے غور سے دیکھے جا

رہا تھا۔ جیسے ہی میں اس کے پاس سے گزری وہ تھوڑا سا آگے بڑھا۔ جیسے مجھ سے ہمکلام ہونا چاہتا ہو۔ مگر میں اسی رفتار سے چلتی رہی۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ جیسے کسی نادیدہ طاقت نے میرے پاؤں آگے بڑھنے سے روک دیئے ہوں۔ میں بادلِ نخواستہ پھر پیچھے پلٹی تو دیکھا کہ وہ انگریز نوجوان ابھی بھی مجھے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ میں جیسے ہی اس کی طرف متوجہ ہوئی وہ دو قدم اور آگے آ گیا اور آتے ہی بولا:

''I am very hungry, can I have some money please to buy food.''

اوہ۔ تو یہ معاملہ ہے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا کہ کہیں نشئی یا شرابی تو نہیں ہے۔ جو اکثر راہ چلتوں سے پیسے مانگتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو میں سختی سے منع کر دیا کرتی تھی۔ مگر یہ خستہ حال انگریز نوجوان قدرے مختلف نظر آ رہا تھا۔ ''اگر تم بھوکے ہو تو میرے ساتھ آؤ میں تمہیں کھانا خرید کر دیتی ہوں'' میں نے جب اسے کہا تو وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ چل پڑا۔ میں قریب والے ایرانی ٹیک اوے میں اسے لے گئی اور اس سے کہا کہ وہ جو بھی کھانا چاہتا ہے اس کا آرڈر کر دے وہ احسان کے بوجھ تلے جیسے دبا جا رہا تھا۔ اور بولا "Anything will do" اس نے برگر چپس اور ڈرنکس کا آرڈر دے دیا تو میں نے ٹیک اوے والوں کو بل کی ادائیگی کر دی۔ اس کی زبان تھینک یو تھینک یو کہتے نہ تھک رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''کوئی بات نہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا ثواب کا کام ہے۔'' مجھے کہیں بزرگان دین کا یہ قول کہ ''مذہب اسلام بھوکے کو کھانا کھلانا اور اچھے اخلاق کا نام ہے'' یاد آ رہا تھا۔

وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے میرے آگے تقریباً جھک سا گیا۔ میں نے سوچا شاید اسے کچھ پیسوں کی بھی ضرورت ہوگی اس لیے میں نے دس پونڈ کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا کہ وہ رکھ لے۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اب کی بار تو اسے ضبط کا یارا نہ رہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے چلے آ رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے گلے لگانا چاہتا ہو یا پھر کم از کم میرے ہاتھ پکڑ کر میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہو۔ مگر شاید ایک مسلمان عورت سے ہاتھ ملانے کی اسے ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔

"Don't worry we are all human beings"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ تو اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

مسکراتے ہونٹوں اور سرشار روح کے ساتھ میں ٹیک اوے سے باہر آ گئی۔ لیکن آنسوؤں سے لبریز دو آنکھیں دم سادھے اب بھی مجھے ٹک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔ مگر اب وہ تشکر کے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔۔۔!!!

چاند میں چڑیلیں

(طنز و مزاح)

انتساب

اسماعیل اعظم

کے نام

جو شگفتہ تحریروں کے

مداح ہیں

پیش لفظ

مزاح نگاری کا مجھے دعویٰ نہیں اور طنز میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔ سچ پوچھئے تو عام زندگی میں ایک طنزیہ جملہ بھی منہ سے نکالتے ہوئے زبان پتھر کی ہوجاتی ہے۔ مبادا کسی کی دل آزاری ہوجائے۔ ان تحریروں سے بھی کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات میرے ماحول کا حصہ ہیں اور میں خود ان کا ایک کردار ہیں۔ دوسروں کی کمزوریوں پر ہنسنے کے ساتھ ساتھ اپنی بدحواسیوں پر ہنسنا بھی اچھا لگتا ہے۔ کہیں کہیں کچھ رنگ آمیزی بھی ہے۔ لیکن کسی واقعہ کو ادب بنانے کے لیے کچھ کمی بیشی تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ کیونکہ لکڑی کی صحیح تراش خراش کے بغیر فرنیچر نہیں بنتا۔

دراصل حقیقی زندگی میں مسائل، تکالیف، رنج وغم، شکر رنجیاں اور آہ و بکا اس قدر ہے کہ وہی حزن و ملال تحریر میں لانے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ نسبت مجھے شاعری سے بھی ہے لیکن شاعری ایسی چیز ہے جس پر آپ کا اختیار نہیں ہوتا۔ آپ سو فیصد پلان بنا کر شاعری نہیں کرتے۔ پتہ نہیں کس لمحے میں کیا منکشف ہو جائے۔ مگر نثر کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسی اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں آپ سے بات کرنے کو جی چاہا۔ عام زندگی میں میری شخصیت کے اس رُخ سے صرف وہی لوگ واقف ہیں جن کے ساتھ بات کرتے ہوئے میں ''ایٹ ہوم'' محسوس کرتی ہوں۔ ایسے ماحول میں ذات کے پرت خود بخود اترتے چلے جاتے ہیں اور یہی لوگ صحیح معنوں میں آپ کی شخصیت سے واقف ہوتے ہیں۔ وگرنہ تو تکلف اور تصنع کے گھٹے گھٹے ماحول میں اچھی سے اچھی شخصیت بھی سات پردوں میں جا چھپتی ہے اور بات چیت رسمی گفتگو سے آگے نہیں بڑھتی۔ ایسے لوگوں کے حصے میں صرف میری سنجیدہ طبیعت کا پرتو ہی آتا ہے۔ کہ بقول شاعر:

کیا جانئے سودا اسے کس حال میں دیکھا

لیکن ایک لکھاری اور قاری کے درمیان ایک ان دیکھی اپنائیت کا رشتہ ہوتا ہے۔ ایک پہچان سی ہوتی ہے۔ ایک الگ ہی دیو لینتھ ہوتی ہے۔ بہت سی باتیں جو آپ حقیقی زندگی میں زبان سے نہیں کہہ سکتے وہی کاغذ اور قلم کو ساتھی بنا کر بہت آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔

میری تحریر سے اگر آپ کے چہرے پر مسکراہٹ نہ بھی آئے کیونکہ قہقہہ لگوانا تو ہرگز مقصود نہیں ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دوبارہ پڑھئے۔ شاید آپ کی سوچ کے دروازے یا کسی کھڑکی پہ ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دے جائے۔ اگر ایسا ہو تو آپ اپنے آپ کو اور ساتھ ہی مجھے بھی شاباش دے دیجئے۔

رضیہ اسماعیل
برمنگھم، برطانیہ

گرینڈ مدر

انسانوں کی تو کئی قسمیں ہوسکتی ہیں مگر ہمارے خیال میں بزرگوں کی صرف دو ہی قسمیں ہوتی ہیں۔ایک وہ بزرگ جو اپنی بزرگی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے وہ جو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے ہیں۔

ہماری نانی اماں یعنی گرینڈ مدر کا تعلق بزرگوں کے اول الذکر قبیلے سے تھا۔ نانی اماں کو اگر بزرگوں کے اس قبیلے کی چیف کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ نانی اماں نے مدرسہ تو دور کی بات ہے، زندگی میں کبھی کتاب بھی نہیں پڑھی تھی مگر وہ زندگی کے فلسفے کو کتابیں چاٹنے والوں سے بہت بہتر طور پر سمجھتی تھیں۔اسی پر بس نہیں بلکہ وہ زبردستی دوسروں کو اپنا فلسفہ حیات سمجھانے کے لیے مثبت اور منفی دونوں طریقے استعمال کرنے سے گریز نہ کرتیں۔

ہم نانی کی اس ہٹلر جیسی عادت سے تنگ آ کر نانی کی بجائے انہیں گرینڈ مدر کہا کرتے تھے۔نانی کو اس لفظ سے بہت چڑ تھی۔ ان کے خیال میں اس انگریزی نام سے ان کا اسلامی تشخص خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ نانی خود ہمارے لیے زندگی بھر خطرے کی گھنٹی بنی رہیں۔

نانی کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا قدرے مشکل ہے۔مگر جب ہمیں نانی سے اور نانی کو ہم سے آشنائی ہوئی تو وہ یقیناً زندگی کے گلشن سے اسی پھول نوچ چکی تھیں۔تمام گلشن کا قریب قریب صفایا کرنے کے باوجود نانی بہت تازہ دم تھیں۔ نانی کے رعب دبدبہ اور گرجدار آواز سے اچھوں اچھوں کا پتہ پانی ہوجاتا۔ایسے میں اگر ہماری نحیف ونزار ٹانگیں صرف کانپنے کا فریضہ سرانجام دیتی تھیں تو اس پر نہ ہمیں اس وقت حیرت تھی اور نہ ہی اب ہے۔

اپنی اس قدر صحت مند نانی کو دیکھ کر ہمیں دوسروں کی مریل قسم کی نانیاں بہت اچھی لگتیں۔بچپن کی بہت سی خواہشات میں سے ہماری ایک خواہش یہ بھی رہی کہ کاش اللہ میاں ہمیں بھی ایک لرزتی کانپتی ہوئی نانی عطا کرتے۔جس کی موتیا بھری آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک ہوتی۔ ہزار کوشش کے باوجود نانی اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکتیں۔مصنوعی دانت ہوتے جو نانی نہ تو ہمیں دکھا سکتیں اور نہ ہی ان سے کھا سکتیں۔کانوں میں آلہ سماعت ہوتا جسے ہم جب جی چاہتا غائب کر دیتے۔ ہماری بچپن کی ان بے تکی خواہشات کے باوجود نانی کی تمام سمعی اور بصری قوتیں پوری طرح بیدار تھیں جس کی وجہ سے ہم بچپن میں کبھی بھی ٹھیک سے خواب خرگوش کے مزے نہ لے سکے۔

اپنی اکلوتی نانی کے اس قدر صحت مند ہونے کا شکوہ ہم اکثر اللہ میاں اور کبھی کبھی اپنی والدہ سے بھی کیا کرتے۔ جو صرف مسکرا

کررہ جائیں۔ نانی کی قابل رشک صحت کی بدولت ہم بچپن میں کبھی صحت مند نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے نانی ہم سے اور بھی نالاں رہتیں۔ نانی شاید یہ نہیں جانتی تھیں کہ برگد کے اس تنومند درخت کی شاخوں میں سے روشنی کی کوئی کرن اس کے سائے میں اگنے والے نرم ونازک پودوں تک اگر پہنچ سکتی تو تب کوئی بات بنتی۔

ویسے اس عمر میں نانی کی قابل رشک صحت ان کے لیے تو عطیہ خداوندی تھی مگر نانی پر اللہ کے انعام واکرام کی یہ برکھا ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ نانی کے بیمار پڑنے کی خواہش حسرت میں بدل جاتی اور اس اٹکل پچوسی خواہش کی پاداش میں الٹا ہم بستر پکڑ لیتے۔

ہمارے خیال میں نانی اور اللہ میاں کے درمیان مواصلاتی رابطہ بہت زبردست تھا۔ یہ سیٹلائٹ کبھی بھی خراب نہ ہوتی۔ اسی لیے تو نانی کی دعائیں تھوک کے حساب سے شرف قبولیت پاتیں جبکہ ہماری کوئی دعا ہی قبول نہ ہوتی۔

نانی نے اپنی صحت کی مکمل ذمہ داری تو اللہ میاں پر چھوڑ رکھی تھی مگر ہماری ننھی منی سی صحت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لادے لادے پھرتیں۔ محلے میں سوطرح کی کھٹی میٹھی چیزیں بیچنے والے وارد ہوتے مگر کیا مجال کہ نانی انہیں کبھی گھر کی دہلیز پر رکنے دیں۔ نانی کے خیال میں یہ تھرڈ ریٹ قسم کی چیزیں کھا کر ہم بچپن میں ہی انہیں داغ مفارقت دے سکتے تھے۔

نانی کی چیرہ دستیاں اگر یہیں تک رہتیں تو خیریت تھی مگر وہ تو ہماری پرائیویت لائف میں بھی دندناتی ہوئی آتیں اور ہر چیز تہس نہس کر کے رکھ دیتیں۔ کتنی بھی آہستگی سے باتیں کرتے، وہ ضرور سن لیتیں۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ یا تو نانی کے پاس جن تھے یا پھر وہ لپ ریڈنگ کی ماہر تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ چہرے کے مختلف زاویوں سے ہی اندازہ لگا لیتیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔

ہم جہاز جیسے گھر کے کسی بھی کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھ جاتے، نانی ہمیں سرچ لائٹ سے ڈھونڈتی ہوئی حاضر ہو جاتیں۔ نانی کی اس کھوجیوں والی عادت سے ہم بہت الرجک تھے۔ کبھی کبھی تو وہ موقع واردات پہ رنگے ہاتھوں پکڑ کر اپنی مرضی کی ایف آئی۔ آر لکھواتیں اور کڑی سے کڑی سزا نہ صرف خود دیتیں بلکہ اماں کو بھی ورغلاتیں۔

اس زمانے میں ہماری اولین ترین خواہش یہی تھی کہ اے کاش ہماری نانی کے ہاتھوں میں اور کچھ نہیں تو ایک عدد لاٹھی ہی ہوتی۔ جیسے ہی ان کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی دیتی، ہم خبردار ہو جاتے۔ ان حالات میں نانی کے آنے کی پیشگی اطلاع ملنا ناممکنات میں سے تھا۔ اسی لیے وہ چراغ کے جن کی طرح ہمارے چراغ کو رگڑنے کے بغیر ہی حاضر ہو جاتیں۔ اور ہم الہ دین کو کوسنے دیتے رہ جاتے۔

نانی کے اسی مستقل مارشل لاء دور کے دوران ہم نے بچپن کو خیرباد کہہ کر جوانی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑا۔ یہ بھی ہمیں نانی سے ہی معلوم ہوا کہ ہم خیر سے جوان ہو گئے ہیں۔ کلی سے پھول بن گئے ہیں۔ نانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ خوشبو کو قید کر لیتیں۔ اس لیے انہوں نے ہمیں ہی قفس میں ڈالنے پر اکتفا کیا۔ اگر ہم جانتے کہ دور جوانی اس قدر دردناک ہوگا تو ہم ہمیشہ بچے ہی رہتے۔

نانی کی چوکیداری بے مثل تھی۔ کیا مجال کہ چڑیا بھی پر مار جائے۔ گھر میں داخل ہونے کے لیے دو دروازے تھے۔ صدر دروازے پر ہمیشہ بڑا سا تالا منہ چڑاتا رہتا۔ اور یہ دروازہ دن کے صرف خاص اوقات ہی میں کھلتا۔ گھر میں عام ٹریفک کے لیے

صرف ڈیوڑھی کا راستہ بچتا جہاں تخت پوش پہ گاؤ تکیہ لگائے نانی اپنا پھن پھیلائے بیٹھی رہتیں۔ گلی میں سے گزرنے والوں پہ وہ خاص نظر رکھتیں۔ محلے میں تقریباً سبھی گھر عزیزوں، رشتہ داروں کے تھے۔ جہاں کوئی نیا چوکھٹا نظر آتا نانی فکرمند ہو جائیں اور اگر نو وارد کوئی نوجوان ہوتا تو نانی کی تشویش دو چند ہو جاتی۔

نوجوان لڑکیوں کو ڈیوڑھی میں بیٹھنے کی سخت ممانعت تھی۔ البتہ اگر کبھی اچھے موڈ میں ہوتیں تو آواز دے کر بلاتیں اور پاس بٹھاتیں۔ نانی کا یہ متضاد قسم کا رویہ ہمیں بے حد کنفیوز رکھتا۔ مگر جیسے ہی ہم ڈیوڑھی میں قدم رکھتے نانی چق گرا دیتیں۔ ان کے خیال میں بچیوں کو نظر لگنے کا اندیشہ تھا۔ ہم نانی کی خوش فہمی کی داد دیئے بنا نہ رہتے۔ بھلا ان کی موجودگی میں نظر کی کیا مجال کہ ہمیں لگ جاتی۔ ہم نانی کی چوکیداری سے اتنے بیزار تھے کہ الٹا نظر کے گلے پڑ جاتے۔

ہماری سہیلیوں کے ساتھ نانی کا رویہ ایسے ہوتا جیسے وہ ہمارے لیے نامحرم ہوں۔ سکول کے علاوہ سہیلیوں سے ملنا جلنا منع تھا۔ صرف مسکین قسم کی سہیلیوں کو گھر میں قدم رکھنے کی اجازت تھی لیکن اس سے پہلے نانی ان کا پورا شجرہ ازبر کرتیں۔ پسند آتا تو راہداری دیتیں نہیں تو ڈیوڑھی سے ہی واپس کر دیتیں۔

تیز طرار قسم کی سہیلیاں نانی کو سخت ناپسند تھیں۔ ان کے خیال میں اس قسم کی لڑکیاں ایڈونچر کی تلاش میں ہوتی ہیں اور ان کی صحبت ہمارے لیے زہر قاتل تھی۔

جن سہیلیوں کے جوان بھائی ہوتے، وہ بھی ہمارے ہاں آنے سے ڈس کوالیفائی ہو جاتیں۔ نانی کے خیال میں جوان بھائیوں والی سہیلیاں سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔

سہیلیوں کے ساتھ ساتھ نانی ٹیلی ویژن سے بھی سخت بیزار تھیں۔ اس زمانے میں ٹی وی نیا نیا آیا تھا۔ اس لیے نانی صدر ایوب کے سخت خلاف تھیں کہ یہ شیطانی چرخہ ملک میں کیوں داخل ہونے دیا۔ جس کمرے میں ٹی وی تھا، نانی وہاں قدم نہ رکھتیں۔ نانی اگر آج زندہ ہوتیں تو ٹی وی کی حالت زار دیکھ کر اپنی این جی او رجسٹر کروائیں۔ احتجاجی جلوس منتظم کرتیں اور اسے انسانی حقوق کا مسئلہ بنا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتیں۔

ہمارے خیال میں نانی اگر ٹی وی اور ہماری سہیلیوں کے معاملے میں ہاتھ ہولا رکھتیں تو ان کے بارے میں ہماری رائے اتنے کنفیوژن کا شکار نہ ہوتی۔

لیکن ہماری باتوں سے آپ ہماری نانی کے بارے میں کوئی غلط رائے مت قائم کریں۔ جہاں نانی میں تھوڑی بہت بشری کمزوریاں تھیں، وہیں ان میں بے شمار خوبیاں بھی تھیں۔ ان کی سب سے اچھی خوبی تو یہ تھی کہ وہ کہانیاں بہت اچھی سناتیں۔ نانی کی خودساختہ کہانیاں کسی فسانہ عجائب سے کم نہ تھیں۔ جب جی چاہتا کہانی کو نیا موڑ دے کر ایک نئی کہانی شروع کر دیتیں۔ کہانی کا انجام معلوم کرنے کے لیے ہم نانی کے رحم و کرم پر تھے۔ اپنی اس پوزیشن کا وہ خوب فائدہ اٹھاتیں۔ جب کبھی ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو ہم نانی سے ناراض ہو جاتے۔ ہنستے ہوئے کہتیں دیکھو چاند میں رہنے والی پریاں تمہیں دیکھ رہی ہیں۔ اچھے بچے ناراض نہیں

ہوتے۔ ہم جل کر جواب دیتے نانی چاند میں پریاں نہیں رہتیں بلکہ وہاں چڑیلیں رہتی ہیں جو ہماری سب باتوں کی رپورٹ تمہیں دیتی رہتی ہیں۔ ہم چاند کو دیکھنے سے بالکل انکار کر دیتے۔ ہماری اس ہٹ دھرمی کا نانی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر چاند کی طرف اچھال دیتیں۔ گویا چڑیلوں کو بھگا رہی ہوں۔

نانی کے چند معمولات زندگی بھر قائم رہے۔ مثلاً کہانی سنانا مہمانوں کی خاطر مدارات کرنا صدقہ خیرات اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔

مہمانوں کو دیکھ کر یوں خوش ہوتیں جیسے بچے رنگ برنگے کھلونوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں۔ مہمانوں کی بے وقت آمد سے ہماری کہانی میں جو خلل واقع ہوتا وہ ہم سے برداشت نہ ہوتا۔ ہم شکایت کرتے تو ہنس کر کہتیں یہ ہمارے نہیں اللہ کے مہمان ہیں۔ یہ بات ہماری نوخیز عقل میں نہیں سماتی تھی اور ہم منہ بسور کر کہتے اگر اللہ کے مہمان ہیں تو اللہ کے پاس جائیں یہاں کیا کرنے آتے ہیں۔

اللہ کے مہمانوں کا ناشتہ بڑا شاندار ہوتا۔ دیسی سویاں اور انڈوں کا حلوہ ان موقعوں پر بہت اہتمام سے تیار ہوتا۔ خالص دیسی گھی جو ہمیشہ اسٹور میں تالے میں پڑا رہتا اس دن قفس سے آزاد ہوتا۔ مہمانوں سے محبت کا نقطہ عروج دیسی گھی ہی ہوتا۔ اس زمانے میں ڈالڈا گھی نیا یا نکلا تھا۔ نانی اس کی سو سو برائیاں کرتیں۔ بناسپتی گھی کی برائیاں سن سن کر ہمیں پورا یقین ہو گیا تھا کہ اسے کھانے والے سب لولے لنگڑے ہو جائیں گے۔ ڈالڈے کا ڈبہ دیکھ کر نانی جھٹ گھونگھٹ نکال لیتیں جیسے کسی نامحرم کو دیکھ لیا ہو۔

صدقہ خیرات دل کھول کر کرتیں۔ فقیروں کا بہت بے چینی سے انتظار کرتیں۔ جیسے ہی کوئی فقیر گلی میں صدا لگاتا' کسی نہ کسی کو دوڑائیں کہ اسے پکڑو۔ فقیر اگر تیز رفتار ہوتا اور گھر کے دروازے سے آگے نکل جاتا تو نانی کا موڈ خراب ہو جاتا۔ خیرات دینے کے ساتھ ساتھ اس کی خوب خبر لیتیں کہ بھیک مانگنے نکلے ہو یا اولمپک ریس میں حصہ لینے۔ فقیر ہو تو فقیر بن کر رہو۔ اللہ کے نام پر سوال کرتے ہو اور جواب کا انتظار کیے بغیر ہی چل پڑتے ہو۔ ہمیں اس سے شرمندہ کراؤ گے کہ اس کے نام پر کسی نے کچھ مانگا اور ہم دے نہ سکے۔

صحت مند فقیر کو دیکھ کر نانی کی تیوری پر بل پڑ جاتے۔ کہتیں ہٹا کٹا مشٹنڈا بھیک مانگتا ہے۔ کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتا۔ ایسی سرزنش کرتیں کہ وہ فقیر دوبارہ ہماری گلی کا رخ نہ کرتا بلکہ شہر کے دوسرے صحت مند فقیروں کو بھی خبردار کر دیتا کہ فلاں محلے میں مت جاؤ۔ وہاں احتساب ہوتا ہے۔ ذرا دبو قسم کے فقیر تو چپ کر کے چلے جاتے۔ مگر دل گردے والے نانی سے الجھ پڑتے اور کہتے اماں اگر کچھ دینا ہے تو دو ہماری صحت کو نظر کیوں لگاتی ہو۔ ایسے گستاخ فقیر کو نانی تھانے میں رپورٹ کرانے کی دھمکی دیتیں جس پر کبھی عمل نہ ہوا۔

نانی کے اس سکندرانہ سلوک کی وجہ سے صرف مریل قسم کے فقیر ہی ہمارے محلے میں قدم رکھتے۔ ہر جمعرات کو اپنے بزرگوں کا ختم پڑھ کر بہت بے تابی سے فقیروں کا انتظار کرتیں۔ اگر فقیر لیٹ ہو جاتے تو انہیں باقاعدہ ڈانٹ پڑتی۔ سامنے بٹھا کر کھانا کھلاتیں، پانی پلاتیں اور پھر یوں بھگا دیتیں جیسے وہ بغیر اجازت ڈیوڑھی میں گھس آئے ہوں۔

نانی کے برعکس نانا بہت کم گو تھے۔ نانی کی ساری سرگرمیوں سے لاتعلق اپنی ہی دنیا میں مگن رہتے۔ نانی کو ان کی خاموشی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ جان بوجھ کر وقفے وقفے سے اس پرسکون تالاب میں کنکریاں پھینکتی رہتیں۔ نئی نئی باتیں نکال کر نانا پر حملہ آور ہوتیں مگر نانا بھی ان کے حملوں سے بچنا خوب جانتے تھے۔

نانی کے مقابلے میں نانا بہت پڑھے لکھے تھے۔ اردو عربی اور فارسی پر انہیں عبور تھا۔ ہیروں کے کاروبار میں دنیا گھوم چکے تھے۔ اس عمر میں زیادہ وقت موٹی موٹی کتابیں پڑھنے میں گزارتے۔ ان کتابوں کو نانی زندگی بھر اپنی سوت ہی سمجھتی رہیں۔

نانی تو قبول صورت ہی تھیں مگر نانا اس عمر میں بھی یونانی دیوتا لگتے۔ اٹھی ہوئی راجپوتی ناک، کشادہ پیشانی، ذہین آنکھیں، سرخ وسپید رنگت۔ نانا اگر خوش شکل اور پڑھے لکھے تھے تو نانی کو اپنے اونچے نمبردار گھرانے کا بڑا مان تھا۔ بات بات پر بابل کے گھر کے ست رنگے کبوتروں کا ذکر کرتیں اور آبدیدہ ہو جاتیں۔

جب کبھی نانا چپ شاہ کا روزہ توڑتے اس دن بہت گھن گرج کے ساتھ بارش ہوتی۔ ایک ہی کمرے میں اپنے اپنے پلنگ پر بیٹھ کر لڑتے۔ بہت سے خاندانی حالات ہمیں ان معرکوں کے دوران ہی معلوم ہوئے۔ نانی لڑتے لڑتے تھک جاتیں تو پانی پی کر لیٹ جائیں۔ ہم سمجھتے کہ سیز فائر ہو گیا مگر نانی تازہ دم ہو کر پھر گولہ باری شروع کر دیتیں۔ نانی کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ نانا نے آج تک اپنے دل کی گھنڈی نہیں کھولی تھی۔ ہم سمجھتے کہ گھنڈی کوئی چھوٹی موٹی کھڑکی ہوگی جو آج تک نہ کھل سکی۔ یہ دروازہ تو ہرگز نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اگر نانا کے دل کا دروازہ بند ہو جاتا تو نانی پر ان کے گھر کا دروازہ کیسے کھلتا۔

جس دن یہ گھمسان کا رن پڑتا ہماری کہانی گول ہو جاتی۔ اس دن ہم نانی کے کہے بغیر ہی چاند میں پریاں تلاش کرنے لگ جاتے مگر ہمیں وہاں ہشاش بشاش چڑیلوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا۔ جو ہماری کہانی گول ہونے کی خوشی میں جشن منا رہی ہوتیں۔

خالہ جو ساتھ والے گھر میں رہتی تھیں، اس معرکہ آرائی کے دوران یو۔این۔او بن کر بیچ بچاؤ کی کوشش کرتیں تو نانی کی گولہ باری کی زد میں آ جاتیں۔ نانی کو یو۔این۔او کی طرح خالہ کے کردار پر بھی شک رہتا۔ ان کے خیال میں وہ نانا کی طرفداری کرتی تھیں، ایسے میں وہ خالہ کی ثالثی کو پوری حقارت سے ٹھکرا دیتیں اور انہیں اپنے ہاں آنے سے بھی منع کر دیتیں مگر شام ہوتے ہی خالہ کو آوازیں دینے لگ جاتیں اور نانا کی سائیڈ لینے پر انہیں برا بھلا بھی کہتی رہتیں۔ نانی کا واویلا سن کر نانا صرف مسکرا کر رہ جاتے۔

نانی ہر دوسرے تیسرے مہینے اپنے بیٹوں سے ملنے داتا کی نگری لاہور ضرور جاتیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ یہ سرکاری دورہ اکثر لڑائی کے فوراً بعد ہی پلان ہوتا۔ سفر کی تیاری بہت زور شور سے ہوتی۔ ایک دن پہلے ہی اسٹیشن جا کر قلی بک کروا کر آتیں۔ تانگہ استعمال کرنا فضول خرچی سمجھتیں۔ خوب اہتمام سے غسل ہوتا۔ کہتیں سفر پر انسان کو پاک صاف ہو کر جانا چاہیے۔ کیا پتہ یہ زندگی کا آخری سفر ہو۔ رات کاٹنی مشکل ہو جاتی۔ اٹھ اٹھ کر رات بھر گھڑی دیکھتی رہتیں۔ کہ کہیں بابوٹرین نہ نکل جائے۔ بابوٹرین کے علاوہ کسی دوسری ٹرین کو زندگی بھر گھاس نہ ڈالی۔ صبح چار بجے ہی دیسی گھی کے پراٹھے تلے جاتے۔ گھی کی مہک سے سارا گھر جاگ اٹھتا۔ ہم آنکھیں ملتے ہوئے نانی کے پاس رسوئی میں آ بیٹھتے مگر کیا مجال جو پراٹھا ہمیں دے جاتیں۔ نانی کی بھی عجیب منطق تھی۔ کہتیں یہ

سفر کا کھانا ہے۔صرف مسافر کھا سکتے ہیں۔دو گھنٹے کے سفر میں ساتھ لے جائے جانے والے پراٹھوں کی تعداد دیکھ کر لگتا کہ یہ ساری ٹرین کا ناشتہ ہے۔جیسے ہی گاڑی اسٹیشن چھوڑتی، پراٹھوں کی پوٹلی کھل جاتی۔نہ صرف خود مزے لے لے کر کھاتیں بلکہ پاس بیٹھے ہوؤں کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر کھانے پر مجبور کرتیں۔یہ سفر نامہ ہم اس لیے لکھ رہے ہیں کہ ہم نانی کے ایک سفر کے چشم دید گواہ ہیں۔اس کے بعد ہم نے نانی کی ہمراہی سے توبہ کر لی۔

نانی کی پسندیدہ ہابی خاندان کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے تلاش کرنا تھی۔آپ ہی آپ جوڑ ملاتی رہتیں۔نانی کے طے کیے ہوئے رشتے کو رد کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔لیکن دونوں فریقوں کی رضامندی کے باوجود بھی اگر بیل منڈھے نہ چڑھتی تو اللہ کی مرضی کہہ کر خاموش ہو جاتیں۔شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکے لڑکیوں کی رضامندی معلوم کرنا شان کے خلاف سمجھتیں۔جہاں کسی لڑکے لڑکی کو آپس میں بات کرتے دیکھا ان کا تخیل لوٹ پوٹ ہو جاتا اور اسے رضامندی ہی سمجھ لیتیں۔

البتہ خاندان سے باہر سے آنے والے رشتوں کو بیک جنبش قلم رد کر دیتیں ان کے خیال میں انسانی نسلیں اسی طرح زوال پذیر ہوئی ہیں۔خالص خون کی اصطلاح بہت شدومد سے استعمال کرتیں، جو کبھی ہمارے پلے نہ پڑی۔غرضیکہ نانی کا بس نہیں چلتا تھا کہ خاندان کے سبھی لڑکے لڑکیوں کی ایک ہی دن میں اجتماعی شادی کروا کر نگرانی کی مشقت سے بچ جائیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ نانی کھلی کتاب تھیں۔اندر باہر سے ایک' مگر نانی نے ہم سے زندگی بھر ایک بات چھپائے رکھی۔یا شاید بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔جس دن نانی کا انتقال ہوا یہ خبر ہم پر بجلی بن کر گری کہ وہ ہماری ثانی نہیں بلکہ پرنانی تھیں۔یعنی گریٹ گرینڈ مدر۔سچ پوچھئے تو ہمیں زندگی میں پہلی بار خاموش لیٹی ہوئی نانی پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

باؤنسر

میڈیا کی اہمیت سے کوئی فاتر العقل ہی انکار کر سکتا ہے۔ اس کی روز افزوں ترقی اور نت نئی ایجادات نے تو اچھوں اچھوں کو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ عام آدمی کو تو اس کا جو بھی فائدہ ہوا ہے، اس سے قطع نظر زندگی کے چند شعبے اس سے بہت فیض یاب ہوئے ہیں جن میں خاص طور پر سیاست، اسپورٹس اور شوبزنس قابل ذکر ہیں۔

ان تمام شعبوں میں گلیمر کے علاوہ ایک اور قدر مشترک بھی ہے۔ یہاں جتنی تیزی سے لوگ اوپر آتے ہیں، اتنی ہی تیزی سے نیچے کی طرف دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ گلیمر اور شہرت کی اس فضا میں توازن برقرار رکھنے کے لیے بندے کے لیے اپنے شعبے میں مہارت کے علاوہ اچھا کھلاڑی ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ وگرنہ نیوٹن کے قانون کی زد میں آنے سے بچنا مشکل ہے۔ ایک بار بندہ زمین پر گر جائے تو پھر گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ کیونکہ ان شعبوں میں کسی گرے ہوئے کو اٹھانے کا رواج کم ہی ہے۔ انہی شعبوں پر کیا موقوف ہے گرے ہوؤں کو اٹھانے کا جھنجٹ پالنے کی تکلیف ہم کرتے ہی نہیں۔

ان تینوں شعبوں کے افراد میں ایک اور خاص خوبی پائی جاتی ہے اور وہ ہے باؤنسر مارنے کی عادت۔ آپ کہیں گے کہ بھئی باؤنسر تو صرف کھلاڑی مارتے ہیں لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں کہ کھلاڑیوں کے باؤنسر مارنے پر تو ان کی سرزنش ہوتی ہے لیکن اگر اناڑی باؤنسر مارنا شروع کر دیں تو آپ کسی عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے۔

باؤنسر مارنے کی پاداش میں بیچارے کھلاڑی تو سزا بھگتتے ہیں لیکن سیاست دانوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ کھلاڑیوں کی طرح ضابطوں کے پابند نہیں ہوتے۔ انہیں خود تو کم ہی باؤنسرز پڑتے ہیں لیکن یہ عوام کو زیادہ باؤنسر مارتے ہیں۔ اگر کبھی کبھار انہیں باؤنسر پڑ بھی جائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ جلدی سے پارٹی بدل لیتے ہیں۔ نعرہ بدل دیتے ہیں اور کچھ نہیں تو پارٹی کا نام ہی بدل لیں گے۔ منشور بدل لیں گے۔ گویا پرانی بوتلوں میں نئی شراب بھریں گے مگر کام وہی کریں گے جو پہلے کر رہے تھے۔ ویسے یہ نیک کام ہمارے سیاست دان ہی کر سکتے ہیں۔ برطانیہ کے سیاست دان اتنے جرأت مند نہیں ہیں۔

باؤنسر کھانے کے لیے بندے کا ڈھیٹ ہونا بہت ضروری ہے اور یہ خوبی سیاست دانوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ نئے نئے نعروں سے عوام الناس کو باؤنسر مارتے ہیں۔ اب تو ہمارے گداگر بھی سیاست کرنے لگ گئے ہیں۔ ایٹمی دھماکے کے بعد انہوں نے بھی بھیک مانگنے کے روایتی سلوگن بدل دیئے ہیں۔ اب وہ ایٹم بم کے نام پر خیرات مانگتے ہیں۔ ''بی بی ایٹم بم کی خیر ہو۔ پاکستان کی خیر ہو۔ ایٹم بم کے نام پر کچھ دیتی جاؤ''۔

ایٹم بم سے ہمارے ملک کو کوئی اور فائدہ ہوا ہے یا نہیں مگر ایک فائدہ ضرور ہوا کہ زندگی میں پہلی بار پاکستان کا نام مغربی میڈیا پر بہت نشر ہوا۔ پردیس میں اتنے سالوں بعد جی خوش ہو گیا کہ کسی مثبت حوالے سے ہمارے وطن کا نام ان زبانوں پر آیا تو جو دن رات کرپشن، بھوک، بیماری، جہالت اور دہشت گردی کے حوالے سے ہی ہمارے وطن کا نام اچھالتے رہتے تھے۔

پاکستان میں ایٹمی دھماکوں کے فوراً بعد سی۔ این این پر ایک دستاویزی فلم دکھائی جا رہی تھی جس میں ایک غریب پاکستانی عورت روٹی پکاتے ہوئے کہہ رہی تھی ''ہم بھوکے رہ لیں گے مگر ایٹم بم ضرور بننا چاہیے'' ہم اس خاتون کے جذبہ حب الوطنی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ دیارِ غیر میں بیٹھ کر پہلی بار انکشاف ہوا کہ اب ہمارے ملک کی غربت میں پسی ہوئی عام گھریلو عورت بھی کچھ باشعور ہو گئی ہے اور یہ سب میڈیا کا کمال ہے۔ لیکن ابھی اس نوزائیدہ شعور کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے تاکہ آنے والے وقتوں میں یہ جوان ہو کر لوگوں کو اپنے مستقبل کے صحیح فیصلے کرنے میں مدد دے سکے اور وہ آئے دن کے باؤنسروں سے بچ سکیں۔

کھیل اور سیاست میں ادھ موا کرنے کے بعد باؤنسرز اپنی شعبدہ بازیاں دکھانے کے لیے شوبزنس میں آدھمکتے ہیں۔ فلم ہمارا میدان نہیں ہے کیونکہ ہمیں اوور ایکٹنگ کرنا نہیں آتی۔ صرف نیچرل ایکٹنگ کر سکتے ہیں اور فلموں میں اس قسم کی ایکٹنگ کا سکوپ بہت کم ہے۔ ہاں البتہ صداکاری سے ہمیں قلبی لگاؤ ہے۔ حیوان ناطق ہیں اس لیے بولنے پر مجبور ہیں۔ اب جب بولنا ہی مقدر ٹھہرا تو کیوں ناں اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ ہوا کے دوش پر لفظوں کی پھلجڑیاں، آواز کے زیر و بم کے ساتھ چھوڑنے والوں کو پریز نٹرز یعنی اناؤنسرز کہا جاتا ہے۔ مگر ہم انہیں باؤنسرز بھی کہتے ہیں۔

اب آپ کہیں گے کہ اناؤنسر اور باؤنسر کا کیا رشتہ ہے۔ بھئی بہت گہرا رشتہ ہے۔ صرف غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دراصل یہ خود تو باؤنسرز نہیں مارتے بلکہ انہیں باؤنسرز پڑتے رہتے ہیں۔ اناؤنسرز کو جس مائیکروفون کے آگے بٹھایا جاتا ہے اس کی شکل مکے سے ملتی جلتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اناؤنسرز کو ڈرانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ ذرا زبان پھسلی اور سیاہ دستانے میں لپٹا ہوا مکا پڑا اناؤنسر کی ناک پر۔ ستم بالائے ستم کہ اناؤنسرز کو اس مشقِ ستم کے لیے تن تنہا بند کمرے میں بٹھایا جاتا ہے۔ صرف ایک شیشے کی دیوار ہوتی ہے جس سے لوگ اناؤنسر کی حالتِ زار دیکھ کر دور ہی سے ہاتھ ہلاتے رہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں تو اناؤنسرز کو کال کوٹھڑی میں اس لیے بند کیا جاتا ہے کہ کمزور دل والے کہیں اٹھ کر بھاگ نہ جائیں۔ محاورے کی رو سے ملا کی دوڑ صرف مسجد تک ہوتی ہے اور کہیں چلا بھی جائے تو مس فٹ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اناؤنسر بھی زیادہ سے زیادہ اسٹوڈیو کے دروازے تک ہی آ سکتا ہے۔ کیونکہ پروگرام پروڈیوسر آگے مکا تانے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ جب اناؤنسر منہ کھولتا ہے تو (چاہے جمائی لینے کے لیے ہی ہو) آن ایئر کا خون میں نہایا ہوا سرخ سائن جگمگ جگمگ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس ریڈ الرٹ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ باملاحظہ ہوشیار۔ اگر کوئی الٹی سیدھی بات کی تو باؤنسرز پڑ جائیں گے۔

اس کے برعکس کچھ اناؤنسرز مائیکروفون کو باؤنسر مارتے ہیں۔ اس کالے کلوٹے مُکّے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بڑے دھڑلے سے آ کر بیٹھتے ہیں۔ اس وقت یہ مکا سمٹ کر پرے ہٹ جاتا ہے۔ بھئی زمانہ ہی ایسا ہے۔ دنیا ڈرنے والوں کو اور ڈراتی ہے

بلکہ دھمکاتی ہے۔ شرافت کو کمزوری پر محمول کیا جاتا ہے۔ مکا بے جان سہی مگر ہماری ہی دنیا کی مخلوق ہے۔ سبق کیسے نہیں سیکھے گا۔ دراصل یہ اناؤنسرز اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ مکے سے ان کی دوستی ہوتی ہے یا مکا دوستی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر ؎

کیا مصلحت شناس تھا وہ آدمی قتیل
مجبوریوں کا جس نے وفا نام رکھ دیا

موبائل ٹیلی فون اور موبائل لائبریریوں کی طرح کچھ موبائل اناؤنسرز بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم گشتی اناؤنسرز کہہ سکتے ہیں۔ یہ گھومتے پھرتے اناؤنسرز کبھی تو گھر سے سودا سلف لانے کے لیے نکلتے ہیں۔ راستے میں یاد آ گیا کہ آج تو پروگرام کرنا تھا، سب شاپنگ بھول کر ہانپتے کانپتے اسٹوڈیو پہنچتے ہیں۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ جیسے ہی قید تنہائی میں گئے، مکا بھی ان کی خبر گیری کے لیے تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ ایسے اناؤنسرز کی نہ صرف ریڈیو انتظامیہ بلکہ عوام الناس بھی خوب خبر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ بغیر تیاری کے ہی ہوا کے دوش پر اڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

کچھ اناؤنسرز ضرورت سے زیادہ ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات بات پر ہنسیں گے۔ چاہے عام زندگی میں سڑے کریلے کی طرح ان کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہ آئی ہو مگر مکّے کے سامنے بیٹھ کر وہ باب ھوپ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک پتے کی بات بتائیں آپ کو۔ ایسے اناؤنسروں کے فین بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم کبھی سیلنگ تو کبھی پیڈسٹل فین کہتے ہیں۔ ہینڈ فین اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ان کا رواج اب کم ہو گیا ہے۔ یہ ضرورت سے زیادہ ان کی تعریفیں کر کر کے دوسروں پر ان کی قابلیت کا رعب جماتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے پنکھوں کو باقاعدہ ترغیبات دی جاتی ہیں تاکہ وہ باقاعدگی سے پروگرام میں فون کر کے اناؤنسرز کی نالائقی کا بھرم رکھیں۔

اناؤنسرز کی ایک قسم گھبراتے شرماتے اور لجاتے اناؤنسرز کی بھی ہوتی ہے۔ یہ عام زندگی کے علاوہ مکے کے سامنے بیٹھ کر بھی شرمانے کی ایکٹنگ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اس نازیبا حرکت پر مکا طیش میں بھی آ سکتا ہے۔

شیشے کی دیوار کے اس پار بیٹھنے والوں کو ہم ندیا کے پار والے بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ پروڈیوسرز کی کشتی میں ہچکولے کھاتے رہتے ہیں۔ جو چپو لیے ان کے سر پر کھڑے رہتے ہیں۔ ایسا شاید ہمارے وطن میں کم مگر بیرون ملک چلنے والے ایشیائی ریڈیو اسٹیشنوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ اناؤنسرز کو ملنے والی ہدایات کچھ یوں ہوتی ہیں ایسے بیٹھو، اس طرح مت بولو، تھوڑا ہنسو اتنے انڈین گانے لگاؤ ملی نغمے اور وہ بھی پاکستان کے بالکل نہ لگاؤ۔ (کہیں وطن کی یاد میں جذباتی ہو کر لوگ ریڈیو اسٹیشن کا گھیراؤ نہ کر لیں) صرف چند پاکستانی گانے لگاؤ اور ساتھ یہ بھی اناؤنس کرو کہ یہ پاکستانی گانا ہے۔ (انڈین گانوں سے تو ساری دنیا واقف ہے ان کے تعارف کی ضرورت نہیں ہے) نعت بالکل نہیں لگانی۔ اس پروگرام میں اتنے پاکستانی کالرز کیوں تھے، ڈسکشن پروگرامز میں صرف بدھو قسم کے پاکستانی کالرز لو جو صرف تعریف ہی کریں اور کوئی ڈھنگ کی بات اپنے ملک اور قوم کے حق میں نہ کر سکیں۔ ہوشیار قسم

کے پڑھے لکھے پاکستانی کالرز اگر لوتو وقت بہت کم دو وغیرہ وغیرہ۔

چند گھنٹے کے پروگرام میں ہی انا ؤنسر اتنے باؤنسرز کھا چکا ہوتا ہے کہ اگلے پروگرام تک ڈپریس رہتا ہے۔ایک راز کی بات بتاتے ہیں۔جب کوئی انا ؤنسر گانے پر گانے لگا تا چلا جائے تو سمجھیں معاملہ گڑبڑ ہے۔یا تو سکرپٹ گھر چھوڑ آئے یا پھر پروڈیوسر سے ڈانٹ کھا رہے ہیں۔نصرت فتح علی اور پٹھانے خان کے لمبے لمبے دردناک گانے لگا کر وہ اپنے غم کو غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میڈیا سے وابستہ اتنی بدحواسیوں اور رنگینیوں کے باوجود بیرون ملک ہمارے لوگ اس شعبے میں کم ہی آتے ہیں۔بس ایک ہی دھن ہے کہ کسی طرح ڈاکٹر انجینئر، وکیل یا اکاؤنٹنٹ بن جائیں۔یہ میدان پڑوسی ملک کے ہاتھ میں دے کر ہمارے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھے نسلی تعلقات کو فروغ دے رہے ہیں۔ہمارے خیال میں تو نسلی تعلقات فروغ نہیں پا رہے ہوتے بلکہ ان کی اپنی نسل تباہ ہو رہی ہوتی ہے جس کا انہیں احساس ہی نہیں ہوتا۔ریڈیو ہر وقت ایک ہی راگ الاپتے رہتے ہیں ''ہم ایک ہیں۔ہم ایک ہیں'' مذہب اور قوم کا ذکر گول کر دیا جاتا ہے اور اگر ذکر ہوتا بھی ہے تو مدر انڈیا کا۔اور پاکستان تو جیسے غلطی سے دنیا کے نقشے پر ابھر آیا ہے۔اپنے قومی تشخص، مذہب، زبان اور تہذیب سے اس طرح کی مجرمانہ غفلت کرنے والے لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ بھائی بھائی کی سازش کا شکار ہو کر ہم کس منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں۔اگر اب بھی ہم نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو اتنے باؤنسرز پڑیں گے کہ خود اپنی صورت پہچاننی مشکل ہو جائے گی۔

آ گئی

مضمون کے عنوان سے کوئی غلط مطلب اخذ نہ کریں۔ آ گئی دراصل اردو زبان کے خوبصورت لفظ آ گہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی اردو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں اسے آ گہی ہی کہتے ہیں مگر برطانیہ میں کچھ لوگ اسے آ گئی کہتے ہیں۔

دراصل بگاڑ ہمارے کلچر کا اتنا اہم جزو بن چکا ہے کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ اب خالص نظر نہیں آتا۔ ایسے میں اگر آ گہی کو آ گئی بنا دیا گیا ہے تو کچھ زیادہ حیرت کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے بھی اس دنیا میں آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ اگر ایک مرتبہ آنے والے یہاں سے رخت سفر نہ باندھیں تو نئے آنے والوں کو بیٹھنے تو کجا کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملے لیکن آمد و رفت کے اس چکر میں آ گہی کی حیثیت بہت منفرد اور مسلم ہے۔ اول تو یہ آتی ہی مشکل سے ہے اور جب ایک مرتبہ آ جائے تو پھر اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی آ گہی کے بارے میں پروین شاکر نے کہا تھا کہ ''آشوب آ گہی سے بڑا عذاب آج تک زمین والوں پر نہیں اترا۔ یہ اس شہر ذات سے روشناس کرواتی ہے جس کے سب دروازے اندر کی طرف کھلتے ہیں اور واپسی کا راستہ نہیں ہوتا''۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ آ گہی بیگم خاصی ڈھیٹ واقع ہوئی ہیں۔ اس کی ہٹ دھرمی کے کرشموں سے تو وہ ہی لوگ واقف ہیں جن کے دل و ذہن کو آ گہی کا چار سو چالیس وولٹ کا بلب اس طرح روشن کرتا ہے کہ انہیں فارسی زبان کی یہ کہاوت کہے بنا چارہ نہیں ہوتا'' آ میری طبیعت کی روشنی تو میرے لیے بلا بن گئی ہے''۔

ویسے آ گہی کو بلا کہنے والے بھی اپنی جگہ درست ہیں کیونکہ جسے جس بات کی آ گہی ہو جاتی ہے، عوام الناس اس روشنی سے اپنے قلب و جاں منور کرنے کے لیے اس شخص کی جان عذاب میں کر دیتے ہیں۔ اب ہونا تو یوں چاہیے کہ آ گہی کی روشنی کو دل و ذہن کے تاریک آنگن میں اتارنے کے لیے سب اپنے اپنے حصے کا ہوم ورک کریں مگر ہمیں پکا پکایا کھانا کھانے کی ایسی منحوس عادت پڑ گئی ہے کہ کچن میں جا کر چولہے کی تمازت سے چہرہ جھلساتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ہماری ناقص رائے میں تو آ گہی کا ہونا بھی مصیبت اور نہ ہونا اس سے بڑی مصیبت ہے۔ لیکن یہ دونوں مصیبتیں بھی ان لوگوں کے کھاتے میں لکھ دی جاتی ہیں جنہیں آ گہی ہوتی ہے اور آ گہی سے کورے لوگ ہلکے پھلکے ہو کر زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ اس سارے کھیل میں سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو وہ ہوتا ہے جہاں لوگ آ گہی نہ ہونے کے باوجود اپنی بات منوانے کے لیے ہٹ دھرمی کا ایسا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ان کی اس جہالت پر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔

خیر جانے دیں۔ایسی باتوں پر غصہ نہیں کرتے۔ ہمارے مذہب میں غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس ہیجانی کیفیت میں لوگ اول جلول قسم کی حرکات کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ حرکات وسکنات دیکھ کر شاید غصے کو بھی شرم آجاتی ہوگی مگر غصہ کرنے والوں کو کوئی ندامت نہیں ہوتی۔

مگر کیا کریں۔ بات بات پر جذباتی ہو جانا ہمارا نیشنل سمبل بن چکا ہے۔ نارمل یعنی شریفانہ لہجے میں بات کرنا بزدلی کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ جب تک پنجابی فلموں والی ٹھاہ ٹھوں نہ ہو، ہمیں لگتا ہے کہ ہماری بات دوسرے کے گوش گزار ہی نہیں ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ چاہے مدمقابل کے کان کے پردے پھٹ چکے ہوں۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوتی دیکھ کر طیش میں آجانا ایک نارمل حرکت ہے لیکن آپ یہ مت سمجھیں کہ اس حالت میں سب لوگ تخریبی یا تادیبی ردعمل کا مظاہرہ ہی کرتے ہیں۔کبھی کبھار تو لوگ غصے میں بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں جو غصہ کیے بغیر ممکن ہی نہ تھے۔

دراصل غصے کی حالت میں بندے کے اندر جو انرجی پیدا ہوتی ہے اسے صحیح سمت میں چینل کرنے اور کسی مثبت یا تعمیری کام کے کرنے کے لیے بندے کے اندر نظم وضبط یعنی انرڈسپلن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کسی ایسے ہی گرما گرم لمحے میں ہم نے بھی اپنے غصے کا رخ تخریب کی بجائے تعمیر کی طرف موڑ کر چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔لفظ دوست سے آپ حیران نہ ہوں۔انسانوں کی یہ جنس برطانیہ میں بھی پائی جاتی ہے مگر جن دوستوں کا ذکر ہم کرنے جا رہے ہیں وہ صحیح معنوں میں دوست ہی تھے۔ اس قسم کے دوست ہر جگہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ان کی اصل پہچان یہ ہوتی ہے کہ یہ باتیں زیادہ اور کام کم کرتے ہیں۔ بلکہ بالکل ہی نہیں کرتے۔قوم کا درد ان کے دل میں رہ رہ کر اٹھتا ہے۔ایسے میں یہ ہسپتال جانے کی بجائے کوئی تنظیم بنانے کی طرف دوڑتے ہیں۔اپنی کمیونٹی کی زبوں حالی اور ہم وطنوں کی بے حسی پر انہیں بہت غصہ آتا ہے۔

ہمارے ان دوستوں کا موقف یہ تھا کہ برطانیہ میں دوسری کمیونیٹیز کے لوگ تو بہت منظم ہیں مگر ہماری کمیونٹی ہر وقت دھینگا مشتی میں لگی رہتی ہے۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ کمیونٹی کم از کم مصروف تو ہے ناں۔ اچھے نہ سہی کسی برے کام میں ہی سہی۔ فارغ تو نہیں بیٹھے۔ ویسے بھی کمیونٹی کی خدمت کے لیے جس قسم کے اوصاف حمیدہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ جراثیم ہمارے اندر نہیں پائے جاتے۔ ہمارے پرسنل ایجنڈے ہر میدان میں سبقت لے جاتے ہیں۔اور بے چاری کمیونٹی منہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔آپ ہی انصاف کریں کہ اپنے ہم وطنوں کو ایسے صدموں سے دوچار کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ بیچارے تو پہلے ہی وطن چھوڑنے کا صدمہ عزیزوں سے بچھڑنے کا دکھ نئی زمینوں پر پنپنے کا عذاب نسلی تعصب، بے روزگاری اور بے مہر ہواؤں میں پلنے والے اپنے بچوں کے مسائل سے ہی ادھ موئے ہو چکے ہوتے ہیں اور مرے کو مارے شاہ مدار۔

آپ یقین کریں کہ ہماری کوئی دلیل کام نہ آئی اور ہمارے ان دوستوں نے ایک نئی تنظیم کی بنیاد رکھنے کے حق میں ایسے ایسے دلائل دیئے کہ ہم خاموش ہو گئے۔سب سے وزنی دلیل جو ہمارے سر پر پتھر کی مانند آ کر لگی وہ یہ تھی کہ دنیا امید پر قائم ہے۔انسان کو اتنا بھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔کیا ہوا اگر ابھی ہم ان اوصاف سے محروم ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تنظیم کی بنیاد رکھنے کے بعد یہ اوصاف

ہم میں پیدا ہو جائیں۔اس کے ساتھ ہی کمیونٹی کی قسمت بھی سنور جائے اور وہ سر پھٹول چھوڑ کر خدمت خلق کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ واہ رے خوش فہمی۔

ہمارے خیال میں ایک اچھی زندگی گزارنے کے لیے کسی نہ کسی فہمی کا ہونا ضروری ہے۔اگر خوش فہمی نہ ہو تو پھر غلط فہمی ہوتی ہے جو خوش فہمی سے زیادہ مضر ہو سکتی ہے۔کسی بھی قسم کی فہمی کے لیے کسی مثبت یا منفی سوچ یا نظریے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔وگرنہ سوچ بچار کے بغیر فہمی قسم کی کوئی بھی چیز کج فہمی بن جاتی ہے۔اور زندگی زیادہ دیر تک کج فہمیوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔

بوجھ سے یاد آیا کہ ہمارے ایک عزیز کافی عرصے سے مجرد زندگی گزار رہے ہیں۔ان کے خیال میں شادی کرنے اور پھر نبھانے کا بوجھ کون برداشت کرے۔شادی نبھانے سے پہلے ہی صرف شادی کرنے کے لیے اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں کہ بندہ اکیلا ہی بھلا۔ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ پاپڑ بیلنے کی بجائے کچوریاں تلا کریں۔تو شاید معاملہ بن جائے۔کیونکہ ان کی موجودہ حالت کو دیکھ کر تو صرف کوئی اندھی لڑکی ہی ان سے شادی پر رضامند ہوگی۔ہماری یہ ہمدردی ہمیں بہت مہنگی پڑی اور وہ ذات شریف تا حال ہم سے ناراض ہیں۔

بات تو تنظیم کی ہو رہی تھی۔یہ ہم شادی کے چکر میں کہاں پڑ گئے۔ویسے شادی کرنے اور تنظیم بنانے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔شادی میں دو فریق پورے ہوش وحواس کے ساتھ ایک شرعی بندھن میں باندھے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر سب ہی خوش ہوتے ہیں۔چاہے یہ دونوں سب سے زیادہ ناخوش ہوں۔

تنظیم کا معاملہ کچھ یوں ہے کہ اس میں تنظیم بنانے والوں کے علاوہ سب ہی ناخوش ہوتے ہیں۔ہماری ایک دوست کا خیال ہے کہ جس دن سب ہی لوگ ایک بات پر متفق ہو کر خوش ہو گئے اس دن سورج خوشی کے مارے زمین پر آ گرے گا۔اس لیے قبل از وقت قیامت بلانے سے بہتر ہے کہ کچھ لوگ ناخوش ہی رہیں۔

خیر تنظیم کی بسم اللہ کے لیے ایک زبردست گول میز کانفرنس ہوئی اور کوئی اچھا سا نام رکھنے کے لیے تخیل کے گھوڑے سرپٹ دوڑائے گئے۔کچھ خواتین کا خیال تھا کہ بزم ادب یا انجمن خواتین ٹائپ کا نام ٹھیک رہے گا۔

بزم ادب جیسے بھاری بھرکم نام سے ہمیں سخت وحشت ہوتی ہے۔کیونکہ جیسی بے ادبی اور جیسی جیسی ریشہ دوانیاں ہم نے ادب کے نام پر ہوتی دیکھی ہیں، زندگی کے دوسرے شعبے اس رونق سے محروم ہیں۔ویسے بھی اردو کو یتیم زبان کہا جاتا ہے اور جس یتیم سے کسی فائدے کی امید ہو اس کے سب ہی سرپرست بن جاتے ہیں۔ادب کی دوڑ میں سبقت لے جانے کے لیے کچھ لوگ تہذیب و شائستگی کو بالائے طاق رکھ کر اخلاقی حدود و قیود یوں پھلانگتے ہیں کہ ریس میں دوڑنے والا اچھے سے اچھا گھوڑا بھی میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔

بزم ادب جیسے نام سے ہمیں زمانہ طالب علمی کی بو آتی تھی، جب ہم اسکول کی اسمبلی میں ادھ کھلی آنکھوں سے لہک لہک کر ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' گایا کرتے تھے لیکن اس عمر میں گرد و پیش کے حالات دیکھ کر لرزتے ہوئے ہونٹوں پہ دعا کی بجائے

آہ وفغاں ابھرتی ہے۔

انجمن خواتین جیسا نام ہمیں خواتین کی ذات پر الزام تراشی لگتا تھا کیونکہ خواتین تو اپنی ذات میں خود انجمن ہوتی ہیں۔اس قسم کے ناموں سے ان کی توہین کیوں کی جائے۔بھلا خواتین کو انجمن بنانے کی کیا ضرورت ہے۔جہاں چند خواتین سر جوڑ کر بیٹھیں، ایسی ایسی موشگافیاں ایسے ایسے ہنگامے کہ زبانوں سے ٹپکتا ہوا ارس دیکھ کر شہد کی مکھیاں بھی چھتہ چھوڑ جائیں کہ اب لوگوں کو ان کے شہد کی ضرورت نہیں رہی۔

ہماری دوستوں کا خیال تھا کہ شادی چلانے کی نسبت تنظیم چلانا زیادہ مشکل کام ہے۔شادی میں تو صرف شوہر اور اس کے گھر والوں کی گھرکیاں ہوتی ہیں جبکہ تنظیم چلانے کے لیے ہر کس وناکس کی کڑوی کسیلی باتیں سننا پڑتی ہیں۔خدمت خلق کے ذکر پہ لوگ عجیب عجیب نظروں سے گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔جیسے انہیں ہماری صحیح الدماغی پر شک ہو۔ایسے ایسے ریمارکس سننے کو ملتے ہیں کہ ہزار بار خدا کی قدرت کے قائل ہونے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے کیسی کیسی چیزیں بنا کر اس زمین پر چھوڑ دی ہیں۔

ہم نے اپنی دوستوں کو تسلی دی کہ دنیا کا کام تو کہنا ہے' سو وہ کہتی رہے گی۔آپ صرف تنظیم کی فکر کریں۔کافی بحث وتمحیص کے بعد قرعہ فال ''آگہی'' کے نام پڑا۔کچھ خواتین کا خیال تھا کہ آگہی مشکل نام ہے اور عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔وہ اسے آگہی کی بجائے آگئی سمجھیں گی۔ہم نے کہا یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ آگہی اتنی جلدی آگئی۔ویسے جنہیں زیادہ مشکل پیش آئے گی تو انہیں سمجھا دیں گے۔آخر آگہی کا مقصد بھی تو سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہی ہے۔ہماری اس دلیل نے سب کو خاموش کرا دیا اور یوں دوستو! آگہی بقول کچھ لوگوں کے آگئی اور ایسی آئی کہ بس آ ہی گئی۔

چھوٹی ی کی کرشمہ سازیاں

ہماری ایک دوست کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کے ناموں کے آخر میں چھوٹی ی ہوتی ہے، ان سے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ہم نے ان کی اس تھیوری کو ماننے سے یکسر انکار کر دیا۔ کیونکہ کسی تھیوری یا فارمولے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ٹھوس حقائق کی ضرورت ہوتی ہے وگرنہ لوگ تو بہت کچھ کہتے رہتے ہیں۔ اب ہر بات کو سچ تو نہیں مانا جا سکتا۔ ہماری اس ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے ہماری دوست نے اپنی تھیوری کے حق میں ایسے ایسے دلائل دیئے کہ ساری دنیا کے سائنس دان انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔

بقول ان کے لفظ منگنی کو ہی لے لیجئے۔ اس کی قید میں آنے والے کو منگیتر اور آنے والی کو منگیتری کہا جاتا ہے۔ ہم نے احتجاج کیا کہ منگیتری کوئی لفظ نہیں ہے۔ کہنے لگیں ہماری لغت میں ہے۔ اگر کبوتر کی کبوتری ہو سکتی ہے تو منگیتر کی منگیتری کیوں نہیں ہو سکتی۔ ہم نے پھر منہ کھولا کہ منگنی کسی کا نام تو نہیں ہے۔ یہ تو محض ایک لفظ ہے۔ کہنے لگیں آپ صحیح کہتی ہیں مگر ہمارے ہاں یہ ایک بہت بڑے سماجی معاہدے کا نام ہے۔ اگرچہ اس کی جڑیں ہندو تہذیب میں پیوست ہیں لیکن بہت سی دوسری رسوم کی طرح برصغیر میں صدیوں اکٹھے رہنے کی وجہ سے ہم نے اس قبیح رسم کو بہت اہم درجہ دے رکھا ہے۔ گو کہ اسلام میں منگنی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔

ان کی دلیل سن کر ہم کچھ خاموش تو ہو گئے مگر پھر سوال داغ دیا کہ چلیں اس کے آخر میں یہ تو ہے مگر اس کا خطرناک ہونا کہاں سے ثابت ہوتا ہے۔ ہنس کر کہنے لگیں کہ آپ اب لائن پر آئی ہیں۔ دیکھئے جی منگنی شادی سے پہلے ہی ٹینشن کا نام ہے۔ اس کے ہونے پر غیر ضروری اخراجات نمود و نمائش لڑکے اور لڑکی کا ایک دوسرے سے وقت سے پہلے ہی ضرورت سے زیادہ واقفیت حاصل کر لینا اور ساتھ ہی اہل خانہ کا ایک دوسرے کی اچھائیوں سے کم اور کمزوریوں سے زیادہ واقف ہو جانا۔ کبھی کبھی تو اس قدر ٹینشن پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ اٹینشن ہو کر سلوٹ مار کر نکل جاتے ہیں۔

دیکھیں ناں اب اگرچہ چھوٹی ی والی چیز سرے سے ہی نہ ہو اور سیدھے سیدھے شادی کر دی جائے تو سب خوبیاں خامیاں بعد میں کھلیں گی اور جب اوکھلی میں سر دے دیا تو موصلے تو کھانے ہی پڑیں گے۔ ان کی دلیل میں کچھ جان پڑتی دیکھ کر ہم نے پوچھا کہ چلیں یہ تو ایک قباحت ہوئی۔ اب اتنی سی بات کے لیے اس قدر پر رونق سماجی تقریب کو سرے سے ختم تو نہیں کیا جا سکتا۔ آخر خواتین کے لیے زیورات اور کپڑوں کی نمائش کے چند مواقع تو ہونے ہی چاہئیں اور کچھ خواتین تو جیتی ہی زیورات اور کپڑے بنوانے اور رنگانے کے لیے ہیں۔ ذرا سوچئے ان کی زندگی کس قدر پھیکی ہو جائے گی۔ کہنے لگیں ایسی خواتین کو چاہیے کہ فارغ وقت میں سماجی

فلاح و بہبود کے کام کیا کریں۔ مطالعہ کیا کریں تا کہ ان کے تاریک ذہن روشن ہو جائیں۔

ہم نے کہا منگیتروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگیں منگیتر دنیا کی مظلوم ترین مخلوق ہوتے ہیں۔ اور خاص طور پر وہ منگیتر جو برطانیہ کا رخت سفر باندھتے ہیں۔ ہم نے کہا اس میں مظلوم ہونے کی کیا بات ہے۔ گلی محلوں میں گلی ٹلے مارتے، ہوائی جہاز کی سیر کرتے وہ دنیا کے مصروف ترین ایئر پورٹ پر شان سے اترتے ہیں اور کیا چاہیے انہیں۔ کہنے لگیں یہی تو بات ہے۔ منگیتر ایک بار جب جہاز سے نیچے اترتا ہے تو پھر وہ پاتال میں اتر جاتا ہے۔ اس کے ابھرنے کی صورت مشکل سے ہی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی منگیتری اور اس کے گھر والوں کے احسان تلے یوں دب جاتا ہے کہ زندگی بھر سر جھکا کر شکریہ کا ورد کرتا رہے پھر بھی کم ہے۔ اور اگر کوئی باغی قسم کا من چلا منگیتر احسان فراموش بننے کی کوشش کرے تو اسے پھانسی کے جملہ لوازمات کے ساتھ تختہ دار پر کھڑا تو کر دیا جاتا ہے مگر تختہ نہیں کھولا جاتا۔

ہم نے بہت افسردہ ہو کر کہا کہ ایسے منگیتر تو واقعی مظلوم و مجبور لگتے ہیں۔ آخر کون سی مجبوری ان سے یہ کام کرواتی ہے۔ کہنے لگیں غربت۔ ماں باپ کی، بہن بھائیوں کی، بیوی بچوں کی۔ ہم نے تقریباً چیختے ہوئے کہا: منگیتر اور بیوی بچے؟ کہنے لگیں: آپ کیا جانیں۔ چھوٹی ی کی آڑ میں بڑے بڑے ڈرامے ہوتے ہیں۔ یہ مکار قسم کے منگیتر پکا ویزہ ملنے تک تو بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔ اس قدر فرمانبردار کہ چاہے صبح ناشتے کی جگہ دس جوتے مارو مگر اُف نہ کریں گے۔ اور جیسے ہی پکا ٹھپہ لگا تو یہ اپنے پلان کے مطابق ہاتھ ہلاتے ہوئے کسی بہتر اسامی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو فیلڈ ورک پہلے ہی کر رکھا ہوتا ہے اور سیدھے کسی اپنے جیسی بے ضمیر خاتون کی چوکھٹ پر لینڈ کریں گے۔ ہم نے بے چین ہو کر پوچھا اور پہلی بیوی اور بچے۔ بھئی ان کو خرچہ برابر ملتا رہتا ہے۔ وہ تو ویزے کی مہر کی طرح پکے ہوتے ہیں۔

اب چھوٹی ی کی خوبیاں ہم پہ رفتہ رفتہ آشکارا ہوتی جا رہی تھیں۔ ہم نے مردہ سی آواز میں کہا مگر سب منگیتر تو ڈبل اسٹیٹس والے نہیں ہوتے۔ کچھ سنگل بھی تو ہوتے ہوں گے۔ بولیں ہاں ہوتے ہیں، ضرور ہوتے ہیں۔ مگر ان کے ماں باپ اور بہن بھائی ان کی مجبوری ہوتے ہیں۔ ان کی مجبوریوں کی داستان اتنی طویل ہوتی ہے کہ ان کی نئی نویلی مجبوری قطار میں سب سے آخر میں کھڑی کر دی جاتی ہے۔ برطانوی منگیتری کو مجبوری بنتے دیکھ کر انسانی ہمدردی کا زبردست حملہ ہمارے گداز دل پر ہوا کہ ایسی منگیتری تو مفت میں ہی ماری گئی۔ آخر بندہ شادی کرتا ہے تو کوئی جذباتی، معاشی اور سماجی تحفظ تو ملنا چاہیے۔ ہوم سویٹ ہوم کا خواب کون سی منگیتری نہیں دیکھتی۔ مگر یہاں تو شادی کے بعد بھی اللہ مارے ماں باپ کے گھر پڑے ہیں۔ یا کسی بیڈ سیٹ میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ کیونکہ نہ تو میاں کو کام ملنا ہے اور نہ ملنے کی امید۔ سارا سرکاری وظیفہ بینک ڈرافٹ کی نذر۔ ایسے میں دلہن ڈپریشن کا شکار ہو کر یا تو روتی دھوتی رہے گی یا پھر ہتھے سے اکھڑ کر الٹی سیدھی حرکتیں شروع کر دے گی۔ اور میاں صاحب زیادہ ہی جل تو جلال تو ٹائپ ہوئے تو بغیر سوچے سمجھے اس کی دھلائی کر دیں گے۔ اس دھلائی کو سکھانے کے لیے کبھی کبھی تو اہل خانہ و اہل محلہ، پولیس، ڈاکٹر، سوشل سروسز، وکیل، مجسٹریٹ، ری فیوج ہوم سب مل کر دھاوا بول دیتے ہیں جو منگیتر کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔

اس کے برعکس کچھ منگیتر ولایت آنے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ وہ شوکن میلے دی بن کر شوقینی میں مارے جاتے ہیں۔ یہاں جب نہ دودھ اور شہر کی نہریں، نہ شیشے کی سڑکیں اور نہ ہی درختوں پر پاؤنڈ نظر آتے ہیں تو اپنے خوابوں کے ٹوٹ جانے کی شرمندگی سے بچنے کے لیے وہ ولایت میں ہی بھلی بری جیسی بھی گزر رے گزار لیتے ہیں مگر ولایت کا خوفناک نقشہ اپنی وصیت میں ضرور رقم کر دیتے ہیں۔ کہ پھر کوئی دام فریب میں نہ آئے۔

کچھ دیر رک کر کہنے لگیں کہ منگیتروں کی ایک خاص قسم بھی ہوتی ہے۔ انہیں ہوائی منگیتر کہا جاتا ہے۔ ہم نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تو ہنس پڑیں۔ ہاں بھئی یہ منگیتر جب آتے ہیں تو ہوا میں تلواریں مارتے ہوئے آتے ہیں۔ دراصل یہ وہ نوجوان ہوتے ہیں جو اپنے ملک میں قدرے بہتر حالات دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ولایت انہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ یہاں کے لوگ انہیں جاہل، ان پڑھ لگتے ہیں۔ ان کی ہوابازی کے کرتب دیکھ کر برسوں سے ان کی منتظر منگیتری پھٹی پھٹی آنکھوں سے صرف انہیں دیکھتی رہ جاتی ہے۔ اس ساری کارروائی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ منگیتری یہ نہ سمجھ لے کہ ولایت بلوا کر اس پر کوئی احسان کیا ہے۔ الٹا یہ چاہتے ہیں کہ منگیتری ان کی احسان مند ہو کہ لڑکے نے ہاں کر دی۔ ایسے منگیتروں کی خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں بڑے پیچیدہ حالات کو جنم دیتی ہیں۔ ایسے منگیتر جلد ہی سب رشتوں ناطوں کو سلام کر کے ٹکٹ کٹا کر یا تو واپس اپنے ملک یا کسی اور ملک کو سدھار جاتے ہیں۔

ہماری دوست کے خیال میں ولایت کو اس قدر حقیر جاننے والے منگیتروں کو یو این او میں پاکستان کی نمائندگی کرنی چاہیے۔ جو احساس برتری ان میں نظر آتا ہے، اس کی ایسی جگہوں پر زیادہ اور گھر کی چار دیواری میں کم ضرورت ہوتی ہے۔

ہم نے عاجز آ کر کہا کہ بس یا کوئی اور دلیل ابھی باقی ہے۔ قہقہہ مار کر بولیں ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ منگنی، شادی، غریبی، مجبوری، مکاری اور مغروری کی چھوٹی ی کا تعلق پانی شانی اور روٹی شوٹی کی ی سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ ہم نے پوچھا کہ پانی اور روٹی تک تو بات درست ہے مگر یہ شانی اور شوٹی کیا ان کے سوتیلے بہن بھائی ہیں۔ نہیں بھئی مہمل الفاظ ہیں۔ کچھ خاص مطلب تو نہیں ان کا بس ذرا زیب داستاں کے لیے لگا لیے جاتے ہیں۔ لیکن جب پانی اور روٹی کے ساتھ لگ جائیں تو بندے کی مجبوری بن جاتے ہیں۔ بھئی ان سب کے آخر میں چھوٹی ی جو آتی ہے۔ ہمیں ایک دم یاد آ گیا کہ بات ابھی تک چھوٹی ی پر اٹکی ہوئی ہے۔ اب تو ہماری دوست اپنی علمیت کا سیدھا سادا رعب جھاڑنے لگی تھیں۔ کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند کر کہنے لگیں بھی جن رشتوں کے آخر میں ی آتی ہے، وہ بھی سنبھل کر برتنے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً بیوی، بھائی، پھوپھی، چچی، تائی، ممانی، نانی، دادی اور بیٹی۔ ہم نے کہا: یہ بیٹی ان سب رشتوں کے بیچ کہاں آ پھنسی۔ تو ایک سرد آہ بھر کر کہنے لگیں کہ سب سے بڑا سکھ اور سب سے بڑا دکھ بیٹی ہی تو ہوتی ہے۔ پیدا ہوئی تو ماں باپ کم اور رشتے دار زیادہ پریشان۔ جوان ہوئی تو سب ہی پریشان۔ پیا گھر جا کر سکھی رہی تو اطمینان اور اگر دُکھی ہو گئی تو سب ہی ہلکان۔

ہاں البتہ ماں، بہن، ساس اور نند کے رشتوں میں یہ چکر نہیں ہے۔ شاید اس لیے یہ رشتے سب سے زیادہ چکر دیتے ہیں۔ کیونکہ

ماں تو ساس بن سکتی ہے مگر ساس ماں نہیں بن سکتی۔ اسی طرح بہن نند تو ہو سکتی ہے مگر نند بہن نہیں ہو سکتی۔ اس لیے مرد زندگی بھر بیوی اور بیٹی کے چکر میں کم اور ان رشتوں کے چکر میں زیادہ رہتا ہے۔

ہم نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے پوچھا کہ ماسی میں بھی توی والا چکر ہے تو پریشان ہو کر بولیں بہتر ہے کہ ماسی کو خالہ کہا جائے۔ کیونکہ ماں کی آدھی خوشبو اس نام میں آجاتی ہے لیکن اگر خالہ ماسی بن جائے تو پھر وہ ماسی ہی بن جاتی ہے اور گھر میں برتن کپڑے کرنے والی ماسی کی طرح عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ اور یہ حرکتیں اس وقت عروج پر پہنچ جاتی ہیں جب ماسی ساس بن جاتی ہے۔

ہم نے کہا پڑوسی کی ی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ بھئی پڑوسی کی ی تنگ وتاریک محلوں اور گلیوں میں زیادہ پریشان کن ہوتی ہے۔ جبکہ ماڈرن بستیوں میں جہاں بڑے بڑے بنگلوں میں شام وسحر ہو کا عالم رہتا ہے، وہاں یہ اپنی شرانگیزیوں سے محروم رہ جاتی ہے۔

ہماری دوست کی گوہر افشانیوں سے ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ ہم نے انہیں اپنی دانست میں گویا پھنسانے کے لیے ایک سوال کر ڈالا کہ ادبی محاذ پر تو یہ بہت اچھل کود کرتی ہوں گی۔ ان کے چہرے پر پہلی بار سایہ سا لہرا گیا اور سرد آہ بھر کر بولیں ادبی میدان میں اس کی تباہ کاریوں سے کون واقف نہیں ہے۔ اس کی گروہ بندی، تنگ نظری اور تعصب کے ڈانڈے کہاں کہاں جا کر ملتے ہیں، اگر ہم نے لب کشائی کی تو بے ادبی کے زمرے میں شمار ہوگی۔ اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ اس موضوع پر بات نہ کی جائے۔

بس اتنا جان لیں کہ اجارہ داری ایک لفظ ہے جو کہ معاشیات اور معیشت میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے، اگر ماہرین معاشیات کو ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ یہ اصطلاح مافیا والے ہائی جیک کر لیں گے تو وہ ضرور متبادل لفظ تلاش کرتے۔ آپ مشاعروں کو ہی دیکھ لیں۔ کیا کیا دھما چوکڑی ہوتی ہے۔ ہم نے کہا کہ مشاعرے کے آخر میں تو وہ آتی ہے پھر بھی.... سر سہلا کر کہنے لگیں بھی حروف تہجی کے آخر میں آنے والے تینوں حروف ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کی خصوصیات میں کچھ خاص فرق نہیں ہوتا۔

ہم نے کہا لگے ہاتھوں اب سیاست میں بھی چھوٹی سی کی کوئی مثال دے دیں۔ کہنے لگیں ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ مثلاً اندرا گاندھی، واجپائی ایڈوانی کلنٹن کی ہلیری اور لیونسکی۔ ان کے ساتھ بی بی سی کو بھی شامل کر لیں۔ ہم نے کہا یہ بی بی سی کہاں سے آ گئی سیاست میں۔ کہنے لگیں بی بی سی سے بڑا سیاست دان کون ہے؟ ہم ان کی دور اندیشی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔

ہم نے آخری سوال داغتے ہوئے کہا کہ آپ کی ساری مثالیں بیرون ملک سے تھیں۔ اپنے ملک میں چھوٹی سی کی قلت ہے کیا؟ نہیں قلت تو نہیں۔ اب ایک ایٹمی ی دریافت ہوئی ہے۔ جس نے سب حساب برابر کر دیئے ہیں۔ اب کسی کو ہمارے خطرناک ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کہہ کر انہوں نے محفل برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ہم نے انہیں روکا بھی نہیں کہ کہیں یہ محترمہ بھی ایٹمی خطرہ نہ بن چکی ہوں۔

گوریاں

کسی زمانے میں گوریوں کا بڑا رعب ہوا کرتا تھا۔ پچاس کی دہائی میں برطانیہ آنے والے ایشیائیوں نے ان کی چمکتی دمکتی رنگت اور ناز و ادا سے متاثر ہو کر یا تو ان سے شادیاں کر لیں یا پھر ویسے ہی۔۔۔

برطانیہ میں ایک ربع صدی گزارنے کے باوجود آج تک یہ عقدہ نہ کھل سکا کہ گوری کو آخر گوری کیوں کہتے ہیں؟ ہم نے تو لال گلابی رنگوں پر مشتمل گوریاں ہی دیکھی ہیں، ہاں البتہ غصے میں گوری نیلی اور غم میں پیلی ضرور ہوتی دیکھی ہے، لیکن رنگت اصلی ہونے کی وجہ سے گوری دھوپ میں بھی کبھی کالی نہیں ہوتی بلکہ سن ٹین ہو جاتی ہے۔ بادامی بادامی سی رنگت جسے ہمارے ملکوں میں خوبصورتی میں شمار نہیں کیا جاتا۔

دراصل گوری جب لٹھے کی چادر کی طرح سفید بلکہ نئی نکور ہو جاتی ہے تو پھر وہ چلتی پھرتی نظر نہیں آتی بلکہ گورستان میں آرام کرتی ہے۔ لیکن دائمی آرام کرنے سے پہلے یہ ہمارے کتنے بھائی بندوں کو بے آرام اور کتنی نسلوں کو آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا جاتی ہے۔ یہ حساب پھر کبھی سہی۔

ہاں گوری اگر اپنے ہم نسلوں کے ساتھ یہ سلوک کرے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں کیونکہ ان کی زندگی میں پہلے ہی کون سا سکون ہوتا ہے۔ سکون کی تلاش میں بیچارے مادر پدر آزاد پھرتے رہتے ہیں۔

ہمارے ایشیائی بھائی بندوں سے شادی کرنے والی گوریاں کبھی کبھار شلوار قمیض سے بھی شغل فرماتی ہیں اور بعض تو فر فر پنجابی بھی بولتی ہیں۔ اس قسم کی گوری اور ڈنگوری میں ہمیں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا کیونکہ یہ ڈنگوری دن رات ہمارے ہم وطنوں کے سر پر پڑتی ہے جبکہ اپنے وطن کی عورت کو یہ بھائی بند کبھی اصلی اور کبھی باتوں کی ڈنگوریاں مار مار کر ادھ موا کر دیتے ہیں۔

جن گوریوں نے ہمارے ہم وطنوں کے ساتھ ساجھے داری کر رکھی ہوئی ہے وہ ہماری زبان، تہذیب، ثقافت، سیاست اور مذہب غرضیکہ سب اندرون خانہ رازوں سے پوری طرح واقف ہو جاتی ہیں۔ ان کی نظر ہماری اچھائیوں پر کم اور برائیوں پر زیادہ رہتی ہے۔ جب جی میں آئے نہ وقت نہ جگہ کا لحاظ زہر اگلنا شروع کر دیتی ہیں۔ ان کی اس ایفی شینسی کو دیکھ کر کبھی کبھی تو کو برا بھی شرما جاتا ہے۔ اس میں سارا قصور گوری کا نہیں کچھ فرق ہمارے نصیب کا بھی ہے۔ جسے دیکھو ہمارے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے لیکن اس سے ہماری صحت پر کیا فرق پڑتا ہے، ہم تو شاک پروف لوگ ہیں۔ اپنا دفاع کرنے کی بجائے دوسروں کے ساتھ مل کر اپنے وطن اور

ہم وطنوں کی مزید برائیاں کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ اسی قسم کی گوری سے ہماری اٹا مک دار ہوتے ہوتے رہ گئی۔ یہ محترمہ کئی مرتبہ پاکستان جا چکی تھیں۔ گویا ہمارے ماضی، حال اور مستقبل پر امریکہ کی طرح ان کی گہری نظر تھی۔ اٹھتے بیٹھتے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر ہماری برائیاں کیا کرتیں۔ آخر صبر کی بھی حد ہوتی ہے، مگر گوری کی شعلہ بیانی کی تو حد ہی نہ تھی۔ ہم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک دن تو ہم نے گوری کا گھیراؤ کر کے اس کے خوب لتے لیے۔ گوری کو اپنی اعلیٰ نسل پر بڑا مان تھا۔ ہم نے بھی غصے میں کہہ دیا۔ اگر تم اتنی ہی اصیل ہو تو اپنی نسل کے کھونٹے سے کیوں نہ بندھیں، ہمارے گھروں میں جھک مارنے کیوں آ گئیں؟ وہ دن اور آج کا دن اس سرحدی جھڑپ کے بعد تمام سفارتی تعلقات منقطع ہو چکے ہیں۔

شکر ہے کہ اس واقع کی اطلاع گوری نے ریس ریلیشن والوں کو نہیں دی وگرنہ ہم پر نسلی تعلقات خراب کرنے کا الزام آ جاتا اپنے ہم وطنوں سے ہم جیسے بھی بات کریں، مگر چٹی چمڑی والوں کو ترکی بہ ترکی جواب دینا کم از کم ہمیں تو زیب نہیں دیتا۔ آخر وہ کبھی ہمارے حاکم رہ چکے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو گئے وقتوں کا ہی لحاظ کرلیں۔ ہم بھی عجیب ہیں، بڑی مشکل سے ان سے جان چھڑائی، ایک آزاد ملک حاصل کیا اور ان کی جدائی سے بدحال ہو کر پھر خوشی خوشی ان کی رعیت میں آ گئے۔ شاید بہت دیر تک اسیر رہنے والوں کو آزادی اچھی نہیں لگتی۔

آزادی پر یاد آیا کہ ہماری ایک دوست نے کافی عرصے سے ایک آسٹریلین طوطا پال رکھا تھا۔ ایک دن نہ جانے دل میں کیا آئی کہ پنجرے کا دروازہ کھول دیا' دیکھتے ہی دیکھتے طوطا اڑن چھو ہو گیا، بہت پریشان ہوئیں کہ ظالم کتنا بے وفا نکلا۔ مر کر بھی نہیں دیکھا۔ کون سا سکھ تھا جو اسے نہیں دیا۔ ایسی طوطا چشمی۔ اسی ادھیڑ بن میں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی، مگر یہ دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ طوطا گھوم پھر کر واپس پنجرے کے پاس آ کر بیٹھا ہوا تھا۔

اس واقعے سے ہمیں تو ایسا ہی لگا جیسے ہم بھی قفس کے عادی ہو چکے ہیں۔ ولایتی پنجرہ اب ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے رہا ہو کر وطن میں آتے تو ہیں مگر پھر اسی پنجرے میں قید ہونے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔

گوری میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو یہ گڈ ٹائمز کی ساتھی ضرور ہوتی ہے۔ دکھ سے کوسوں دور بھاگتی ہے، اور صرف سکھ میں ساتھ رہنے کی کچی قسم کھاتی ہے۔ ادھر آپ کے حالات بگڑے، صحت خراب ہوئی اور ادھر گوری صاحبہ رفو چکر۔ آخر مغربی اور مشرقی عورت میں کوئی تو فرق ہونا چاہئے، وگرنہ برطانیہ میں ہر گھر میں گوری ہی نظر آئے گی۔ مشرقی بیوی کو چاہے میاں نے ساری زندگی محبت کی ایک نظر سے نہ دیکھا ہو مگر برے وقتوں میں یہ سب کچھ بھول بھال کر غمگساری کرنے کو تیار۔ ہماری عورتیں، شوہر پرستی میں اتنا آگے نکل جاتی ہیں کہ کبھی کبھی تو ان پر بت پرست ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

کچھ لوگ تو گوری کے شکنجے میں زندگی سے ہی آزاد ہو جاتے ہیں یا یوں کہئے کہ گوری انہیں ترس کھا کر چھوڑ دیتی ہے، مگر کچھ لوگ اس کے سحر سے زندگی بھر آزاد نہیں ہو پاتے۔ گوری کی نرم و نازک بانہوں میں دم توڑنے کے بعد ہی عزیزوں کو اطلاع ملتی ہے اور

اکثر صورتوں میں تو یہ جانکاہ خبر اس وقت ملتی ہے جب منکر نکیر ان کی قسمت کا فیصلہ کر چکے ہوتے ہیں۔

گوری کی ٹھنڈی ٹھار چھاؤں میں مرحوم جن عزیزوں کے نام تک بھول چکے تھے وہی روتے روتے نہیں تھکتے کہ جنازے کو کندھا نہ دے سکے۔ پتہ نہیں گوری نے آخری وقت میں کیا درگت بنائی ہوگی؟ ان سے کوئی پوچھے کہ اب گوری نے کیا درگت بنائی تھی۔ جو ہونا تھا وہ تو زندگی میں ہی ہو چکا۔ مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے قرآن پاک پڑھائے جاتے ہیں۔ گویا انہیں ایک بار پھر مسلمان کیا جا رہا ہو۔ لواحقین کو اپنے گناہوں کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی مرنے والے کی عاقبت کی۔

کئی مرتبہ تو صورت حال دلچسپ نہیں بلکہ عبرتناک ہو جاتی ہے۔ گوری کا اصرار ہوتا ہے کہ میت جلائی جائے گی اور اگر کفن دفن پر رضامند ہو جائے تو پھر مطالبہ ہوتا ہے کہ مرحوم کو سوٹ بوٹ میں بڑھیا پرفیوم لگا کر آگے بھیجا جائے۔ جہاں تو گوری ذرا کمزور قسم کی ہوتی ہے وہاں تو میت صحیح سالم گوری کے پنجے سے برآمد کر لی جاتی ہے، البتہ دینگ قسم کی گوریاں سوٹ بوٹ میں ہی مرحوم کو اگلی دنیا میں پارسل کر دیتی ہیں۔

برطانیہ میں پرورش پانے والے جوان بیٹوں کی مائیں بھی بڑی وہمی ہوتی ہیں۔ گوریوں سے بہت خوفزدہ رہتی ہیں۔ انہیں الٹے پاؤں والی چڑیلیں کہتی ہیں کہ جہاں گوری نے صدا لگائی، صاحبزادے نے مڑ کر دیکھا اور سمجھو پتھر کے ہو گئے۔ کچھ ماں باپ تو عمر بھر اس پتھر سے سر پھوڑتے اگلی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔

اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کہ کچھ دیسی بیویوں کے آنگن کی خوشبو گوری کے گلشن حیات کو معطر کرتی رہتی ہے جبکہ ان کے حصے میں دھول مٹی ہی آتی ہے۔ رشک آتا ہے گوریوں کے نصیب پر کہ کیسے شوہر کو کمان میں تیر کی طرح کس کر رکھتی ہیں۔ کیا مجال ذرا جھول آ جائے۔ ہمارے ہم وطن گوریوں کے ہاتھوں تو کمان میں کس جائیں گے مگر اپنی مشرقی بیویوں کو خود کمان میں کس کر رکھیں گے۔

اس قدر خوش نصیبی کے باوجود گوریوں کو بھی زندگی میں کچھ صدمے اٹھانے پڑ جاتے ہیں۔ گوریوں کے لیے آج کل سب سے بڑا صدمہ یہ ہے کہ دیسی میموں کی وجہ سے ان کی مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہو رہی ہے۔ یہ دیسی میمیں گوریوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ اسی پریشانی میں گوریاں عجیب و غریب حرکات کرتی مثلاً کبھی ساڑھی تو کبھی شلوار قمیض زیب تن کرتی ہیں۔ ہاتھوں پر بندیا تو ماتھے پر مہندی لگاتی ہیں۔ جسم پر پیاز کا پرفیوم اور گھر میں لہسن کا ایر فریشنر مارتی ہیں، پھر بھی کسی دیسی کی نظر نہ پڑے تو باقاعدگی سے بالٹی ریسٹورنٹ جاتی ہیں کہ شاید کوئی دل پھینک قسم کا کھاتا پیا دیسی انہیں گود لے لے۔

ریسٹورنٹ سے یاد آیا کہ ہمارے دیسی بھائی گوری کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں، کیونکہ گوری نے نہ تو کھانے میں نقص نکالنا ہوتا ہے، چاہے اسے مرچوں کا قورمہ مرچوں کے کباب دے دو وہ بہت سعادت مندی سے کھا جائے گی اور نہ ہی اس نے ٹپ دینے میں کنجوسی کرنی ہوتی ہے۔ مرچوں سے گوری کا دماغ اس طرح چکرا جاتا ہے کہ اسے کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا کر رہی ہے۔

اس کے برعکس ہمارے جیسے گاہکوں کو تو دیکھ کر ریسٹورنٹ والوں کی تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں، چہرے لٹک جاتے ہیں، مرے

مرے قدموں سے آرڈر لینے کے لیے آتے ہیں۔ جیسے دل میں کہہ رہے ہوں، یہ مصیبت کہاں سے نازل ہوگئی۔ کابل عورت گھر میں کھانا نہیں پکا سکتی۔ یہاں کیا خاک ملے گا کھانے کو۔ یہ تو خاص گوریوں کے لیے اہتمام کیا گیا ہے۔ ریسٹورنٹ والوں کی پریشانی دیکھ کر ہم نے باہر کھانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کیوں کسی کا موڈ اور اپنا معدہ خراب کریں۔ گوری کی حکمرانی ہے وہ خوش تو راوی چین ہی چین لکھے گا۔

گوری میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ وہ صرف شادی کرنے کے لیے اسلامی نام رکھتی ہے۔ دل سے اسلام قبول نہیں کرتی۔ ویسے گوری سے شادی کرنے والے ہمارے بھائی بند خود بھی اسلام پر عمل پیرا نہیں ہوتے مگر انہیں اتنا ضرور علم ہوتا ہے کہ اہل کتاب سے شادی کرنا مذہب اسلام میں جائز ہے۔ اب اس بات کی گواہی کون دے گا کہ گوری واقعی اہل کتاب ہے یا نہیں۔ بائبل پڑھنا اور اس پر عمل کرنا تو بڑی بات ہے چاہے اس نے بائبل کی شکل تک نہ دیکھی ہو۔

ویسے خاندانی گوری ابھی بھی کالے آدمی کے بارے میں تعصب کا شکار ہے، لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مالدار ایشیائیوں سے دوستی یا شادی کرنے میں کوئی خاص برائی نہیں سمجھتی۔ اس بات سے عام آدمی کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ہاں البتہ اگر ان کی لاٹری نکل آئے تو بات بن سکتی ہے۔ اس لیے ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ ہفتے میں دو بار نہیں تو ایک بار لاٹری ضرور بھریئے۔ شاید قسمت مہربان ہو جائے اور ساتھ ہی گوری بھی قدردان ہو جائے۔

ادبی جمود

سنا ہے کہ ہمارے دانشور جب کبھی بھی رسمی یا غیر رسمی طور پر مل بیٹھتے ہیں تو اردو ادب پر طاری جمود کے بارے میں بہت پریشان بلکہ پروفیسر پری شان بن جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں پروفیسر صاحب بھی زندگی میں اپنے اس منفرد نام سے اتنے پریشان نہ ہوئے ہوں گے بلکہ جس نے نام ہی پری شان رکھ لیا تو پریشانی کو ان سے کیا سروکار؟ ایسے میں پریشانی در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہوئی دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کے آنگن میں خیمے گاڑ دیتی ہے۔

دانشور قسم کے لوگوں کو کسی ایک نقطے پر متفق ہوتے ہوئے کم ہی دیکھا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر یہ انہونی ہو جائے تو وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ادب پر طاری جمود کو توڑنے کے لیے یہ تیشہ فرہاد ثابت ہوگا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اتنا پڑھ لکھ کر بھی بندے کو اگر کلہاڑا ہی بننا ہے تو پھر اس قدر عرق ریزی کا مطلب؟ ویسے جب تک آدمی کسی سے اختلاف نہ کر لے اس کے پڑھے لکھے ہونے کا پتا نہیں چلتا۔ چپ چاپ دوسروں کی ہاں میں ہاں ملا دینے سے یہ کیسے پتا چلے گا کہ ہم عقل و دانش کی کسی سیڑھی پر لڑھک رہے ہیں؟

بات بات میں اختلاف کرنے اور دوسروں کے کام میں کیڑے نکالنے کی عادت بری تو لگتی ہے کیونکہ اختلاف برائے اختلاف یا تنقید برائے تنقید سے کوئی ذاتی فائدہ تو حاصل ہو سکتا ہے، مگر اصلاح کا پہلو نکلنے کا امکان کم ہی ہوتا ہے لیکن یہ کئے بغیر ہمارے تعلیم یافتہ اور اینٹی لیکچوئل ہونے کا پتہ بھی تو نہیں چلتا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ہمارے ہاں تعلیم کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ مغربی اقوام ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ جو بیچارے تنقید کرتے ہوئے بھی اصلاح کا پہلو مدنظر رکھتے ہیں۔

ہم جب بھی ادبی جمود کی بات کرتے ہیں تو ہمیں سوئٹزرلینڈ یاد آ جاتا ہے۔ برف سے ڈھکے ہوئے بلکہ جے ہوئے پہاڑ۔ پھر جب اس گلیشیر کا سوچتے ہیں جو ہمارے ادب پر بے نیازی سے براجمان ہے تو ہم جلدی سے ایسے طریقے سوچنے لگ جاتے ہیں جن سے یہ برف پگھل سکتی ہو لیکن اس فریز شدہ دماغ میں کوئی سوچ بھی تو نہیں آتی۔

ہماری دوست کا کہنا ہے کہ اب شاعر اور ادیب بھی کیا کریں آخر انسانی ذہن ہی تو ہے کہاں تک ساتھ دے گا۔ مسلسل فصل دیتے دیتے تو زمینیں بھی تھک جاتی ہیں۔ برس ہا برس سے چلنے والے دریا رخ بدل لیتے ہیں۔ اب دماغ کو اگر کوئی نئی بات نہ سوجھے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔ بقول ہماری دوست اب ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو کوئی نئی دنیا تلاش کرنا پڑے گی۔ اس دنیا اور اس میں رہنے والوں کا تو وہ ہر زاویہ دریافت کر چکے ہیں۔ اب نئی تشبیہات و استعارات آخر کہاں سے آئیں۔ ممکن ہے جب

دوسرے سیارگان پر آبادکاری ہوتو نئی دنیائیں آشکار ہوکر نیا ادب لکھنے میں کچھ مددگار ثابت ہوں۔جس سے شاید موجودہ ادبی جمود دم توڑ جائے۔

ہمیں ان کے خیالات سے قدرے اختلاف ہے کہ دوسری دنیائیں تو پتہ نہیں کب دریافت ہوں گی۔کب ان پر آبادکاری ہوگی تو کیا اس وقت تک ہمارا ادب سرد خانے میں پڑا رہے گا۔ویسے ایک راز کی بات بتاتے ہیں کہ ادب پر طاری جمود کو توڑنے کی سر توڑ یعنی سر پھوڑ قسم کی کوششیں اُردو کے تیسرے مرکز یعنی برطانیہ میں شروع ہو چکی ہیں۔اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ کوششیں اردو کے پہلے نہیں تو دوسرے مرکز سے ہی شروع ہو جاتیں۔خیر کیا فرق پڑتا ہے کوشش تو کوشش ہی ہوتی ہے۔مشرق سے ہو یا مغرب سے۔

اُردو ادب پر طاری جمود کو توڑنے کے لیے برطانیہ کے ایشیائی ریڈیو اسٹیشن بہت فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔شعر و شاعری کے پروگراموں میں لوگ اساتذہ تک کے کلام کو اپنا کلام کہہ کر سنا جاتے ہیں۔پروگرام کرنے والوں کو تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس کا کلام تھا بلکہ شاید وہ اچھے بھلے شاعر کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتے تو کلام کا کیا خاک پتہ چلے گا۔ایسے میں ہم جیسے کور ذوق پری شان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔اس فاش چوری کی اگر نشاندہی کی جائے تو بڑی معصومیت سے جواب دیتے ہیں کہ اچھا میرا خیال تھا کہ یہ میرا شعر ہے۔اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔

اس پر یاد آیا کہ ایک محترمہ کو لکھنے لکھانے کا بہت شوق ہے اور وہ بضد ہیں کہ اگر کرنی ہے تو شاعری ہی کرنی ہے، کسی اور صنف سخن کو وہ خاطر ہی میں نہیں لاتیں۔ایک دن صبح ہی صبح ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔دوسری طرف سے محترمہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ۔آج تو غضب ہو گیا۔ایک شعر ہو گیا۔ہم نے کہا سبحان اللہ بسم اللہ کیجئے۔اب شعر سنئے ؎

وہ جو خوشبو بن کے بیٹھا تھا میرے سامنے
میں اسے محسوس کر سکتی تھی چھو سکتی نہ تھی

ہم نے تڑپ کر کہا۔یہ تو عدیم ہاشمی کی معروف غزل کا شعر ہے۔ایسے دن دہاڑے چوری کرتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہئے۔روہانسی ہو کر کہنے لگیں واقعی ہم بھی کہیں کہ اتنا اچھا شعر ہم سے نہیں کہا جا سکتا۔ہم نے کہا اچھا کیا آپ نے تو اس کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔جائیے سو جائیے لمبی تان کر۔

شاعری کرنے کے شوقین کچھ لوگ تو مقطع میں سے اصل شاعر کا نام ہٹانا بھی گوارا نہیں کرتے۔جیسے اس شاعر نے ان کا کلام چوری کر لیا ہو۔اس پر بس نہیں ساتھ ہی اپنا نام بھی ٹھونس دیں گے۔اب آپ ہی انصاف کریں کہ دو ناموں والا مقطع مرزا غالب، میر تقی میر، علامہ اقبال یا فیض احمد فیض لکھ پائے ہرگز نہیں۔تو یہ ادب پر طاری جمود کو توڑنے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے؟

ادبی جمود کو توڑنے کی دوسری کوشش کسی لطیفے سے کم نہیں۔ہم نے برطانیہ کے ایک ریڈیو اسٹیشن کی انتظامیہ کو مفت مشورہ دیا کہ اردو ادب کے پروگراموں کو بہتر بنانے کے لیے اچھے اچھے شاعروں اور ادیبوں کو دعوت دیں۔

معیاری کلام اور گفتگو سننے کو ملے گی۔ عوام الناس کا ذوق بلند ہوگا۔ بے وزن اشعار اور غلط سلط تلفظ سن کر تو کان سراپا احتجاج بن گئے ہیں۔ ہماری بات سن کر بہت سنجیدگی سے کہنے لگے کہ ریڈیو پر آنے کے لیے شاعروں اور ادیبوں کو پیسے دینے پڑیں گے۔ ان کا جواب سن کر ہم ان کی ادب نوازی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ واہ کیا بات ہے۔ شاعر، ادیب اور پیسے۔ کتنی متضاد بات ہے۔ یہ لوگ تو الفاظ و خیالات کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ویسے ابھی اردو ادب پر اتنا بھی جمود طاری نہیں ہوا کہ یہ لوگ پیسے دے کر اپنا وقت اور پیٹرول برباد کر کے آپ کے پروگراموں کو رونق بخشیں۔ پیسے تو الٹا آپ کو انہیں دینے چاہئیں۔ ہماری اس تجویز پر ریڈیو انتظامیہ ہمیں یوں گھور گھور کر دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کیا غیر کاروباری ذہنیت پائی ہے۔

ہمارے خیال میں ذرائع ابلاغ کی ترقی نے بھی ادب پر طاری جمود کو توڑنے میں کافی مدد کی ہے۔ اب شاعری امپورٹ کرنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ کہاں ایک غزل مہینوں میں سفر کی صعوبتیں اٹھاتی ہوئی پہنچتی تھی۔ اب تو فیکس ای میل ٹیلی فون نے ساری مشکل ہی آسان کر دی ہے۔ ہماری دوست کا خیال ہے کہ مشکل آسان نہیں ہوئی بلکہ بڑھ گئی ہے۔ اب ایسے ایسے لوگ شاعر کہلانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں جو دوسروں کی لکھی ہوئی غزل بھی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتے۔

ہم نے کہا، آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ انہیں جلدی میں ریہرسل کرنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ شاعروں کی زبوں حالی پر ہمیں وہ سیٹھ صاحب یاد آ رہے ہیں جو کسی محفل میں ایک شاعر سے پوچھنے لگے، حضرت آپ کام کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے خوش ہو کر جواب دیا، شاعر ہیں، شاعری کرتے ہیں۔ سیٹھ صاحب نے پھر پوچھا۔ کوئی کام دھندا تو کرتے ہوں گے۔ تو شاعر صاحب سینہ پھیلا کر بولے نہیں جی شاعری کرتے ہیں۔ گویا سیٹھ صاحب کے نزدیک شاعری کرنا کوئی کام نہ تھا۔

ادب پر طاری جمود کو توڑنے کا ایک تیر بہدف نسخہ ہمارے فریز شدہ ذہن میں بھی آ رہا ہے کہ اساتذہ کے نام ذرا تبدیل کر دیئے جائیں۔ مرزا غالب تو پہلے ہی مرجا گالب بن چکے ہیں۔ میر تقی میر کو نیر تقی نیر کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ محبوب کے غم میں بہت آزردہ خاطر رہتے تھے اور ہر وقت آنسو بہاتے رہتے تھے۔ اسی طرح داغ کو بے داغ کہہ سکتے ہیں، بہادر شاہ ظفر کو مجبور یا محصور شاہ ظفر کہہ سکتے ہیں۔ اب باقی کا کام آپ کریں۔

ہماری دوست کے خیال میں ادب پر جمود اس لیے بھی طاری ہو گیا ہے کہ مشاعروں میں سامعین سے زیادہ مہمان خصوصی ہوتے ہیں۔ اگر اتنی کثیر تعداد میں مہمان خصوصی بنائے جا سکتے ہیں تو پھر حاضرین خصوصی کیوں نہیں ہو سکتے؟ اگر حاضرین نہ ہوں گے تو مشاعرے کون سنے گا؟ نظامت کرنے والوں کو میزبان خصوصی کا عہدہ ملنا چاہئے۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر نہ شاعروں میں کوئی صدر ہو نہ مہمان خصوصی۔ اسٹیج پر ایک تپائی رکھ کر اس پر ایک کتاب (موٹی سی جو حاضرین کو نظر آ سکے، ایک لالٹین اور گلاب کے چند مرجھائے ہوئے پھول رکھ دیئے جائیں کیونکہ شاعروں کا کل اثاثہ کتاب چراغ اور خوشبو ہی ہوتا ہے۔ ایسے میں نظامت بھی پردے کے پیچھے رہ کر ادا کی جائے۔ یعنی مکمل طور پر بات اشاروں، کنایوں میں ہو تو پھر جمود ٹوٹنے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ ہم نے کہا کہ ایسے میں مشاعرہ پڑھنے کون آئے گا؟ تو ہنس کر بولیں۔ کیا فرق پڑ جائے گا؟

ہماری دوست کا ذہن بہت زرخیز ہے۔ پتہ نہیں یہ جمود کی زد میں کیوں نہیں آتا؟ اصل میں یہ نہ تو شاعر ہیں، نہ ادیب بلکہ تنقید کرتی ہیں، لکھتی نہیں۔ کہتی ہیں کہ جمود کو توڑنے کی ایک اور صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اساتذہ کے کلام میں نئے معانی تلاش کئے جائیں مثلاً غالب کا یہ شعر لے لیں ؎

قرض کی پیتے تھے مئے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا نے غربت کے باوجود جو شوق پال رکھے تھے ان کی تکمیل ادھار کے سوا اور کیسے ہوسکتی تھی؟ مرزا بھی بڑے کائیاں تھے۔ جانتے تھے کہ ادھار محبت کی قینچی ہے۔ اگر ادھار نہیں لیں گے تو قرض کی وصول یابی کے لیے کون پریشان کرے گا؟ پریشان نہ ہوں گے تو اچھی شاعری نہ کرسکیں گے۔ کوئی کام دھندا کر کے روزی کمانے کا وسیلہ کر سکتے تھے مگر انہیں معلوم تھا کہ بھرے پیٹ سے تو ذوق جیسی شاعری ہی ہوگی۔ دیوان غالب تو نہ لکھا جاسکے گا۔ اسی طرح شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر لے لیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

دراصل اس شعر میں علامہ اقبال لوگوں کو پہاڑی مقامات پر جا کر چھٹیاں گزارنے کا مشورہ دے رہے ہیں، کیونکہ ان کا تعلق بھی کشمیر سے تھا۔ ہمارے ملک میں تو بادشاہت نہیں ہے اس لیے لوگوں نے اپنے گھروں کے باہر ہی قصر فلاں فلاں لکھ کر لگا رکھا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں چھٹیوں میں زیادہ تر عزیز و اقارب کے ہاں جانے کا رواج ہے اس لیے حکیم الامت منع کر رہے ہیں کہ اپنی چھٹیوں کے لیے دوسروں کی زندگیاں اجیرن نہ کرو۔ اس کے بجائے صحت افزا پہاڑی مقامات پر جا کر قدرت کی صناعی کے نظارے کرو۔ اس صورت میں پاکستان کے لوگ تو شمالی علاقہ جات میں جاسکتے ہیں جبکہ برطانیہ کے لوگوں کے لیے اسکاٹ لینڈ بہترین جگہ ہے۔ لندن جا کر چھٹیاں منانے سے منع کر رہے ہیں کیونکہ وہاں ایک تو ٹریفک کا رش بہت ہے۔ منگائی کمر توڑ دیتی ہے اور قصر شاہی یعنی بکنگھم پیلس بھی وہاں ہے جس سے دور ہی رہنا چاہئے۔

ہماری اس زرخیز ذہن والی دوست کے خیال میں ادبی جمود کو توڑنے کے لیے فی الحال اتنی تجاویز کافی ہیں۔ اگلے عشرے میں اگر ان پر دیانتداری سے عمل ہوگیا تو پھر صورت حال کا جائزہ لے کر مزید مشورے دیئے جاسکتے ہیں۔

ایجنڈا

ایجنڈا ویسے تو انگریزی زبان کا لفظ ہے مگر یہ ہماری زندگیوں پر کچھ اس طرح سے قابض ہو چکا ہے کہ ہم اردو میں بھی اس کا استعمال نہایت وسیع القلبی سے کرتے ہیں۔ ایجنڈے کی برکات سے ہماری بے آب و گیاہ زندگیاں کافی حد تک رنگین ہو چکی ہیں۔ اگر ایجنڈے کو ہم اپنی زندگیوں میں سے منہا کر دیں تو معاملہ کچھ یوں ہو جائے گا جیسے ہوا نکلا ہوا غبارہ یا روح کے بغیر جسم غبارے اور بندے میں سے ہوا نکل جائے تو دونوں ہی زمین کا رزق ہو جاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ جو بزم رونق ہے وہ ایجنڈے کے دم سے ہی ہے۔ ایجنڈے کی اس اہمیت کے پیش نظر ہماری ایک دوست اسے جھنڈا کہتی ہیں۔ جب ہم نے ایجنڈے اور جھنڈے کی نسبت کے بارے میں استفسار کیا تو بہت معصومیت سے کہنے لگیں۔ بھئی آج کل ہر کوئی اپنا اپنا ایجنڈا لیے پھرتا ہے۔ یہی کوشش ہوتی ہے کہ بس ان کا ہی جھنڈا لہرائے۔ ہم نے کہا کہ ایجنڈا کو جھنڈا کہنے پر ہمیں اعتراض ہے کیونکہ جھنڈا کسی ملک وقوم کی شناخت ہوتا ہے، لوگ اس کے احترام میں سر جھکا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ہماری تشویش پر گویا ہوئیں کہ جو لوگ اپنے اپنے ایجنڈے لیے پھرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا وہ ان کا احترام نہیں کرتے۔ سر جھکانے پر کیا موقوف۔ وہ تو سر کے بل کھڑے ہوتے ہیں اس کے احترام میں اور ضرورت پڑے تو لیٹ بھی جاتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ تم نے کسی کو جھنڈے کے احترام میں سر کے بل کھڑے ہوتے یا لیٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر نہیں دیکھا تو خاموش ہو جاؤ۔ پھر بھی اگر تمہیں ایجنڈے کو جھنڈا کہنے پر اعتراض ہے تو اسے ترنگا کہ لو لیکن اس سے سفارتی تعلقات متاثر ہو سکتے ہیں۔

ہماری دوست کا کہنا ہے کہ ایجنڈے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک شخصی اور دوسرا اجتماعی۔ لیکن شخصی ایجنڈا نمبر ون ہوتا ہے۔ ایجنڈے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اسے ہمیشہ سات پردوں میں لپیٹ کر رکھا جاتا ہے کیونکہ اگر اسے ہوا لگ جائے تو پھر یہ ایجنڈا نہیں رہتا بلکہ انڈہ اور وہ بھی گندہ انڈا بن جاتا ہے۔ گندے انڈوں کی مار سے بچنے کے لیے اس کی عوامی رونمائی نہیں ہوتی۔ ہم نے کہا گویا ایجنڈا نہ ہوا نئی نویلی دلہن ہو گئی جسے غیر شادی شدہ حضرات سے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔

چھپانے پر یاد آیا کہ ہم اس فن میں بہت ماہر ہیں۔ حکومتیں عوام سے حقائق چھپاتی ہیں۔ حکومتوں کے مشیر حکومتوں سے پردہ پوشی کرتے ہیں۔ سیاستدان ووٹ لینے کے بعد عوام سے چھپے پھرتے ہیں۔ صرف بیچارے عوام ہیں جو درد دل ظاہر کرتے ہیں مگر ان کی اشک شوئی نہیں ہوتی۔

عوام اور حکومتوں کی اس ہائیڈ اینڈ سیک یعنی لکن میٹی سے ہمیں اپنا بچپن یاد آجاتا ہے جب یہی کھیل کھیلنے پر ہماری سرزنش ہوتی

تھی۔ معلوم نہیں اس قدر بے ضرر کھیل پر اتنی کڑی پابندیاں کیوں تھیں۔ ہمارے سیاست دان کب سے چور سپاہی کھیل رہے ہیں آخر انہیں مرغا کیوں نہیں بنایا جاتا۔ ککڑوں کڑوں کرنے کے لیے کیا معصوم بچے ہی رہ گئے ہیں۔

دراصل ہم اپنی تجسس کی عادت کے ہاتھوں بہت تنگ ہیں۔ ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اگر ماحول میں شک کا زہر سرایت کر چکا ہو، پھر کوئی اس سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ویسے نیک نیتی اور خلوص کا فقدان ہو تو اسی قسم کے وبائی امراض زور پکڑ لیتے ہیں۔ اس پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی عادت نے ہمارے بہت سے خیر خواہوں کو ہم سے بدظن کر رکھا ہے۔ ویسے دوستوں کو ناراض کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے، مگر ناراضگی کبھی کبھی سودمند ثابت ہوتی ہے اور بہت سے غیر ضروری سوالات سے جان بچی رہتی ہے۔

ہماری دوست کا کہنا ہے کہ لڑائی جھگڑا اچھا نہیں ہوتا۔ ہم بھی کہتے ہیں بالکل غلط ہے، مگر ان لوگوں کا کیا کیا جائے جو ہر چوتھے دن لڑائی کی سبیل نکال کر پھر صلح کا جھنڈا لہراتے چلے آتے ہیں۔ اب ایسی صلح سے کیا فائدہ؟ اس سے تو اچھا ہے کہ مستقل لڑائی ہی رہے تاکہ کم از کم جھنڈے کی بے حرمتی تو نہ ہو۔

صلح پر یاد آیا کہ ہمارے مذہب میں روٹھے ہوؤں کے درمیان صلح کرانا بہت ثواب کا کام ہے۔ ہمارے ایک جاننے والے اس مذہبی بونس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پہلے عزیزوں رشتہ داروں کو دانہ ڈالتے ہیں۔ جب وہ چک کر بدہضمی کا شکار ہوتے ہیں اور بول و براز کی نوبت آتی ہے تو پھر صلح کا جھنڈا لہراتے ہوئے میدان میں اترتے ہیں۔ دونوں پارٹیوں کی صلح کرواتے ہیں بلکہ اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے دعوت بھی کرتے ہیں اور صلح کا کریڈٹ سمیٹ کر کسی دوسرے محاذ پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی تجسس اور شکوک وشبہات کی۔ ایک مرتبہ تو ہماری اس عادت نے ہمیں عجیب صورت حال سے دوچار کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک میٹنگ کا بلاوا آ گیا۔ جس کے ساتھ ایجنڈا بھی مسلک تھا۔ کاغذات کو خوب الٹ پلٹ کر دیکھا کہ شاید کسی خانے میں خفیہ ایجنڈے کے بارے میں کوئی معلومات ہوں، کیونکہ اصلی ایجنڈا تو بہت بے ضرر سا لگ رہا تھا۔ ہماری سادگی دیکھئے کہ بھلا خفیہ ایجنڈا بھی کوئی کاغذ اور قلم کے سپرد کرتا ہے۔ یہ تحریر تو دلوں پر نقش ہوا کرتی ہے۔ شاید ایسی ہی تحریروں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''لکھے موسیٰ اور پڑھے خدا''۔

لکھنے لکھانے پر یاد آیا کہ ہمارے ڈاکٹر حضرات کی خوش نویسی مشہور ہے۔ ایسی ایسی تحریریں نسخہ جات پر دیکھنے کو ملتی ہیں کہ جیسے ڈاکٹر نے یہ نسخہ اپنے ہی لیے لکھا ہے۔ یہ تحریر اگر رائٹنگ ایکسپرٹس کو تجزیے کے لیے بھیجی جائے تو وہ بھی معذرت کر لیں۔

خیر ہماری ہینڈ رائٹنگ بھی کسی ڈاکٹر یا کنسلٹنٹ سے کم نہیں ہے۔ اس کی تصدیق ہماری بیٹی کے اسکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر کر چکے ہیں اور جس چیز کی تصدیق انگریز کر دیں، وہ تو کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ ہیڈ ماسٹر کے نام لکھے ہوئے ایک خط کو پڑھ کر اس نے ہماری بیٹی سے بہت رازداری سے پوچھا کیا آپ کی امی ڈاکٹر ہیں؟ بچی حیران پریشان کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ گھر آ کر ہم سے پوچھنے لگی تو ہم صرف مسکرا کر رہ گئے کہ پتہ نہیں کہاں سے پڑھ کر آ جاتے ہیں ہیڈ ماسٹری کرنے۔

بہر حال بات ہو رہی تھی میٹنگ کی۔ حسب عادت ہم شکوک وشبہات میں گھرے مذکورہ میٹنگ میں جا پہنچے۔ صدر میٹنگ کو ایک طرف بلا کر پوچھا کہ ابھی بتا دیں کہ اصل ایجنڈا کیا ہے۔ یعنی کس بات کی حمایت کرنی ہے اور کہاں مخالفت کرنی ہے۔ ہمارا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ جہاں لوگ حمایت کرتے ہیں، ہم اکثر مخالفت کا روڑا اٹکا دیتے ہیں اور جہاں مخالفت ہو رہی ہو، ہم وہاں حمایت کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ آخر انفرادیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جو سب کر رہے ہیں، بلا سوچے سمجھے وہی کرتے چلے جائیں۔ ویسے ہماری اس انفرادیت کی وجہ سے ہمیں میٹنگوں میں کم ہی بلایا جاتا ہے۔

صاحب صدر ہماری دور اندیشی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے، ستائشی نظروں سے ہمیں یوں دیکھنے لگے کہ ہم شرمندہ سے ہو گئے کہ شاید کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ شہد میں گھلے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔ بس جی جس بات کی مخالفت کرنا ہوگی ہم ناک پر انگلی رکھ دیں گے۔ ہم نے پریشان ہو کر پوچھا کہ اپنی ناک پر یا ہماری ناک پر۔ ہماری بات سن کر کہنے لگے۔ بھئی آپ تو مذاق کر رہی ہیں۔ ہم نے کہا ایجنڈے کی قسم جو مذاق کیا ہو، ہم تو واقعی سنجیدہ ہیں۔ صرف صورت حال کی وضاحت درکار ہے۔ یوں سمجھئے کہ ڈرامے سے پہلے ڈریس ریہرسل کر رہے ہیں۔ کہنے لگے بس جہاں ناک اور انگلی کے درمیان فاصلہ رہے وہاں حمایت ہی حمایت ہے۔ ہم نے کہا واہ خوب تو یہ ایجنڈا ابھی جھنڈا ہی ہے۔ کچھ خجل سے ہو کر کہنے لگے۔ بس کچھ ایسا ہی ہے۔

خیر ایجنڈے کا کوڈ یاد کرتے ہوئے ہم بوجھل سے دل سے میٹنگ میں جا بیٹھے کہ دیکھئے اب کیا تماشا ہوتا ہے۔ ذہن کسی منہ زور گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا۔ سب کوڈ گڈمڈ ہو گئے۔ جن باتوں کی حمایت کرنی تھی۔ وہاں ٹھوک بجا کر مخالفت شروع کر دی اور جہاں مخالفت کرنی تھی وہاں حمایت میں ایسے ایسے والا کل دیئے کہ ہمیں خود اپنی شعلہ بیانی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ صاحب صدر پریشان کہ یہ کیا مصیبت مول لے لی۔ وہ دن اور آج کا دن کسی میٹنگ میں ہمیں بلانا تو دور کی بات ہے وہ صاحب ہمیں دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

ہمارے ایک جاننے والے کسی زمانے میں شاعری کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعروں اور مشاعروں کی صورت حال دیکھ کر شاعری سے کنارہ کشی کر لی ہے اور اب موسیقی کی ریاضت کر رہے ہیں۔ ہمارے تجسس نے پھر ہمیں مزید کرید پر مجبور کر دیا۔ پوچھا کہ کوچہ عشاق سے کیوں نکل آئے۔ کیا پذیرائی نہیں ہوئی۔ کہنے لگے، جی یہ بات نہ تھی، شاعری کیا وہ تو نری مصیبت ہو گئی تھی، آخر روٹی کی فکر بھی کرنا ہوتی ہے۔ سارا دن کام کرتے تھکے ہارے گھر آؤ تو شام کو وقت گزاری کے لیے شاعر حضرات آ دھمکتے۔ شاعروں کے رخصت ہوتے ہی بیوی قوالی کرنے لگتیں۔ ہر ویک اینڈ پر کوئی نہ کوئی محفل۔ اتنا وقت کون نکالے۔

ہم نے نہایت افسردگی سے کہا کہ یہ تو شاعری چھوڑنے کا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔ ویسے بھی شاعری کو پکڑنا اور چھوڑنا کیا۔ یہ تو خود بندے کو پکڑتی بلکہ جکڑتی ہے۔ کہنے لگے آپ صحیح کہتی ہیں مگر مشاعروں میں جس طرح کے ایجنڈے چل رہے تھے ان سے طبیعت مکدر ہو گئی۔ ہم نے نہایت بے صبری سے پوچھا تو مشاعروں میں کیا ایجنڈے چلتے ہیں۔ کہنے لگے بھئی سو جھنجٹ ہیں۔ یہی کہ صدر کون ہوگا۔ مہمان خصوصی کسے بنائیں۔ کتنے مہمان خصوصی ہوں۔ نظامت کا فریضہ کون سرانجام دے گا۔ کس کی صدارت میں

مشاعرہ پڑھنا ہے۔ کس کی نظامت میں نہیں پڑھنا۔ پھر تقدیم وتاخیر کے مسائل۔ کس کے شعروں پر داد دینی ہے اور کس کے شعروں پر منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھے رہنا ہے۔ چاہے کتنا ہی اچھا شعر ہو کوئی داد فریاد نہیں ہونی چاہئے۔ طبیعت بہت زور مارے تو بس ہلکی سی آہ واہ کے سوا منہ سے اور کوئی آواز نہ نکلے۔ چاہے کتنا اچھا شاعر ہو، اگر اپنے دھڑے میں سے نہیں ہے تو اسے یوں گھور کر دیکھو کہ جیسے وہ اپنی پہلی غزل پڑھ رہا ہے۔ ہم نے احتجاج کیا کہ یہ تو سراسر ادبی بددیانتی ہے۔ اگر شعر اچھا ہے تو داد تو دینی چاہئے۔ ہنس کر کہنے لگے، جی آپ اس میدان میں نووارد ہیں۔ بس دیکھتی رہیے خود ہی سمجھ جائیں گی۔

ان کے اس دل شکن مشورے کے بعد ہم نے شاعری کو خبردار کر دیا ہے کہ ہمارے دروازے پر دستک نہ ہی دے تو اچھا ہے، کیونکہ اور بھی غم ہیں زمانے میں ایجنڈے کے سوا۔

ٹررن ٹررن

ٹیلی فون کی افادیت سے تو ہمیں انکار نہیں ہے مگر اس کی ٹررن ٹررن نے ہماری زندگیوں میں جو ہلچل پیدا کر رکھی ہے وہ کبھی کبھی تو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ افادیت کا یہ سفر کہیں اذیت کا سفر تو نہیں بن گیا۔ پطرس بخاری نے تو مہمانوں کو بلائے جان کہا ہے مگر ٹیلی فون کا وقت بے وقت بلا وا بھی ہمیں بلائے جان سے کم نظر نہیں آتا۔

پرانے وقتوں میں جب ٹیلی فون سے آشنائی نہیں تھی تو کیسے کیسے خطوط لکھے جاتے تھے، بزرگ کیا کیا پند و نصائح کرتے دوستوں عزیزوں کی تحریریں کیسے سنبھال سنبھال کر رکھی جاتی تھیں جو نہ صرف بار بار پڑھی جاتیں بلکہ بوقت ضرورت ریفرنس کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں۔ گویا لکھنے والے کے لیے اپنی بات سے مکر جانا ممکن ہی نہ تھا۔

آہ! اس ٹیلی فون نے کیا کیا ستم ڈھائے ہیں، کیسی کیسی تحریریں مٹا دیں' کتنے اچھے اچھے ہینڈ رائٹنگ خراب کر دیئے، لکھنے پڑھنے سے تو ہم ویسے ہی الرجک ہیں اور کچھ نہیں تو کم از کم خط پتر تو لکھ پڑھ لیتے تھے اب یہ مشغلہ بھی جاتا رہا۔

اب تو رشتے ناتے، لڑائی جھگڑے، محبتیں، نفرتیں، مزاج پرسی، حتیٰ کہ شاپنگ تک فون پر ہی ہو جاتی ہے۔ کام کرنے والی ماسیاں کیسے جوان لڑکے لڑکیوں والے گھروں کے طواف کرتیں، پیغامات آتے، منہ میں گھی شکر ٹھونسے جاتے ڈھولک پر تھاپ پڑتی اور ہر کس و ناکس کو پتا چل جاتا کہ ماسی اپنا کام دکھا گئی ہے۔ ٹیلی فون نے سب رونقیں اپنی گھنٹی میں باندھ لی ہیں۔

ہمارے خیال میں تو گراہم بیل کی اس ایجاد کا بہترین استعمال لڑائی جھگڑوں میں ہوتا ہے۔ کوئی شکر رنجی ہوئی جھٹ فون اٹھا کر جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ نہ آنکھ کی شرم نہ سامنے والے کا لحاظ۔ آخر فون پر آواز کے سوا ہوتا ہی کیا ہے اب صرف آواز کا لحاظ کون کرے!

کسی سے ناراضگی ہوئی جھٹ فون اٹھا کر کسی اور سے محو گفتگو، ایسے ایسے مسالہ جات لگا کر باتیں ہوتی ہیں کہ وہ مسالے ابھی تک دکانوں پر بھی دستیاب نہیں ہیں۔

ہمارے خیال میں آداب محفل کی طرح ٹیلی فون کے بھی آداب ہوتے ہیں گویا کسی کی خاندانی شرافت کا پتا بھی فون سے لگایا جا سکتا ہے یعنی فون کرنے والے نے کیسے کس طرح اور کتنی دیر بات کی۔ فون بند کرنے سے پہلے اجازت لی یا منہ اٹھا کر بغیر کچھ کہے سنے چپل گھسیٹتے ہوئے چل دیئے۔

پرانی کہاوت ہے کہ مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا آپ کی مرضی سے ہے۔ جب آپ کسی کے ہاں فون کرتے ہیں تو گویا آپ ان کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ آپ سے بات چیت کر کے آپ کو مہمان ٹھہرایا جاتا ہے چاہے ہوا کی لہروں پر

ہی۔فون کے مہمان کو بھی چاہیے کہ شرفاء کے طور طریقے اپنائے کیا ہوا اگر شکل نظر نہیں آ رہی ہوتی تو۔

میکے جانا لڑکیوں کے لیے ہمیشہ سے ہی محبوب مشغلہ رہا ہے، اب وہ فون پر جاتی ہیں۔سسرال کی ساری کتھا فون پر ہی گوش گزار ہو جاتی ہے۔ایسے میں اگر وہ میکے جاتی بھی ہیں تو کرنے کو کوئی بات ہی نہیں ملتی ،تھوڑی دیر بیٹھیں اور یہ کہتی ہوئی اٹھ جاتی ہیں اچھا اماں افون پر بات کروں گی۔

کبھی کبھی تو فون کی گھنٹی بانگ دہل معلوم ہوتی ہے۔ذرا باتھ روم گئے، ذرا کچن میں گھے،فون نے آہ وفغاں شروع کر دی۔ گرتے پڑتے فون تک آئے اب آگے سے کوئی بول ہی نہیں رہا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ایسے ناہنجاروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم فون پران کا چوکھٹا دیکھنے سے تو رہے کہ صرف اسے ہی دیکھ کر خوش ہو جائیں، بات نہیں کرنی تو فون کی زحمت کیوں کی۔دراصل ایسے کالرز کا مقصد ہی آپ کو زحمت دیتا ہوتا ہے۔اس طرح کی کالز کرنے والوں کو علم ہونا چاہیے کہ فون کی چند گھنٹاں دوسروں کو کتنی دیر تک ذہنی اذیت میں مبتلا رکھتی ہیں۔

ٹیلی فون کرنے والوں کی شکایتیں بھی اپنی ہی قسم کی ہوتی ہیں۔بھئی آپ تو کبھی گھر پر ملتی ہی نہیں ہیں یا اتنی گھنیاں بج رہی تھیں آپ نے فون دیر سے کیوں اٹھایا؟ کیا بات ہے مری مری آواز میں کیوں بول رہی ہیں؟ سانس کیوں پھول رہی ہے؟ کیا بھاگ کر آئی ہیں؟ اب انہیں کیا بتایا جائے کہ اس فون کے چکر میں اس دل ناتواں پر کیا گزرتی ہے؟

کچھ لوگ فون گھر پر ہونے کے باوجود پبلک فون سے ہی فون کریں گے۔ہماری ایک عزیزہ اس کفایت شعاری مہم پر بہت دلجمعی سے عمل کرتی ہیں۔ٹررن ٹران...''ذرا شاپنگ کے لیے نکلی تھی سوچا حال پوچھ لوں''۔ابھی ہم کوئی جواب بھی دے نہیں پاتے کہ کھٹ سے فون بند۔دل چاہتا ہے کہ ان سے پوچھیں آپ گھر سے ہمارا حال پتہ کر کے کیوں نہیں نکلتیں، یہ بیچ چوراہے میں ہمیں کیوں رسوا کرتی ہیں۔ابھی سانسیں درست نہیں ہونے پاتیں کہ کال داغ مفارقت دے گئی اور ہم بڑی حسرت سے ریسیور کو تکتے رہ جاتے ہیں کہ اس کال کی بس اتنی ہی زندگی تھی۔

رانگ نمبر تو پریشان کرتے ہی ہیں مگر وہ فون بھی کم پریشان کن نہیں ہوتے جو کیے تو صحیح نمبر پر ہی جاتے ہیں مگر رانگ وقت پر آتے ہیں۔رات کے دو تین بجے آنے والے فون کی ٹررن ٹررن سن کر لگتا ہے کہ خواب میں گھنٹیاں بج رہی ہیں۔شاید اللہ میاں کی طرف سے فون آیا ہو۔

اتنی رات گئے آنے والے کالر کے ساتھ جس قسم کا مکالمہ حالت نیند میں ہوسکتا ہے آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہماری ایک دوست امریکہ میں رہتی ہیں۔(شکر ہے ایک ہی دوست امریکہ میں ہیں، چند اور ہوتیں تو ہم تو گئے تھے کام سے) جب بھی فون کریں گی شب خون ہی ماریں گی۔ایک مرتبہ تو ہم نے جل کر کہہ دیا''یار تم اپنی ڈائری میں لکھ کر رکھ لو کہ انگلینڈ اور امریکہ کا ٹائم ڈفرنس کیا ہے''۔مسکرا کر کہنے لگیں''وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن دن کے وقت میں آفس میں ہوتی ہوں''۔(تو گویا ہم رات میں آفس جاتے ہیں) سبحان اللہ! کیا آگہی ہے،ہم سمجھے محترمہ بے خبری میں وقت بے وقت فون کرتی ہیں مگر یہاں تو ہم ہی بدھو نکلے!

کچھ کالرز تو بالکل فارغ ہو کر کافی کا کپ پاس رکھ کر فون کرتے ہیں۔ کتنی ہی جان چھڑاؤ بات ہی نہیں بنتی۔ اب ہم مروت کے مارے کھل کر کہہ بھی نہیں پاتے کہ ہم کوکنگ کر رہے تھے اور ہماری ہنڈیا ہماری منتظر ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں اکثر ہماری ہنڈیا ہماری جدائی میں جل کر کباب ہو جاتی ہے۔ ہمارے میاں کہتے ہیں کہ تم زیادہ کوکنگ پوٹس اسٹور کر کے رکھو کیونکہ ہر روز تین نہیں تو دو برتن تو تم جلا ہی دیتی ہو۔ ہم نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے نہ صرف ہر سائز اور ہر شکل کی دیگچیاں اسٹاک کر لی ہیں بلکہ ایک ہی دن میں کم از کم تین طرح کے سالنوں کی تیاری کر کے رکھتے ہیں۔ گوشت جل گیا تو سبزی کا نمبر، سبزی دغا دے گئی تو دال اور اگر وہ بھی بے وفا نکلی تو انگلش ڈنر۔

سارا ہفتہ تواتر سے جلنے والی دیگچیوں کو ہم صحن میں ایک قطار میں رکھتے جاتے ہیں ویک اینڈ پر ہمارا سب سے پہلا کام جلی بھنی دیگچیوں کو راضی کرنا ہوتا ہے۔ وقت گزاری کے لیے ہم با آواز بلند گاتے جاتے ہیں ''دیور گڑا انہاں نوں دیور گڑا۔ شکر ہے پڑوس میں انگریز رہتے ہیں ورنہ نئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

فون کا صحیح استعمال ہماری ینگ جنریشن کرتی ہے۔ ہاہا ہی ہی ہوہو، جیسی آواز میں سن کر لگتا ہے کہ جنریشن گیپ کس قدر کم ہو گیا ہے بلکہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ ہی نہیں رہا اپنی دھن میں لگے ہوتے ہیں، لاکھ آنکھیں دکھاؤ وہ آپ کی طرف دیکھیں گے ہی نہیں۔ لمبے لمبے بل جب مہینے کے آخر میں آپ کی طبیعت کو باغ و بہار کریں گے تو یہ صرف سوری ممی کہہ کر چل پڑیں گے۔

ابھی تک تو خیریت ہے، ہمیں تو اس وقت کا سوچ سوچ کر ہول آتا ہے جب فون پر تصویر بھی آیا کرے گی۔ خواتین کی جان تو ویسے ہی مصیبت میں رہتی ہے بننے سنورنے کے ہاتھوں، پھر وہ سر جھاڑ منہ پھاڑ فون تک بھی نہیں آپائیں گی۔ صبح سویرے اٹھ کر میک اپ کا بریک فاسٹ کرنا پڑے گا، معلوم نہیں کب گھنٹی بج اٹھے!

ادھر موبائل فون نے الگ دھما چوکڑی مچا رکھی ہے۔ کہیں چھپ جاؤ لوگ ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔ آخر پرائیویسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس نامعقول ایجاد کی کیا ضرورت تھی۔

ہمارے خیال میں تو گراہم بیل نے فون صرف ایمرجنسی کے لیے ایجاد کیا ہوگا مگر ہم نے اس کی کیا درگت بنا دی ہے اور ویسی ہی درگت اس نے ہماری بنا دی ہے۔ اگر اس کا موجد زندہ ہوتا تو یقیناً ہم پر اپنی ایجاد کے اس قدر عامیانہ سلوک پر ہتک عزت کا دعویٰ دائر کرتا اور انجمن انسداد بے رحمی ٹیلی فون بنا کر اپنی ایجاد کی جی جان سے حفاظت کرتا۔

قدموں تلے

پتا نہیں لوگ جوتی کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں۔ پاؤں میں جوتا نہ ہو تو چار قدم چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جوتی ہماری زندگی میں اتنی اہم ہے کہ اس کے محاوروں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ پھر بھی اسے وہ سٹیٹس نہیں مل سکا جس کی یہ مستحق ہے اور کچھ ہو نہ ہو مگر ایک بات اس کے بارے میں وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جب تک یہ پیر میں رہے تو جوتی رہتی ہے اور سر پر پڑے تو چھٹی کا دودھ یا نانی یاد آ جاتی ہے۔ آخر مصیبت میں نانی ہی کیوں یاد آتی ہے، دادی یا پھوپھی کیوں یاد نہیں آتی۔ دراصل نانی کا ماں سے بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے مصیبت یا افتاد میں سب سے پہلے اللہ اور پھر ماں کا نام منہ سے نکلتا ہے۔

خیر بات تو جوتی کی ہو رہی تھی ہم کہاں سے کہاں نکل گئے۔ جوتی اس لیے بھی کام کی چیز ہے کہ اس میں دال بھی بٹتی ہے۔ آج تک یہ پتا نہیں چلا کہ دال مسور کی ہوتی ہے یا کوئی اور۔ ویسے مسور کی دال کے ساتھ بھی لوگ جوتی جیسا سلوک کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مسور کی دال بھی اپنا مقام اور اہمیت رکھتی ہے جیسے ایک خوش خوراک نواب صاحب نے مسور کی بہت اچھی دال پکانے والے خانساماں کی شہرت سن کر اسے بھی درباری خانساماؤں میں شامل کر لیا مگر بہت عرصہ تک بیچارے خانساماں کو اپنے فن کی داد وصول کرنے کا موقع نہ ملا۔ دبی دبی زبان سے نواب صاحب سے شکایت بھی کی، خیر ایک دن ان کی باری آ ہی گئی۔ بڑے طمطراق سے مسور کی دال پکائی گئی مگر دسترخوان پر پڑی پڑی دال بیچاری ٹھنڈی ہو گئی اور کھانے کی نوبت نہ آئی۔ اس پر وہ شاہی خانساماں بہت بھنائے اور نواب صاحب کو یہ کہہ کر چلتے بنے کہ ''یہ منہ اور مسور کی دال''۔

یہ تو تھی محاورے کی بات، جوتیوں میں دال اکثر جگہوں میں بٹتی رہتی ہے۔ مثلاً گھروں کے اندر یا پھر کمیونٹی میں بہت زور و شور سے اس کی بانٹا بانٹی ہوتی ہے۔ اس کے لیے برطانیہ میں ہماری کمیونٹی پیش پیش ہے۔ گھروں میں بٹنے والی دال اکثر ساس بہو بھائی اور نند یا پھر دیورانیوں، جیٹھانیوں میں بٹتی ہے۔ کبھی کبھار یہ بہن بھائیوں میں بھی بنتی ہے، خاص طور پر جب والدین کی وراثت یا جائیداد کے بٹوارے کا وقت آتا ہے۔ بقول کچھ لوگوں کے والدین کی جائیداد نری مصیبت ہے اولاد کے لیے اس خیال سے کچھ دور اندیش والدین جائیداد بناتے ہی نہیں ہیں تاکہ ان کے مرنے کے بعد ان کے لخت جگر لڑائی کی زحمت سے بچ جائیں۔ لیکن والدین ایک نقطہ بھول جاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس مال و دولت ہو تو ان کی اولاد ان کے گرد زیادہ طواف کرتی رہتی ہے، بڑھاپے میں ان کا خیال اور کچھ نہیں تو اسی لالچ میں زیادہ رکھتی ہے کہ جو ان کی خدمت خاطر زیادہ کرے گا زیادہ مال بھی وہی بٹورے گا۔ اس کے بر عکس غریب والدین اکثر ہی کسمپرسی کی زندگی گزارتے نظر آتے ہیں۔ کئی تو یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ آخر انسان کو اپنے

بڑھاپے کے لیے کچھ تو فکر کرنی چاہیے یہ کیا کہ بیٹوں پر تکیہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ آخر ہماری بھی تو ذمہ داریاں ہیں۔ والدین کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے، اس پر ضرور غور کریں!

بیچاری عورت کو بھی اکثر و بیشتر پاؤں کی جوتی سے تشبیہ دی جاتی ہے مثلاً عورت تو پیر کی جوتی ہے جب چاہو بدل لو یا پھر پیر کی جوتی سر پر نہیں رکھی جاتی۔ اب ہمیں یہ پتا نہیں کہ عورت جوتی کون سی ہوتی ہے؟ پاکستانی جو چند دفعہ پہن کر ہی داغ مفارقت دے جاتی ہے، انگریزی جو موسم کی سختیاں برداشت کرتی ہے یا پھر اٹلی کی بنی ہوئی جوتی جو سب سے زیادہ مہنگی اور دیدہ زیب ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں تو ہماری عورت یقیناً انگریزی جوتی ہوتی ہوگی۔ سخت جان ہر دکھ سکھ میں ساتھ دینے والی قدم سے قدم ملا کر چلنے والی ...اب یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں جوتی پیچھے رہ جاتی ہے اور پاؤں نکل کر آگے چل پڑتا ہے، ایسے پاؤں کو پابند سلاسل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ''اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی'' مگر ہمارے خیال میں اس محاورے کو یوں ہونا چاہیے کہ ''جوتی رے جوتی تیری کون سی کل سیدھی کیونکہ جب بیچاری عورت کو اس سے تشبیہ دی جائے گی تو اسے اس کا کچھ تو بھرم رکھنا ہی ہوگا۔ اسی لیے عورت کی سیدھی کل کا بھی مردوں کو آج تک پتا نہیں چلا۔ ویسے عورت ٹیڑھی کل ہی میں بہتر رہتی ہے کیونکہ جو اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ ٹوٹ جائے گی، بالکل پسلی کی ہڈی کی طرح اس لیے عورت کے ٹیڑھ پن سے ہی عقل مند کام چلا لیتے ہیں اور جو بالکل ناک کی طرح اسے سیدھا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں وہ اسے توڑ بیٹھتے ہیں اور پھر خود بیٹھ کر روتے ہیں جیسے شریر بچے پہلے کھلونے توڑ لیتے ہیں اور پھر منہ بسورنے لگتے ہیں۔

خوش لباس لوگ تو جوتی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی انسان کی ذاتی صفائی کا معیار دیکھنا ہو تو اس کے جوتے دیکھو کہ کتنے صاف ہیں۔ بقول ان کے گندے جوتے میں ایک اچھا دماغ رہ ہی نہیں سکتا۔ اچھا ہوگا بھی تو جوتوں کی خوشبو سے باغ و بہار بنا رہے گا۔ جوتوں پر یاد آیا کہ ایک دن ہمارے میاں جوتوں کو خوب لشکا رہے تھے، ہم نے ٹوکا تو کہنے لگے: ''اوئے بھلئے لوکے تینوں نہیں پتا اسی لگدیاں پھدیاں والے آں، دشمن دی نظر پہلاں جوتی تے فیر منہ تے جاندی اے''۔ (یعنی کہ او بھلی عورت ہم دشمن دوست بھی رکھتے ہیں اور دشمن کی پہلی نظر انسان کے جوتے پر ہی جاتی ہے اور پھر منہ پر پڑتی ہے۔ ہم اس نئی تھیوری کو سن کر بالکل خاموش ہو گئے تب سے ہم جوتے کی اہمیت کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہے تھے، آج نقطہ ہاتھ لگا تو لکھنے بیٹھ گئے۔

جوتوں کی بارش بھی ہوتی ہے جیسے سیاستدانوں پر گندے انڈوں اور ٹماٹروں کی بارش ان کی ناراض رعایا کرتی ہے مگر ایک بات ہے کہ سیاستدانوں میں دال جوتیوں میں نہیں بٹتی بلکہ ان میں پلاٹ بٹتے ہیں مگر برطانیہ میں تو پلاٹوں کا جھنجھٹ نہیں ہے اس لیے یہاں کے کمیونٹی لیڈروں میں اور خاص طور پر مسجدوں میں دال اکثر جوتیوں میں بٹتی رہتی ہے۔ ویسے تو مسجد میں جوتا پہن کر جانا منع ہے آخر خدا کے گھر میں کچھ تو ادب ملحوظ خاطر ہونا چاہیے مگر دال بانٹنے کے لیے جوتا اندر لے جانے کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ اکثر یہ دال کچی ہی بٹتی ہے پھر اس میں مرچیں، ہلدی، نمک ڈال کر پریشر ککر میں ڈالا جاتا ہے۔ غلطی سے یہ مسالہ جات، خاص طور پر مرچیں،

کبھی کبھی لوگوں کی آنکھوں میں بھی پڑ جاتی ہیں جسے دیکھ کر پولیس دندناتی ہوئی جوتوں سمیت اور کبھی کبھی جوتے اتار کر مسجدوں میں گھس آتی ہے اور ''سر منڈاتے ہی اولے پڑے'' والا محاورہ یہاں الٹ ہو جاتا ہے کہ دال پکاتے ہی جوتے پڑے۔

غرضیکہ اس جوتم پیزار' آدم بیزار' گل وگلزار' ہستی ناپائیدار نسل انسانی کا جوتوں کے بغیر گزارا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جب کسی کو طعنہ دینا ہو اس کی ناکامی پر تو لوگ کہتے ہیں" اپنا جوتا اپنے ہی منہ پر پڑا ہے" ۔اب یہ الگ بات ہے کہ جوتا پڑنے سے منہ پر کچھ فرق پڑے نہ پڑے کیونکہ بقول کسی کے کچھ لوگوں کے منہ ہی ٹوٹے چھتر ورگے ہوتے ہیں۔ٹوٹے چھتر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اس لیے لوگ کسی کی سرزنش کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ تم ٹوٹے چھتر کی طرح بڑھتے ہی جا رہے ہو۔ یہ چھتر اس وقت یقیناً زبردست ہوتا ہے جب یہ پاکستانی پولیس کے ہاتھ میں ہو جس پر لکھا ہوتا ہے ''آ جا مورے بالما تیرا انتظار ہے''۔ عجیب بات ہے جوتوں کو بھی لوگوں کا انتظار رہتا ہے۔

کسی کی نازیبا حرکت پر گلے میں پھولوں کے ہار کی بجائے جوتوں کا ہار بھی ڈالا جاتا ہے مگر یہ دولہا ہرگز نہیں ہوتا کیونکہ شادی کرنا نازیبا حرکت کے زمرے میں نہیں آتا۔ دولہا کے سر پر سہرا سجایا جاتا ہے جبکہ مجرم کا منہ کالا کر کے نحیف ونزار سی گدھی/گدھے پر بٹھا کر سارے گاؤں کا چکر لگایا جاتا ہے۔ یہ تماشا شہروں میں نہیں ہوتا کیونکہ وہاں پولیس جلدی پہنچ جاتی ہے اور مجرم کو لوگوں کے نرغے سے نکال کر اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے جہاں اس کی تواضع اور طرح سے ہوتی ہے۔

جوتوں کی اعلیٰ اور خاندانی قسم سلیم شاہی جوتے ہیں جو شاید شہزادہ سلیم کے لیے ایجاد ہوئے تھے کیونکہ انارکلی کے عشق میں اکبر بادشاہ سے جوتوں کے سوا انہیں اور کیا مل سکتا تھا، اسی لیے یہ جوتے نفیس، نازک اور ہلکے پھلکے بنائے گئے کہ اگر شہزادے کو مارنے کی نوبت آئے تو چوٹ زیادہ نہ لگے، آخر ناز ونعم میں پلا ہوا شہزادہ ہے مذاق تو نہیں۔ برطانیہ میں ہمارے ہاں کے اکثر والدین بچوں پر جوتا اٹھاتے تو ہیں مگر ڈرا دھمکا کر نیچے رکھ دیتے ہیں۔انہیں معلوم ہے کہ مارنے کی صورت میں یہ جوتا گلے کا ہار بن جائے گا۔اب گلے میں جوتوں کا ہار پہننے سے تو رہے اس لیے اس نادر شاہی حرکت سے گریز ہی کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ پاؤں کی جوتی کو سر پر نہیں رکھا جاتا بوقت ضرورت یہ حرکت بھی کرنا پڑتی ہے کیونکہ ہم نے دیہاتیوں کو سفر کے دوران یعنی پا پیادہ جوتوں کو بغل میں لیے اور بارہا سر پر رکھے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ بیچارے سادہ لوح لوگ ہیں، یہ نہیں جانتے کہ محاورے کی رو سے یہ غلط اور ناقابل قبول فعل ہے۔

نئی جوتی اور نئی بیوی دونوں تنگ کرتے ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ دونوں کے دم خم نکل جاتے ہیں اور دونوں ہی بے دم ہو کر مالک کے مرہون منت ہو جاتے ہیں۔ جوتوں کی چوری بھی بہت مشہور ہے مگر پرانے جوتوں کی نہیں، یہ خطرہ صرف نئے جوتوں کو لاحق ہوتا ہے۔ جوتوں کی چوریاں اکثر مساجد میں ہوتی ہیں اور جوتے چرانے والے کو گھٹیا قسم کا چور سمجھا جاتا ہے جو لوگوں کی بددعاؤں کے علاوہ خدا کے غضب کو بھی دعوت دیتا ہے۔

جوتوں کو بطور تحفہ دیتے ہوئے کم ہی دیکھا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سے تحفہ وصول کرنے والے کی بے عزتی ہوتی ہے۔ نہ

جانے کیا مطلب پہنا لیے جائیں اس تحفے کو۔لیکن اکثر لوگوں کو اپنے پیرومرشد کے جوتوں کو بھی سینے سے لگائے دیکھا ہے۔ ہمارے ایک بزرگ جب برطانیہ آئے تو اپنے پیرومرشد کے جوتے بھی عقیدت کے طور پر لیتے آئے۔انہیں اپنی زندگی میں مرشد سے دوبارہ ملنے کا موقع تو نہیں ملا مگر ان کے جوتوں کو ایسے ہی پیار سے رکھتے اور دیکھتے تھے جیسے مرشد سامنے بیٹھے ہوں۔ایسی عقیدتیں اب کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ جوتے پہننے والوں کے حساب سے جوتوں کی بھی درجہ بندی یعنی کلاس ہوتی ہے مگر ان میں مفلس ترین جوتے وہ ہوتے ہیں جنہیں ان کے مالک پیچھے چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور وہ پہننے والے کی ناقدری پر اشکبار رہتے ہیں۔ جوتوں کو ایسے دکھ سے دوچار نہیں کرنا چاہیے بہتر یہی ہے کہ جوتے سر پر رکھ کر سرپٹ دوڑ لگا دی جائے تاکہ یہ بے ضرر سی چیز آخری دم تک اپنے مالک کے قدموں سے لپٹی رہے۔

تقریر کی لذت

رچرڈ اشبرن چائلڈ کا کہنا ہے کہ ''دل سے اٹھنے والی وہ آواز جو آپ لوگوں کو سنانا چاہیں تقریر کہلاتی ہے۔ مگر تقریر کرنا بھی ایک فن ہے جو ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر شخص کو زندگی میں تقریر کرنے کا شوق کبھی نہ کبھی ضرور چراتا ہے۔ کچھ لوگ تو اس پل صراط سے بخیر وخوبی گزر جاتے ہیں اور کچھ ایسی کھائی میں گرتے ہیں کہ زندگی بھر تقریر کرنا تو دور کی بات ہے تقریر سننے سے بھی گریزاں ہوتے ہیں۔

کچھ اس قسم کا شوق ہمیں بھی لاحق ہوا تھا ویسے تو شوق لاحق نہیں ہوا کرتا صرف مرض لاحق ہوتا ہے، مزے کی بات یہ ہے کہ یہ مرض اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک بندہ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار نہیں کر لیتا کیونکہ بندے کے خیال میں اگر اس آزمائش سے نہ گزرے تو شاید دنیا ایک بہت بڑے مقرر سے محروم رہ جائے گی۔

اس محرومی کا ازالہ کرنے کے لیے ہم بھی ایک مرتبہ تقریر کے میدان جنگ میں کود گئے۔ شکر ہے وہ طالب علمی کا زمانہ تھا اس زمانے میں ہونے والی حماقتیں اتنی قابل گرفت نہیں ہوتیں۔ صلاحیتوں کے پرکھولنے کے اس دور میں اگر اڑنا سیکھ گئے تو کیا ہی بات ہے اور گر پڑے تو پھر بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر زندگی تعلیمی اداروں تک تو ختم نہیں ہو جاتی، اصل زندگی تو علم و دانش کی درسگاہوں سے باہر کروٹیں لے رہی ہوتی ہے جو اس کٹھالی میں تپ گیا سمجھو سنہرا ہی سنہرا ہو گیا۔

اسی نظریے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے باہوش وحواس کالج کے ایک تقریری مقابلے کے لیے اپنا نام دے دیا۔ گھر والوں کو بتانے کی دیر تھی کہ سب پنجے جھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑ گئے کہ جب کبھی تقریر کی ہی نہ تھی تو اس دیدہ دلیری کی کیا ضرورت تھی۔ اس اچانک حملے سے ہم اس قدر گھبرا گئے کہ ہمیں یوں لگا جیسے جرم کر کے ہم نے خود اپنے خلاف ایف آئی آر کٹوالی ہو۔

ہم میں ایک بری عادت ہے، جہاں کسی نے ہماری مخالفت کی ہمارے ارادوں میں اور پختگی آجاتی ہے۔ ہمارے ہمالیہ پہاڑ سے بلند ارادوں کو دیکھ کر گھر والے زیر لب مسکرا کر رہ گئے۔ ہم نے دل ہی دل میں سوچا کہ ابھی سے رعب پڑ گیا ہے اور جب ہم انعام جیت کر ایک احساس تفاخر کے ساتھ گھر میں وارد ہوں گے تو پھر مزہ آئے گا۔

تقریری مقابلے کے لیے نام دیتے وقت ہم نے بالکل بھی نہیں سوچا کہ تقریر کرنے سے پہلے لکھنا پڑتی ہے۔ ہمارا خیال تھا یہ کار خیر کالج والے ہی انجام دیں گے اور ہمیں صرف اپنی شعلہ بیانی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ تقریر لکھنے کے خیال سے ہی ہمیں گھبراہٹ ہونے لگی۔ پورے خاندان پر نظر دوڑائی مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر ہم سوچنے لگے کہ کیا ہمارا تقریر کرنے کا

فیصلہ صحیح بھی ہے۔ ذہن عجیب کشمکش کا شکار ہو گیا۔ دل نے بھی ہوشیاری پکڑ لی۔ ذہن کتا بند کرو یہ بکواس تم تقریر نہیں کر سکتیں۔ دل کہتا آگے بڑھو اور دشمن کی صفوں کو چیرتی ہوئی نکل جاؤ۔ دل و دماغ کے گرما گرم مکالمے سن کر ہم نے خود سے کہا باز آجاؤ ابھی بھی وقت ہے، ڈُھلے بیراں دا کُجھ نئیں گیا، مقابلے سے نام واپس لینے میں بس تھوڑی سی خفت محسوس ہوگی مگر یہ اس شرمندگی سے بدرجہا بہتر ہے جو تقریر کی ناکامی پر ہمیں اٹھانا ہوگی۔

قصہ مختصر تمام رات دل و ذہن ماسٹر مائنڈ بنے رہے، اس سوال و جواب سے تنگ آ کر ہم نے تقریر نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور لائٹ آف کر کے سونے کی کوشش کی مگر جیسے ہی بستر پکڑا تھوڑے تھوڑے وقفوں سے دماغ میں مختلف پاورز کے بلب روشن ہونے لگے۔ اچانک یوں لگا کہ چار سو چالیس وولٹ کی طاقتور لہر دل و دماغ میں سے گزر گئی ہو۔ ہمارے ضمیر کی ہیبت ناک آواز نے تو ہماری جان ہی نکال لی۔ یہ کیا بے ہودگی ہے، تمہیں تقریر کرنی ہے، ہر قیمت پر۔ زمانہ طالب علمی سے بہتر موقع تمہیں اور کہیں نہیں مل سکتا، بعد میں یہ حالت ہو جائے گی کہ تم تقریر کرنے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپو گی مگر مقررین کی قطار اس قدر طویل ہوگی کہ خوش قسمتی سے اگر موقع مل بھی گیا تو تمہاری باری آنے تک پنڈال خالی ہو چکا ہوگا۔

قطار سے ہمیں یاد آیا کہ ایک مرتبہ برطانیہ میں ہمیں اپنی کمیونٹی کی ایک تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ یہ کسی سماجی کارکن کے اعزاز میں عشائیہ تھا۔ جیسے ہی ہال میں داخل ہوئے تقریر کرنے والوں کی لمبی قطار کرسیوں پر قبضہ کیے بیٹھی تھی۔ یہ سب مقامی مقررین بلکہ معززین تھے اور ان سب کے نرغے میں پھنسے ہوئے مہمان خصوصی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا آ رہا تھا۔ شاید اس غم میں گھلے جا رہے تھے کہ تھوک کے حساب سے بیٹھے ہوئے مقررین کی موجودگی میں ان کی باری کب آئے گی۔ ہال سے ملحقہ کمرے سے طرح طرح کے کھانوں کی خوشبوئیں مشام جاں کو معطر کر رہی تھیں یعنی منتظمین نے کھانا کھلانے سے قبل تقریریں سننے بلکہ سہنے کی شرط عائد کر رکھی تھی۔ اوپن ایئر رشوت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر ہمیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ہم کس قدر کرپٹ ہو گئے ہیں۔

ہم گئے تو تھے مہمان خصوصی کی زیارت کرنے اور ان کی بات چیت سننے مگر دوسرے مقررین نے وہ ہاہا کار مچائی کہ خدا کی پناہ! ایک مولانا قسم کے مقرر نے تو حد ہی کر دی، تقریر کرتے ہوئے چک سواری سے چاندنی چوک، بھائی گیٹ اور براستہ لالو کھیت ہوتے ہوئے مکہ مدینہ پہنچ گئے۔ سب حیران و پریشان کہ یہ گاڑی کانٹے پر کانٹا کیوں بدل رہی ہے۔ مولانا جوش خطابت میں یوں گرج برس رہے تھے جیسے ان سماجی کارکن کو ڈانٹ پلا رہے ہوں کہ ہماری موجودگی میں تم نے یہاں آ کر تقریر کرنے کی جرات کیسے کی۔ اسی اکھاڑ پچھاڑ میں ان کی سانس پھول گئی، شاید دے کا پرانا مرض عود کر آیا تھا۔ رکتی ہوئی سانسوں کے ساتھ انہوں نے منتظمین سے پانی کی بجائے کوکا کولا مانگا اور کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ مولانا کی حالت سے تقریر کے انتظار میں بیٹھے ہوئے حضرات عبرت پکڑیں گے مگر کسی دوسرے کے تجربے سے سبق سیکھنا تو ہم نے شاید سیکھا ہی نہیں۔ زیادہ تر مقررین منتظمین کے دوست احباب تھے یا وہ کمیونٹی لیڈرز جن کی ناراضگی مول لینا

ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لطف کی بات یہ تھی کہ مقررین مہمان خصوصی کے بارے میں بات کرنے کی بجائے منتظمین کے آباء و اجداد کے اوصاف حمیدہ گنوا رہے تھے۔ اس نازک صورت حال کو دیکھ کر ہم نے ایک پرزہ نظامت کرنے والے صاحب کو بھجوا دیا جسے پڑھتے ہی ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا جبکہ پاس بیٹھے ہوئے مہمان خصوصی کے چہرے پر کئی مسکراہٹیں بکھر گئیں۔ انہوں نے اسی گھبراہٹ میں باقی ماندہ مقررین پر لعنت بھیجتے ہوئے مہمان خصوصی کو تقریر کی دعوت دے ہی ڈالی۔

بات تو ہو رہی تھی ہماری تقریر کی اور ہم لگ گئے ادھر ادھر کی ہانکنے۔ آپ سمجھے ہوں گے کہ ہم اپنی تقریر کی روئیداد سنانے سے بچنا چاہتے ہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے نہایت عرق ریزی سے بالآخر تقریر تیار کر ہی لی۔ اتنی محنت کرنے پر ہمیں یقین تھا بلکہ یقین کامل تھا کہ پہلا نہیں تو دوسرا انعام تو ہمیں مل ہی جائے گا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ ہلا ہلا کر، مسکراہٹوں کے نئے نئے زاویے بنا کر ہم نے کچھ اس طرح مشق ستم کی کہ اپنے ہوشربا قسم کے پوز دیکھ دیکھ کر ہمیں خود پر پیار آنے لگا۔ ہم نے سوچا اگر بند کمرے میں یہ حال ہے تو باہر تو تباہیاں ہو جائیں گی اور عین ممکن ہے کہ کچھ دل پھینک قسم کی لڑکیاں ہم پر عاشق بھی ہو جائیں۔ (جی ہاں لڑکیوں کے کالج میں صنف مخالف کا داخلہ ممنوع ہے اس لیے یہ فریضہ بھی صنف نازک کو ہی انجام دینا پڑتا ہے)

ہمیں مشہور مفکر ڈی الیگنی کا قول اچھی طرح یاد تھا کہ ''فن خطابت اولاد آدم کی روحوں کو حیرت زدہ کر دینے والی قوت کا نام ہے''۔ اپنے فن خطابت سے حیرت زدہ کرنے کے لیے ہم نے ایک دن اپنی بہت اچھی دوست کو گھر پر مدعو کر لیا۔ اب جو ہم نے تقریر شروع کی اور غضب کے پوز مارنے شروع کیے تو ہماری دوست پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگیں۔ جیسے ہی ہم نے تقریر ختم کر کے ان سے داد چاہی وہ سخت برہم ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''یہ کیا تماشا ہے، یہ تقریر ہے یا نوٹنکی؟ ہم نے نہایت بھولپن سے پوچھا کیوں کیا ہوا کیا ہم بہت اچھی تقریر کر رہے تھے؟'' جل کر بولیں ''خاک اچھی تھی، تمہیں تو ایکٹنگ کرنے سے ہی فرصت نہیں تھی تو الفاظ پر تم کیا توجہ دیتیں۔ بہتر ہوگا کہ تم کالج کے سالانہ ڈرائے میں حصہ لے لو، شاید حوصلہ افزائی کا انعام مل جائے''۔

ہماری دوست کی حوصلہ شکن رائے نے ہمیں تو لرزا کر رکھ دیا۔ یا اللہ! اب کیا ہوگا صرف ایک رات میں ہم تقریر کرنے کا نیا انداز کہاں سے ڈھونڈیں گے، ریہرسل کب کریں گے اہماری پریشانی دیکھ کر وہ گویا ہوئیں ''تم جانتی ہو کہ الٹی سیدھی تیاری سے حاضرین کے سامنے جا کھڑا ہونا ایسے ہی ہے جیسے بندے نے آدھا لباس پہنا ہو''۔ اب تو ہمارے صبر کا جام بھی ہلکورے لینے لگا، ہم نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ ''اللہ میاں نے کیا تمہیں تنقید کرنے کے لیے ہی بنایا ہے، ذرا حوصلہ افزائی نہیں کر سکتیں یا اس کی بھی کوئی فیس ہے جو آپ کو ادا کرنا پڑے گی۔ اور تو اور یہ آدھے اور پورے لباس کا کیا معاملہ ہے'' ہم نے بھی جل کر کہا ٹھیک ہے ہم برقع پہن کر بلکہ نقاب گرا کر تقریر کر لیں گے تاکہ آدھے پورے لباس کا قصہ ہی ختم ہو جائے''۔ ہماری اس غیر متوقع گولہ باری سے ڈر کر ہماری دوست تو گھر کو سدھاریں مگر ہمیں ایک نئی اذیت سے دوچار کر گئیں۔

دوسری صبح ہم نے اپنے نیم مردہ جسم کو یوں بستر سے گھسیٹ گھسیٹ کر نکالا جیسے مجرم کو تختہ دار پر لے جایا جا رہا ہو۔ گرتے پڑتے تیار ہوئے، اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ کالج پہنچے تو پنڈال میں خوش گپیوں میں مصروف لوگوں کو دیکھ کر ہمارا تو دل ہی بیٹھ گیا۔ سانس

دھونکنی کی طرح چلنے لگا، ٹانگیں لرزہ براندام دماغ ایسے جیسے کنکورڈ، جمبو جیٹ اور بوئنگ سب ایک ہی وقت میں ہمارے سر پر لینڈ کر رہے ہوں۔ گویا ہمارا سر نہ ہوا بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہو گیا۔ اسی شاں شوں میں ہمارا نام پکارا گیا ہم روسٹرم تک پہنچ تو گئے پھر پتا نہیں کیا ہوا ہوش آیا تو اپنے بستر پر تھے اور ہماری دوست ہمارے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم نے بے قرار ہو کر پوچھا ''ہم نے کیسی تقریر کی؟'' مسکرا کر کہنے لگیں: ''آپ نے تقریر نہیں ڈرامہ کیا تھا، ایکٹنگ تو جیسی بھی تھی مگر آپ کی مسکراہٹ لاجواب تھی''۔ ہم نے شرما کر کہا: ''ہم نہ کہتے تھے کہ ہم میں بہت ٹیلنٹ ہے، بس ذرا سی حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی''۔

ولایتی چوزے

آج تک یہی سنتے آئے تھے کہ بچے کسی بھی قوم مذہب یا معاشرے سے تعلق رکھتے ہوں وہ بچے ہی ہوتے ہیں۔ان کے رنگ لال گلابی کالے سفید یا براؤن تو ہو سکتے ہیں مگر عالمی طور پر ان کے مزاج عادات،طرز فکر اور حرکات وسکنات میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔مگر کچھ عرصہ پہلے بچوں کی ایک نئی قسم دریافت ہوئی ہے جنہیں ولایتی بچے یا ولایتی چوزے کہتے ہیں۔بچپن میں ولایتی مرغی کے چوزے دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ انہیں دیکھتے ہی رہیں۔بالکل روئی کے گالوں جیسے نازک،نفیس اور ان کی نگہداشت بھی بہت اعلیٰ طریقے سے کی جاتی تھی۔ان کی ناز برداریوں سے ہمارے معصوم دل سے ایک آہ نکلتی اے کاش ہم بھی ولایتی مرغی کے ولایتی بچے ہوتے مگر یہ حسرت آج تک حسرت ہی ہے اور اس کے پورا ہونے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آتی۔

ولایت میں آکر ولایتی مرغی کے بچے تو آج تک نظر نہیں آئے مگر ولایتی انسانی بچے قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔معاف کیجئے یہ انگریزوں کے بچے نہیں ہیں،یہ ہمارے پاکستانی بھائی بندوں کے یہاں پروان چڑھنے والے بچے ہیں جنہیں عرف عام میں ولایتی بچے کہا جاتا ہے مگر ہم انہیں ولایتی چوزے کہتے ہیں۔یہ بچے اپنی مادری زبان کو کمتر سمجھتے ہوئے صرف انگریزی میں ہی بات کرنا پسند کرتے ہیں۔انگریزی میں گٹ پٹ کرتے ہوئے دیکھ کر ان کے دیسی والدین بہت خوش ہوتے ہیں ان میں سے کچھ والدین تو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور کچھ نے سکول کالج کا منہ بھی نہیں دیکھا ہوتا،اپنی ساری محرومیوں کا ازالہ اپنے بچوں کو اپنی مادری زبان سے محروم کر کے وصول کر رہے ہوتے ہیں۔ایسے بچوں کو عوام الناس سے اکثر دور رکھا جاتا ہے مبادا ان کے انگریزی طور طریقوں کو نظر لگ جائے یا پھر مشرقی ذہن کے لوگ انہیں خواہ مخواہ ہی تنقید کا نشانہ نہ بنائیں۔بالکل بنائیں۔جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے چھپا کر چیل کوؤں سے بچاتی ہے ایسے ہی یہ بچے اور پروٹیکشن کا شکار ہوتے ہیں۔

یہ بچے زیادہ تر لٹی وائٹ علاقوں یعنی انگریزوں کی اکثریت والے علاقوں میں پائے جاتے ہیں تاکہ انگریزی زبان وتہذیب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں انہیں کوئی دقت نہ ہو۔اندرون شہر یہ بچے اپنے والدین کے ساتھ کبھی کبھی سبزی گوشت کی دکانوں پر آتو جاتے ہیں مگر ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہیں کہ پاکی ایریا میں کہاں آگئے۔والدین شادی بیاہ پر اکثر اکیلے ہی آتے ہیں تاکہ انہیں دیسی نظروں سے بچا سکیں مگر ان کی شادیوں کے لیے اکثر و بیشتر دیسی گھرانے ہی ڈھونڈے جاتے ہیں کیونکہ اتنی انگریزیت کے باوجود مڈل کلاس انگریز انہیں کالا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ خود کو کونٹ (ناریل) بنے ہوتے ہیں یعنی باہر سے براؤن اندر سے سفید۔

ایسے بچوں کو والدین پاکستان کم ہی لے کر جاتے ہیں کیونکہ انہیں وہاں کی گرمی،گرد وغبار اور بے ہنگم ٹریفک دیکھ کر ہول آتا

ہے۔ پڑھنے کے لیے انہیں ایسے سکولوں میں بھیجا جاتا ہے جہاں مشکل سے کوئی دیسی بندہ نظر آتا ہے تاکہ رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے۔ یہ ولایتی بچے رشتہ داروں کو اول تو جانتے نہیں کیونکہ والدین اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اگر بدقسمتی یا خوش قسمتی سے کسی رشتہ دار سے واقف ہو جائیں تو نزدیک آنے سے گھبراتے ہیں۔ رشتہ دار اگر کبھی گھر پر وارد ہو جائیں تو یہ سلام کلام کیے بغیر ہی اٹھ جاتے ہیں۔ والدین کبھی کبھار انہیں کہہ دیتے ہیں کہ آنٹی یا انکل کو سلام کرو تو وہ آدھا سلام یعنی آنٹی سلام، انکل سلام کہہ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ والدین ان کی اس ادا پر صدقے واری ہوتے ہوئے کہتے ہیں ''بھئی ولایتی بچے ہیں، اپنے طور طریقوں سے واقف نہیں ہیں''۔

ایک گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے لوگ ان کی دنیا ہوتے ہیں۔ سجا سجایا گھر اچھی گاڑیاں، سینما، تھیٹر، ہوٹلنگ ہالیڈیز۔ بس یہی ان کی زندگی کا منتہائے مقصود ہوتا ہے۔ نہ کسی کے فائدے میں نہ کسی کے نقصان میں، جیسے دنیا میں آتے ہیں ویسے ہی خاموشی سے واپس چلے جاتے ہیں۔ انگریزی فلمیں، انگریزی زبان و میوزک کلب وغیرہ وغیرہ ان کی گفتگو کے خاص موضوع ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی تعریف کرتے ان کی زبان نہیں تھکتی۔ انگریز کی طرف داری میں ایسے ایسے دلائل دیں گے کہ انگریز بھی سنیں تو وہ بھی شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔ اس بات پر ان کا سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ مغربی معاشرے میں تعصب یا ریس ازم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ پاکستان اور پاکستانیوں کی برائی کرتے نہیں جھکتے اور اکثر کہتے ہیں کہ بھئی ہمارے لوگ ہی غلط ہیں کونسی برائی ان میں نہیں ہے۔ اب اگر انگریز انہیں برا سمجھتے ہیں تو اس میں قصور ان کا نہیں، یہ ہمارے لوگوں کا قصور ہے۔

اپنی قوم، ملک، زبان و تہذیب اور کمیونٹی سے کٹے ہوئے یہ ولایتی بچے گوشہ گمنامی میں ہی زندگی گزار کر راہی عدم ہو جاتے ہیں۔ اپنی دیسی سوچ رکھنے والی کمیونٹی سے بچانے کے لیے بعض والدین کو ان کی دوسرے مذاہب، زبان تہذیب اور قومیت کے لوگوں سے شادی کرنے پر کوئی خاص اعتراض نہیں ہوتا ہے۔ ہاں البتہ کچھ والدین بڑھاپے کا خیال کر کے ان کی شادیاں دیسی لڑکیوں سے بھی کروا دیتے ہیں تاکہ گھر میں مفت کی کنیز آ جائے جو شوہر اور بچوں کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت بھی کرتی رہے۔

جیسا کہ انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ ''چائلڈ از دی فادر آف مین یعنی کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے، ایسے ہی یہ بچے اپنے باپ کے باپ ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر اپنے والدین کو اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں اور والدین بادل نخواستہ ان کے مشوروں پر عمل بھی کرتے رہتے ہیں کیونکہ اب اور کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا، بچوں کو کسی اور نظریے پر چلانے کا وقت نکل چکا ہوتا ہے۔ والدین پوری طرح ان کی گرفت میں ہوتے ہیں جہاں وہ پھڑ پھڑا تو سکتے ہیں مگر پنجرہ توڑ کر باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ایسے وقت میں یہ والدین اکثر سرد آہیں بھرتے نظر آتے ہیں کیونکہ یہ ولایتی بچے ان کی رعایا بننے سے صاف صاف انکار کر دیتے ہیں اور ان کے کسی دیسی نظریے کا اطلاق اپنے اوپر کروانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ والدین اگر ایک کہیں تو یہ دس سناتے ہیں، والدین کو زبان بندی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

ایسے ولایتی بچوں کے والدین اگر بیمار پڑ جائیں اور ان کے عزیز رشتہ دار انہیں دیکھنے کے لیے جانا چاہیں تو اکثر یہ پیغام دیا

جاتا ہے کہ اب مریض پہلے سے بہتر ہے، آنے کی ضرورت نہیں ہے۔فون پر ان سے بات کریں یا کارڈ بھیج دیں جسے وہ سینے سے لگا کر سو جائیں گے، عیادت کے لیے جانے والے حیران پریشان کہ ہمیں گھر میں آنے سے کیوں منع کر رہے ہیں۔اب ان عقل کے اندھوں کو کون سمجھائے کہ انگریز لوگ زیادہ تر کارڈ یا پھول ہی بھیجتے ہیں، دوسروں کے گھر جتھے بنا کر نہیں جاتے وگرنہ اڑوس پڑوس کے لوگ یعنی انگریز پریشان ہو جائیں گے کہ اس گھر میں کیا مصیبت آ گئی ہے۔ بے چارے رشتہ داروں کو چین اس وقت آتا ہے جب ان عزیزوں کی موت کی خبر ملتی ہے، اس خبر پر انہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ دل کو پیٹیں یا جگر کو روئیں کیونکہ آخری خبریں آنے تک تو سب اچھا کی گردان ہو رہی تھی، یہ اچانک عزرائیل نے مارشل لاء لگا کر زندگی کا آئین کیوں منسوخ کر دیا۔کم بخت رشتے دار چاہے خوشی ہو یا غمی پیچھا ہی نہیں چھوڑتے بال کی کھال اتارنا تو کوئی ان سے سیکھے۔کتنا بھی ان سے بچنے کی کوشش کرو ملاقات کی سبیل نکال کر ہی دم لیتے ہیں۔ذرا تعلیم یافتہ اور رکھ رکھاؤ والے رشتے دار تو گوارا ہیں مگر یہ جاہل ان پڑھ تو مصیبت ہیں۔عورتیں خواہ مخواہ ہی بے ہنگم آوازیں نکال کر رو رہی ہیں چاہے آنکھ میں ایک آنسو بھی نہ ہو۔مرنے والے سے محبت ہے کہ اُمڈی پڑتی ہے' چاہے زندگی میں سیدھے منہ کبھی اس سے بات نہ کی ہو۔بے چارے ولایتی بچے ان اچانک حملوں سے سخت گھبرا جاتے ہیں اور ان کے نزدیک موت سے زیادہ بڑی ایمرجنسی سے بھگتنا مشکل ہو جاتا ہے۔کچھ تو سوچتے ہیں کہ 999 ڈائل کر کے مدد طلب کی جائے مگر کنفیوژن کا شکار ہوتے ہیں کہ کونسی سروس طلب کریں کیونکہ رشتہ داروں کو بھگانے والی سروس ابھی ایجاد نہیں ہوئی۔گورے تو بہت پہلے سے رشتہ داریوں سے ناتے توڑ چکے اور منہ موڑ چکے ہیں، چونکہ یہ شعبہ ان کا نہیں ہے اس لیے کسی ایسی سروس کا ہونا وقت اور پیسے کا زیاں ہے۔

مختصر یہ کہ ولایتی بچے ہمارے شاعر مشرق علامہ اقبال کے شاہین بچے تو بالکل نہیں ہوتے بلکہ یہ وہ بچے ہیں جن کے لیے اقبال نے کہا تھا کہ ؎

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

محبت کی کارفرمائیاں

چونکہ یہ کائنات جذبۂ محبت کے تحت ہی معرض وجود میں آئی ہے شاید اس لیے ہر کس و ناکس اس کا دعویٰ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس قدر ارزانی دعوؤں کی ہے اتنی ہی ناقدری اس پاکیزہ جذبے کی ہو رہی ہے جبکہ دلوں میں جنم لینے والا یہ خوبصورت اور نازک سا جذبہ تو مالک کی خاص دین ہے جسے جب چاہے اس سے نواز دے اور جسے چاہے محروم رکھے۔

اس بیچاری صنف کے بارے میں بھی انوکھے ہی نظریات ہیں مثلاً یہ پہلی ہی نظر میں ہو جاتی ہے اس کے بعد چاہے ہزار بار دیدے گھما گھما کر دیکھو، چشمہ لگا لو یا خوردبین سے دیکھنے کی کوشش کرو دل کی لہروں میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے ہم اسے ذرا ضدی اور خودسر قسم کی چیز بھی کہہ سکتے ہیں۔

دوسرا خیال اس کے بارے میں یہ ہے کہ یہ جنس مخالف کے درمیان ہی وقوع پذیر ہونا زیادہ پسند کرتی ہے حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ تو دنیا بنانے والے نے آدم و حوا کے درمیان انہیں دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی پیدا کر دی تھی۔ جذبہ محبت کے ساتھ سیکس ڈسکریمی نیشن کرنا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ اس کا مرکز و محور اور بہت سے رشتے اور چیزیں بھی تو ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ماں باپ کی اولاد کے لیے محبت، بہن بھائیوں، عزیزوں رشتہ داروں اور خاص طور پر دوستوں میں محبت کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

رشتوں ناطوں کے علاوہ ان انسانوں سے محبت کرنا جو زندگی میں اعلیٰ جذبوں اور اچھے نظریات و مقاصد سے محبت کرتے ہیں۔ زندگی کی ارفع و اعلیٰ قدروں سے محبت فطرت کی رنگینیوں سے محبت، غرضیکہ یہ جذبہ پوری کائنات میں اس طرح جاری و ساری ہے اور اتنی شدت سے پھیلا ہوا ہے کہ اسے صرف مرد اور عورت کے خانوں میں قید کر دینا زیادتی ہے۔

محبت کے بارے میں کچھ بھی کہئے یہ ہے بڑی الگ قسم کی چیز۔ یا تو یہ ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان کچھ نہیں ہوتا البتہ لاتعلقی، بیزاری اور سرد مہری ضرور ہوتی ہے۔ جب نہیں ہوتی تو برسوں ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی عنقا ہوتی ہے اور ہونے پر آتی ہے تو برسوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر لیتی ہے۔

کبھی کبھی تو محبت کی اس تیز رفتاری پر ہمیں رشک آتا ہے کیونکہ یہ ہماری گاڑی سے زیادہ تیز بھاگتی ہے۔ اس وقت ہمیں اس سے حسد بھی ہونے لگتا ہے جب ہماری گاڑی چلنے سے بالکل انکار کر دیتی ہے۔ لیکن یہ تو کسی مشاق گھوڑے کی طرح اسپیڈ بریکرز کی پروا کیے بغیر سب حدود و قیود پھلانگتی ہوئی آگے ہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں تو اولمپیک ریس میں اتھلیٹس کی بجائے اگر محبت کو دوڑایا جائے تو ہمیشہ ہی گولڈ میڈل جیت کر لائے۔

اپنی تیز رفتاری کے باوجود کبھی کبھی یہ ون وے ٹریک کی طرح بھی ہوسکتی ہے جس میں ایک فریق تو عرش معلیٰ تک پہنچ جاتا ہے جبکہ دوسرے کو خبر بھی نہیں ہوتی ،لیکن اس میں بھی کچھ زیادہ قصور محبت کا نہیں ہوتا بلکہ جذبوں میں تھوڑی گڑبڑ ہوسکتی ہے کیونکہ اگر جذبے خالص ہوں تو کبھی نہ کبھی دل کو دوسری پارٹی کے دل کے تاروں کے ساتھ ملا ہی دیتے ہیں مگر اس کے لیے تاروں کا آپس میں صحیح طرح سے جڑنا بہت ضروری ہے۔ایسا نہ ہو کہ ارتھ کو نیوٹرل کر دیا جائے اس بے احتیاطی کے نتیجے میں زبردست دھماکہ ہوسکتا ہے اور شکل وصورت کچھ یوں بن سکتی ہے جیسے کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا۔لیکن محبت کرنے والے پھر بھی یہ کہنے سے باز نہیں آتے کہ کالا شاہ کالا میرا کالانی دلدار تے گوریاں نوں پراں کرو۔

ایسی حالت میں بھی ہمیں گورے پتا نہیں کیوں یاد آجاتے ہیں، ہماری یہ درگت انہوں نے تو نہیں بنائی ہوتی۔آخر ہم تھرڈ ورلڈ کے لوگ اپنی ساری محرومیوں کا ذمہ دار گوروں کو ہی کیوں ٹھہراتے رہتے ہیں۔یہ چٹی چمڑی والے تو ہمیں بہت مظلوم لگتے ہیں۔ اقتصادی محاذ ہو یا سیاسی اور معاشرتی ،ثقافتی معاملہ ہو یا عسکری، ہم سب خرابیوں اور برائیوں کو ان کے سر تھوپ کر انہیں بخشنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ بیچارے دوہری مصیبت کا شکار۔نہ یہاں بخشش اور نہ وہاں بخشش کی وعید۔جائیں تو جائیں کہاں! یہ کہاں جائیں گے البتہ ہم ان کی دل جوئی کرنے ان کے دیسوں میں ہر جائز و ناجائز طریقے سے درآمد ہوتے رہتے ہیں۔کچھ بھی کہئے گورے ہیں بڑے صابر مجال ہے جو منہ سے ایک لفظ بھی نکال جائیں۔اتنی لعن طعن ہونے پر بھی ہنس ہنس کر تھینک یو تھینک یو کہتے رہتے ہیں مگر خاموشی سے ہماری جڑیں کاٹتے رہتے ہیں۔

ویسے جڑیں کاٹنے میں ہم خود بھی ماہر ہیں پھر بھی شکوہ کرتے رہتے ہیں کہ خون سفید ہوگیا ہے۔خون پتلا یا گاڑھا تو ہوسکتا ہے بھلا سفید کیسے ہوسکتا ہے۔شکر ہے انگریزوں کو اس دیسی محاورے کا علم نہیں وگرنہ وہ اپنی ساری ریسرچ کا رخ خون کا رنگ معلوم کرنے کی طرف موڑ دیتے۔

محبت کی ایک پریشان کن خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کبھی تو نظر آتی ہے اور کبھی سلیمانی ٹوپی پہن لیتی ہے۔محبت کرنے والوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ بھئی یہ عملی طور پر آپ کو نظر نہ بھی آئے تو کچھ خاص فرق نہیں پڑتا دل میں تو ہوتی ہے۔ہمارے خیال میں تو یہ خوبصورت جذبہ صرف الفاظ تک محدود نہیں کیا جاسکتا اس کا عملی مظاہرہ بھی ہونا چاہیے۔

محبت ہمیشہ سے مظلوم رہی ہے۔ظالم سماج اور اس کے درمیان ایسی رسہ کشی ہوتی ہے جیسے امریکہ اور روس کے درمیان اور آخر میں روس کی طرح ناکام عشاق دل کے ہزار ٹکڑے لیے صحرا میں نکل جاتے ہیں۔اگر ظالم سماج مہربان ہو جائے تو روس کو گلے میں پھولوں اور نوٹوں کے ہار پہنا کر دلہن کے گھر لے جانے میں قباحت محسوس نہیں کرتا۔ہمیشہ سے مظلوم اور ناکام رہنے والی یہ چیز ان رنگ برنگے صدموں سے نڈھال ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں شادی سے پہلے محبت کا دم بھرنے والے شادی کے بعد اس کے منکرین میں شمار ہونے لگتے ہیں۔محبت کی اس تذلیل پر بیوی جب ماتھے پر ہزاروں بل ڈال کر کمر پر ہاتھ رکھ کر اور کبھی کبھی ہاتھ میں بیلن پکڑ کر کپڑے دھونے والا ڈنڈا مغربی ممالک میں نہیں اپنے سابقہ عاشق اور حالیہ مجازی خدا سے ڈائیلاگ کرتی ہے تو مزہ ہی

آ جاتا ہے۔ ''شادی سے پہلے تو تم عاشقوں کے قبیلے کے سردار تھے۔ سرد آہیں بھر بھر کر ہماری گلی کو ٹھنڈی سڑک بنایا ہوا تھا۔ اب کہاں گئی تمہاری محبت''۔ بیوی کے ان ڈائریکٹ سوالات پر میاں بچنے کا کوئی راستہ نہ پا کر ڈرتے ڈرتے کہتے ہیں: ''ہاں یہ سچ ہے کہ جوانی میں ایسی حماقت ضرور سرزد ہوئی تھی مگر تب بات اور تھی، ہر لڑکی جولیٹ نظر آتی تھی''۔ ''ناں تو میں اب تمہیں کیدو نظر آتی ہوں، تب کی بات اور تھی کا کیا مطلب مگر میں تو وہی ہوں اور تم کیا بوڑھے ہو گئے ہو؟'' اس تفتیش پر میاں جان بخشی کی درخواست دائر کرتے ہیں کہ اگر ان کا پیچھا چھوڑ دیا جائے تو ان کی سات پشتوں پر احسان ہوگا۔

آپ ذرا ایسی بیوی کی ذہنی اور جذباتی حالت کا تصور کریں جس نے زندگی کی بنیاد ہی محبت کے دھواں دھار ڈائیلاگ سن کر رکھی ہو وہ ایسے میں شیرنی کی طرح دھاڑنے اور ناگن کی طرح بل کھانے کا مظاہرہ بھی نہ کرے تو اور کیا کرے۔ الزام پھر بیچاری عورت پر۔ واہ ری اکیا نصیب لے کر آئی ہے تو...

ہمارے خیال میں تو یہ بہت غیر اخلاقی حرکت ہے۔ شوہروں کو چاہیے کہ بیویوں کو ایسے صدمات سے دوچار نہ کریں۔ اگر یہ چاہتی ہیں کہ آپ زبان سے محبت کا اقرار ایک بار نہیں بلکہ بار بار کریں تو کر لیا کریں، آپ کے کون سے پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ وعدوں اور وعدہ خلافیوں پر پلنے والی مخلوق خوش ہو جائے گی۔ ایک بار ہاں کر کے پھنس گئے تو دوسری بار ہاں کر کے خیریت سے نکل جایئے۔

اس کے برعکس کچھ دل پھینک قسم کے شوہر بیویوں سے زنانے دار عشق کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے اصلی شوہر ہونے پر ہمیشہ شک ہی رہتا ہے کہ عشق اور وہ بھی بیوی سے توبہ کس قدر بدذوق ہیں! یہ کام ان سے یقیناً کوئی مجبوری ہی کروا رہی ہوگی وگرنہ عشق تو نام ہی ناکامی اور نامرادی کا ہے۔ عشق میں وصال نو گوایریا ہے۔ یہ حسرت و یاس کے گھر میں رہتا ہے۔ آنسو اس کی غذا، میٹھا میٹھا درد اس کی تفریح، بے خواب راتیں اس کا مقدر، ریت جیسی چبھن آنکھوں کا کاجل، جنون اس کا دستِ راست، یادیں اس کا سرمایہ اور محبوب کا چہرہ کائنات کا کل منظر۔ سچے عاشقوں کو نہ بچھڑنے کا غم اور نہ ملنے کی خوشی۔ نشاطِ غم میں وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں ہر کسی کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔

دراصل قدرت نے انسان کی فطرت میں جو لچک رکھی ہے وہ اسے ہر قسم کے حالات کا عادی بنا دیتی ہے۔ درد عشق انہیں اتنا عزیز ہو جاتا ہے کہ اگر کبھی محبوب کے ملنے کا ذرا سا بھی امکان پیدا ہو جائے تو یہ گھبرا اٹھتے ہیں۔ اس حالت میں وہ اپنے محبوب کو ٹھکرانے سے بھی گریز نہیں کرتے کیونکہ صرف ایک شخص کے وصال سے وہ کیسی کیسی جاں سوز کیفیات سے محروم ہو جائیں گے اور یہ گھاٹے کا سودا سچے عاشق تو ہرگز نہیں کر سکتے ہاں البتہ شوہر صاحبان کرنا چاہیں تو انہیں کون منع کر سکتا ہے!

بھلا جو چیز بیوی کی شکل میں دن رات شوہر کا طواف کرے دن میں چار کی بجائے پانچ موسم بدلے، فرمائشوں کا لامتناہی سلسلہ ہو تو اس سے کوئی بہت دبنگ قسم کا میاں ہی عشق کر سکتا ہے۔ خیر یہ دلوں کے معاملے ہیں اور دل دریا سمندروں ڈونگے ہوتے ہیں۔ اب یہ تو میاں ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ اصلی عشق ہے یا ریہرسل ہو رہی ہے اور اصل ڈرامہ کسی اور اسٹیج پر ہوتا ہے۔

کاش پوچھو

پچھلے دنوں ایک پرانے واقف کار سے ملاقات ہوئی تو دیکھتے ہی شکوہ کرنے لگے۔ یہ آج کل آپ خواتین کے مسائل پر بہت لکھ رہی ہیں۔ مردوں سے کیا قصور ہو گیا ہے کیا وہ آپ کو نظر نہیں آتے۔ ہم نے کہا ایسی کوئی بات نہیں ہے مرد تو ہمیں ضرور نظر آتے ہیں بلکہ چار چار نظر آتے ہیں کیونکہ چار بیویوں کے شوہر کو ہم چار مردوں کے برابر ہی سمجھتے ہیں۔ وہ صاحب کچھ جز بز سے ہو گئے کہ آپ تو غیر سنجیدہ ہو گئیں۔ مردوں کے بھی بہت سے مسائل ہیں بلکہ شاید عورتوں سے زیادہ گھمبیر ہیں، مگر انہیں کوئی درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔ ان صاحب کی بات سن کر ہم زندگی میں پہلی بار خوشگوار حیرت کا شکار ہوئے کہ یا الٰہی خیر۔۔۔ یہ کیا ماجرا ہو گیا؟ ہم تو سمجھتے تھے بلکہ اب بھی سمجھتے ہیں کہ خواتین کے سارے نہیں تو بہت سارے مسائل کے ذمہ دار مرد حضرات ہی ہیں، مگر یہاں تو یہ معاملہ ہو گیا کہ ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔

آخر رواداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہم نے نہایت خوش اخلاقی سے ان حضرت سے کہا کہ بھئی لکھنے لکھانے کے معاملے میں ہم بالکل تعصب کے قائل نہیں۔ مسئلہ عورت کا ہو یا مرد کا وہ تو آخر مسئلہ ہی ہوتا ہے۔ ہاں آپ اگر واقعی سمجھتے ہیں کہ مردوں کی اس دنیا میں مردوں کے بھی مسائل ہیں تو ہمیں ان پر لکھتے ہوئے روحانی خوشی ہوگی۔ ہماری اس فراخدلانہ پیشکش پر وہ صاحب کچھ کھسیانے سے ہو گئے۔ فرمانے لگے، آپ مذاق تو نہیں کر رہی ہیں۔ ہم نے کہا مذاق کیا کرتے تھے اب نہیں کرتے۔ اب تو ہم بے حد سنجیدہ ہو گئے ہیں۔

ہماری یقین دہانی پر ان کی ذرا ہمت بندھی تو فرمانے لگے کہ سب سے بڑا گلہ تو ہمیں یہ ہے کہ آخر عورتیں اپنے خود ساختہ مسائل کا ذمہ دار مردوں کو کیوں سمجھتی ہیں؟ وہ تو بے حد معصوم ہوتے ہیں۔ نہایت بے ضرر قسم کی چیز پیدائش ہی سے عورت کے رحم و کرم پر وہ بھلا احسان فراموش کیسے ہوں گے کہ عورت کے لیے مسائل پیدا کریں۔ دراصل عورتیں ان کے لیے مسائل پیدا کرتی ہیں۔ اب دیکھئے ناں یہ بھی عورتوں کی مردوں کے خلاف کتنی بڑی سازش تھی کہ اچھے بھلے جنت میں رہتے تھے اسے بہکا دیا اور وہاں سے نکلوا کر ہی دم لیا اور پھر یہ زمین بیچارے مرد کے لیے جہنم بنا دی۔ ایک لمحے کی لغزش سے ساری نسل انسانی صدیوں سے سزا بھگت رہی ہے اور غضب یہ کہ اوپر سے عورتیں الزام تراشی کرتی رہتی ہیں۔

ہم نے کہا: ''ہاں، مسئلہ تو واقعی ٹیڑھا ہے۔ اس کا حل تلاش کرنے میں تو بڑی عرق ریزی کرنا پڑے گی'' تو پلٹ کر بولے ''آپ حل تلاش کرنے کو چھوڑیئے، پہلے بندے کو پوری عرضی تو داخل دفتر کرنے دیں۔'' ہم نے کہا فرمایئے جی ابندی کی کیا مجال کہ

آپ کو راستے میں ٹوکے''۔ میری بات سن کر دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے بڑے دکھی ہو کر کہنے لگے کہ دراصل مرد ہونا ہی بذات خود بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس قدر امیدیں وابستہ کر لی جاتی ہیں بیچارے مرد سے کہ ان پر پورا اترتے اترتے وہ زندہ درگور ہو جاتا ہے۔ اب دیکھئے ناں! ہماری پیدائش کے لیے کتنی دعائیں اور منتیں مرادیں مانگی جاتی ہیں، پیدائش پر لڈو بٹتے ہیں، شادیانے بجتے ہیں، ہماری پرورش کتنے ناز و نعم سے ہوتی ہے۔ بیچاری لڑکیاں ہمیں دیکھ دیکھ کر کڑھتی ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اب ہم پر اتنی محنت یونہی تو نہیں کی جاتی۔ بہت سے امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں ہم سے جیسے دودھ دینے والی گائے کی بڑی سیوا کی جاتی ہے ویسے ہی ہماری ناز برداریاں ہوتی ہیں، کیونکہ بعد میں ہمارا خون نچوڑنا ہوتا ہے''۔

میں نے کہا: بھئی آپ تو ماشاءاللہ ابھی جوان ہیں، نئی نئی شادی ہوئی ہے میرے خیال میں تو یہ آپ کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ ایسی کوئی خاص گھریلو ذمہ داری بھی ابھی آپ پر نہیں پڑی۔ ماں باپ حیات ہیں، کوئی خاص مالی پریشانی بھی نہیں ہے تو کہنے لگے جی یہی تو بات ہے۔ کوئی ہمارے مسئلے کو ٹھیک سے سمجھتا ہی نہیں ہے۔ جس سے بات کرو سب اچھا ہے کا نعرہ لگا کر ہمارا دل توڑ دیتا ہے۔ ہم نے کہا نہیں ضرور کہئے، بددل نہ ہوں، معاملہ کیا ہے؟ تو بولے۔۔۔ دیکھئے نا پہلے تو برطانیہ میں یونیورسٹی میں پڑھائی کے لیے گرانٹ ملتی تھی۔ وہ اب برائے نام رہ گئی ہے۔ اب قرض اٹھانا پڑتا ہے۔ گویا ابھی عملی زندگی کا آغاز بھی نہیں کیا کہ مقروض ہو گئے۔ پڑھائی کے بعد نوکری نہیں ملتی اور اگر مل بھی جائے تو تنخواہ اتنی کم کہ بچت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اوپر سے ماں باپ کو شادی کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ بیٹا برسرِ روزگار ہو گیا ہے، کہیں گوری کے چکر میں نہ پڑ جائے۔ اسے کھونٹے سے باندھ دو، شادی نہ کرو تب مصیبت کر لو تب مصیبت۔ اب بیوی کے ناز نخرے الگ اٹھاؤ۔ سیر سپاٹے، زیور، کپڑے، میک اَپ، تحفے تحائف۔ اب ان سب کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟ بیوی کا خیال کرو تو ماں ناراض ہوتی ہیں اور ماں کی فکر کرو تو بیوی مصیبت کھڑی کر دیتی ہے۔ نہ جانے کیسے کیسے الفاظ سے نوازا جاتا ہے ہمیں کہ ساری مردانگی اور عزت نفس کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ کیا عورتیں ذرا قناعت پسندی اور صبر و شکر نہیں کر سکتیں؟ میں نے کہا کہ آپ کی تسلی کے لیے اتنا بتا سکتی ہوں کہ جہنم میں زیادہ عورتیں ہوں گی اور جانتے ہیں کس لیے؟ اپنے خاوندوں کی ناشکری اور ناقدری کرنے کے لیے۔ اس پر وہ صاحب خوش ہو گئے کہ چلو اچھا ہے ایک مسئلے کا حل تو نظر آیا۔ اب کہئے دوسرا مسئلہ کون سا ہے تو بولے:

بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ڈال دی جاتی ہے اور چھوٹے سب جان بچا کر نکل جاتے ہیں۔ بھئی عجیب منطق ہے، بیٹا چھوٹا ہو یا بڑا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بیٹا تو بیٹا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ذمہ داری سب پر برابر کی ہونی چاہیے۔ دیکھیں نا عید شب برات، مرن جیون جب دیکھو بڑے بھائی کو آگے کر دیا جاتا ہے کہ باپ کی جگہ ہے۔ بھئی ہم پر بڑی کرم نوازی ہو گی اگر ہمیں بیٹا ہی رہنے دیں، باپ نہ بنائیں۔ کیونکہ باپ یہ ہم اپنے بال بچوں کے بھی ہوتے ہیں۔ اب ایک باپ اتنے کم وسائل میں اتنے سارے بچوں کی صحیح طرح سے پرورش کیسے کرے گا؟ میں نے کہا بات تو آپ کی دل کو لگتی ہے۔ میرے خیال میں تو اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ بڑے بیٹے کو شادی ہی نہیں کرنی چاہیے تاکہ ان کی قربانیوں اور خدمات سے سارا

خاندان خوش رہے اور بیٹے کی دنیا اور عاقبت سنور جائے۔

وہ صاحب تو اپنے دل کی بھڑاس نکال کر چلتے بنے مگر ہمیں لکھنے کے لیے ایک دلچسپ موضوع دے گئے۔ دل نے کہا کیوں نہ لگے ہاتھوں کسی ایسے مرد سے بات کی جائے جن کی شادی پرانی ہوگئی ہو اور جن مسائل کی نشاندہی پہلے والے صاحب کر رہے تھے، ممکن ہے عمر کے اس دور میں مسائل کچھ اور ہوں اور شاید مسائل کا کوئی حل نکل آیا ہو۔

یہ صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ پروفیشنل ہیں۔ شادی کو دس بارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ بظاہر تو ان کی گھریلو زندگی پرسکون نظر آتی ہے مگر معلوم نہیں پرسکون سمندر کے اندر کیسے کیسے طوفان کناروں سے لپٹنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ بیوی زیادہ خوبصورت ہو تب مسئلہ خوبصورت نہ ہو پھر بھی مسئلہ ہے۔ زیادہ خوبصورت بیوی کی نگرانی شوہر کو کرنا پڑتی ہے اور دوسری صورت میں بیوی شوہر کی نگرانی کرتی رہتی ہے۔ بیوی کی کسی خوش شکل سیلی سے بات کر لو تو جان کو آجاتی ہے۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ ہو جاتی ہے۔ گھر کیا بلکہ بیگار کیمپ بن جاتا ہے۔ سارے فرائض بجالاتے رہو، پھر بھی طعن و تشنیع جان نہیں چھوڑنے الزام تراشی شروع ہو جاتی ہے کہ تم کو تو میں اچھی ہی نہیں لگتی، دوسری عورتوں سے لہک لہک کر باتیں کرتے ہو اور گھر آکر خاموش طبع بن جاتے ہو۔ تمہیں تو مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔ تمہارے گھر کالے بالوں کے ساتھ آئی تھی، تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی خدمت گزاری کرتے کرتے سفیدی آگئی، مگر مجال ہے جو کبھی تم نے شکریے کے دو بول بولے ہوں۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ کیا ہمارے بالوں میں سفیدی نہیں آگئی۔ ان کی صلواتیں سنتے سنتے سفیدی کیا بلکہ بال ہی داغ مفارقت دینے لگے ہیں۔

بیوی زیادہ پڑھی لکھی ہو تو اور مصیبت ہے۔ کوئی بات اس سے چھپا ہی نہیں سکتے۔ سب حالات حاضرہ کا پتا رہتا ہے محترمہ کو۔ یہ بیوی کم اور اماں بلکہ استانی زیادہ بنی رہتی ہیں۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔۔۔ ساری کتابوں کے نسخے اور نصیحتیں ہم پر آزمائی جاتی ہیں۔ اماں کی بات تو کبھی پہلے باندھی نہ تھی اور یہاں جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ ہر وقت یہی طعنے تم میں ذرا نظم و ضبط نہیں ہے۔ ڈسپلن نام کی کسی چیز سے تم آشنا ہی نہیں ہو گویا ہمیں دوبارہ سکول داخل کرانے کا پروگرام بنائے بیٹھی رہتی ہیں۔ میرے خیال میں تو بیوی کو کم تعلیم یافتہ اور کم عقل ہونا چاہیے۔ مرد کی جان بہت سے عذابوں سے بچی رہتی ہے۔ ہم نے جسارت کر کے کہا کہ اندھی، بہری اور گونگی بھی ہونی چاہیے تاکہ کوئی مسئلہ ہی پیدا نہ ہو تو کہنے لگے نہیں نہیں، یہ حل مت بتائیے مسئلے کا وگرنہ اور بہت سے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔

ہم نے پوچھا اور کوئی مسئلہ ہے تو کہنے لگے بالکل ہے۔ مرد کا حق ہے چار شادیاں کرنا۔ اب دوسری شادی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ پہلی بیوی میں کوئی نقص ہو بس دل آگیا گدھی پر تو پری بھی کیا۔ اور محترمہ ہیں کہ آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ سارا خاندان دشمن بن جاتا ہے کہ دوسری شادی کا نام کیوں لیا؟ اب انصاف کی بات کریں، دیکھیں ایک ہی کھونٹے سے بندھی تو گائے بھینس بھی ڈکرانے لگتی ہیں۔ ہم تو آخر مرد ہیں، تھوڑی سی آزادی تو ہونی چاہیے۔ ہم نے کہا کہ ایسی آزادی کا مطالبہ عورتیں بھی کرنے لگیں تو جانتے ہیں اس معاشرے کا ڈھانچہ کیا ہوگا جو پہلے ہی دم توڑتی ہوئی خاندانی قدروں کی وجہ سے آخری سسکیاں لے رہا ہے تو وہ

حضرت بے یقینی سے ہمارا منہ تکنے لگے۔

یہ تو تھے شادی شدہ یعنی بیویوں والے حضرات۔ اب ایک ایسے حضرت سے بات ہوئی جو سنگل پیرنٹ ہیں۔ بیوی کوئی دس سال پہلے فوت ہوگئی تھی۔ دو بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ انہوں نے ماں باپ دونوں بن کر انہیں پالا۔ دوسری شادی کی جسارت نہیں کی۔ اب جبکہ بچے بڑے ہو گئے ہیں تو ساتھی کی کمی انہیں شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں پہلے تو حیرت ہوتی ہے جب مرد حضرات ہی اس بات پر مجھے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ بھئی اب شادی کی کیا ضرورت ہے جس وقت ضرورت تھی اس وقت تو کی نہیں اور یہ وہ مرد ہیں جو گھروں میں اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم نے کہا عورتوں سے تو آپ کو کوئی شکایت نہیں ہے ناں۔ کہنے لگے نہیں بلکہ عورتیں تو میرے حالات سن کر بہت ہمدردی کرتی ہیں، بلکہ رشتے ڈھونڈنے میں بھی لگی رہتی ہیں۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو کم از کم کوئی ایک شخص تو ملا جس کو عورتوں سے شکایت نہیں ہے۔ اب یہ مردوں کا مسئلہ ہے کہ مرد حضرات ایسے تنہا زندگی گزارنے والوں سے کیا سلوک روا رکھتے ہیں۔ ہم پرائی آگ میں کیوں جلیں؟

یہ تو سب وہ مرد حضرات تھے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ہم نے سوچا کہ لگے ہاتھوں کسی ایسے مرد سے بات کی جائے جو ذرا کم پڑھا لکھا ہو۔ اس سلسلے میں ایک صاحب سے بات ہوئی تو فرمانے لگے بھئی مرد تو بادشاہ لوگ ہیں۔ انہیں کیا مسئلہ وسلہ ہوسکتا ہے۔ یہ مسئلے مسائل تو عورتوں کے ہوتے ہیں۔ یا ان مردوں کے جو عورتوں کی الٹی سیدھی باتوں کا اثر لیتے ہیں۔ یہ دراصل پڑھے لکھے مرد بھی بڑے کمزور ہوتے ہیں جی جو خود اپنے لیے مسئلے کھڑے کر لیتے ہیں۔ ہم تو ٹھونک بجا کر خدمت لیتے ہیں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں اور ڈکار مارتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ یہ مہاشے سب سے زیادہ ٹھیک جا رہے ہیں۔ انہوں نے تو بات ہی ختم کر دی ہے۔

گویا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا مردوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے کیونکہ جتنی تعلیم زیادہ ہوتی ہے، اتنی سوچیں زیادہ لحاظ، رواداری، تہذیب، شائستگی جیسے لاکھوں بکھیڑے ہوتے ہیں۔ وگرنہ گدھے پر کتابیں لادنے کا الزام آجاتا ہے۔ اب مرد حضرات اتنے گئے گزرے بھی نہیں کہ ایسا الزام سر لے لیں۔ اس لیے تعلیم کا کچھ تو بھرم رکھنا ہی پڑتا ہے۔ ہمارے خیال میں مردوں کے مسئلے کا حل تو یہ ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرنا ہی چھوڑ دیں نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔

رنگ برنگی ناریاں

سنسکرت زبان کے ادب میں لکھا ہے کہ ''جہاں ناری کی عزت ہوتی ہے وہاں دیوتاؤں کا نواس ہوتا ہے۔ بھلا کہاں ناری اور کہاں عزت؟ کیونکہ ناری کی عزت اور بے عزتی کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ ہوتا ہے۔ یہ فاصلہ نہ تو دیوار چین ہے کہ اسے پار نہ کیا جا سکے اور نہ ہی دیوار برلن جسے گرانے میں برسوں لگ گئے۔ ویسے ناری کو بیچاری بنانے کے لیے کسی خاص فارمولے کی ضرورت نہیں ہوتی بس دو ہاتھ ادھر دو ہاتھ ادھر اور ناری بن گئی بیچاری۔

ذرا غور کریں کہ ناری کی یہ قدر و منزلت دیکھ کر دیوتاؤں کا نواس کیا خاک ہوتا ہوگا۔ اگر بھولے بھٹکے سے کوئی دیوتا ادھر نکل بھی آتا ہوگا تو ناری کی یہ درگت دیکھ کر بے زبان دیوتاؤں کو سانپ سونگھ جاتا ہوگا۔ زمین کے دیوتاؤں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر کوئی احمق دیوتا ہی وہاں رکنے کی حمایت کرے گا۔ یہی نہیں بلکہ دیوتا تو سوشکر بجالاتے ہوں گے کہ آدمی بنا کر اس زمین پر نہیں بھیجا گیا۔ ان کی قدر و منزلت ان کی اپنی نظروں میں اور بڑھ جاتی ہوگی۔

ناری کے بارے میں دنیا بھر کے ادب میں جو بھی لکھا ہو اس سے قطع نظر ہمیں تو یہ مخلوق بہت بہادر اور زندہ دل لگتی ہے۔ اس قدر ناروا سلوک کے باوجود اپنی رنگ برنگی طبیعت سے زندگی کے پھیکے پھیکے رنگوں میں دھنگ رنگ بکھیرتی رہتی ہے۔

ویسے تو ہر معاشرے میں ناریاں ایک ہی جیسی ہوتی ہوں گی، مگر ہم بات کرنے جا رہے ہیں اپنی خاص مشرقی ناری کی۔ اور جو خاص الخاص خوبیاں اس میں ہوتی ہیں، مغرب کی ناری تو ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ ناریوں کی جن خوبیوں کا ذکر ہم کرنے جا رہے ہیں وہ سب خصوصیات تو ایک ہی ناری میں ملنا مشکل ہیں کیونکہ ہر ناری کا اپنا اپنا فلسفہ حیات ہوتا ہے جس پر وہ پوری دیانت داری سے عمل پیرا رہتی ہے۔

ناریوں کی گوناگوں صفات کا احاطہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی درجہ بندی کی جائے۔ اس لحاظ سے ناریوں کی اولین قسم کو اگر ناریل سے تشبیہ دی جائے تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔ اس قبیل کی ناریاں بظاہر تو سخت جان اور کھردری نظر آتی ہیں، مگر اندر سے بہت نرم و نازک جذبات و احساسات کی مالک ہوتی ہیں۔ ان کی زبان چاہے پرتھوی، غوری اور شاہین میزائل گراتی رہے لیکن ان کے میزائیلی حملے اتنے تباہ کن نہیں ہوتے کیونکہ یہ اپنی شعلہ بیانی کے مظاہرے کے فوراً بعد میدان جنگ میں ایک فاتح کی طرح وارد ہوتی ہیں، زخموں سے چور نیم جان سپاہیوں کو نہ صرف اٹھاتی ہیں بلکہ ان کی مرہم پٹی بھی کرتی ہیں۔

ناریوں کی اس قسم کا ہمیں ذاتی تجربہ ہے۔ خدا غریق رحمت کرے ہماری ایک بزرگ خاتون ناریوں کی اس تعریف پر پوری

اترتی تھیں۔ہم اکثر ان کی باتوں سے برہم ہوکر باغیانہ ردعمل کا مظاہرہ کرتے مگر بعد میں پتا چلتا یہ سب پھوکے فائر تھے۔زبان دانی کے اس ڈیمانسٹریشن کے بعد وہ نہ صرف پیار کرتیں بلکہ اپنی حالت یا شاید ہماری حالت پر آنسو بہائیں۔اگر زیادہ دل گیر ہوتیں تو گلے بھی لگاتیں،مگر اس حسن سلوک کی شرط یہ تھی کہ آپ اس کشت وخون میں جوابی فائر نہ کریں۔

ناریوں کی دوسری قسم وہ ہے جو کنارے کنارے چلتی ہے۔جھیل ڈل کے کنارے نہیں بلکہ رشتوں اور رشتہ داروں کے کنارے۔ان کا رویہ انگریزی کے محاورے سٹنگ آن دی فینس والا ہوتا ہے۔یہ نہ تو کھل کر کسی کی مخالفت کرتی ہیں اور نہ ہی حمایت۔بس ہاں ہوں سے کام چلاتی ہیں۔گویا سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن موقع ملنے پر کام ضرور دکھاتی ہیں۔ان کا یہ امریکن قسم کا رویہ کبھی کبھی دونوں فریقوں کے دل میں ان کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر دیتا ہے۔ایسی محتاط رویے والی ناریوں سے آپ کو سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیے۔معلوم نہیں کب داخلی اور خارجی پالیسی بدل لیں۔

ناریوں کی تیسری قسم ناز وانداز میں اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔رومانس ان کی نس نس سے اہل رہا ہوتا ہے۔شرعی بندھن میں بندھنے کے باوجود گرل فرینڈ کی طرح رہنا انہیں زیادہ پسند ہوتا ہے۔لیکن اگر میاں پر کوئی اور گرل فرینڈ قسم کی بیوی ڈورے ڈالنے کی کوشش کرے تو سخت برہم ہوجاتی ہیں۔اس وقت یہ خالص بیوی بن جاتی ہیں۔ایسی حالت میں یہ میاں کے ساتھ کلب یا پارٹی میں جانے سے انکار بھی کرسکتی ہیں مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔عقل مند شوہر ان کے انکار پر زیادہ اصرار نہیں کرتے اور اکیلے ہی دشت نوردی کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

ناریوں کی پیاری قسم شوہروں کی بے حد لاڈلی ہوتی ہے۔جیسے ماں باپ کو پیٹ کروڑی کے بچے۔ان کی دیکھ بھال ایسے ہوتی ہے جیسے پالنے میں ہوں۔انہیں چھینک آئے تو شوہر رومال کی بجائے ٹشو پیپر کا پورا ڈبہ لے کر حاضر ذرا ماتھا گرم ہوا تو ڈاکٹر کو بلانے کی بجائے شوہر ایمبولینس بلا لیتے ہیں اور گھبراہٹ میں خود ہسپتال میں ایڈمٹ ہوجاتے ہیں۔یہ گرنے لگیں تو انہیں تھامنے کی بجائے شوہر صاحب خود سو بار گر جاتے ہیں۔میاں خود تو پھٹے پرانے کپڑوں میں رہیں گے مگر پیاری بیگم بہت شان سے اعلیٰ لباس زیب تن کر کے ہر محفل کی جان بنی نظر آئیں گی۔ایسی ناریاں شوہروں سے اس قسم کا سلوک کیوں کرتی ہیں۔اس کا جواب یا تو خود وہ یا شوہر صاحب ہی بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔

ان کے مشورہ جات پر شوہر بلا چون وچرا عمل کرتے ہیں۔ایسے شوہروں کے گھر والے انہیں بہت آسانی سے زن مرید ہونے کا خطاب دے دیتے ہیں مگر یہ روشن خیالی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں۔''دراصل ہماری آپس میں بہت انڈرسٹینڈنگ ہے اور لوگ ہم سے جلتے ہیں''۔

عورتوں کی اس قسم سے دوسری عورتیں بہت چڑتی ہیں۔جہاں موقع ملے ان کے بجے ادھیڑتی رہتی ہیں،مگر دل ہی دل میں ان پر رشک بھی کرتی ہیں۔اپنے نصیب سے شاکی ہوتی ہیں کہ ایسا بھلا مانس خدمت گزار انہیں کیوں نہ ملا۔کوسنے دے دے کر تھک جائیں تو یہ کہہ کر صبر کر لیتی ہیں کہ بس جی یہ تو سارا نصیب کا کھیل ہے۔

ایسی بیویاں اگر شکل وصورت میں ذرا دیتی ہوں تو پھر سارے خاندان اور محلے کی ہمدردیاں میاں کے ساتھ اور زیادہ ہوتی ہیں۔ بات بات میں اسے مزید بدصورت بنا کر پیش کرنے کا کوئی سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ ان کا منتہائے مقصود سب کو یہ یقین دلانا ہوتا ہے کہ بظاہر یہ محترمہ اس راج سنگھاسن کی مستحق تو نہیں ہیں، بس اپنی اپنی قسمت ہے۔ سجی سجائی ناریوں کا محبوب ترین مشغلہ میک اپ، زیور، کپڑے اور میچنگ جوتے خریدنا ہوتا ہے۔ یہی جوتے بوقت ضرورت شوہر صاحب کے استعمال میں آتے ہیں، اس لیے انہیں جوتوں کی خریداری سے احتراز کرنا چاہیے۔

برطانیہ میں ایسی ناریاں حکومت کے طرف سے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ملنے والے ہفتہ وار الاؤنس یعنی چائلڈ بینیفٹ سے ہر ہفتے نیا جوڑا خریدنا عین عبادت سمجھتی ہیں۔ گھر میں ایسے رہتی ہیں جیسے مہمان آئی ہوں۔ ہر ہفتے کی خریداری کے باوجود کسی خاص موقعے پر پہننے کے لیے ان کے پاس کپڑے نہیں ہوتے (کیونکہ سب کپڑوں کی نمائش تو یہ کر چکی ہوتی ہیں شوہر مزید خریداری کے لیے اگر قابو میں نہ آئیں تو نفسیاتی حربے استعمال کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ لوگ پرانے کپڑے دیکھ کر کیا کہیں گے۔ میرا کیا ہے میں تو پہن کر چلی جاؤں گی مگر تمہاری عزت کا کباڑہ ہو جائے گا کہ بیوی کو اس موقعے پر نیا جوڑا بھی لے کر نہ دیا)۔ یہ وار اکثر کارگر ثابت ہوتا ہے اور شوہر صاحب جیب خالی ہونے کے بعد چھت کو خالی خالی نظروں سے گھورتے ہوئے یہ شعر پڑھتے رہتے ہیں۔

عشق میں ایک تو ہمارا ہے
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

ناریوں کی گرفتاری قسم بہت خطرناک ہوتی ہے۔ یہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے شوہروں پر غیر ضروری دباؤ ڈالتی رہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ ان کے بے تکے خوابوں کی تکمیل کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے سے پیسہ گھر میں آنا چاہیے۔ دوسرے لوگوں کی خوشحالی کی مثالیں دے دے کر شوہروں کو زندہ درگور کرتی رہتی ہیں۔ خود کو مفلس ترین سمجھتی ہیں۔ گو کہ صرف اخلاقی اور ذہنی طور پر دیوالیہ ہوتی ہیں۔ ناریوں کی اس قسم سے شوہروں کو محتاط رہنا چاہیے۔ انہیں شروع سے ہی ایسی ناری کو اپنی اوقات میں رہنے کا درس دینا چاہیے، وگرنہ یہ نہ ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے۔

ناریوں کی ایک قسم گزاری ناریوں کی بھی ہوتی ہے کیونکہ بقول شوہر صاحبان یہ صرف گزارے لائق ہوتی ہیں۔ یہ شوہروں سے کتنا ہی پیار و محبت کریں، کبھی دل پر نہیں چڑھتیں۔ یہ اکثر و بیشتر والدین کی پسند ہوتی ہیں جو شوہر کے سر منڈھ دی جاتی ہے۔ کبھی وٹے سٹے کی شادیاں بھی ایسی ناریوں کو جنم دیتی ہیں۔ شوہروں کی ساری عمر ایسی ناریوں کی ذات کی نفی کرنے میں گزرتی ہے۔ ایسے شوہر اپنی مظلومیت کے قصے سنا سنا کر دوسری خواتین کی بہت ہمدردیاں سمیٹتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ گلے پڑا ڈھول بجا رہے ہیں، مگر یہ ڈھول اس انداز سے بج رہا ہوتا ہے کہ گھر بچوں کی کلکاریوں سے گونج رہا ہوتا ہے اور میاں کے اندر کے سنائے بڑھتے جاتے ہیں۔

ایسے شوہر مستقل طور پر حسرت و یاس کی تصویر بنے رہتے ہیں۔ دردناک قسم کی غزلیں یا پھر سلوک و معرفت والا کلام سنتے رہتے ہیں کیونکہ یہ جسمانی سے زیادہ روحانی تعلق کے قائل ہو جاتے ہیں۔

ناریوں کی اشتہاری قسم کے بارے میں ہماری رائے محفوظ ہے کیونکہ یہ قسم اتنی اوپن ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

بیچاری قسم کی ناریاں ہمارے ملک کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ پیدا ہوتے ہی اذان کے ساتھ ان کے کان میں یہ ڈالا جاتا ہے کہ والدین کا گھر ان کا مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ اس لیے اپنے گھر پر ڈولی میں جاتی ہیں اور کندھوں پر ہی واپس آتی ہیں۔ ان کی پرورش شادی کے نقطہ نظر سے ہی کی جاتی ہے۔ بہشتی زیوران کا نصاب ہوتا ہے۔ دنیاوی تعلیم سے نابلد رکھی جاتی ہیں اور دینی تعلیم میں بھی ایثار وقربانی، فرمانبرداری اور شوہر پرستی کے تصور کو خوب خوب اجاگر کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول توبتہ النصوح کی ہیروئین ہوتی ہیں۔ ایسی ناریوں کی آنکھوں میں یاسیت اور محرومی کے سائے لہراتے رہتے ہیں۔ منہ سے کچھ نہ کہنے کے باوجود ان کی خاموشی ہزار داستانیں سناتی ہے۔ ہر سال بچہ پیدا کر کے انہیں مصروف رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی اور تفریح ان کے لیے شجر ممنوعہ ہوتی ہے۔ یہ شوہر پرستی میں اتنی آگے نکل جاتی ہیں کہ ہر طرح کا ظلم سہ کر خود کو جنت کی حقدار سمجھتی ہیں۔

ناریوں کی اس قسم میں دو ناریاں بھی آجاتی ہیں جن کی خدمت کا صلہ کبھی کبھی صرف طلاق کی شکل میں ملتا ہے مگر انہیں چھوڑ کر جانے والے بھی ان کی شرافت کے قائل ہوتے ہیں اور ایک دن کہہ اٹھتے ہیں کہ ؎

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے
تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خسارہ ہے

لیکن اس سے ان کے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی۔ کچھ بیوگی کے ہاتھوں بیچارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ گئے دنوں کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ بڑھاپے میں اولڈ پیپلز ہوم ان کا ٹھکانہ بن جاتے ہیں۔ برطانیہ میں ایسی ناریاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں صحیح معنوں میں جنت کی حقدار یہ فرمانبردار قسم کی ناریاں ہی ہوتی ہیں۔

ناریوں کی ہوشیاری قسم تقریباً ناریوں کی سبھی قسموں میں پائی جاتی ہے، مگر بیچاری قسم کی ناریاں اس زمرے میں نہیں آتیں۔ ویسے مردوں کے نزدیک سب ہی ناریاں ہوشیار ہوتی ہیں مگر یہ قسم کچھ زیادہ ہی ہوشیار ہوتی ہے۔ یہ میاں کے کام پر جانے کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے کام نپٹا کر اگر بچوں کا جھنجٹ ہے تو انہیں سکول میں پھینک کر مٹر گشت کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ ونڈو شاپنگ کے علاوہ محلے کی خیر خبر رکھنا، ادھر کی ادھر پہنچانا ان کے فرائض میں شامل ہوتا ہے۔ کسی نیوز ایجنسی کی چیف رپورٹر بھی اپنا کام اتنی مستعدی سے نہیں کر سکتی جتنا یہ بغیر تنخواہ کے کام کر دیتی ہیں۔

شوہر کے گھر لوٹنے سے پہلے ہی بچوں کو دانا دُنکا دے کر سر باندھ کر لیٹ جاتی ہیں۔ آخر اتنی محنت کے بعد ہیڈ ایک نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔ دن بھر کی مشقت کے بعد گھر آنے والے شوہر ان کی اجڑی ہوئی حالت دیکھ کر مزید پریشان ہو جاتے ہیں۔ سیدھے سادے قسم کے شوہر تو تیمارداری میں لگ جاتے ہیں مگر اکھڑ قسم کے شوہر دوسرے طریقوں سے ان کی خبر لیتے ہیں۔

ہماری پوری ہمدردیاں ایسے شوہروں کے ساتھ ہیں۔ان ناریوں کے شوہر اگر بے روزگار ہو جائیں تو یہ سخت ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہیں۔شوہر سے زیادہ انہیں کام کی فکر ہوتی ہے کیونکہ ان کی صحافتی اور سماجی سرگرمیاں سرد پڑ جاتی ہے۔

ناریوں کی آخر الذکر قسم کمیاب ہوتی ہے۔ہم انہیں چنگاری ناریاں بھی کہتے ہیں۔ناریوں کی یہ قسم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پر اعتماد ہوتی ہے۔اپنی ذات اور ماحول کا شعور وادراک ہونے کی وجہ سے یہ عورت پر غیر ضروری سماجی دباؤ کے خلاف ہوتی ہیں۔فرسودہ رسم و رواج جو عورت سے امتیازی سلوک روا رکھتے ہیں، انہیں دل سے ناپسند کرتی ہیں۔عورت کی ذہنی اور فکری بالیدگی کو بہت ضروری سمجھتی ہیں۔ہر طرح سے روایت شکنوں کی صف میں شمار ہوتی ہیں۔

ناریوں کی یہ قسم عامیانہ سوچ رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ذہنی تنگ نظری سے سخت الرجک ہوتی ہیں۔آپ کے دلائل میں وزن ہو تو ضرور غور کرتی ہیں، لیکن بے جا ضد اور ہٹ دھرمی سے آپ انہیں قائل کرنے کی بجائے ہتھے سے اکھاڑ سکتے ہیں۔ان ناریوں کے ساتھ سطحی اور روایتی سوچ رکھنے والے مردوں کا گزارہ نہیں ہوسکتا۔اگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے یہ آپ کے پلے یا آپ ان کے پہلے سے بندھ گئے ہیں تو جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عمل کریں۔آپ بھی خوش اور یہ بھی آسودہ وگرنہ ان کے شعلوں سے بچنا ناممکن ہے۔

سرونٹ

متوسط طبقے میں انہیں نوکر اور اعلیٰ طبقے میں انہیں سرونٹ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ سرونٹ کوارٹرز میں رہتے ہیں۔جس طرح اپر کلاس ہر جگہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتی ہے، اسی طرح نوکروں کے بارے میں بھی وہ کافی کانشیئس ہوتی ہے۔ان کی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے ہی انگریزی کا یہ لفظ ایجاد ہوا ہے۔متوسط طبقہ چونکہ نوکری پر گزارا کرتا ہے اس لیے وہ ہر ایک کو نوکر ہی سمجھتا ہے۔انہیں خود اپنی رہائش کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے اس لیے وہ سرونٹ کوارٹر مہیا نہیں کر سکتے۔غریب طبقہ نوکر رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔اس لیے خود نوکر بن جاتا ہے۔

نوکر کیہ تے نخرہ کیہ۔کسی زمانے میں یہ محاورہ درست تھا مگر اب نہیں چلتا۔اب تو نوکر کا نخرہ مشہور ہے۔نوکروں کے زیادہ نخرے کا اہل قسم کی بیگمات کو زیادہ اٹھانا پڑتے ہیں کیونکہ اگر نوکر ہاتھ سے نکل جائے تو پھر بیگمات کے اپنے نخرے خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔اس قسم کی بیگمات شوہروں کی بدولت کم مگر نوکروں کی بدولت زیادہ عیش کرتی ہیں۔شوہر کی ناراضگی قابل برداشت ہے مگر نوکر کی ناراضگی سے بیگمات سخت قسم کے ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ڈپریشن ویسے ہی ہماری عورتوں میں زیادہ ہے۔متوسط طبقے کی بیویاں تو زندگی کے شب و روز میں کچھ اس طرح الجھی رہتی ہیں کہ انہیں ڈپریس ہونے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔آٹے دال، گھر کے بلوں اور بچوں کے سکون کے اخراجات کا حساب کتاب ہی ان کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

متوسط طبقے میں گھر والی کو بیوی اور اَپر کلاس میں بیگم کہا جاتا ہے۔یہ فرق صرف نام کا ہی نہیں ہوتا کام کا فرق بھی ہوتا ہے۔بیوی کو ہزاروں لاکھوں جھمیلے ہوتے ہیں جبکہ بیگم بے غم ہوتی ہے۔اسے اگر کوئی غم ہوتا ہے تو صاحب کے معاشقوں کا۔اپنی فگر، ڈھلتی ہوئی جوانی اور اسٹیٹس برقرار رکھنے کا۔بیگم کی زندگی صاحب کے چکر میں کم لیکن نوکروں کے چکروں میں زیادہ گزرتی ہے۔اس لیے بیگمات کو چکر زیادہ آتے ہیں۔راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔سلیپنگ پلس کے باوجود نیند کی دیوی ان پر مہربان نہیں ہوتی۔

بیگمات کا سب سے بڑا غم نوکروں کا انہیں چکر دیتا ہے۔نوکروں کی چک پھیریاں انہیں ادھ موا کر دیتی ہیں۔انہیں باقی سب غم حقیر لگتے ہیں لیکن نوکروں کے نخروں کا غم ان کی پہلے سے برباد شدہ زندگی کو مزید برباد کر دیتا ہے۔

یہ بربادی صرف پاکستانی بیگمات کا مقدر ہے۔برطانیہ میں بیگمات نہیں ہوتیں۔اگر کوئی بیگم بھولے بھٹکے سے اس سرزمین پر جا نکلے تو کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی واپس آ جاتی ہے۔توبہ توبہ۔یہ بھی کوئی زندگی ہے۔جھاڑو، برتن کپڑوں سے لے کر ٹائلٹ تک خود

صاف کرو۔ مالی اور ڈرائیور کے ساتھ ساتھ دربان ہونے کا فریضہ بھی خود ہی سرانجام دو۔ برطانیہ ایسی خواتین کے لیے جیل سے کم نہیں۔اس لیے انہیں سوچ سمجھ کر برطانیہ کا رخ کرنا چاہیے۔

ذرائع ابلاغ کی ترقی نے اب بیگمات کی معلومات میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔انہیں پتہ چل گیا ہے کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔اس لیے وہ باہر کے ممالک میں صرف سیر وتفریح اور شاپنگ کے لیے جاتی ہیں۔ان کا بس نہیں چلتا کہ ایسے تفریحی دوروں پر بھی نوکروں کی فوج ظفر موج ساتھ رکھیں۔امیگریشن والے انتہائی جاہل اور بدذوق لوگ ہیں جو بیگمات کے اس غم اکبر کو نہیں سمجھتے۔

بیگمات کے بارے میں نوکروں کو جس قدر معلومات ہوتی ہیں، صاحب ساری زندگی بیگم کے ساتھ گزار کر بھی لاعلم رہتے ہیں۔ ویسے صاحب کے لیے لاعلم رہنا ہی بہتر ہے۔کیونکہ اگر صاحب علم دار ہو جائے تو بیگم، بیگم نہیں رہتی بیوی بن جاتی ہے اور بیگمات ایسی توہین کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتیں۔

جس طرح بیویوں کی درجہ بندی ہے، اسی طرح نوکروں کی درجہ بندی بھی کی جاتی ہے۔نوکروں کی اعلیٰ نسل خاندانی نوکر ہوتے ہیں جو نسل در نسل کسی خاندان کی غلامی کا بانڈ بھرتے ہیں۔یہ فیملی کے فرد ہی تصور کیے جاتے ہیں۔ان کے ساتھ بیگمات تھرڈ ریٹ قسم کا سلوک کرنے کی ہمت نہیں رکھتیں۔الٹا انہیں نوازتی رہتی ہیں۔نوکروں کی دوسری قسم گشتی نوکروں کی ہوتی ہے۔یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے رہتے ہیں۔ایک دن یہاں دردن وہاں۔یہ گھوم پھر کر میلہ دیکھنے والے نوکر ہوتے ہیں۔ذرا سی سرزنش پر دم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ایسے نوکروں کے ہتھے چڑھنے والی بیگمات کی زندگی بہت دردناک ہوتی ہے۔ہر جگہ ان کی گفتگو کا موضوع نوکر ہی ہوتا ہے۔بیگمات صاحب کے طور طریقوں اور خیالات سے کم لیکن نوکروں کے ہتھکنڈوں سے زیادہ واقف ہوتی ہیں۔ صاحب تو ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔خاص طور پر دولت مند بیگمات کے لیے صاحب پالنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔لیکن اچھے نوکر اتنی آسانی سے نہیں ملتے۔

برطانیہ میں خواتین نوکروں کا جھنجھٹ نہیں پالتیں۔اس لیے نوکری بھی کرتی ہیں۔نوکروں کی لمیٹڈ سپلائی کی وجہ سے وہاں صرف گارڈنرز اور ونڈو کلینرز ہی نصیب ہوتے ہیں۔اچھا گارڈنر اور ونڈو کلینر ڈھونڈنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔حتی المقدور کوشش کی جاتی ہے کہ پرسنل ریفرنس سے کوئی اچھا کام کرنے والا مل جائے۔مگر ایسا ہونا بہت کم ہے۔اکثر اخبارات میں دیے گئے اشتہارات پر ہی تکیہ کرنا پڑتا ہے۔جی ہاں۔برطانیہ میں نوکر خود اشتہار دیتے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں نوکروں کے لیے اشتہارات دیے جاتے ہیں۔ان اشتہارات کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ہمارا ملک کتنا امیر ہو گیا ہے اور روزگار کے مواقع کس قدر بڑھ گئے ہیں۔

نوکروں کی اتنی زبردست ڈیمانڈ کے باوجود پتہ نہیں ہم ابھی تک ترقی پذیر ممالک کی صف میں کیوں کھڑے ہیں۔اور کچھ نہیں تو کم از کم نوکروں کی حد تک تو ہم ترقی یافتہ کہلانے کے حقدار ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں عوام الناس کے لیے کل وقتی نوکر رکھنا ناممکنات میں سے ہے۔یہ شرف صرف امیروں اور رئیسوں کو ہی

حاصل ہوتا ہے۔ یہ کل وقتی یعنی فل ٹائم سرونٹ صحیح معنوں میں نوکر ہوتے ہیں۔ اور اپنے انگریز صاحبوں اور میموں کی خدمت جی جان سے کرتے ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے ملک میں نوکروں کے نخرے دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ انہیں ٹریننگ کے لیے انگریز صاحب کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ ویسے نوکروں کی علت بھی انگریزوں کی دین ہے۔ گورا صاحب تو اپنا ہیٹ، سگار اور چھڑی لے کر چلا گیا اور پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خیر تھا۔ لیکن ہم نے اپنی خاک اڑانے کے لیے خود کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ زندہ قوموں کی یہی نشانی ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں صرف نوکر رکھے ہی نہیں جاتے پالے بھی جاتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ جانور پالے جاتے ہیں، غم پالے جاتے ہیں یا پھر پرندے پالے جاتے ہیں۔ نوکر کیسے پال سکتے ہیں۔ وہ تو خود مالکوں کو پالتے ہیں، دانہ دنکا دیتے ہیں۔ نوکر گھر میں نہ ہو تو میم اور صاحب چائے کی پیالی تک سے محروم رہ جاتے ہیں۔

نوکروں کی پالتو قسم کو بچپن سے ہی گود لے لیا جاتا ہے۔ ان کے گلے میں اپنے نام کا پٹہ ڈال کر انہیں سگھر بیٹی کی طرح ہر کام سکھایا جاتا ہے لیکن بیٹی کے برعکس ایسے نوکر کی رخصتی کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ انہیں گھر والوں سے زیادہ خبر ہوتی ہے کہ کون سی چیز گھر کے کس کونے میں پڑی ہے۔ ان کے ناز نخرے صحیح معنوں میں اہل خانہ کو اٹھانا پڑتے ہیں۔ کیونکہ اتنی لونگ ٹرم انوسٹمنٹ کے بعد آدمی گھاٹے کا سودا ہرگز نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ منہ پھٹ بھی ہو جاتے ہیں۔ ذرا سخت ست کہنے پر ان کی عزت نفس کو بہت زیادہ ٹھیس لگ جاتی ہے۔ ایک دن کی چھٹی لے کر کئی دن غائب رہنے پر بھی کھل کر انہیں لعنت ملامت نہیں کی جا سکتی۔ مبادا یہ کہ کسی دوسری بیگم کے ہاں پولیٹیکل اسائیلم لے لیں۔

حال ہی میں ہمیں ایک ایسے ہی گھر میں جانے کا موقعہ ملا۔ اتفاق سے نوکر چھٹی پر تھا۔ ہماری سادگی کا اندازہ لگائیں کہ ہم نے بیگم صاحبہ سے گاجر کے جوس کی فرمائش کر دی۔ ہماری اس ناہنجار فرمائش پر بیگم صاحبہ بادل نخواستہ کچن میں چلی گئیں۔ مگر کافی دیر تک جب ان کی شکل نظر نہ آئی تو ہمیں تشویش ہوئی۔ ہم نے دبے قدموں سے رسوئی کا رخ کیا جہاں بیگم صاحبہ جوسر سے ماتھا پھوڑ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر اوپری مسکراہٹ سے بولیں دراصل نوکر ہی یہ سب کام کرتا ہے۔ میں نے تو کبھی جوس نکالا نہیں اس لیے کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ استعمال کیسے کرتا ہے۔

بیگم صاحبہ اگر اناڑی تھیں تو ہم بھی کھلاڑی نہیں تھے۔ دراصل برطانیہ میں جوس نکالنے کی تکلیف نہیں کرنا پڑتی۔ ہر قسم کے جوس دیدہ زیب پیکنگ میں باآسانی مل جاتے ہیں۔ ہم بھی اوپری مسکراہٹ سے بولے کوئی بات نہیں۔ جانے دیں۔ کوئی اور ڈرنک لے لیتے ہیں مگر بیگم صاحبہ بضد تھیں کہ جوس نکلے گا تو گاجر کا ہی وگرنہ کچھ اور پینے کو نہیں ملے گا۔

ہم نے بیگم صاحبہ کو فراخدلانہ پیشکش کی کہ ہم بھی ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ خیر ہمیں یہ تو پتہ چل گیا کہ گاجریں ڈالنا کہاں ہیں مگر جوس کدھر سے نکلے گا اس کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔ ہم سمجھے کم بخت جوس بھی اندر ہی کسی ڈبے میں جائے گا۔ جیسے ہی گاجروں کی سپلائی کر

کے ہم نے جو سرآن کیا سرخ سرخ جوس نے کچن کے ورک ٹاپ کو جل تھل کر دیا۔ ہم شرمندہ شرمندہ سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے لیکن بیگم صاحبہ ہم سے زیادہ شرمندہ نظر آ رہی تھیں۔ کیونکہ مہمان بھی ان کے تھے، جوسر بھی ان کا۔ گاجریں بھی ان کی اور سب سے بڑھ کر نوکر بھی ان کا اور وہ بھی پالتو نوکر۔

ان حالات کے پیش نظر ہم بیگمات کو یہی مشورہ دے سکتے ہیں کہ اگر ایسے نوکر مل جائیں تو یا تو انہیں بالکل چھٹی نہ دیا کریں۔ احتیاط سے سیف ڈیپازٹ لاکر میں رکھیں یا پھر ان سے کچھ کام سیکھ لیا کریں۔ کیونکہ ایسے نوکر اگر مل کر بچھڑ جائیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اگوں تیرے بھاگ لچھیے۔

موازنے

سیاست دان، پولیس، ڈاکٹر، گداگر اور طالب علم کسی بھی معاشرے کے بہت اہم ستون ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہم اکثر ان کے رویوں کی شکایت کرتے رہتے ہیں، لیکن اگر انہیں معاشرے سے دربدر کر دیا جائے تو شاید کچھ مسائل کا حل تو نکل آئے لیکن بہت سے ایسے مسائل پیدا ہو جائیں گے جو پہلے سے زیادہ گھمبیر ہوں گے۔ اس لیے عقل مندی اسی میں ہے کہ انہیں ان کا کام کرنے دیا جائے اور آپ صرف انہیں خاموشی سے کام کرتے ہوئے دیکھتے رہیں۔

پولیس

ہمارے ملک کی پولیس اور برطانیہ کی پولیس میں چند فنڈامینٹل فرق ہیں۔ مثلاً برطانوی پولیس کی وردی گہرے نیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ سرخ و سپید رنگت پر پرتکلف وردی پہن کر یہ جب ایک شان سے گشت پر نکلتے ہیں تو پتہ چل جاتا ہے کہ قانون آ رہا ہے۔

انہیں اُردو بولنا نہیں آتی اس لیے انگریزی بول کر کام چلاتے ہیں۔ اب کچھ پولیس والوں نے اردو اور کچھ دوسری ایشیائی زبانیں سیکھ لی ہیں۔ زبان سیکھنے میں زیادہ مشکل پیش آئے تو پھر اردو بولنے والے پولیس میں بھرتی کئے جاتے ہیں اور بوقت ضرورت مترجم کی خدمات حاصل کر لی جاتی ہیں۔ ہمارے ایشیائیوں کو پولیس کا یہ امتیازی سلوک ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ''می نو انگلش'' کہہ کر پولیس کو چکر دے دیا جاتا تھا۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی کا ڈنڈا نہیں ہوتا بلکہ قانون کا ڈنڈا ہوتا ہے۔ جسے یہ وا کی ٹا کی کے ذریعے قانون شکنوں پر برساتے رہتے ہیں۔ یہ پیدل کم ہی چلتے ہیں، اکثر نئی رجسٹریشن کی چمچماتی گاڑیوں یا اعلیٰ نسل کے گھوڑوں پر گشت کے لیے نکلتے ہیں۔

ہمارے ہاں مجرم زیادہ صحت منداور ہشاش بشاش لگتے ہیں، جبکہ برطانیہ میں پولیس اور مجرم کا فرق صاف نظر آتا ہے۔ یہ پولیس مقابلے نہیں کرتے کیونکہ ڈرپوک ہوتے ہیں۔ انہیں اگر مجرم للکارے بھی تو یہ اسے زندہ ہی پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے ان کی اپنی جان چلی جائے۔ ان کی گرفت میں آیا ہوا مجرم مشکل سے ہی بھاگ سکتا ہے۔

اس حسن سلوک کے باوجود لوگ ان کی شکایت بھی کرتے ہیں جبکہ اپنی پولیس کی لوگ ہر وقت شکایت ہی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ثابت ہو جائے کہ انہوں نے کسی سے زیادتی کی ہے تو چیف کانسٹیبل نہ صرف معذرت کا خط لکھتا ہے بلکہ پولیس کے خاص فنڈ میں سے ہرجانہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔

اگر ہمارے پولیس والوں کی شکایت کی جائے تو یہ الٹا شکایت کنندہ کو اندر بند کر دیتے ہیں اور خود ہرجانہ وصول کر لیتے ہیں۔ ہماری پولیس اور برطانوی پولیس میں وردی کی رنگت، جلد کی رنگت اور زبان کے فرق کی وجہ سے ان کے کام میں بھی بہت فرق ہو جاتا ہے، مگر اس پولیس میں بس ایک بری عادت ہے کہ یہ زیادہ تر میلی رنگت والوں کو ہی پکڑتی ہے۔ اس کے برعکس ہماری پولیس نے ہر طرح کی بری عادتیں پالی ہوئی ہیں اور یہ لوگوں کے رنگ کی بجائے ان کا سوشل اسٹیٹس دیکھ کر انہیں گرفتار کرتی ہے۔

سیاست دان

انہیں اپنی زبان میں سیاست دان اور انگریزی میں پالیٹیشن کہا جاتا ہے۔ سیاست دان اور پالیٹیشن میں بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ پالیٹیشن اصلی اور سچی پالٹیکس کرتے ہیں لیکن سیاست دان صرف سیاست ہی نہیں کرتے باقی اور سب کچھ کرتے ہیں۔ پالیٹیشن سال کے بارہ مہینے اپنے ووٹرز سے رابطہ رکھتے ہیں اور اگر کبھی ووٹرز انہیں یاد نہ کریں تو یہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے سیاست دان صرف الیکشن کے دنوں میں منہ دکھائی کی رسم ادا کرتے ہیں اور الیکشن جیتنے کے بعد اعتکاف میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی زیارت کرنا محبوب کی زیارت کرنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ہمارے شعراء کو چاہیے کہ سنگدل روایتی محبوب کی بجائے سیاستدانوں کو محبوب بنائیں۔ وہ ان سے جس طرح کا سلوک کریں گے اس کے نتیجے میں اگر شاعری کی بجائے چھٹی کا دودھ یاد نہ آجائے تو ہمیں مطلع کریں۔

برطانیہ میں پالیٹیشن اگر کسی بدنظمی یا کرپشن میں پکڑے جائیں تو جانتے بوجھتے ہوئے بھی پالیٹکس میں رہنے پر اصرار نہیں کرتے بلکہ شرمندگی کے مارے استعفیٰ دے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے سیاست دان نہ صرف جرم کرنے کے باوجود اپنی بے گناہی پر اصرار کرتے ہیں بلکہ آیت کریمہ پڑھا پڑھا کر خدا کو بھی پریشان کرتے رہتے ہیں۔

پالیٹیشن صرف جینوئن کام کے لیے سفارش کرتے ہیں بلکہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں اپنے ووٹرز کی مدد کریں جبکہ سیاست دان غلط کام کروانے کے لیے سفارشیں کرتے ہیں۔ برطانیہ کے پالیٹیشن بھی وعدے وعید کرتے ہیں مگر کم کم۔ انہیں علم ہوتا ہے کہ اگر وعدے پورے نہ کئے گئے تو ووٹرز ان کا حقہ پانی بند کر دیں گے۔ لیکن سیاست دانوں کو اگر وعدے یاد دلائے جائیں تو یہ ووٹرز کا حقہ پانی بند کر دیتے ہیں۔ وعدہ خلافیوں پر ہمارے سیاست دانوں پر عوام ٹماٹروں اور گندے انڈوں کی بارش کرتے ہیں جبکہ پالیٹیشن کی وعدہ خلافی کی صورت میں ووٹ گندے انڈوں اور ٹماٹروں کا کام کرتے ہیں۔

گداگر

آپ یہ مت سمجھیں کہ برطانیہ میں فقیر نہیں ہوتے۔ ضرور ہوتے ہیں مگر ہمارے فقیروں جتنے بدحال اور ڈھیٹ نہیں ہوتے۔ بھیک مانگنے میں بھی عزت نفس کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ یہ مسکین مگر مہذب ہوتے ہیں۔ بھیک نہ بھی ملے تو آپ کو قہر آلود نگاہوں

سے دیکھ کر فقرے بازی نہیں کرتے۔ مگر ہمارے فقیر رعب سے مانگتے ہیں اور کچھ نہ ملنے کی صورت میں ان کی دعاؤں کو بددعاؤں میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی۔

برطانیہ کے فقیروں کے سبھی اعضاء سلامت ہوتے ہیں کیونکہ یہ جسمانی بلیک میلنگ کے ذریعے بھیک نہیں مانگتے۔ اس کے بر عکس ہمارے فقیروں کے ہاتھ پاؤں خود توڑ دیئے جاتے ہیں۔ وہاں کٹے پھٹے بازوؤں، ٹوٹی ٹانگوں اور مڑے تڑے ہاتھوں اور بینائی سے محروم لوگ اس پیشے میں نہیں آتے بلکہ ہسپتالوں نرسنگ ہومز یا گھروں میں حفاظت سے رہتے ہیں۔ ان کے بھیک مانگنے میں بھی تخلیقی پہلو ہوتا ہے۔ یہ اکثر موسیقی سنا کر آپ کو خوش کرتے ہیں۔ اگر پسند آئے تو کچھ دے دیں وگرنہ خاموشی سے گزر جائیں۔ یہ آپ کا پلو نہیں پکڑیں گے لیکن ہمارے فقیر ابھی تک صدیوں پرانے سلوگن ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہیں ریفریشر کورسز کروانے کی ضرورت ہے۔

کیونکہ برطانیہ میں گداگری جرم ہے اس لیے وہاں کے فقیر کھلے بندوں بھیک نہیں مانگتے۔ اگر ان کے پاس کوئی آلہ موسیقی نہ ہو تو پھر ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھ کر ہی دست سوال دراز کرتے ہیں۔ ان کے پاس بھی اکثر گھر پہنچنے کا کرایہ نہیں ہوتا، لیکن ان کی جیب نہیں کٹتی۔ ہمارے ہاں گداگری ایک منظم پیشہ ہے جبکہ برطانیہ میں اس کی کمرشل ویلیو نہیں ہے۔ اس لیے کوئی بھی اس بزنس میں ہاتھ نہیں ڈالتا اور گداگر فری لانس کے طور پر ہی کام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر

اگر دیکھا جائے تو ڈاکٹر اور ڈاکو ہونے میں بہت کم فاصلہ ہے۔ جو ڈاکٹر مرض کی تشخیص صحیح طرح نہ کرے، غلط سلط دوائیاں دے کر مریضوں کی جان خطرے میں ڈالے بلکہ انہیں زندگی کی قید سے آزاد کر دے اور پھر بھی بھاری فیس وصول کر کے دن دہاڑے لوٹے اسے ڈاکو کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

ہمارے ہاں جب جی چاہے، ڈاکٹر تبدیل کریں، مگر برطانیہ میں نسل در نسل لوگ ایک ہی ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ مریض بد تمیزی کریں تو ڈاکٹر مریض بدل لیتے ہیں، لیکن یہاں ڈاکٹر ناروا سلوک کریں تو لوگ ڈاکٹر بدل لیتے ہیں۔

ہمارے ڈاکٹرز پرائمری سے ہائر ایجوکیشن تک کی ساری ڈگریاں بورڈز پر لکھ کر نمائش کرتے ہیں تاکہ ان پڑھ عوام پر رعب رہے، لیکن برطانیہ میں ڈاکٹرز اپنی ڈگریاں یوں چھپا کر رکھتے ہیں جیسے امتحان پاس نہیں کیا تھا بلکہ ڈگری خریدی تھی۔

ہمارے ہاں کے ڈاکٹرز بہت زیادہ خدمت خلق کرتے ہیں۔ دن میں ہسپتالوں میں ہوتے ہیں جبکہ شام میں پرائیویٹ کلینک میں بیٹھتے ہیں اور زیادہ تر ان مریضوں کو دیکھتے ہیں جن کا دن کے وقت ہسپتالوں میں علاج کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے۔ یہ اپنی ڈگریوں کو اچھی طرح کیش کرواتے ہیں اور نوٹوں کے تھیلے بھر بھر کر گھر لے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس برطانیہ میں ڈاکٹر یا تو ہسپتالوں میں کام کرتے ہیں یا پھر اپنے کلینک میں۔ پارٹ ٹائم پرائیویٹ پریکٹس بھی کرتے

ہیں مگر افرادی طور پر نہیں بلکہ پرائیویٹ اسپتالوں کے ساتھ لیکن عام ڈاکٹرز جنہیں جی۔ پی کہا جاتا ہے، وہ بڑے مسکین ہوتے ہیں اور شام کو سرجری سے جاتے ہوئے ان کے بریف کیس میں صرف تھکن، مریضوں کا درد اور پیراسیٹامول کی چند گولیاں ہی ہوتی ہیں۔

طالب علم

انہیں عرف عام میں اسٹوڈنٹس بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علم کی طلب میں کم اور دوسری چیزوں کے حصول میں زیادہ پریشان رہتے ہیں۔ ان کی اس حرکت پر اگر انہیں ان کا اسٹیٹس یاد دلایا جائے تو طیش میں آکر نعرے بازی بھی کر سکتے ہیں مگر برطانیہ کے طالب علم نعرے نہیں لگاتے، صرف پڑھائی کرتے ہیں اور بہت ہوا تو خاموش احتجاج کرتے ہیں۔ پبلک پراپرٹی کو نقصان نہیں پہنچاتے کیونکہ کل کو انہیں اس نقصان کی تلافی ٹیکسوں کی شکل میں کرنا ہوتی ہے۔

برطانیہ کے سکولوں میں استاد پڑھانا چاہتے ہیں مگر طالب علم پڑھنا نہیں چاہتے حتیٰ کہ اساتذہ انہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور گھروں تک سے پکڑ کر بھی لاتے ہیں۔ اگر وقت کی کمی کی وجہ سے گھروں تک نہ جا سکیں تو سوشل ورکرز کو بھیج دیتے ہیں۔ سکول کے اوقات میں آوارہ گردی کرنے والے طالب علموں کو پولیس پکڑ کر یا تو واپس گھر یا سکول میں لے آتی ہے۔ والدین بچوں کو باقاعدگی سے سکول نہ بھیجیں تو قانونی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے، جرمانے بھرتے ہیں۔ وہاں کے بچے سولہ سال کی عمر تک بڑی مصیبت میں رہتے ہیں کیونکہ سویٹ سکسٹین تک تعلیم لازمی ہے۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں کے طالب علم تو پڑھنا چاہتے ہیں مگر استاد ٹیوشن پڑھانے پر اصرار کرتے ہیں۔ طالب علموں کو سکول میں آنے کی ترغیبات کم اور مولا بخش کی مدد سے بھگانے کے زیادہ نسخے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہمارے اساتذہ کے اس حسن سلوک کی وجہ سے بہت سے طالب علم ہمیشہ کے لیے ہی تعلیم کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

ہمارے ہاں بچے کتابوں کی پوری دکان کمر پر لاد کر چلتے ہیں جبکہ وہاں کے طالب علم ہاتھ لٹکاتے سکول جاتے ہیں اور ویسے ہی واپس آجاتے ہیں۔ ہمارے ہاں طالب علم ہوش میں آتے ہی سیاست کے اسرار و رموز سے واقف ہو جاتے ہیں جبکہ برطانوی طالب علم تعلیم سے فارغ ہو کر عملی سیاست میں قدم رکھتے ہیں۔

برطانیہ میں ذریعہ تعلیم جرمن یا فرنچ زبان نہیں بلکہ ان کی اپنی مادری زبان انگریزی ہے۔ اگرچہ وہاں بھی گرائمر پبلک اور پرائیویٹ سکول ہوتے ہیں لیکن حکومتی سطح پر چلنے والے سکولوں کا معیار اور سہولتیں بھی ہمارے ملک کے مہنگے ترین سکولوں سے زیادہ بہتر ہیں۔ تعلیمی درسگاہوں کے دروازے ہر شخص کے لیے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں اچھی تعلیمی درسگاہوں کے دروازے صرف امیروں اور سفارشیوں کے لیے کھلے رہتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے جوہر قابل غربت کے ہاتھوں تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔

فارمولے اور تبصرے

فارمولا نمبر 1 (پی ٹی وی)

خبر نامہ + ڈرامے + اشتہارات = پی ٹی وی

جب اس دنیائے رنگ و بو کی تخلیق ہوئی تو پاکستان ٹیلی ویژن کے خبر نامے کا سانچہ بھی اسی وقت تیار ہو گیا تھا لیکن اس کی اطلاع اربوں کھربوں سالوں کے بعد اس خطہ زمین تک پہنچی۔ دراصل عرش والے اس انتظار میں تھے کہ پاکستان معرض وجود میں آجائے۔ اس الہامی خبر نامے کو تبدیل کرنا یا اس میں کوئی رد و بدل کرنا انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے عوام دوسرے ممالک کے خبر ناموں پر انحصار کرتے ہیں۔

ڈرامے کی صنعت میں ترقی پر ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ ہماری سرشت میں شامل ہے۔ ہر لمحے زندگی میں ڈرامہ بازی ہوتی رہتی ہے۔ ویسے زندگی سے بڑی کامیڈی اور ٹریجڈی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اندرون خانہ ڈراموں کو گلیمرائز کر کے ناظرین کے لیے تفریح طبع کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ ہماری دیکھا دیکھی ہمارے پڑوسی بھی ڈرامے کرنے لگے ہیں۔ ویسے وہ تو ہر روز بلکہ ہر لمحے ایک نیا سکرپٹ لکھتے ہیں۔ انہیں اپنے ڈراموں کی کم مائیگی پر احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ پی ٹی وی کے ڈرامے ساری دنیا میں بہت ذوق وشوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے ڈراموں کی دوسری زبانوں میں ڈبنگ کر کے انہیں بین الاقوامی سطح پر پروموٹ کریں۔

اشتہارات کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کی حفاظت بندہ جی جان سے کرتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ ٹوٹ جائے تو بندہ بالکل پالک بن جاتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اس شعبے نے کافی ترقی کی ہے اور نت نئے چہروں کو منی سکرین پر متعارف کروایا جاتا ہے۔ ان چہروں کی تازگی اور سج دھج دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ملک میں غربت کا بالکل خاتمہ ہو چکا ہے۔ عورتوں کی ڈریس سینس بہت اچھی ہو گئی ہے اور ہمارے ہاں صرف اپر کلاس ہی ایگزاسٹ کر رہی ہے۔ ویسے ان اشتہارات کو دیکھ کر کچھ خواتین احساس کمتری کا شکار بھی ہو جاتی ہیں کیونکہ اس قدر بن سنور کر اور چہرے پر مسکان لا کر گھریلو کام کاج کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔

فارمولا نمبر 2 (زی ٹی وی)

گپ شپ + سارے گاما پا + تھا تھی تھیا = زی ٹی وی

پی ٹی وی کا خبر نامہ اور زی ٹی وی کا سچ گپ ہم پلہ پروگرام ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ خبر نامے میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اصل خبر لیک نہ ہو جائے جب کہ زی ٹی وی اصل خبر کو اس طرح بگاڑ کر پیش کرتا ہے کہ اس پر گپ شپ پروگرام کا گمان ہوتا ہے۔ اس لیے بچے اسے شوق سے دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی بڑے بھی دیکھ کر ہنستے ہیں۔ ویسے رو بھی سکتے ہیں مگر ہر روز رونا بھی تو آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے وہ ہنسنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ لافٹر از دی بیسٹ میڈسن۔ اس کے لیے انہیں زی ٹی وی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

زی ٹی وی کا بریک فاسٹ میوزک، لنچ میوزک اور سپر بھی میوزک ہی ہے۔ ویسے میوزک اگر ڈھنگ کا ہو تو سننے میں ہرج نہیں کیونکہ موسیقی روح کی غذا کہی جاتی ہے۔ مگر اس قسم کی بے ہنگم غذا سے سخت قسم کے ڈائیریا کا اندیشہ رہتا ہے۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوتا ہے کہ اعضا کی شاعری یعنی رقص کو بھی تینوں وقت کے کھانے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے ہر دو ممالک کے علاوہ جہاں جہاں بھی دنیا میں براؤن چمڑی والے لوگ رہتے ہیں، وہاں نوجوان نسل تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا ہی کرتی رہتی ہے۔

فارمولا نمبر 3 (بی بی سی)

خبریں = بی بی سی

بی بی سی کا قیام خالص خبروں کے نقطہ نظر سے ہی وجود میں آیا تھا اس لیے اس شعبے میں یہ پی ٹی وی اور زی ٹی وی کی والدہ ماجدہ ہیں۔ جو خبریں دونوں ٹیلی ویژین نشر نہیں کرتے، وہ بی بی سی کرتی ہے۔ اس لیے ان کی خبریں بہت مستعد مانی جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ بی بی سی کے اس قسم کے کردار کو دیکھ کر ہمارے گھر میں کام کرنے والی مائی اسے بی بی سلندر کہتی ہے۔ شکر ہے بی بی قلندر نہیں کہتی نہیں تو اس پر بنیاد پرستی کا مقدمہ قائم ہو جاتا۔

فارمولا نمبر 4 (اپر کلاس)

گٹ مٹ + میکڈونلڈ + کے ایف سی + چائنیز = اپر کلاس

ہمارے ملک میں کلاس سسٹم کی گرپ اس طرح ہے جیسے پڑوسی ملک میں ذات پات کی۔ یہ کلاس جسمانی طور پر تو پاکستان میں رہتی ہے مگر ذہنی اور نفسیاتی طور پر یورپ اور امریکہ میں ہوتی ہے۔ مغربی کلچر کو امپورٹ کرنے کے لائسنس ان کے پاس ہیں۔ اپنے ملکی کھانوں سے انہیں بدہضمی ہو جاتی ہے اس لیے ان کے خیر خواہوں نے ان کے لیے برگر شرگر اور سوپ شوپ کا انتظام کر رکھا ہے۔

یہ کلاس ماں بولی میں بات کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہے کہ کہیں ان پر دیسی اور غیر مہذب ہونے کا الزام نہ آجائے۔اس لیے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں کتنی بھی مشکل پیش آئے ، یہ انگریزوں سے غداری نہیں کرتے۔ان کے نونہال برٹش اور امریکن ایجوکیشن سسٹم کو فالو کرتے ہیں۔ پاکستان کا آؤٹ آف ڈیٹ سلیبس صرف غریب اور متوسط بچے ہی پڑھتے ہیں۔اس لحاظ سے اگر تعلیمی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم مغربی ممالک سے پیچھے نہیں ہیں۔اس طبقے کے نازنخروں کی بدولت انہیں وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملتا ہے اور اس امیر ملک کے غریب لوگوں پر حکمرانی کی سعادت بھی انہیں ہی حاصل ہوتی ہے۔

فارمولانمبر 5 (سسرال)

ساس+نند=سسرال

مجازی خدا جسے خواتین مزاجی خدا بھی کہتی ہیں کیونکہ یہ مزاج درست کرنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں) یہ ان کی والدہ ہوتی ہیں۔ویسے انہیں خوشدامن بھی کہا جاتا ہے۔شادی سے پہلے ان کے دامن میں خوشیاں ہی خوشیاں ہوتی ہیں مگر بعد میں انہیں کئی غم دامن گیر ہوجاتے ہیں۔مثلاً رسہ گیری خبر گیری وغیرہ وغیرہ۔سسرال کی رونق ان کے دم قدم سے ہے۔جس سسرال میں ساس نہ ہو اسے یتیم ویسیر سرال کہا جاتا ہے اور اس سسرال میں پلنے والی بہو کو ناتجربہ کار۔منہ دکھائی میں ساس نہ ملنے والی بہوئیں بھی بڑی مظلوم ہوتی ہیں۔وہ سمجھتی ہیں کہ ساس کی دست برد سے محفوظ ہیں لیکن وہ زندگی کے اس حسین تجربے سے محروم رہ جاتی ہیں جو ساس کی شکل میں ان کے حصے میں نہیں آتا۔ساس اور نند ایک ہی تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ساس کی غیر موجودگی میں یہ کاروبار خانہ داری سنبھال لیتی ہیں کیونکہ ماں کی مشیر اعلیٰ ہوتی ہیں۔شادی شدہ نندوں کو اپنے گھر کی فکر کم اور بھائی کی فکر زیادہ رہتی ہے۔

ساس اور نند کی موجودگی سسرال کی رونقوں کو دوبالا کر دیتی ہے لیکن اگر کہیں نند غیر موجود ہو تو ساس تنہا رہ جاتی ہے۔ایسی ساس بھی ہمدردی کے لائق ہوتی ہے کہ اکیلی ہی بہو کے ظلم وستم کا نشانہ بنتی ہے۔نند نہ ہو تو آدھی سسرال اور اگر ساس بھی نہ ہو تو پھر سسرال اور میکے میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا۔

کچھ شوہر بھی کبھی کبھی ساس کا چولا پہن لیتے ہیں۔ایسے شوہروں کو ٹریننگ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے رول کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور غیر ضروری ٹینشن اپنے سر نہ لیں وگرنہ وہ نہ شوہر رہیں گے اور نہ ساس بن سکیں گے۔

سسرال میں سب لوگ ساس کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔جہاں ساس نہ ہو وہاں بہو کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ایسی بہوؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے جامے میں رہیں اور معصوم رعایا پر بے جا ظلم نہ کریں۔کیونکہ ظالم کی رسی دراز تو ہوتی ہے مگر اتنی بھی دراز نہیں ہوتی کہ کبھی پکڑ میں نہ آسکے۔

متفرقات

کچھ مصنفہ کے بارے میں

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل برطانیہ میں کوئی نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے مقیم ایک ممتاز شاعرہ، ادیبہ، سماجی کارکن، حقوقِ نسواں کی علمبردار اور ادبی وثقافتی تنظیم آگہی کی بانی اور صدر ہیں۔

1973ء میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد برطانیہ آئیں اور یہاں مزید اعلیٰ تعلیم لندن، برمنگھم، واروک اور آکسفورڈ میں حاصل کی۔ شروع میں برٹش سول سروس میں ملازمت اختیار کی مگر کچھ ہی عرصہ بعد انہوں نے سوشل ورک اور سماجی خدمت کو اپنے لئے بطور پروفیشن منتخب کرلیا۔

سوشل ورک کی اعلیٰ تعلیم برمنگھم اور واروک کی جامعات سے امتیازی حیثیت سے مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ سال کی بہترین طالبہ کا اعزاز حاصل کیا۔ ان کا تعلیمی کیریئر شروع سے ہی شاندار رہا۔ انہوں نے ہر امتحان امتیازی حیثیت اور اسکالرشپ کے ساتھ پاس کیا۔

ان کے سوشل ورک میں ڈاکٹریٹ کے مقالے کا موضوع گھریلو تشدد کے بچوں پر اثرات تھا۔ انہوں نے سینڈول اور برمنگھم کے لوکل گورنمنٹ کے سوشل ورک محکموں میں تقریباً تیس برس ملازمت کرنے کے بعد 2015ء میں بوجوہ قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کی۔

دورانِ ملازمت ہی انہوں نے چند پاکستانی پروفیشنل خواتین کے ساتھ مل کر ۱۹۹۷ء میں ایک ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کی بنیاد رکھی۔ جس کی یہ بانی اور صدر نشین مقرر ہوئیں۔

اس تنظیم کا مقصد برطانیہ کی ایشیائی خواتین میں انہیں یہاں کے معاشرہ میں درپیش مسائل کے بارے میں شعور وآگہی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مثبت حل کی طرح رہنمائی کرنا بھی تھا۔ یہ کام اُردو ادب اور آرٹ کی وساطت سے کیا گیا جس سے نہ صرف یہاں خواتین قلمکاروں کو ایک مؤثر پلیٹ فارم میسر آیا بلکہ اُردو زبان وادب اور فنونِ لطیفہ کی ترویج وترقی کو بھی یہاں اجاگر کرنے کا ایک نادر موقع میسر آیا۔ اس مقصد کے لئے برطانیہ بھر کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایشیائی خواتین قلمکاروں اور فنونِ لطیفہ سے متعلق افراد کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملا۔

انہیں شاندار کمیونٹی ورک پر 2000ء میں ملینیم کمشن کی تاحیات فیلوشپ دی گئی۔ جبکہ 2015ء میں پی ٹی وی گلوبل ایوارڈ انہیں بہترین کمیونٹی اور سوشل ورک خدمات پر دیا گیا۔

ادب سرائے (لاہور) نے ان کے ادبی اور سماجی کام کو سراہتے ہوئے حُسنِ کارکردگی ایوارڈ سے نوازا جبکہ یارک شائر ادبی فورم

(برطانیہ) نے نہیں 2017ء میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا۔

2017ء میں انہیں برطانیہ کی ایشیائی کمیونٹی بالخصوص پاکستانی خواتین کے ساتھ پچھلے پچیس برس مختلف سماجی اور ثقافتی مسائل پر بھرپور انداز میں رضا کارانہ طور پر کام کرنے اور ان کے مسائل میں مثبت پیش رفت کو سراہتے ہوئے ملکہ معظّمہ الزبتھ دوم نے اپنی سالگرہ پر انہیں ایم بی ای (M.B.E) یعنی ممبر آف برٹش ایکسیلنس کے قابلِ قدر اعزاز سے نوازا۔ سوشل اور کمیونٹی ورک میں نمایاں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ انہیں برطانیہ اور بیرون برطانیہ ادبی اور ثقافتی تنظیموں کی مجلس عاملہ کی رکن ہونے کے ساتھ ساتھ کئی ادبی رسائل و جرائد کی مدیرہ، سرپرست اور میئر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ جن میں پرواز (لندن)، ادب سرائے (لاہور) ادبی منظر (برطانیہ) ترسیل (انڈیا) اور آگہی (لندن) وغیرہ شامل ہیں۔

ان کی نثری اور شعری تخلیقات برطانیہ، پاکستان اور انڈیا کے مؤقر ادبی جریدوں اور اخبارات کی زینت بنتی رہی ہیں اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ ان جرائد و رسائل اور اخبارات میں چہارسو (اسلام آباد) پیغام (انڈیا) پرواز (لندن) عکاس (اسلام آباد) شام کے بعد (لاہور) ساحل (لندن) آدرش (لندن) شفق (برمنگھم) ترسیل (انڈیا) بیاض (لاہور) الحمرا (لاہور) شاعر (بمبئی) ادب سرائے (لاہور) لیڈی رپورٹر (لاہور) شوہر نامدار (لاہور) کے علاوہ بہت سے اور اخبارات جن میں روزنامہ جنگ (لندن) اوصاف (لاہور) روزنامہ جنگ (راولپنڈی) روزنامہ جنگ (لاہور) نوائے وقت (لاہور) دن (لاہور) انشا (انڈیا) جدید ادب (جرمنی) نیشن (لندن) اُردو ٹائمز (لندن) پاکستان پوسٹ (لندن) کے علاوہ اور بہت سے ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات شامل رہے ہیں۔

ان کی ادبی اور تخلیقی کاوشوں پر تبصرے، جائزے اور تاثرات بیان کرنے والوں میں اُردو ادب کے بڑے معتبر نام شامل رہے ہیں۔ ممتاز تذکرہ نگار سلطانہ مہر نے اپنی کتاب سخنور پنجم میں ان کا تفصیلی انٹرویو شائع کیا۔ اس کے علاوہ لندن سے شائع ہونے والی کتاب برطانیہ کے ادبی مشاہیر میں ان کا تفصیلی انٹرویو شائع ہوا جبکہ چہارسو (اسلام آباد) پرواز (لندن) شام کے بعد (لاہور) عکاس انٹرنیشنل (اسلام آباد) جنگ (لاہور) ڈاکٹر حسن رضوی۔ جنگ (اسلام آباد) انوارِ فطرت اور نوائے وقت لاہور کے علاوہ کئی رسائل و اخبارات نے ان کے گوشے چھاپنے کا بھی اہتمام کیا۔

ان کے ادبی اور تخلیقی کام پر پاکستان میں بی اے، ایم اے اور ایم فل کے مقالات لکھے جا چکے ہیں۔

ان تمام تر کامیابیوں کے باوجود ڈاکٹر رضیہ اسماعیل بے حد عجز و انکساری سے کام لیتی ہیں اور خود کو ملنے والے اعزازات و انعامات اور ستائش کو صرف اپنا ذاتی اعزاز ہی نہیں سمجھتیں بلکہ یہ ان تمام لوگوں کا بھی اعزاز خیال کرتی ہیں جو ''آگہی'' کے سفر میں ان کے ساتھ شریک رہے۔

''آگہی''، تنظیم کی مجلس عاملہ اور کارکنان کے علاوہ تمام ایشیائی کمیونٹی انہیں ان کی کامیابیوں اور عزت افزائی پر دلی مبارک پیش کرتے ہوئے ہر وقت ان کی مزید کامیابیوں کے لئے دعا گو رہتی ہے۔ اللہ رب العزت انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

اہلِ نظر کے تاثرات

حمید رقریشی (جرمنی)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل شاعری کی مختلف اصناف (غزل، نظم، ماہیا، دوھے) میں اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی مسلسل پیش قدمی کر رہی ہیں۔ تنقیدی، تعارفی مضامین اور طنز و مزاح پر مشتمل تحریریں وہ عرصہ دراز سے لکھ رہی ہیں۔ ان کے بعض شاندار خاکے بھی پڑھنے کا موقع ملا ہے پھر ان کی علمی بحث کے ساتھ شائع ہونے والی کہانیوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے'' یہ ساری شعری اور نثری نگارشات میں دل چسپی کے ساتھ پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔

ان کی کہانیوں اور آدھی چادر کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔ ایک اور خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول اور علاقے کی بات کر رہی ہوتی ہیں عام طور پر وہیں کا پورا ماحول اور لفظیات کہانی میں سرایت کر جاتی ہیں۔ ہندوستان کے دیہات کا ماحول ہو یا انگلینڈ کا شہری ماحول۔ پنجاب کے صوفی شاعر ہوں یا قونیہ کے صوفی رقاص، پاکستان کا دیہاتی منظر ہو یا امریکہ و جاپان کا کوئی بیان رضیہ اسماعیل کہانی کے بیانیے میں پوری طرح ڈوبی دکھائی دیتی ہیں۔ کہانی کے زمانے اور ماحول کا پوری طرح کہانی میں سرایت کر جانا رضیہ اسماعیل کی فنی مہارت کا ثبوت ہے اور یہ مہارت ایک طویل ریاضت کے بغیر نہیں ہوتی۔

سلمیٰ اعوان۔ (لاہور)

رضیہ اسماعیل کے افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر'' پڑھ کر احساس ہوا کہ وہ کہانی کہنے کا فن جانتی ہی نہیں بلکہ اسے سلیقے سے طریقے سے سجا کر پیش کرنے میں بھی ماہر ہیں۔ آدھی چادر اس مجموعے کی مرکزی کہانی جہاں وہ پاکستان کی کٹی پھٹی تقسیم پر نوحہ خواں ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ہم پاکستانیوں خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت بھی ان حقائق سے آگاہ نہیں جن پر اس کی کہانی نہ صرف روشنی ڈالتی ہے بلکہ جا بجا کرب اور دُکھ کا اظہار بھی کرتی ہے۔

رضیہ اسماعیل اتنی متنوع صفات کی حامل شخصیت ہیں کہ ان پر رشک آتا ہے۔ شاعری کا میدان ہو یا نثر کی دشوار گزار گھاٹیاں یا پوپ کہانیوں پر علمی و ادبی بحث ہو۔۔ وہ ایک فکری گہرائی، سچائی اور بے باکی سے جس طرح اپنے ہونے کا اظہار کرتی ہیں وہ قابل

صد تحسین ہے ان کی تحریروں اور کلام کی نغمگی اور اس میں ٹھاٹھیں مارتی عنایت ایک طرف اگر اس کا حسن بڑھاتی ہے تو وہیں اس کے اندر کے دکھ اس کے لفظوں کے راستوں سے باہر آ کر آپ کو افسردہ کر دیتے ہیں۔

ایک وسیع دنیا رضیہ اسماعیل کے حصار میں رہتی ہے۔ دعا گو ہوں کہ ان کا یہ فنی سفر جاری و ساری رہے اور وہ مزید کہانیوں اور افسانوں کے توسط سے ہمیں ان کرداروں سے ملواتی رہیں جو انہیں لکھنے پر اکساتے رہتے ہیں۔

بشریٰ رحمٰن۔ (لاہور)

رضیہ اسماعیل کی نثری اور شعری تحریریں پڑھ کر ایک بہت واضح تاثر ابھرتا ہے کہ اتنا عرصہ بیرون ملک گزارنے کے باوجود ان کی تحریریں اپنی زمین اور اپنی مٹی سے جڑی ہوتی ہیں۔ جب وہ اپنی زمین اور مٹی کی بات کرتی ہیں تو پھر نہیں زمین کے ساتھ لگی ہوئی اپنی عورت نظر آتی ہے۔ اور وہ عورت کے جذبات و احساسات کو ایک عورت بن کر پوری فکری اور ادبی سچائی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ''یہ آگہی میری مجھے رکھتی ہے بے قرار'' رضیہ اسماعیل کے پاس آگہی بھی ہے خوب صورت تحریر بھی ہے' محبت ہے شدتِ احساس ہے' ان کی تحریروں میں سادگی' سچائی اور احساسِ آگہی ہے جو سیدھا دل پر جا کر لگتا ہے۔ رضیہ اسماعیل کی شاعری ہو یا نثری تحریریں۔ ان میں ایک خاص طرح کی اداسی ہر وقت یوں چھائی ہوئی ملتی ہے جیسے کعبے کی فضاؤں میں دعائیں رہتی ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ رضیہ اسماعیل علم و آگہی کی جو مشعل لے کر نکلی ہیں اس کی روشنی کبھی ماند نہ پڑنے پائے۔ (آمین)

ڈاکٹر شہناز مزمل۔ (لاہور)

چشم بینا اور چشم بصیرت رکھنے والی رضیہ اسماعیل بیک وقت شاعری اور نثر کی وادی پُرخار میں آبلہ پائی کے لیے قدم رکھ چکی ہے۔ اس وادی پُرخار میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنے جذبات اور محسوسات کو جو شمار نہیں کیے جا سکتے بلکہ مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتے ہیں' ایک نیا رنگ دیا ہے۔

رضیہ کی آنکھیں بولتی اور جاگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور ہمہ وقت کچھ تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔ دورانِ تلاش رضیہ کی چشم حیراں نے اسے چشم نم عطا کر دی۔ جس سے اس نے اپنی جنس کے وہ روپ اور انداز دیکھے کہ جذبات میں طوفان آ گیا۔ رضیہ اسماعیل جو ایک عورت اور ایک ماں ہے سراپا درد ہے۔ ہر درد' ہر کرب اس کو ممتا نے بخشا ہے جو کہ تخلیق کار ہے اور تخلیق کرب کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ تاریک راہوں کے اندر کی روشن' متلاشی آنکھ رضیہ کے ساتھ قطب ستارے کی طرح ہے۔ جس سے وہ ظاہر اور باطن دونوں کے ادراک کا سلیقہ رکھتے ہوئے بہت جاندار اور دل کو چھو جانے والی تحریریں ادب کے باذوق قارئین کے لیے پیش کر رہی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ (آمین)

یعقوب نظامی۔ بریڈفورڈ (برطانیہ)

رضیہ اسماعیل کی شخصیت کے کئی روپ ہیں' شروع میں تو میں اسے سوشل ورکر' حقوقِ نسواں کی جنگ لڑنے والی ایک سپہ سالار کی حیثیت سے جانتا تھا' جنہوں نے برطانیہ میں ایشیائی خواتین کی فلاح و بہبود اور عصری آگہی کے لیے 1997ء میں ''آگہی'' نامی تنظیم کا قیام کیا۔ بعدازاں ان کی شعری اور نثری تخلیقات کو پڑھنے اور ان پر اظہارِ خیال کا موقعہ بھی میسر آیا۔ رضیہ اسماعیل نے جہاں سنجیدہ شاعری کی ہے وہیں نثر میں طنز و مزاح کے پھول کھلائے ہیں۔ آدھی چادر کے افسانے ان کی ادبی اور فنی مہارت کا ثبوت ہیں۔ اپنے لیے تو ہر کوئی کام کرتا ہے' دوسروں کے لیے کام کرنے والے لوگ بلاشبہ عظیم ہوتے ہیں۔ رضیہ اسماعیل بھی اپنی ذات کی بجائے دوسروں کے دکھ درد کا مداوا کر رہی ہیں اور بلاشبہ ایک عظیم اور حوصلہ مند خاتون ہیں۔ برطانیہ میں جب مؤرخ اُردو ادب کی تاریخ لکھے گا تو رضیہ اسماعیل کے ادبی اور تخلیقی کام سے چشم پوشی کی گئی تو وہ تاریخ ادھوری ہی رہے گی۔

پروین شیر۔ (کینیڈا)

رضیہ اسماعیل کے لیے یہ کائنات ایک حیرت کدہ ہے جب چشمِ باطن وا ہو جائے تو سچ کے کئی دریچے کھل جاتے ہیں۔ علم کے عرفان اور نورانیت سے روح روشن ہو جاتی ہے تاریکی کی فصیلیں ڈھے جاتی ہیں اور آگہی کا شور کاغذ سے لپٹ جاتا ہے۔

رضیہ کی نثری اور شعری تحریریں پڑھتے ہوئے رضیہ کے باطن کی روشن دنیا مزید روشن ہوتی چلی گئی۔ جس کے دل کا پیمانہ مظلوم عورتوں کے اشکوں سے لبالب ہے۔ تخلیق شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ فن کے بطن سے زندگی کی سچائیاں نمودار ہوتی ہیں جو رضیہ کی تحریروں میں چھلک رہا ہے۔ مجھے رضیہ اسماعیل اس کوزہ گر کی مانند نظر آتی ہیں جو کچی مٹی کی لوئی سے بغیر کسی چاک کے صرف اپنے ہاتھوں سے شاہکار تخلیق کر دیتا ہے اور یہ شاہکار رضیہ کی تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کی بیٹیاں بھی ہیں جنہیں وطن سے دور رہ کر بھی انہوں نے اپنی تہذیب و تمدن کا نمونہ بنا دیا ہے میری دعائیں ہمہ وقت ان کے ساتھ ہیں۔

سلطانہ مہر (کیلیفورنیا)

رضیہ اسماعیل نے صنف شاعری میں غزل' نظم (آزاد اور پابند) ماہیے اور دوہے لکھنے کے بعد نثر کے میدان میں بھی بڑے کامیاب افسانے اور افسانچے تحریر کئے ہیں۔ طنز و مزاح لکھنے کا ملکہ بھی قدرت نے انہیں ودیعت کر رکھا ہے جس کی جھلک ان کی کتاب ''چاند میں چڑیلیں'' میں نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر'' اور ''مٹی کی آواز'' ہیں جبکہ ''دائروں کا سفر'' افسانچے ہیں' جس میں انہوں نے کامیابی سے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے نا آسودہ کرداروں اور حالات کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ رضیہ اسماعیل کی رنگارنگ تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ یکسانیت سے اکتا جاتی ہیں اور طائرِ خیال انہیں نت نئے تخلیقی تجربات کرنے پر مامور کیے رکھتا ہے۔ رضیہ اسماعیل کی تحریریں بلاشبہ اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

ڈاکٹر صفات علوی (بریڈفورڈ۔برطانیہ)

رضیہ اسماعیل کی نثری اور شعری تحریروں میں زندگی کی حرارت ہے۔ سنجیدہ افسانوں کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہونا خوش آئند بات ہے۔ ان کی نثری تحریروں میں طنز کا پہلو نمایاں ہے۔ ایسا طنز جو زندگی کی حقیقتوں پر سے اس طرح پردہ اٹھاتا ہے کہ قاری طمانچہ تو محسوس کرتا ہے لیکن بلبلاتا نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مزاح کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما جائے۔ رضیہ اسماعیل خواتین کی ادبی اور ثقافتی تنظیم ''آگہی'' کی بانی اور صدر ہونے کے ساتھ ساتھ سوشل ورک کے پیشے سے منسلک ہیں جو ان کے نزدیک ایک خدمت خلق کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ اس لحاظ سے قابل مبارکباد ہیں کہ انہیں ابلاغ کے سلسلے میں عصری تقاضوں کا علم ہے چنانچہ جہاں تک میرے علم میں ہے برطانیہ میں یہ پہلی اُردو ادیبہ ہیں جنہوں نے اُردو ادب کے سلسلے میں ایک ویب سائٹ کا اجرا کیا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ محترمہ رضیہ اسماعیل اسی طرح برطانیہ کے اُردو ادب کی ترقی میں معاون رہیں۔

ڈاکٹر حسن رضوی۔(لاہور)

فن کار دیا چاہے کہیں بھی روشن ہو اس کے راستے میں سرحدیں حائل نہیں ہوتیں۔ ایک ایسا ہی چراغ رضیہ اسماعیل کی صورت میں برطانیہ کے شہر برمنگھم میں عرصہ دراز سے روشن ہے جس کی لو میں اگر روایتی غزل نظر آتی ہے تو آزاد اور نثری نظموں کا تجربہ بھی شامل ہے۔ اگر افسانے کی ریاضت ہے تو طنز و مزاح کی چاشنی بھی ان کی نثری تحریروں میں ایک خوش کن اضافہ ہے۔

رضیہ اسماعیل کی نثری اور شعری تخلیقات کو پڑھتے ہوئے یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ وطن سے دور رہ کر بھی انہوں نے اپنی مٹی سے ناتا نہیں توڑا، اپنی روایات سے بندھے رہنے کو ہی اپنی شناخت اور پہچان بنایا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ ایک طویل عرصہ مغرب میں رہنے کے باوجود وہ مشرق کی ہی بیٹی ہیں۔

عقیل دانش۔لندن (برطانیہ)

رضیہ اسماعیل نے ایک طویل عرصے سے خود کو خرد افروزی، فکر و فن، شعر و ادب اور دیدۂ دانش کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ان کی نثری اور شعری تخلیقات سے ایک واضح تاثر ابھرتا ہے کہ معاشرے میں ابھرنے والے مسائل، مصائب اور محرومیوں پر ان کی گہری نظر ہے انہوں نے پھولوں کی چھاؤں کو چھوڑ کر کانٹوں کی راہ گزر اپنائی ہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور کاوش سے اس راہ گزر کو بھی گلزار بنا دیا ہے اسی لئے انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا ہے

؎ گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو
مجھے کانٹوں پہ چلنا آ گیا ہے

حسن عسکری کاظمی۔(لاہور)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کی تخلیقی ثروت مندی، مختلف جہات میں نمو پذیر ہو کر ان کی جہدِ مسلسل اور تراسیل فکر میں ان کی ریاضت فن پر قارئین ادب اور ناقدین کا اتفاق ہے کہ وہ انسان دوستی، اعلیٰ انسانی اقدار اور روشن مستقبل پر یقین رکھتی ہیں۔ ایک طرف اعلیٰ پائے کی شاعرہ ہونے کے ناطے خوشبو، گلاب، کانٹے جیسی خوبصورت اور دیدہ زیب کلیات کا تحفہ لے کر ایوانِ شعر و سخن میں داخل ہوتی ہیں اور دوسری طرف افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر'' اور ''کہانی بول پڑتی ہے'' جیسی نثری تخلیقات میں اپنے وطن کی ثقافت کی نمائندہ بن کر سامنے آتی ہیں، اور یوں رضیہ اسماعیل بحیثیت افسانہ نگار اور کہانی کار اپنی پہچان کا یہ رُخ دکھا کر ہمیں مبتلائے حیرت و انبساط کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

ان کی نثری تحریریں پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کے ورق پر لکھی عبارت کے قاری ہیں اور رضیہ اسماعیل ایک ایسی کہانی کار ہیں جو ہمارے روز و شب کی تصویریں بنا کر انہیں ہمارے حجرۂ جان میں سجانے آتی ہیں۔

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی۔(انڈیا)

رضیہ اسماعیل نثر لکھتی ہیں تو یافت کی مختلف کیفیات سے طلوع ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں اور شاعری کرتی ہیں تو صداقت کی اڑان پر اپنے پنکھ تولتی اور ادراک کو لطافت بخشتی دکھائی دیتی ہیں۔

رضیہ اسماعیل کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اسی لیے وہ شعوری جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ معنی آگیں آفاقی بصیرت کو تخلیقی ویژن عطا کرنا فن کاری ہے اور رضیہ اسماعیل اس میں ایک انفرادی حیثیت کی حامل نظر آتی ہیں۔

شاہدہ احمد۔لندن (برطانیہ)

صدیوں تک عورتوں کے فن پارے منہ بند تجوریوں کی طرح زبان بندی کے قفل میں رکھے رہے۔ وہ اندر ہی اندر شعر تراشتی، کہانی لکھتی اور تصویریں بناتی رہیں۔ مگر آنچل میں بندھی گرہ کو کھولنے کی اجازت نہ ملنے کے انتظار میں نہ جانے کیا کیا اس کے اندر ہی تلف ہو گیا اور اجازت اس لئے نہ مل سکی کہ اس کے اندر چھپے خزانے نظروں میں آ کر اس کی فکر کو اعتبار نہ دے دیں۔

مغربی ادب میں مردوں کی اس اجارہ داری کے دائرہ کو توڑ کر اندر قدم رکھنے والی جن خواتین نے ہراول دستے کا کام کیا ان میں ایملی ڈکشن، جین آسٹن، گلیمن اور ورجینیا وولف کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان میں سے کچھ کا کام زندگی میں اور کچھ کا مرنے کے بعد تسلیم کیا گیا۔

رضیہ اسماعیل اس لحاظ سے مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی شعری اور نثری تحریروں کے توسط سے دھیمے لہجے کے پیرہن میں۔ عورت کی داخلی کیفیات کے علاوہ اندر سر اٹھانے والے سوالوں کی گونج کو زبان دی ہے۔ ان کی غزل ہو یا نظم یا نثری نظم، ماہیے

ہوں یا دو ہے یا پھر افسانے' افسانچے' کہانیاں اور طنز و مزاح وہ ہر صنف میں اپنی صنف کا ہاتھ پکڑ کر قدم سے قدم ملا کر چلتی اور اس کے اندر شور مچانے والے سوالوں کا جواب تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔ رضیہ کی تحریروں میں عورت کے کرب' احتجاج اور پیاس کے علاوہ اس کا اپنے وجود کی سمت' احساس آگہی بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ احساسِ آگہی ہی عورت کی حق رسی کا سب سے اہم موڑ ہے۔

محمود ہاشمی (برمنگھم۔برطانیہ)

شاعروں اور مشاعروں کی بالادستی کے دور میں ایک شاعر کا نثر اور وہ بھی طنز و مزاح کی طرف متوجہ ہونا ایک خوش آئند بات ہے۔

رضیہ اسماعیل مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انہوں نے نہ صرف نہایت سنجیدگی سے معیاری شاعری کی ہے بلکہ نثر لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ اگر لکھنے کا ڈھنگ آتا ہو' مزاج میں اپج ہو' طبیعت میں روانی ہو تو نثر میں برجستگی اور شگفتگی سے ایسی ایسی جادو بیانی کی جاسکتی ہے کہ اس پر کئی شعر قربان کئے جاسکتے ہیں۔

رضیہ اسماعیل نے نثر لکھ کر اس فصیل کو بہت حد تک توڑ دیا ہے جو آج کے اکثر ادیبوں کے لاشعور میں نثر کی طرف جانے والے راستے میں ایک کوہِ گراں بن کر کھڑی رہتی ہے۔

زاہد مسعود (لاہور) پاکستان

رضیہ اسماعیل اُردو کی مؤقر شاعرہ اور ادیبہ ہیں وہ نظم و نثر اور ان کی ضمنی اصناف میں کہنے پر عبور رکھتی ہیں۔ اس سے قبل ان کی شاعری کا کلیات' پوپ کہانیاں اور دیگر مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس وقت ان کے افسانوں اور افسانچوں پر مشتمل کتاب آپ کے سامنے ہے۔ تحیر اور تجربات کی آمیزش ان کے افسانوں اور افسانچوں کا بنیادی نقطہ ہے اس کی مدد سے وہ افسانہ بُنتی ہے ان کے افسانے اور افسانچے قارئین کو متاثر کرتے ہیں اور اُن کو حیران بھی کرتے ہیں۔ اپنی بات کہتے ہوئے دوسروں کو حیران کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ میری نیک تمنائیں اس حوالے سے اُن کے ساتھ ہیں کہ وہ اپنے قارئین کو ساتھ لے کر چلیں۔

ادبی اور تخلیقی سفر

شاعری

☆ گلابوں کو تم اپنے پاس رکھو (غزلیں، نظمیں) ۲۰۰۰ء

☆ سب آنکھیں میری آنکھیں ہیں (نظمیں) ۲۰۰۰ء

☆ میں عورت ہوں (نظمیں مع انگریزی ترجمہ) ۲۰۰۱ء

☆ پیپل کی چھاؤں میں (رنگ رنگ کے ماہیے) ۲۰۰۱ء

☆ ہوا کے سنگ سنگ (غزلیں، نظمیں، دوہے) ۲۰۱۱ء

☆ خوشبو، گلاب، کانٹے (پانچوں مجموعوں کی کلیات) ۲۰۱۲ء

☆ خوشبو اُڑتی پھرے (دوہے) ۲۰۱۶ء

☆ احساس کی خوشبو (نظمیں مع انگریزی ترجمہ) ۲۰۱۶ء

نثر

☆ چاند میں چڑیلیں (طنز و مزاح) ۲۰۰۰ء

☆ کہانی بول پڑتی ہے (پوپ کہانیاں) ۲۰۱۲ء

☆ آدھی چادر (افسانے) ۲۰۱۶ء

☆ مٹی کی آواز (افسانے) ۲۰۱۹ء

☆ دائروں کا سفر (افسانچے) ۲۰۱۹ء

☆ عکسِ آگہی: ڈاکٹر رضیہ اسماعیل فن اور شخصیت ۲۰۲۳ء

☆ کاروانِ خیال (نثری کلیات) ۲۰۲۵ء

☆ ولایت گُم گشتہ (سرگذشت) (زیرِ طبع)

تالیفات

☆ نذرانۂ عقیدت.....مجموعۂ درود شریف ۱۹۹۷ء

☆ نیشنل ویمن ڈائریکٹری ۱۹۹۹ء

(برطانیہ میں قلم کار خواتین کی حوالہ جاتی دستاویز).....بہ اہتمام ''آگہی''

☆ رائٹ ٹریک (Write Track) ۲۰۰۰ء

(''آگہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین ویمن رائٹرز کی نثری
اور شعری تخلیقات کا خاص نمبر، اردو اور انگریزی میں)

☆ پوئٹری ٹائم (Poetry Time) ۲۰۰۰ء

(''آگہی'' کے زیرِ اہتمام برطانیہ میں ینگ ایشین رائٹرز کا شاعری کا
مقابلہ اور انعامات حاصل کرنے والی تخلیقات کتابی شکل میں شائع کی گئیں)

☆ قرضِ وفا (شہناز مزمل کی شاعری کا انتخاب) ۲۰۰۲ء

☆ ''آگہی'' ویب سائٹ کا اجراء ۱۹۹۹ء

www.aaghee.co.uk

رابطہ: 10 Augusta Road
Acocks Green
Birmingham
B27 6LA
England.(UK)

ٹیلی فون: +44 0121 574-5148

موبائل: 0750 764 6659

ای میل: aaghee@hotmail.com